سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ ہجری

شہید انسانیت

باہتمام

صادق حسین خنداں لکھنوی پرنٹر

سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی

فہرست مضامین کتاب "شہید انسانیت"

بسلسلۂ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ

حصۂ سوم
واقعۂ کربلا کے نتائج

دسواں باب
اخلاقی نتائج

تمام شد

وہ افراد اہل قلم جن کے نتائج قلمی اور دماغی کاوشیں اس کتاب کی تالیف میں شریک ہیں

(ہر ایک نام کے مقابل میں وہ مقدار صفحات یا سطور کی درج ہے جو کسی ایک صاحب قلم کے اس کتاب میں یک جا یا متفرق طور پر درج ہیں)

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۱	گبن (مصنف زوال سلطنت روم)	۲	۰
۲	مسٹر جان پونگ	۲	۰
۳	سوامی شنکر اچاریہ	۲	۰
۴	ریورینڈ فادر بیلا شس ایس جے پی، ایچ ڈی ڈی سابق پرنسپل سینٹ اکسویرس کالج بمبئی	۲	۰
۵	ہز ہائنس ناصر الملک آف چترال	۲	۰
۶	کارلائل	۳	۰
۷	ہز ہائنس نواب صاحب خنجرہ	۳	۰
۸	قائداعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ (بمبئی)	۳	۰
۹	خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری (موگا کالج)	۳	۰
۱۰	سر بہرام جی جی جی بھائی (بمبئی)	۴	۰
۱۱	بابو راجندر پرشاد ایم اے، ایم ایل۔ ایل، ڈی، سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس (پٹنہ)	۴	۰
۱۲	دستور کیخسرو مہیار کتور پیشوائے اعظم فرقہ پارسی (بمبئی)	۴	۰
۱۳	مولانا اختر علی صاحب تلہری (شاہجہانپور)	۴	۰
۱۴	ہز اگزالٹیڈ ہائنس محمد عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن	۵	۰
۱۵	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی (دہلی)	۵	۰
۱۶	ہز ہائنس مہاراجہ ہلکر آف اندور	۵	۰
۱۷	مہاتما گاندھی (واردھا)	۶	۰
۱۸	مسٹر براؤن (مصنف تاریخ ادبیات ایران)	۶	۰
۱۹	سر رادھا کرشنن وائس چانسلر ہندو یونیورسٹی بنارس	۶	۰

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۶۸	مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی (سرپرست رسالہ البرہان لدھیانہ)	۱۲	۴
۶۹	نواب الحاج سید محمد عباس صاحب طالب صفوی اخباری (شمس آباد)	۱۲	۴
۷۰	سید کلب مصطفےٰ صاحب بی، اے، ایل، ایل، بی (لکھنؤ)	۱۴	۴
۷۱	مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری دکتور جامعہ ازہر مصر (ناظمیہ کالج لکھنؤ)	۰	۶
۷۲	مولانا محمد نعمت امام صاحب پھلواروی	۱۶	۶
۷۳	پنڈت چندر کا پرشاد جگیاسو (لکھنؤ)	۹	۷
۷۴	محمد صادق حسین صاحب بی، اے (علیگ) ہردوئی	۲	۸
۷۵	علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء (نجف اشرف)	۱۶	۸
۷۶	مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی (لکھنؤ)	۱۲	۱۱
۷۷	خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر	۸	۱۳
۷۸	سید اشفاق حسین صاحب ایم، اے بارایٹ لا (سیتاپور)	۲۲	۱۳
۷۹	ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی	۱۱	۱۷
۸۰	علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب (لکھنؤ)	۴	۱۹
۸۱	خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب (مصنف ناموس اسلام) پٹیالہ	۷	۱۹
۸۲	سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایم، اے ایڈوکیٹ (پٹنہ)	۱۸	۲۰
۸۳	مرتب و مولف کتاب ناظم ادارہ یادگار حسینی علی نقی النقوی (لکھنؤ)	۰	۴۷۸

سوائے ناظم ادارہ کے ہر ایک شخص کا مقولہ یا مضمون جہاں سے شروع ہوا ہے نشان ع بنا کر فٹ نوٹ میں یا عبارت کے قبل اصل کتاب ہی میں اُس شخص کا نام درج ہے اور جتنی عبارت دو طرفہ واوین (" ") کے درمیان ہے وہ اسی شخص کی ہے جو اجزا اس طرح کے نشان اور واوین کے باہر ہیں انھیں ناظم ادارہ کے قلم کا سمجھنا چاہیئے۔ والسلام

علی نقی النقوی

ناظم مرکزی و ناظم شعبہ تصنیف یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

کتاب تجویز شدہ متعلق یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ

تہذیبِ انسانیت

(مرتّبہ)

ادارۂ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ
یادگار حسینی لکھنؤ

مخصوص اڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور
منتخب اہل قلم کے لئے

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

بیان حال

یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ ہجری کے سلسلہ میں واقعہ کربلا کے اسباب، حالات، اور نتائج کے متعلق جس کتاب کا اعلان ہوا ہی اُس کی ترتیب و تدوین کیلئے ایک اڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی مگر عملی صورت سے یہ صورت غیر ممکن ثابت ہوئی کہ تمام ارکان مجتمع ہوکر اس کی ترتیب میں حصہ لیں اس لیے تمام مضامین اور عنادین کو پیش نظر رکھتے ہوے ادارہ کی جانب سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہی۔ اور اب اس کو طبع کراکر تمام اڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور منتخب اہل قلم کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ ان حضرات سے گزارش ہی کہ اس کتاب کے تمام اجزا، کا نظر غائر سے مطالعہ فرمائیں۔ اور جس مقام پر اضافہ کی ضرورت ہو یا کمی لازم ہو یا ترتیب کا بدلنا مناسب معلوم ہو۔ وہاں اپنا نوٹ تحریر فرمادیں اور اس کتاب کے اُن کے پاس پہونچنے کے بعد ایک ماہ کے اندر اپنی زریں رائے سے ادارہ کو مستفید فرمائیں تاکہ اُن کے آرا اور قیمتی مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کی آخری تدوین و ترتیب کا کام انجام پائے اور پھر اس کتاب کی وسیع اشاعت کی جائے۔ والسلام

ناظم شعبۂ تصنیف یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

۲ رجب سنہ ۱۳۶۱ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین

دیباچہ

دنیا میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے "عرب" کا نام نہ سنا ہو۔ "عرب" ایک بڑا صحرائی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر دریائے احمر لہریں مار رہا ہے۔

"عرب" میں قریش کا قبیلہ نسبی شرافت کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھا جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے بڑی عزت اور بلندی حاصل کی قصی کے فرزندوں میں عبد مناف کو کعبہ کی تولیت اور قریش کی ریاست حاصل ہوئی۔ وہی کعبہ جس کے پاس آج تمام دنیا کے مسلمان "حج" کے لیے جاتے ہیں۔ یہ اسلام سے مدتوں پہلے بھی عرب کا سب سے بڑا عبادت خانہ اور مذہبیت اور تقدس کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کی تولیت اور مجاوری ایک بہت بڑا منصب تھا جو اس خاندان سے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ سخاوت، کرم، خدمت خلق اور انسانیت کے تمام اچھے اخلاق و اوصاف میں یہ لوگ نمایاں درجہ رکھتے تھے۔

عبد مناف کے فرزندوں میں ہاشم بڑے صاحب صولت اور با اثر تھے اگرچہ اُن کے بھائیوں میں عبد الشمس کا بھی شمار تھا مگر اپنے باپ کے اوصاف و مراتب کی پوری شان ہاشم ہی میں نظر آتی تھی اس لیے وہ تمام امتیازات جو عبد مناف کو حاصل تھے وہ اُن کے بعد ہاشم کے لیے تسلیم کیے گئے۔

امیہ جو اپنے کو عبد الشمس کا بیٹا کہتا تھا اُس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا اور کوشش کی کہ عزت اور سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اتار لے مگر نتیجہ میں ناکامی اور رسوائی ہوئی

مخالفت کی آگ کے شعلے حسرت اور بے چارگی کے ساتھ وقتی طور پر بیٹھ گئے مگر دل میں حسد اور عداوت
کی چنگاریاں سُلگنے کے لیے رہ گئیں۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے اختلافات کی ابتدا یہیں سے ہے
ہاشم کے بعد اُن کے بیٹے عبدالمطلب خانۂ کعبہ کے مجاور ہوئے اور اس خدمت سے عظمت
حاصل کرنے کے علاوہ اپنے بلند انسانی اوصاف کی بدولت عام ہر دلعزیزی حاصل کی۔
عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے جن میں سے ایک عبداللہ اور ایک ابو طالب تھے۔
عبداللہ کے فرزند حضرت محمدؐ وہ عظیم المرتبت انسان ہوئے جس نے کلمۂ توحید اور دین اسلام
کا پیغام پہونچایا اور اپنی پیغمبری کا اعلان کر کے بُت پرستی کی مخالفت کی۔
ابو طالب کے فرزند علیؑ تھے جنھوں نے اس آواز پر لبیک کہی اور دست و بازو بن کر اسلام
کی اشاعت میں حضرت محمدؐ کا ساتھ دیا۔
اس موقع پر بنی امیہ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر کہیں لوگوں نے حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول
اور اُن کے دین کو مذہب حق تسلیم کر لیا تو بنی ہاشم کے مذہبی اقتدار کے سامنے ہمارا چراغ ہمیشہ
کے لیے گُل ہو جائے گا اگرچہ حضرت محمدؐ کی تعلیم براہ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی
پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار
کی خوبی اور فرائض انسانی کی بجا آوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے
تھے اور اس طرح اُن کے اقتدار کو سخت صدمہ پہونچتا تھا چنانچہ امیہ کے پوتے ابوسفیان نے محمدی
تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عرب کے راسخ العقیدہ بُت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت
محمدؐ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے۔ پہلے تو آپ مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے مگر جب
اُن لوگوں نے ایکا کر کے آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوراً آپ اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر
مدینہ میں چلے جہاں کے لوگوں نے آپ کی تعلیم کو قبول کیا تھا اور آپ کی امداد کا اقرار کیا تھا
اسی واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی ہجرت کے واقعہ سے مسلمانوں میں سنہ ہجری
کا حساب کیا جاتا ہے جس کو اب کی اپریل سنہ ۱۹۴۲ء میں تیرہ سو اکسٹھ (۱۳۶۱) برس ہوئے ہیں۔
دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کر کے
آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر و اُحد اور احزاب

بہت مشہور لڑائیاں ہیں ان میں مخالف جماعت کا سرگروہ وہی ابوسفیان تھا جو حرب بن امیہ کا بیٹا تھا مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمدؐ کے پیرووں کی تعداد اور اُن کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے بھی قبول اسلام کی نقاب ڈال لی اور وہ موقع کے منتظر رہنے لگے کہ کب اسلام کی طاقت ذرا کمزور ہو اور کب انھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمدؐ کی زندگی میں اُن کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرتؐ کی وفات ہوگئی۔ اس بڑے حادثہ نے مسلمانوں کے نظام میں بہت ابتری پیدا کی۔ بہت سے لوگ مختلف اطراف میں جو اس موقع کے منتظر تھے انھوں نے سر اونچا کیا اور اسلام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا کچھ آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینا بند کردی مسلمان ان شورشوں کے دبانے میں لگ گئے اور بہت مشکلوں سے اس میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں روم اور فارس کے بڑے ممالک سے مسلمانوں کو جنگ درپیش ہوگئی۔ یہی پُر آشوب اور انقلابی دور وہ تھا جس کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاکر بنی امیہ کو دمشق میں اپنی حکومت قائم کرا لینے کا موقع مل گیا۔ یہ حکومت شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں اُس نے خودمختار حکومت کی حیثیت حاصل کرلی

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمدؐ کے رائج کیے ہوئے طریقوں کو اور اسلام کی پھیلائی ہوئی مساوات کو مٹانا شروع کردیا اور آخر میں تو یہ حالت ہوئی کہ احکام اسلام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی اور تختِ حکومت کا وارث دار ابوسفیان کا پوتا یزید بن معاویہ قرار پایا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔

حضرت محمدؐ کے جانشین اور اُن کی اولاد اس کو برداشت نہیں کرسکتے تھے چنانچہ حضرت علیؑ کا آخری زمانہ اسی گروہ سے مقابلہ میں صرف ہوا تھا۔ حضرت علیؑ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسنؑ نے کچھ شرائط کے ساتھ ان لوگوں سے صلح کی تھی مگر اُن شرائط کی پابندی نہیں کی گئی اور خفیہ طور پر زہر دیکر اُن کی زندگی کا خاتمہ کردیا گیا۔ اب پیغمبرؐ کے خاندان میں پوری ذمہ داری حسینؑ

پر تھی جو حضرت محمدؐ کے دوسرے نواسے اور علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

٭"یزید نے حکومت کے نشہ میں اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے اسلام کے اصولوں کی مخالفت کھلے خزانوں شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کے "من بھائے اصول" اسلام کے اصول سمجھے جانے لگے اور لوگوں کے دلوں میں خدا کے خوف کے بدلے یزید کا ڈر سما گیا، دنیا یزید کی طرف جھک پڑی۔ اتنی بڑی حکومت کے بعد یزید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دنیا میں مجھے کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ پھر کیا تھا یزید کی نگاہ بغیر کسی خیال کے حسینؑ کی طرف اٹھ گئی اور یہ مشورے ہونے لگے کہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ یزید کی بیعت کریں۔ یزید جانتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اسلام کے وہ اصول جو رسول اسلام نے دین اور دنیا کی کامیابی کے لیے مقرر کئے تھے ان کا حقیقی محافظ رسول کے نواسے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ممکن ہے کہ سچائی کی آواز پر دنیا سمٹ آئے اور اپنا بنایا ہوا گھروندا زمین پر آ رہے۔ اس لیے یزید کو ضرورت ہوئی کہ حسینؑ کو اپنا فرماں بردار بنا لیا جائے تاکہ دنیا یہ سمجھ سکے کہ جب رسول کے نواسے نے یزید کو قابل بیعت سمجھ لیا ہے تو یزید سچائی پر ہے" اس طرح وہ فتح جو حضرت محمدؐ یا اُن کے دین (اسلام) کو بنی امیہ کے خلاف حاصل ہوئی تھی آئینی طور پر شکست میں تبدیل ہو جاتی اور یزید کے بزرگوں کی شکست کا بدلا ہو جاتا۔

حسینؑ ایسے بے نفس انسان تھے کہ اگر صرف شخصی اقتدار کا معاملہ ہوتا تو وہ اس پر تیار ہو جاتے کہ یزید کی سلطنت کو منظور کرلیں مگر وہ یزید کے افعال و اوصاف کو دیکھ رہے تھے جو صاف صاف آئین اسلام سے اعلان جنگ کے مرادف تھے حسینؑ نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یزید حسینؑ کے عزم و ارادہ کی پوری طاقت سے واقف نہ تھا اس لئے اس نے تشدد کے احکام جاری کئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح حسینؑ کا سر جھکوا لیا جائے گا مگر جتنا جتنا یزیدی حکومت کا تشدد بڑھتا گیا اُتنا اتنا حسینؑ کے صبر و استقلال میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ہر مصیبت کے برداشت

٭ حسین مہتی مرتبہ سیدعاشورہ حسینی یادگار کمیٹی بلگرام

کرنے پر تیار نظر آئے۔

پہلا ہی حکم جو یزید نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا لکھا یہ تھا کہ "حسینؑ سے بیعت لو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو" حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لئے اور وہ اسے پہلے سے سمجھے ہوئے تھے۔

"بیعت" .. اُن کے لیے غیر ممکن چیز تھی۔ سر کا قلم ہونا بے شک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

حسینؑ نے اس کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام گھر کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور اپنے خاص عزیزوں، بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو اپنے ہمراہ لیا اور مکہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ اپنی مخالف جماعت کو بتلانا چاہتے تھے کہ آپ کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کے خواہاں ہیں۔

مکہ عرب کے بین الاقوامی قانون کے مطابق اور پھر اسلام کے آئین کے موافق ایک امن کا مقام تھا جہاں کسی کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیئے مگر حسینؑ کو یہاں اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا مجبوراً ایسے وقت پر جب تمام عالم اسلامی مکہ کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا حسینؑ نے مکہ کو ترک کر دیا۔ یہاں سے نکل کر اب آپ کہاں جاتے؟ ناچار کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو بڑے اصرار کے ساتھ بلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے۔ آپ اپنے چچازاد بھائی مُسلم کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیج بھی چکے تھے۔ اب آپ خود اسی طرف روانہ ہوئے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی، وہاں سنگدل حاکم عبیداللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مُسلم بن عقیل قتل کر دئے گئے۔ اب آپ کو کوفہ میں کوئی امید باقی نہیں رہی تھی مگر مکہ اور مدینہ جانے کا بھی موقع نہ تھا اُدھر کوفہ سے آپ کے گرفتار کرنے کو فوج بھیجدی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی زمین پر اُتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا تمام راستے بند کر دیئے گئے اور امام حسینؑ کو ان فوجوں میں گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حسینؑ کے ساتھ صرف اُن کے سترہ اٹھارہ عزیز اور چند خاص دوست تھے جو کوفہ سے

یا بعض دوسرے مقامات سے آپکے پہونچنے کی خبر سُنکر کسی طرح آپ تک پہونچ گئے تھے اُن کی تعداد دو سو سے بھی کم تھی۔

آپ اپنے وظیفۂ منصبی اور فرض انسانی کی بنا پر امن و امان کے محافظ تھے اس لیے آپنے یزیدی فوج کے افسر اعلیٰ عمر بن سعد کے سامنے ایسی صورتیں پیش کیں کہ معاملات رو بہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپکا طریقۂ کار اتنا سُلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد اس بات کا قائل ہو گیا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں عمر سعد نے کوفہ کے حاکم ابن زیاد کو اس مضمون کا خط بھی بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اُس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری کا نتیجہ خیال کیا اس لیے اُس نے کہا کہ حسینؑ کو یزید کی بیعت کر لینا چاہیئے تب اُن کی جان بچ سکتی ہے یہ وہ بات تھی جسے پہلے ہی حسینؑ طے کر چکے تھے کہ ناممکن ہے۔ اُنھیں بیعت کرنا ہوتی تو پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے۔ اب خطرہ کو سامنے دیکھکر وہ اس بیعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسینؑ نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔

آپکے سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ آپکے گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ آپکے عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے آپکے سامنے تھے اور آپکے ساتھ پردہ دار عورتیں تھیں اور چھوٹے بچّے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بٹھا دیا گیا تھا اور ایک قطرہ پانی کا حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔ چھوٹے بچے پیاس کی شدت سے بیتاب اور مضطرب نظر آ رہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر بادشاہ کو اپنا دینی پیشوا تسلیم کر لیں۔

آپ کا ارادہ پہلے ہی سے مضبوط تھا مگر عملی طور پر جتنے مشکلات بڑھتے جاتے تھے آپ کی ہمت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آپ نے آخری بار پھر قطعی طور پر جواب دیدیا کہ میں بیعت نہیں کرونگا نویں محرم کی شام تھی جب اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ بھی کر دیا مگر آپنے ایک شب کی مہلت لے لی آپ چاہتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کو آخری بار سوچنے کا موقع دیدیں کہ وہ اگر آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ آپنے اُن ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتلا دیا کہ کل ہی

زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہا۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑینگے ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

ان میں چند ضعیف بڈھے۔ کچھ نو عمر لڑکے اور چند معصوم بچے بھی شامل تھے مگر اس منتخب جماعت میں ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنے کارناموں سے حسینی قربانی کی عظمت اور اثر میں اضافہ نہ کیا ہو۔ جب مہلت کی شب گزر گئی اور امام حسینؑ اپنے ارادہ پر قائم رہے تو یزیدی لشکر جس کی تعداد کم سے کم تیس ہزار بتائی جاتی ہے میدان کربلا میں صف آرا ہو گیا کہ ایک صبر و استقلال کے پہاڑ کو ظلم و جبر کی آندھیوں سے متزلزل کر دے۔ طبل جنگ بجنے لگے۔ امام حسینؑ کا سر لینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے لشکر کا سامنا ہے۔ بھوک پیاس کی شدت سے کسی کے دم میں دم نہیں اپنی اور عزیز ترین ہستیوں کی موت۔ گھر کی تباہی۔ ناموس کی اسیری کے منظر آنکھوں کے سامنے ہیں، مگر امام حسینؑ کی فرض شناسی، اصول پروری، ایثار اور جرأت کا کیا کہنا کہ آپ کی جبینِ استقلال پر اب بھی شکن نہیں آئی۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر تک حسینؑ کے جاں باز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور اُن کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے۔ جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو حسینؑ اور اُن کے عزیزوں کی نوبت آئی۔ اب بہت آسان تھا کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنا سر پیش کر دیں مگر آپ کو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا اب عزیز آپ کے آپ سے جدا ہونے لگے۔ ان میں سے کس کو آپ پہلے موت کے منہ میں جانے کی اجازت دیتے۔ ہاں سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھا مرنے کے لیے بھیجدیا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور اُن کا چاند فوج دشمن کی گھٹا میں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سُن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہیں آیا وہ اس قربانی کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ انکی اسکیم کا ایک بڑا جزو

ؐ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی

پائہ تکمیل کو پہونچ گیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوئے اور موت کی نیند سو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانباز بھائی عباس آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ فوج کے علمدار تھے۔ ان کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر آپ کی ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ آپ کے پاس اب کوئی سرمایہ سچائی کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک وہ معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا وہ شیرخوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور اپنے ہاتھوں پر بلند کیا۔ یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر حلیہ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا۔ حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا اب کیا تھا؟ حسینؑ کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ آپ نے اسی شکستگی اور بے کسی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنی کسی انسان میں طاقت ہو سکتی ہے اس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا وہ مقابلہ جو تاریخ عالم میں یادگار ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب۔ جسم زخموں سے چور ہو گیا، گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کیا گیا اور نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ پردہ نشین عورتوں کے سروں سے چادریں تک اتاری گئیں۔ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ مردوں میں ایک فرزند حسینؑ کے زین العابدین زندہ بچے تھے جو بیماری کے عالم میں تھے انھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مندبی بیاں رسیوں میں باندھ کر قیدی بنائی گئیں اور انھیں دربدر پھرایا گیا۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے مشہور ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم، کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہی اور اس لحاظ سے واقعہ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، بنی ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا ہی مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہی

اُن خصوصیات اور اُن نتائج کے لحاظ سے جو نوع انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو اور اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہی تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوع انسانی کے تعلق کا مرکز ہی۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرت بشری میں داخل ہے اگر کوئی قصہ آپ کے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اُس واقعہ سے متعلق اشخاص کے ناموں سے یا اُن کی شخصیتوں سے آپ واقف نہوں تب بھی اوّل الذکر سے آپ کو نفرت اور دوسرے کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اس میں کسی مذہب اور خیال کا امتیاز نہیں ہی۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے اُن کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاءؑ و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوے ہیں، بہت سے بیگناہ افراد مقتول ہوے ہیں، بہت سے لوگوں کا مال و اسباب تاراج ہوا ہی، بہت سے لوگ قید ہوئے ہیں مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جو فرداً فرداً بہت سے اشخاص پر تقسیم تھے وہ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور ان کے اجتماع سے آپ کی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال بن گئی۔

عہ "دنیا میں موجودہ جنگ سے زائد کوئی خونریز جنگ نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مظالم، بیرحمیاں اور نا انصافیاں جس حد تک واقعہ کربلا میں ہوئیں اُن کا عشر عشیر بھی کبھی کسی معرکہ میں نہیں ہوا یہ ہوتا رہا ہی کہ آدمی زائد مارے گئے ہیں۔ یہ دیکھا ہی کہ خون زائد بہا ہی۔ لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ دل و روح کے پاک و عزیز ترین جذبات کے ساتھ ایسی بیرحمی ہوئی جیسی کہ کربلا میں واقع ہوئی ہے۔ ہٹ دھرمی، بے انصافی، جور و ظلم اور ہر طرح کی سختی جو اس میدان میں مظلوموں کے ساتھ برتی گئی اس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملتی"۔ پھر جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند ہے۔ اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہی اُسی قدر وہ محبت جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہیے وہ بھی ہر دوسرے شخص سے زیادہ ہی اور جو نفرت ہر انسان کو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہے وہ بھی تمام دنیا کے ستمگاروں سے زیادہ ہے۔

عہ علامہ ہندی

دوسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مظلومیت صرف ایک بے بسی کی طرح کی مظلومیت نہ تھی جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کر دیں اور اُسکے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اُسے قتل کر ڈالیں۔ مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی۔ مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاق کے نقطۂ نظر سے قابل مدح ہو جضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصُول کی حفاظت کے لیے اُن تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہوسکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افراد انسانی کی عزت و احترام کا مرکز ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اُتنی ہی قربانی اہم اور قابل عزت ہوگی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک بیمثال کارنامہ ہے۔ مساوات، سادگی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور طاقت و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا اُس وقت حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو تلواروں سے ٹکڑے کرا کے جبر و استبداد کو کاری ضرب لگائی اور ثبات و استقلال، ضبط و صبر، ایثار و قربانی، حق پروری اور راست کرداری کا بلند نمونہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں ہیں حسینؑ تمام دنیائے انسانیت کے ہیں اُنھوں نے وہ کام کیا جس نے مٹتے ہوئے انسانیت کے نقوش کو اُبھار دیا جس نے دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا جس نے انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہونچا دیا۔ اُنھوں نے اپنی جان دے کر دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُنھوں نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں زندگی کی حقیقت مضمر ہے اس لیے تمام اقوام عالم جو قربانی کی عزت کرتے ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں

تیسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محل اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی منزل وہ ہے جہاں تمام

مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر اُن کی عمارت کا قیام ہوا ہے اخلاق انسانی کو نقطۂ ارتقار تک پہونچانا ہی ممکن ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں تبدیلی ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ بعض مذاہب کے اصُول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناسمجھی سے کچھ زیادتی یا کمی ہو گئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیب اخلاق اور تکمیل بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اسی نوع کا تھا۔ یقیناً حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور آپ کا اقدام عمل اگر کسی دوسرے مذہب کے افراد کے خلاف ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے کتنی ہی حقانیت آپ کے مشن کی ہوتی اور آپ کو کتنی ہی مظلومیت کے ساتھ قتل کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے خلاف آپ کا اقدام ہوا تھا اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑتے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اس لیے واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی مذہب کے لوگوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اور چونکہ بُرائی اور اچھائی حدود مذہب و ملت سے بالاتر ہے۔ ہر مذہب والوں کے نزدیک بُرائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو قدر و منزلت کا حامل سمجھیں گے۔"

عــ۵ "جہاں کہیں گروہ انسانی کے افعال کا محرک فیاضانہ خیال اور شریفانہ جوش ہوگا جہاں کہیں وہ عظیم المرتبت اور پسندیدہ افعال کی تحسین کرینگے جہاں کہیں وہ ایسی تحریکات کی معاونت کرینگے جن کا مقصود انسانوں کو ظلم و جبر، بے انصافی اور خود پرستی کی زنجیروں سے آزاد کرانا ہوگا وہاں حسینؑ کو لوگ قائد اعظم تسلیم کرینگے کیونکہ کسی دوسرے نے ایسی وضاحت کے ساتھ اور اتنے نتیجہ خیز طور پر اس امر کو عمل کر کے نہیں دکھایا کہ انسان حقیقی عظمت اور دائمی حیات اُس وقت حاصل کر لیتا ہی جبکہ وہ کسی اچھے اصُول سے اپنی زندگی کو متحد کر لیتا ہی اور انسانی خدمت میں

عــ۵ خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر

اپنی ذات کو محو کر دیتا ہے ۔۔۔۔ مسلمانوں کے لیے ناپسندیدہ تکبّر ہوگا اگر وہ حسینؑ کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیں کیونکہ وہ ان اخلاقی اور روحانی قوتوں کے مظہر ہیں جن کا تعلق اپنے اثر اور وسعت کے لحاظ سے تمام اقوام و مذاہب عالم سے ہے۔ دنیا کی مختلف اقوام میں مخالفت و مغائرت کے بہت کثیر اسباب موجود ہیں جن کا کم کرنا بلکہ دور کرنا صحیح سیاست کا اقتضا ہونا چاہیے۔ اس پسندیدہ کوشش میں ان تمام کامیابیوں کو جو انسانوں کو کسی بڑے معیار تک پہونچنے میں حاصل ہوں مستحق تبریک و تمجید سمجھنا چاہیے جس کے ذریعہ سے تمام گروہ انسان ایک خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک زبان ہو کر فطرت انسانی کے بلند جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور اس معراج کمال کی طرف صریح اشارہ کرتے ہیں جہاں تک انسان رسائی کی قدرت رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ سب مل کر بلا لحاظ اس امر کے کہ ہم کس قوم و قبیلہ و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، حسینؑ کی قدر و قیمت سمجھیں اور ان کی عزت کریں۔ کیونکہ انھوں نے انسان کو خدا کا مظہر اعلیٰ ثابت کرنے میں فاتحانہ کامیابی حاصل کی۔"

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے واقعہ کربلا کے اثنا میں مختلف اخلاق و اوصاف کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لیے ایک دائمی درس عمل رکھتی ہیں اس لیے تمام افراد بشر ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں ۔۔۔

کارلائل نے لکھا ہے: "وہ بہادرانہ کارنامے محض ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ تمام انسانی برادری کی میراث اور ملکیت ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں سلسلۂ شجاعت و استقامت باقی رہتا ہے۔"

ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگت کا برتاؤ کیا اور اقوام عالم نے یکساں طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ ان کی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرم کے زمانہ میں شرق اور غرب کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محرم کے پہلے دس دن الگ الگ زمین کے حصوں پر گزارے تو وہ دیکھے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے

معیار زندگی اور طرز معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

لـه "عراق عرب، ایران، مصر اور یمن میں عزائے امام کی جو اہمیت ہے اُس سے سب ہی واقف ہیں شام میں بھی عزائے حسینؑ جاری ہے۔ ٹرکی میں جس شان کے ساتھ مجالس کا انعقاد ہوتا رہا اور امام مظلوم کا ماتم جاری رہا اُس کی شہادت جناب شبلی نعمانی کے سفرنامہ بلاد اسلامیہ سے ملتی ہے۔ حجاز میں صحرا نشین عرب عشرۂ محرم کے زمانہ میں اپنے گریہ و ماتم سے ایک انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ افغانستان میں عزاداری کافی انہماک سے کی جاتی ہے خود کابل میں متعدد اماموں کے ہیں جن میں باقاعدہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ برما تبت اور بربر کے باشندے عزاداری و ماتم کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں چینی مسلمان بھی محرم میں عاشورا قائم کرتے ہیں اور اس دن عزائے حسینؑ کا ماتم برپا کرتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو قوم بھی امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ گوالیار اندور۔ بڑودہ۔ دھولپور۔ جے پور۔ جودھپور۔ الور۔ دتیا اور بنارس میں حکمرانوں کی طرف سے عزاداری بڑے تزک و احتشام سے کی جاتی ہے۔

یورپ میں خود لندن میں گزشتہ کئی برس سے برابر خبریں آتی ہیں کہ مجلس حسینؑ برپا ہوتی ہے۔ اور تمام سفرائے ممالک و امرائے دولت عزائے امام میں شرکت کرتے ہیں اور ایک سال تو سر عبد القادر نے اس مجلس میں امام حسینؑ کے تذکرہ سے سامعین کو اشکبار کیا۔"

ـلـه "پارسی بھی ایام عزا میں مجالس کرتے ہیں، نذریں مانتے ہیں۔ عزا خانوں میں شمعیں روشن کرتے ہیں اور خوشبو کے لیے بخور جلاتے ہیں (مجلہ العرب بمبئی یوم پنجشنبہ ۹ محرم ۱۳۴۶ھ عدد ۱۰) سکھوں کو عزاداری سے بہت خلوص ہے وہ "گرو حسین کا دیوان" کے نام سے مجالس عزا برپا کرتے ہیں، علاوہ اور تعزیوں کے مہاراجہ شیر سنگھ کا تاریخی بڑا تعزیہ آج تک لاہور میں رکھا جاتا ہے اور اس کا گشت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ لاہور مصنفہ خان بہادر محمد لطیف سی آئی ای)"

لـه سید عابد حسین کجھوی ایڈیٹر مسلم ریویو لکھنؤ

ـلـه ہندو قوم اور عزاداری۔ مولانا سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی

تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر خانہ بدوش صحرائی اور پہاڑ کی رہنے والی غیر متمدن قوموں تک وہ جو حضرت امام حسینؑ کے بزرگوں کا نام نہیں جانتے حسینؑ کے نام سے واقف ہیں اور اُن کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں ۔ ۵ اودھ میں دیہات کی عورتیں ہندو مسلمان جن کو نہ مذہب سے واقفیت ہے ، نہ واقعات عالم سے باخبر ہیں ۔ ان کی دنیا ان کے گاؤں ہیں ، کھیت ہیں اور ان کے جانور ہیں لیکن شب عاشور کو نہایت دردناک لہجہ میں ٹھیٹھ دیہاتی زبان میں وہ ایسے جملے ادا کرتی ہیں جن کو ” وہے “ کہتے ہیں جن کا مفہوم انتہائی دردناک ہوتا ہے مثلاً ” اے فاطمہ بی بی کے بیٹے تمہارے ساتھ کیسی دغا کی گئی “ تم کو مہمان بلایا اور پانی تک پینے کو نہ دیا ۔ ظالموں نے بہن کے سامنے بھائی کو حلال کر دیا اور سر کاٹ لیا ۔ اے فاطمہ بی بی کے بیٹے ۔ آپ تو اپنے بچے کو پانی پلانے لے گئے تھے ، دشمنوں نے اُسے تیر مار دیا ۔ کیا جس بچہ کی ماں کا دودھ خشک ہو جائے اُس کی پیاس تیر سے بجھتی ہے “ اس قسم کے بکثرت دردناک بیانات ہیں جن کے متعلق یہ پتہ لگانا انتہائی دشوار ہے کہ اُن کا رواج کب اور کیونکر ہوا ۔ اسی طرح پنجابی اور ملتانی زبان میں بھی واقعات کربلا نہایت مؤثر اور دردناک الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں “ یوں ہی پشتو ۔ تلگو ۔ کشمیری اور دوسری زبانوں میں ۔

یورپ کی متمدن دنیا کے مصنفین اور ایشیا کے اہل قلم اور بڑے آدمیوں نے متفقہ طور پر اپنی عقیدت کا خراج حسینؑ کی بارگاہ میں پیش کیا ہے ان تصانیف میں جو تاریخ اسلام یا تاریخ عالم یا کسی ایسے موضوع پر لکھی ہیں جس کا کسی حیثیت سے واقعہ کربلا کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوتا ہے ! یا اُن تقریروں میں جہاں حسینی کارنامہ کا تذکرہ آیا ہے یا اُن پیغاموں میں جو محرم کے موقع پر نشر کئے گئے ہیں بلکہ ڈاکٹر سر سید سلطان احمد کی لفظوں میں وہ اس حادثہ پر مؤرخین کا قلم خون کے آنسو رُلاتا ہے “

مشہور مؤرخ گبن اپنی تاریخ ” زوال سلطنت روم “ میں لکھتا ہے :-

” بعید ترین زمانوں اور بعید ترین اقلیموں میں بھی حسینؑ کی موت کے اندوہناک مناظر ٹھنڈی سے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی میں بھی ہمدردی کے شعلے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے “

---

۵ سفیر صاحب سندیلوی

مسٹر براؤن اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" میں لکھتے ہیں کہ:-
حسینؑ کا قتل، مدینہ کی تاراجی اور مکہ کا محاصرہ ان تین تاریخی چیرہ دستیوں میں پہلی چیرہ دستی ایسی تھی جس نے تمام اسلامی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا اور ایک شخص بھی جس کے سینے میں جذبات تھے، اس دردناک کہانی کو سن کر بے چین ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔"

مسٹر جان یونگ چار سو شعر میں حسینؑ مظلوم کا دردناک مرثیہ لکھتے ہیں اور کربلا کا خونین منظر دکھلا کر آخر میں حسینؑ کی تعریف کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ حسینؑ دیندار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھے۔ حسینؑ سلطنت و حکومت کے لیے نہیں لڑے بلکہ خدا پرستی کے جوش میں۔" (رسالہ نظام المشائخ دہلی محرم ۱۳۳۵ھ)

مہاتما گاندھی شہادت حسینؑ کی عظیم الشان نوعیت کا اعتراف ۸ اپریل ۱۹۲۴ء میں یوں کرتے ہیں کہ "میں نے کربلا کی المناک داستان اس وقت پڑھی جبکہ میں نوجوان ہی تھا۔ اس نے مجھکو دم بخود اور مسحور کر دیا۔"

ہز اکسیلنسی سر کشن پرشاد فرماتے ہیں۔ "نہ فقط دنیائے اسلام بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعہ روح فرسائے ارض نینوا کے مثل ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہو سکتا ہے۔ واقعہ کربلا ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے انسان کو تہذیب اخلاق کا پورا پورا میدان ہاتھ آتا ہے۔ مظلوم حسینؑ نے جس استقلال اور مضبوط ارادہ کے ساتھ دنیا میں صداقت اور حق کا علم گاڑا وہ صرف اسی کی ذات سے ہو سکتا تھا جس کو خدا نے ایسا بہادر دل دیا تھا۔"

سوامی شنکر اچاریہ فرماتے ہیں "میں نے حسینؑ سے بڑھ کر کوئی شہید نہ دیکھا اور حسینؑ کی شہادت کے اثر سے زیادہ کسی شہید کی قربانی کا اثر نہ ہوا۔"

پریم چند کی رائے ہے "معرکہ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں "کسی کارنمایاں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ اس کا دوسروں پر کتنا اثر مترتب ہوتا ہے، کس قدر وہ انھیں ابھار رہا ہے۔

کس قدر ان کو طاقتور بنا رہا ہے اور کتنی شرافت و تہذیب ان میں پیدا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ لاتعداد نسلیں کربلا کی اس قربانی اور عظیم سانحے سے زبردست طریقہ پر اثر پذیر ہوتی آئی ہیں۔ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قربانی کس قدر لازوال قیمت رکھتی ہے۔"

دوسرے پیغام میں جو آپ نے اسی ۱۳۶۱ھ میں حسین ڈے کمیٹی بمبئی کو بھیجا ہے لکھا ہے "اس شہادت میں ایک عالمگیر پیغام ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ایک ظالم حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہماری مادی قوت دشمنوں کی قوت کے مقابلہ میں کم ہے۔ ایمان کی قوت ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت تھی جو ہر مادی قوت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ ہر فرقہ اور قوم کے لیے یہ قربانی شمع راہِ ہدایت ہے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ جیواجی راؤ سندھیا آف گوالیار محرم ۱۳۶۱ھ کے پیغام میں فرماتے ہیں "رسول اسلام کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؑ نے ظالم کے مقابلہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، وہ جور و تعدی کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہیں تھے۔ ان میں عقیدہ اور ضمیر کی پختگی تھی۔ اعلیٰ ترین مقاصد اور بلند ترین نصب العین ان کے سامنے تھے اس لیے انھوں نے ایک بڑی اور طاقتور فوج کا دنداں شکن مقابلہ کیا۔ وہ اور ان کے ساتھی اس جنگ میں مارے گئے۔ دشمن کے ظلم و تعدی کا مقابلہ آپ نے خدا کے انصاف پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے اٹل ارادہ، اپنی بلند ہمت اور اس مستحکم عقیدہ سے کیا کہ چاہے اس وقت جو کچھ بھی ہو مگر آخر میں حق اور صداقت ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ تاریخ اسلام کا یہ یادگار واقعہ عقائد کے اختلاف اور نسل، رنگ اور مذہب کے تنگ نظریات سے بالاتر ہے اور اس قابل ہے کہ نسلِ انسانی اس کو اپنے دلوں میں جاگزیں کرلے اور قربانیوں کی پرواہ کیے بغیر ادائے فرض کی اہمیت کو سمجھے۔"

ہز ہائی نس نواب صاحب جنجیرہ اس موقع پر اپنے پیغام میں لکھتے ہیں "انسانی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جبکہ اتنے مصائب کے مقابلہ میں حقانیت اور مذہب کی خاطر ایسی پُر خلوص قربانی پیش کی گئی ہو۔ بہت سے بلند پایہ مصنفین نے اس بے مثال قربانی کی عظمت اور اس کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے مگر پھر بھی ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

۱۳۶۱ھ کے موقع پر بمبئی کے عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ میں سر بہرام جی جیجی بھائی نے

بحیثیت صدر یوم الحسین کمیٹی تقریر فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ "یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ ایک خالص اسلامی جلسہ کی صدارت ایک ہندو کرے اور اس کا استقبال ایک پارسی کے سپرد کیا جائے مگر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ جلسہ اُس مجسمۂ ایثار و قربانی کی یادگار منانے کے لیے منعقد کیا گیا ہے جس نے اپنی بے نظیر قربانی اور ایثار سے دنیائے انسانیت پر زبردست احسان کیا ہے۔"

بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر رادھا کرشنن نے اس جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "امام حسین نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں حق و صداقت کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے ہتھیاروں اور فوجوں کے بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ انھوں نے دنیا کے سامنے ایک بے مثال نظیر پیش کی ہے آج ہم اس بہادر جان فدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے والے عظیم الشان انسان کی یادگار مناتے ہوئے اپنے دلوں میں فخر و مباہات کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسین نے ہمیں بتا دیا ہے کہ حق و صداقت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔"

بمبئی کے سابق وزیر اعظم مسٹر بی جی کھیر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ امام حسین نے ہمیں جو سبق سکھایا ہے وہ ہماری زندگی کے لیے چراغ کا کام دیتا ہے۔ یہ آسان بات ہے کہ حق اور سچائی کے لیے اپنی جان دے دی جائے مگر یہ کام مشکل ہے کہ ہزاروں دشمنوں کے مقابلے میں چند گنے چنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو لے کر اُن کا مقابلہ کیا جائے اور یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل ہوتا ہوا اور گھروں کو لٹتا اور برباد ہوتا ہوا دیکھیں انھوں نے تیرہ سو سال قبل جو سکھایا تھا وہ سبق آج تک ہم سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امام حسین صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی ہیں اور ہندو مسلمان ان کے نقش قدم پر چل کر ظلم و ستم کے خلاف سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔"

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حضرت امام حسین نے آج سے تیرہ سو سال قبل دنیا کے سامنے جو پیغام اور اصول پیش کیا تھا وہ اتنا بے نظیر اور مکمل تھا کہ آج ہم اسکی یادگار منا رہے ہیں۔ میرے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں اور نہ دنیا کی کوئی ایسی فصیح و بلیغ زبان ہے کہ جس کے ذریعہ میں ان جذبات عقیدت کو بیان کر سکوں جو اس شہید اعظم

کے لیے میرے دل میں ہے۔ حضرت امام حسینؑ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ رب العالمین کے سارے بندوں کے لیے ہیں۔ میں مسلمانوں کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ان میں ایک ایسا بلند انسان گزرا ہے جسے دنیا کی ہر قوم یکساں طریقہ سے مانتی ہے اور اُن کی عزت کرتی ہے۔"

آپ نے حسین ڈے کمیٹی بمبئی کے نام اپنے پیغام میں بھی کہا ہے "کربلا کا دردناک سانحہ آج بھی ویسا ہی تازہ، ویسا ہی درد انگیز اور ویسا ہی اثر خیز ہے جیسا کہ اس روز تھا جب اسلام کا یہ بہترین رہبر شہید کیا گیا تھا۔ تیرہ سو سال کے بعد بھی امام حسین کی مثال حق و حریت کی تلاش رکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے روشنی کا منارہ بنی ہوئی ہے۔ ان کی ذات تمام اختلافات سے بالاتر ہے۔ وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد ہے اور برائیوں کے مقابلہ میں صداقت کی فتح کا لافانی نشان ہے۔"

حیدر آباد دکن کے اجلاس یادگار حسینی کے موقع پر جو پیغام بھیجا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"اکثر جب لوگ مرتے ہیں تو ان کی یاد بھی موسم خزاں میں پتوں کی طرح غائب ہو جاتی اور ختم ہو جاتی ہے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام قسمت انسانی کی ان نادر اور منتخبہ ہستیوں میں سے ہیں جن کے نام افق تاریخ پر ایک روشن ستارہ کی طرح جگمگا رہے ہیں شاید ہی کسی ہستی کو اسلام کے اس ہر دلعزیز رہنما کی طرح ایسی غیر فانی شوکت اور حسن نصیب ہوا ہو، شاید ہی کوئی قصہ اتنا المناک اور دلدوز ہو جتنا کہ قصہ کربلا ہے۔ جو آج تیرہ صدیوں کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو خون کے آنسو رُلانے کی قابلیت رکھتا ہے۔ تیرہ صدیوں کے بعد بھی اس مقدس شہادت کی عظمت و شوکت ظلم اور باطل کے خلاف کشمکش کی اعلیٰ ترین نشانی ہے اور انسانی آزادی اور حق پرستی کی راہ میں سب سے بڑھی ہوئی انسانی قربانی ہے۔"

ریورینڈ فادر ہیکلاسس ایس۔ جے پی۔ ایچ ڈی، ڈی عالم متبحر و سابق پرنسپل سینٹ اکسویریس کالج بمبئی نے لکھا ہے "امام حسین کی قربانی یقیناً تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے جس نے صداقت کو کذب پر فتح حاصل کرنے میں مدد پہونچائی ہے۔"

بابو راجندر پرشاد ایم اے ایم ایل۔ ایل ڈی سابق صدر نیشنل کانگریس لکھتے ہیں "کربلا کا واقعۂ شہادت انسانی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور جو دنیا کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگی پر اثر ڈالتا رہے گا۔ ہندوستان میں اس واقعہ کی یادگار

بڑی سنجیدگی سے منائی جاتی ہے جس میں نہ صرف مسلمان حصّہ لیتے ہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی مساویانہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔"

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (الٰہ آباد یونیورسٹی) لکھتے ہیں :-

"حسین کا نام اس وسیع دنیا کے کروڑوں انسانوں کے لیے آبِ حیات ہے۔ اس نام نے میری آنکھیں ہمیشہ اشک آلود کر دی ہیں۔ حسین کی بلند اور پاکیزہ سیرت محسوس کیے جانے کی چیز ہے۔ ایسے الفاظ کا پانا آسان نہیں جو اُن کے کردار کی عظمت کے مکمل مظہر ہوں یوں تو ان کی شیر روحانیت اور آنسوؤں کی سب سے زیادہ تابناک روشنی میں کربلا (کرب و بلا) کے اندر چمک دکھاتی ہے۔ لیکن جو لوگ حسین کی زندگی سے کربلا میں شہادت واقع ہونے سے پہلے سے واقف ہیں اُن کے لیے اس زندگی کی بے داغ اور استوار پاکیزگی، اس کی بشریت، اس کا خلوص اور وقار، سچ کی عجیب اور سخت امتحان کے مقابلہ کی طاقت۔ یہ باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر فرد سے بخوشی خراجِ عقیدت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایسے ہیرو روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین | چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو | ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

جوش

وہ دنیا کے بڑے سے بڑے غدار سیدہ رسُولوں اور شہیدوں کے ہم پلّہ ہیں، اُن کا نام اور اُن کا کام اُن کی زندگی اور موت کے واقعات اُن نسلوں کی روحیں بیدار کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں

دستور کیخسرو مہیار کتور پیشوائے اعظم فرقۂ پارسی بمبئی فرماتے ہیں :-

"اگر شہدائے اعظم کی قربانیاں نہ ہوتیں تو دنیا اخلاق و مذہب اور صداقت سے نا آشنا رہتی دنیا ان شہداء کی ممنون ہے جنھوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی۔ امام حسین ان شہداء میں ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے جان دی۔ ہم کو ان کی یاد اپنے عمل سے منانا چاہئے اور ان کی قربانیوں سے سبق لینا چاہیئے"

کیپٹن ایل ایچ بنٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ایک کتاب سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھی تھی اس میں شاہانِ اودھ کے حالات، ہندوستان کے خاص خاص مذہبی تہواروں کا ذکر اور بعض دوسری حکایتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مضمون "محرم اور تعزیہ داری" پر ہے۔ اس میں تعزیہ داری کی

کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اسی طرح دنیائے اسلام اُس واقعہ کی یاد مناتی ہے جو نہایت ہی دردناک تھا اور تاریخ میں بے نظیر۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جامِ شہادت پی کر آپ نے اسلام کو صفحہ ہستی سے محو ہونے سے بچا لیا۔ (اس کے بعد آپ نے مؤثر طور پر واقعۂ کربلا کا مختصر حال تحریر کیا ہے)

مسٹر کے ایل رلیا رام ہندوستانی عیسائیوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ آپ نے ملتان میں حسینی جلسہ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔ "اس شخص کی زندگی پر میں کیا کہوں جو روئے زمین پر حق و صداقت کا علم بلند کرنے والا پہلا فرد ہے امام حسین کی شہادت کا واقعہ کسی ایک قوم سے متعلق نہیں ہے — امام اس وقت اپنی بلند سیرت کا اظہار فرما کر آنے والی قوموں کے سامنے ثبات و استقلال، صبر و سکون، اور حق پسندی کا ایک کامل نمونہ رکھ گئے ہیں تاکہ اُن کی قربانی کو سامنے رکھ کر ظالموں اور جفاکاروں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں — کربلا کے میدان میں امام حسین کی سیرت کے وہ وہ جوہر کھلے ہیں جن پر غور کر کے انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے — اس چودھویں صدی میں جبکہ دنیا انسانیت اور صداقت سے سیکڑوں کوس دور ہٹ گئی ہے آپ کی بلند سیرت قوموں کیلئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے — امام نے چونکہ حق و صداقت کے ایک عام اصول کے لیے جان دی اس لیے ہر قوم و مذہب کے لوگ آپ کی مظلومیت اور فداکاری پر آنسو بہاتے ہیں — دنیا سے سیکڑوں سلطنتیں مٹ گئیں۔ ہزاروں بڑے بڑے انسان پیوند زمین ہو گئے کہ آج کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا لیکن امام نے اپنی قربانی سے تاریخ پر ایسا نقش چھوڑا ہے جو اپنی پائداری سے جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا ہے دنیا بدل جائے گی، عالم ظاہر کے آب و رنگ میں تغیر آ جائے گا لیکن ظالم اور مظلوم باقی رہیں گے اور جہاں بھی حق و صداقت جبر اور ظلم سے برسرِ پیکار ہو گی وہاں حسینؑ اور یزید کو یاد کیا جائے گا ہر دور میں یزید پیدا ہوتے رہیں گے لیکن حسین جیسا صداقت پسند بلند سیرت کا انسان اب پیدا نہ ہو گا۔ امام حسین کے اصول کی ہمہ گیری ایک ایسا واقعہ ہے جس پر تمام قوموں کے اتحاد کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔"

اندور میں حسین ڈے کانفرنس ہوئی۔ ہز ہائی نس مہاراجہ ہلکر آف اندور نے پیغام بھیجا جس میں فرماتے ہیں:۔ "آج اس جلسہ کو تمام اقوام و مذاہب کے لوگ مشترکہ طریقہ سے کر رہے ہیں جس میں امام حسین کے اس کارنامہ سے سبق حاصل کریں گے جو آپ نے آزادی کے لیے وحشیانہ طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا کر دہ عظیم الشان قربانی دکھائی جس سے حق اور انصاف کو

دنیا میں قائم کر دیا۔ اگر تمام ملک میں اس قسم کے جلسے ہونے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ تمام قوموں اور مذہبوں میں اتحاد و اتفاق ہو جائے"

فریڈریک جے گولڈ نے لکھا ہے کہ "اگر میں نوجوانانِ ایشیا۔ افریقہ۔ اسٹریلیا۔ امریکہ اور یورپ کو عراق کے میدان میں جمع کر سکوں اور اگر میں حسین اور عباس کے روضوں کے روبرو کربلا میں کھڑا ہو سکوں اور اگر میری زبان اور لب و لہجہ سب لوگ سمجھ سکیں تو میں حسین کی زندگی اور موت کے اندرونی اور روحانی پیغام کے متعلق گفتگو کروں گا حسین انسانیت کا ایک بہترین نمونہ تھے جبکہ وہ ریگستانوں میں، دریاؤں میں، نفرت اور بیرحمی کی تاریک گھاٹیوں میں امن اور ہمدردی کی دعوت دے رہے تھے۔ اُن کی عملی زندگی میرے نزدیک ایسی ضرب المثل ہے جو عالمگیر معنی رکھتی ہے"

پھر جب تمام اقوام عالم اس حادثہ کی عظمت سے اس درجہ متاثر ہوئے۔ تو مسلمان جو قریب سے اس واقعہ کے دیکھنے والے تھے اور جن کے ساتھ براہ راست اُس کا تعلق تھا وہ کیسے متاثر نہ ہوتے چنانچہ ہوئے اور اتنا کہ جتنا کسی چیز سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس کا اظہار جسٹس سر محمد سلیمان "گولڈن ڈیڈس آف حسین"، میں ان الفاظ میں فرماتے ہیں "آج دنیا میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جو امام مظلوم کی شہادت کے اندوہناک واقعات کو سُنکر یا پڑھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکے حضرت امام کی شخصیت کو ہر عہد کے مسلمانوں سے محبت اور عقیدت کا خراج ملتا رہا اور اُن کا نام اسلامی تاریخ کے شہداء کی فہرست میں سب سے اونچا رہا اور رہے گا"

ہز اگزالٹڈ ہائی نس محمد عثمان علیخاں نظام حیدر آباد دکن ۱۳۶۰ھ ہجری کے پیغام میں ارشاد فرماتے ہیں "تیرہ سو برس ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے وفاداروں اور جاں نثاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ رضائے الٰہی پر راہ حق میں قربان ہو گئے۔ اگر وہ ظلم و جور کا اس طرح مقابلہ نہ کرتے تو دین محمدی کو اس سے بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ملت اسلامی کو ایک گمراہ رہنما کی تقلید پر مجبور رہنا پڑتا۔ امام مظلوم نے ہمارے سامنے فرض شناسی اور راہ حق میں ایثار و قربانی کی ایک عظیم الشان مثال قائم کر دی ہے"

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کہتے ہیں "امام حسین علیہ السلام سے

بہتر اور روشن تر مثال دنیا میں نہیں پیش کی جا سکتی اس لیے کہ وہ مجسمہ تھے محبت اور بہادری کا اور پیکر تھے قربانی اور ایثار کا۔ ہر مسلمان کو بالخصوص ان کی زندگی سے سبق لینا چاہیے اور اُن کی پیروی کرنا چاہیے۔"

مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ جماعت نے واقعۂ کربلا کی یاد قائم رکھنے میں نمایاں حصہ لیا اور اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات کا ایک اہم عنصر قرار دے لیا۔ اس کا اندازہ آپ کو آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد ایسے روشن دماغ شیعہ کے ان الفاظ سے ہو جائے گا جو اُنھوں نے شیعہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۴-۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمائے تھے:- "در اصل واقعۂ شہادت کی وہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے شیعوں کی حیاتِ اجتماعی کی ایک ایسی کارفرما روح ہے جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر حکمران ہے۔ اگر آپ اس میں مداخلت کریں گے تو گویا ان کے اُس خزینۂ حیات پر ڈاکہ ڈالیں گے جس کو وہ اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جو اُن کے لیے موت اور زندگی کا سوال ہے۔"

یہ اہم یادگار کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ [1] "یہ وہ عزاداری ہے جو چودہ صدیوں سے برابر جاری ہے۔ یہ وہ ماتم ہے جو آج ۱۳۹۱ھ تک چلے کا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہ عزاداری ہے جو دبائے دب نہ سکی۔ جو مٹائے مٹ نہ سکی۔ بادشاہتیں اُس کے مٹانے کی درپے ہوئیں مگر خود مٹ گئیں۔ سلطنتیں اُس کی بیخ کنی میں اپنی طاقتیں صرف کرتی رہیں مگر ساری طاقتیں سلب ہو رہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اُس کو پامال کرنے اُٹھے مگر خود پامال ہو رہے۔ ہزاروں عزاداروں کو سولیاں دی گئیں۔ ہزاروں ماتمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا مگر یہ ماتم بند نہ ہوا اور یہ عزاداری بند نہ ہوئی۔"

یہ موقع نہیں ہے کہ عزاداری کے ہر دور کی صورت اور اس کی رفتار پر تاریخی حیثیت سے کوئی بسیط تبصرہ کیا جائے اس کے لیے کتاب کے آخر میں ایک مستقل ضمیمہ درج کیا جائے گا مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ حسینی شہادت کی یہ طولانی عمر رکھنے والی یاد ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں ناپید ہے۔

---

[1] مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن)

ــــه انسان فطرتاً راحت پسند ہے اور غم کو پسند نہیں کرتا اور حوادث زمانہ سے جو غم پیش آتے ہیں اُن کو جلد سے جلد بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں غم کی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ جملہ اقوام عالم کی یادگاریں سب خوشی کی یادگاریں ہیں پھر کیا یہ اپنی نوعیت میں عجیب بات نہیں ہے کہ دشت کربلا میں فرزند رسول کی مظلومانہ شہادت کی یادگار صدہا سال سے مستقل طور پر قائم ہے۔

یہ بھی دیکھیے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش بنا دیتا ہے اور اثر کو ختم کر دیتا ہے۔ ماضی کی یاد کا اس شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی نقشہ اس نقش کو مٹا نہ سکے یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم میں کوئی مثال اُس کے بعد اس سے بڑھ کر تو کیا اسکے قریب بھی نظر نہیں آئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد کتنے انقلابات ہوئے۔ تمدن نے کتنی کروٹیں لیں۔ دنیا میں اخلاق کے معیار میں کس درجہ تغیرات ہوئے۔ بہت سی چیزیں جو کسی وقت میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں بعد کو انسانوں کی نظروں سے گر گئیں۔ بہت سی وہ باتیں جو نہایت شرمناک اور ذلت آمیز سمجھی جاتی تھیں دوسرے وقت میں وہ باعث عزت عظمت بن گئیں ــــ ہر دسویں برس، پانچویں برس بلکہ ہر سال انسان کے مزاج میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، انسان کا اخلاقی معیار بدلتا رہتا ہے جبکہ ہماری آنکھوں کے سامنے انسانی تمدن میں یہ انقلابات ہوتے رہتے ہیں تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے اتنی طولانی مدت کے متعلق جس میں بہت سی صدیاں آئیں اور چلی گئیں۔ بادشاہتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں اور انسانوں میں ہزاروں قسم کے حالات میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن وہ کون سی چیز تھی کہ جس طرح وہ اپنے وقت میں عزت کی نگاہ سے دیکھی گئی اُسی طرح عزت کی نگاہ سے آج تیرہ سو برس بعد بھی دیکھی جاتی ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لیے قربانی کی گئی تھی کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اُس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے۔ اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی قائم ہے۔

ــــه سفیر صاحب سندیلوی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حوادث میں جتنی کسی واقعہ کو ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اسی قدر اس پر اہل فکر و قلم طبیعت آزمائی زیادہ کرینگے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ پر نظم و نثر لٹریچر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا اسلامی تاریخ کی تدوین سے پہلے خصوصیت سے اس واقعہ پر تصانیف شروع ہو گئے اور ابھی کربلا کی زمین پر خون شہیداں کی تری خشک نہ ہوی ہوگی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کی نظم کے اشعار تراوش کرنے لگے۔

سب سے پہلے [۱] واقعات کربلا کے تاریخی عناصر کا تحفظ بہت کچھ اسیران کربلا نے کیا۔ جو کچھ مواد ان سے ملتا ہے وہ اگرچہ مقدار میں کم ہے لیکن اس سے حسینؑ کے فلسفۂ شہادت اور بنی امیہ کے مقصد زندگی کے سمجھنے میں حوصلے کے مطابق مدد ملتی ہے۔ اسیران کربلا کی وہ تقریریں جو کوفہ اور شام کے بازاروں اور درباروں میں ہزاروں کے مجمع عام میں ہوی ہیں اور مدینہ واپس آکر مخدرات عصمت اور امام زین العابدین نے جس طرح ان واقعات کی اشاعت کی ہے اس کے نتیجہ میں اس واقعہ نے سارے عرب سے شناسائی حاصل کرلی۔ خود اموی نامہ نگاروں اور فوجیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں واقعات کو (مسخ کرکے سہی) بیان کیا۔ وہ بغیر شعور کے اکثر اس کے ایسے جزئیات بیان کردیتے تھے جن کی مورخ کی نگاہ میں بڑی قیمت ہے۔ شعراء کے لیے اس واقعہ نے دردانگیز مواد مہیا کیا اور خطیب اس سے اپنے کلام میں زور پیدا کرنے لگے، علاوہ ان اشعار کے جو اہلبیت حسینؑ کی طرف منسوب ہیں عام شعراء میں چند شعر مرثیہ کے جو پہلے پہل کہے گئے وہ دیوان حماسہ کے صفحات پر اب تک موجود ہیں مگر مستقل طور سے اس سلسلہ کی ابتدا کمیت اسدی شاعر نے کی ہے۔ پھر سید اسمٰعیل حمیری نے اس میں ترقی کی اور دعبل خزاعی نے اس پر جلا کی اور یہ سلسلہ اس کے بعد جاری ہوگیا۔

نثر میں ان مختلف خطبوں کو چھوڑتے ہوئے جو اہلبیت کی زبان سے یا مختلف مقررین کے دہن سے ہنگامی طور پر نکلے ہیں خصوصاً ان اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلا لینے کے لیے سلیمان بن صرد خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوے ہیں جن کا مقصد

---

[۱] مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری

ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعۂ کربلا کی اہمیت سے متاثر بنایا جائے۔ ان میں سے بہت کم خطبے موجود ہیں اور میرے خیال میں اگر وہ سب جمع ہوتے تو ایک بہت بڑا ذخیرہ واقعۂ کربلا کے متعلق ہمارے ہاتھ میں ہوتا مستقل طور سے اس سلسلہ میں تصنیف کی ابتدا پہلی صدی کا اختتام سے ہوگئی اور ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کے مقتل کا نام اس عہد کی یادگار ہے جس سے اس کے بعد کی تمام کتابوں میں واقعات لیے گئے ہیں — اس کے بعد برابر مستند مورخین واقعہ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

آخر کتاب میں دوسرا ضمیمہ مختلف زبانوں میں واقعۂ کربلا کے بارے میں کتابوں کی فہرست کے متعلق آئے گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے کسی موضوع پر اتنا نہیں لکھا گیا اور نہیں کہا گیا ہے جتنا کہ واقعۂ کربلا کے بارے میں لکھا اور کہا گیا ہے۔ مگر جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں سب مذہبی نقطۂ نظر کے ماتحت اُن ہی لوگوں کے لیے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے معتقد ہیں۔ اُن میں قرآن کی آیتیں ہیں، پیغمبر کی حدیثیں ہیں اور اس طرح کی روایتیں ہیں جو مسلمانوں کے طبقہ میں مقبول ہو سکتی ہیں۔ کوئی غیر مسلم ہندو، عیسائی یا کسی دوسرے مذہب کا انسان اگر واقعۂ کربلا کو اُس کے اسباب، نتائج اور ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کا پتہ دیا جا سکے۔ پھر ° جن لوگوں نے تاریخ نویسی کے فریضہ کو اپنے ہاتھ میں لیا وہ مورخ نہیں تھے اور نہ تاریخ نویسی کے قوانین سے واقف تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعۂ کربلا کبھی فلسفۂ تاریخ کے ماتحت صحیح استنتاج سے آشنا نہیں ہوا۔

زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جبکہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب و ملت کے افراد متفق ہو کر حسین بن علی کی سیزدہ صد سالہ یادگار کی جانب پورے طور پر متوجہ ہیں تو یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ میں۔ انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں۔ انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی بارگاہ میں۔ انسانی وقار، عزت

° مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب۔

اور افتخار کی بارگاہ میں۔ انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے
حسین بن علی کے کارنامۂ جاوید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود
دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اُس ایثار و قربانی کی
تصویر کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لا سکے تو یہی اس خدمت کا پورا حصل ہوگا۔

آغاز کتاب

(حصۂ اوّل)

شہید کربلا کا تعارف اور سیرت زندگی

(پہلا باب)

نسبی خصوصیات، خاندان اور اُس کے شاندار روایات

"اصلی مکوّن نظام اخلاق کے آباؤ اجداد ہیں" (مسیو لیبان)

بے شک ایسا ہی ہے "توارث صفات" کے لحاظ سے بھی اور خاندانی جذبات اور احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپنے سے کان میں پڑے ہوئے تذکروں اور ماضی کے افسانوں سے قوائے ادراک و شعور کی اُسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یونہی بچپنے کے سُنے ہوئے تذکرے بجلی کی ایسی رو کے ساتھ انسان کے دماغ کی گہرائیوں میں اُترتے اور نفس کے نیم شعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

ع ۵ "توارث" کا عام اصول تو یہ ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد اُس کی منقولہ اور غیر منقولہ تمام چیزیں اُس کی اولاد یا دوسرے قرابتداروں کی طرف جاتی ہیں مگر یہ محض مادّی نقطۂ نظر سے ہے۔ روحانی اور اخلاقی خوبیوں کا توارث جو نسلاً بعد نسل چلا کرتا ہے۔ اُس

ع ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ پٹنہ

مادی ورثہ سے بہت بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو غصب کیا جا سکتا ہے اور نہ چرایا جا سکتا ہے
یہ ایک پیدائشی حق ہے جس کا رستہ نہ تو ملتوی کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے۔ عام
بات ہے کہ بیٹا باپ کی اکثر خصوصیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جنسی کا تجربہ بھی بتاتا ہے اور مستقبل میں
بھی اس بات کی صداقت ظاہر ہو کر رہے گی "۔

اس بنا پر حسین کے نفس کو سمجھنے کے لیے تاریخ کے بہت سے ورق الٹ کر اور صدیوں
کی مسافت طے کر کے ہم کو بڑی دور سے اُن کے آباؤ اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔
یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیم خلیل سے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں یعنی
یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی طور پر مورث اعلیٰ
کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اپنے کو ملت ابراہیم
کا رہبر بتلایا اور حضرت ابراہیم ہی نے اس جماعت کا جو راہ حق میں اُن کے پیچھے آئے سب سے پہلے
نام "مسلم" رکھا اور ابراہیم کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ
خداوندا ہم کو "مسلم" قرار دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "امت مسلمہ" قرار دے۔ اس
طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبر اسلام کی بعثت گویا دعائے ابراہیم کا نتیجہ تھی اس لیے
حضرت ابراہیم کے روایات زندگی ابنائے اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے
تھے اور فرزندان اسلام کے عناصر اخلاق کی تشکیل میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے اسحاق اور اسمٰعیل۔ اسحٰق سلسلہ بنی اسرائیل کے
مورث اعلیٰ ہیں اور اسمٰعیل ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دادا ہیں۔ اسباب ایسے
مجتمع ہوئے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند اسمٰعیل کو شیر خوارگی کے عالم میں اُن کی ماں ہاجرہ
کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہونچا دیا یہ وہی جگہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے۔ اس خانۂ کعبہ کی تعمیر
ان ہی باپ بیٹے ابراہیم اور اسمٰعیل نے کی خانۂ کعبہ تیار ہو گیا اور تمام اطراف ملک کے
لوگوں کا نقطۂ اجتماع بن گیا۔ یہاں سے آل ابراہیم کی مرکزیت کا سنگ بنیاد قائم ہوا کیونکہ
خانۂ کعبہ کے بانی اور اُسکے محافظ تھے اور کعبہ تمام قبائل عرب کا مرکز تھا۔

قدرت نے ان باپ بیٹے کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامور ہو گیا کہ بیٹے کو اپنے ہاتھ

سے ذبح کرے اور اُس نے بڑی ثابت قدمی اور پُرجگری کے ساتھ حکم ربانی کی تکمیل کے لیے اس فرض کو انجام دینے کا سامان کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت پر حکم برطرف ہو گیا اور بجائے انسان کے جانور کی قربانی کا عملدرآمد ہوا اور اس ذریعہ سے اُس جاری شدہ رسم کی اصلاح ہو گئی جو دیوتاؤں کے لیے انسان کی جان کی قربانی کی صورت میں بہت سی قوموں میں رائج تھی۔ اسلام نے قدیم زمانہ کے اس واقعہ کو بڑی اہمیت دی اور عید قرباں کی شکل میں اُس کی مُستقل یادگار قائم کر دی۔ شاید یہ احساس زندہ رکھنے کے لیے کہ اس سلسلۂ شرافت کی ابتدا ہی نفس کی قربانی سے ہوئی ہے۔

لے "اسمٰعیل کے بارہ[12] فرزند تھے۔ ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور پیغمبر اسلام ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔"

سے "حضرت کا نسب نامہ آپ کی ذات سے لے کر عدنان تک معتبر کتب تواریخ و سیر میں موجود ہے۔ اس طرح:۔

عدنان[1] ۔ معد[2] ۔ نزار[3] ۔ مضر[4] ۔ الیاس[5] ۔ مدرکہ[6] ۔ خزیمہ[7] ۔ کنانہ[8] ۔ نضر[9] ۔ مالک[10] فہر[11] ۔ غالب[12] ۔ لوی[13] ۔ کعب[14] ۔ مرہ[15] ۔ کلاب[16] ۔ قصی[17] ۔ عبد مناف[18] ۔ ہاشم[19] ۔ عبد المطلب[20] عبد اللہ[21] جو حضرت محمد مصطفیٰ کے والد بزرگوار تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے عدنان تک اکیس[21] پشتیں ہیں اور اگر ہر نسل کا اوسط تیس[30] سال قرار دیا جائے تو سنین میں کل پشتوں کی مدت تقریباً ۶۲۰ برس ہوئے یعنی حضرت عیسیٰ سے تقریباً سو ڈیڑھ سو سال پیشتر۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام پشتیں کتب تواریخ میں نہ صرف مذکور ہیں بلکہ ان پر تمام مورخین اور ارباب سیر کا اتفاق ہی اور قدیم زمانہ میں یہ بہت بڑی فضیلت سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص جو کسی ملک کا باشندہ ہو اُس کے آباؤ اجداد سب اسی ملک میں پیدا ہوں۔ مصری اور یونانی اقوام اس فضیلت کے بہت قائل تھے اور وہ لوگ جن میں یہ صفت پائی جاتی تھی کہ اباً عن جدٍ کسی خطۂ زمین کے رہنے والے ہوں اہل یونان و مصر اُن کو اپنا دیوتا یا نیم دیوتا مانتے تھے۔ قریش کا لقب

لے مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن)، سے مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی

ان اکیس ۲۱ آدمیوں میں سے کس کو ملا اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور بعض کے نزدیک نضر بن کنانہ کو اور بعض کے نزدیک قصی بن کلاب نے یہ عزت و افتخار حاصل کیا چنانچہ عقد الفرید میں اس کی تصریح ہے کہ چونکہ قصی نے خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا تھا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ "تقریش" کے معنی جمع کرنے کے ہیں اور اسی سے وہ مجمع کہلاتے ہیں:-

قصی ابوکم من یسمّی مجمّعا بہ جمع اللہ القبائل من فہر"

عل۱۔ بابل والوں کے حملے کی وجہ سے کعبہ کی مجاوری جو نسل اسمٰعیل ہی کے لیے مخصوص تھی ان کے ہاتھ سے نکل کر جرہمی خاندان کی طرف منتقل ہوگئی تھی جرہمی اپنے کو ملک کہا کرتے تھے اور اس کا یہ سبب تھا کہ وہ دنیوی اور مذہبی اقتدار کے مالک تھے۔ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں بنی خزاعہ نے یمن سے نکل کر مکہ اور جنوبی حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں بنی اسمٰعیل بھی اپنی قوت اکٹھا کر رہے تھے۔ خاندان خزاعہ تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک رہا قصی نے خزاعیوں کو مکہ سے نکال باہر کیا اور خود سریر قابض ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام حجاز کو اپنے زیر حکومت داخل کر لیا۔ مکہ اس زمانہ میں چھوٹا سا قریہ تھا جس میں محض خیمے اور جھونپڑے تھے۔ قصی نے از سر نو کعبہ کی تعمیر کی اور اپنے لیے ایک عالی شان محل بنوایا جس میں خود اُن کا کمرہ دار الندوہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے قریش جو تمام ملک میں منتشر تھے آ کے گرد و نواح میں بس گئے قصی نے لوگوں کے لیے قوانین بھی بنائے اور خراج کی وصولیابی اور حاجیوں کے خورد و نوش کا بھی انتظام کرایا۔ قصی کا انتقال ۴۸۰ء میں ہوا۔"

قبیلہ قریش کو خاص امتیازات حاصل ہوئے عل۲۔ "ان کے روحانی اقتدار کے سامنے عرب کے تمام معزز و ممتاز قبائل نے اپنی گردنیں خم کر دی تھیں۔ یہ لوگ اپنے روشن کیرکٹر کی بناء پر خانۂ کعبہ کے محافظ بھی تھے اور موسم حج کے منتظم بھی۔ نزاعات قومی کے منصف بھی تھے اور مفاسد تمدن کے مصلح بھی۔ ان کا فیصلہ ہر قضیہ میں ناطق اور ان کی رائے ہر معاملہ میں صائب تھی۔ اس قبیلہ کو دنیاوی وجاہت کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ حاصل تھی کہ

عل۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ عل۲ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی۔ مرادآباد

کفر و شرک کی گھنگور گھٹاؤں میں یہ ایسی چمکتی پیشانیاں تھیں جو ملتِ ابراہیمی کے قیام سے آج تک بت پرستی کے غبار سے آلودہ نہیں ہوئیں۔"

ع۱ "قصی کے بعد ان کے بیٹے عبدالدار مسند نشین ہوئے جن کا تقرر قصی نے بطور جانشین کے اپنی زندگی ہی میں کر دیا تھا۔ عبدالدار کے انتقال کے بعد جانشینی کے بارے میں اُن کے پوتوں اور اُن کے بھائی عبد مناف کے بیٹوں میں اختلاف ہوا مگر جلد ہی آپس میں یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ عبدالدار کے پوتوں کے ہاتھ میں کعبہ کی کنجی، دارالندوہ اور فوجی نشان رہے اور عبد مناف کے بیٹے عبدالشمس کو سقائی اور خراج کی وصولیابی کی خدمت تفویض ہوئی۔ عبدالشمس نے اپنے حقوق اپنے بھائی ہاشم کی طرف منتقل کر دیئے۔"

ع۲ "ہاشم نہایت باثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں سقایہ اور رفادہ ان کو سپرد کی گئیں جو انھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ انھوں نے قیصر روم سے خط و کتابت کر کے کچھ خاص حقوق عرب تجار کے واسطے حاصل کئے تھے۔ "ہاشم" ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں روٹیاں شوربے میں چور کر کے لوگوں کو کھلائیں (عربی میں ہاشم چورا کرنے کو کہتے ہیں)۔"

ع۳ "ہاشم کا انتقال ۵۱۰ء میں ہوا۔ انھوں نے یثرب کی ایک خاتون سلمٰی کے بطن سے ایک فرزند شیبہ نامی چھوڑا۔ ہاشم کی وفات کے بعد اُن کے بھائی مطلب جانشین ہوئے۔ مطلب کا انتقال ۵۲۰ء میں ہوا اور اُن کی جگہ اُن کے بھتیجے شیبہ تخت نشین ہوئے جو عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔"

ہاشم کے فرزند عبدالمطلب بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے "سید البطحا" ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو اُن کی اولاد میں رہ گیا جس سے آج تک آلِ رسول "سادات" کہلاتے ہیں۔ ان کا اعتماد، توکل اور خدا پر بھروسا اُس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے آ کے کعبہ پر حملہ کیا۔ یہ اصحابِ فیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبدالمطلب بارگاہِ الٰہی

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ع۲ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے
ع۳ سید امتیاز حسین صاحب

میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحاب فیل کو برباد کر دیا۔ اب عبدالمطلب جو محافظ حرم تھے عملی طور پر حافظ حرم ثابت ہو گئے۔ عبدالمطلب کے دس بارہ بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوطالب تھے۔

ا؎ "انہی عبداللہ کی قربانی کا واقعہ مثل حضرت اسمٰعیل کی قربانی کے واقعہ کے کتب تواریخ میں مذکور ہے جس طرح حضرت اسمٰعیل کا فدیہ ایک دنبہ تھا اُسی طرح مشہور ہے کہ عبدالمطلب نے سو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بچائی" اس واقعہ کی بنا پر عبداللہ بھی ذبیح کہلائے۔

قدرت کا کرنا کہ آخر میں ان کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابوطالب کو حاصل ہوئے ابوطالب "شیخ البطحا" اور "سردار قریش" مشہور ہوئے اور حامل ہوئے تمام مواریث انبیاء کے اور اُن امانتوں کے جو ابراہیم و اسمٰعیل کی متروکہ تھیں اور سب سے بڑی امانت ایک ان کی حفاظت میں آئی۔ وہ عبداللہ کے یتیم محمد کی ذات تھی اور وہ قدرت کے مقاصد جو اس ذات کے ساتھ وابستہ تھے ان سب کی حفاظت ابوطالب سے متعلق تھی۔

ابوطالب کی آغوش میں جب حضرت محمد مصطفےٰ کی پرورش ہو رہی تھی تو ابھی آپ کی عُمر نوجوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کر لیا اور آپ کو "صادق" اور "امین" کا لقب دیا یہاں تک کہ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھا۔ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ کی عمر بیس۲ برس کی تھی جب قریش میں "حلف الفضول" کا عہد نامہ ہوا۔ تاریخ صاف اقرار کر رہی ہے کہ اتنے شریفانہ اصول پر معاہدہ اس کے پہلے کبھی نہ ہوا تھا اس معاہدہ کی تحریک کا سہرا بنی ہاشم ہی کے سر تھا زبیر بن عبدالمطلب سب سے پہلے اس کے داعی تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ع۲ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی

ا؎ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے ع۲ سید امتیاز حسین صاحب ایڈوکیٹ

پھر شروع ہوگئی رشتے ناتے کی وجہ سے آپس میں خونریزیاں تو نہیں ہوئیں لیکن اجنبی لوگوں کی زندگی محفوظ نہیں تھی۔ معاملات کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی کہ حنظلہ جو قبیلہ بنی القیس کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ دن دہاڑے مکہ کی سڑکوں پر لوٹ لیا گیا۔ بنی ہاشم کا حساس دل انسانی تکلیفوں اور اس قسم کے حیوانی اقدامات کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُنھوں نے پردیسیوں اور اجنبیوں کی خدمت و نگہداشت کا بیڑا اُٹھا لیا۔"

بنی ہاشم، زہرہ اور تیم سب عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دینگے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ اُس کا حق ادا نہ ہو جائے اور ہم اسباب زندگی میں ایک دوسرے کی معاونت اور ہمدردی کرینگے اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ یہ نام جرہمین کی ایک قدیم انجمن کے نام کی یادگار میں رکھا گیا جس میں فضل۔ فضال۔ مفضل اور فضیل شامل تھے اور اس لئے اس کا نام فضول پڑ گیا تھا۔ حضرت محمدؐ اس معاہدہ میں شریک تھے اور آپ نے اس انجمن میں شرکت ۵۹۵ء یعنی اپنی شادی کے کچھ دن بعد کی تھی اور ہمیشہ اس پر آپ نازاں رہے بلکہ دعوت اسلامی کے ظہور کے بعد جبکہ سابق کے تمام عرب کے معاہدات اور مخاصمات کالعدم قرار دیدیے گئے تھے آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اُس کی صدا پر لبیک کہوں گا (طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن ق ۱ ص ۸۲)

اگر آپ نے عرب کی تاریخ پڑھی ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ عرب قوم کی اسپرٹ کے بالکل خلاف تھا وہاں تو یہ تھا کہ ہم کو اپنے ہم قوم کی مدد کرنا چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس قبائلی تعصب کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شخص کی جنگ قبائلی جنگ بن جاتی تھی جو چالیس چالیس برس رہتی تھی۔ اس غلط ذہنیت کے خلاف اگر بغاوت کرنے والے تھے تو بنی ہاشم تھے جو دنیا کو حق اور انصاف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت یا برادری کوئی چیز نہیں ہے۔

ع۵ در حلف الفضول کی تنظیم کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں عثمان بن حویرث نے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

بازنطینی دولت وثروت کی لالچ اور پشت پناہی کی وجہ سے حجاز کو رومی سلطنت کا محکوم بنانا چاہا عثمان کی یہ یورش نہایت جسارت اور مردانگی کے ساتھ تھی اور وہ یقیناً کامیاب ہو گیا ہوتا اگر عربوں میں اس وقت بھی پیشتر کی طرح نفاق اور بے آئینی باقی رہتی لیکن حلف الفضول کی وجہ سے عربوں میں کافی سمجھ آگئی تھی اس لیے وہ اقدام ناکامیاب ہوا اور حجاز ایک غیر قوم کی غلامی سے محفوظ رہا۔

محمد مصطفےٰ کی عمر تیس برس کی تھی اُس وقت ابوطالب کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا "علی" ابھی علی چار یا پانچ برس کے ہونگے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالب اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بار کو کم کرنے کیلئے محمد مصطفےٰ نے علی کی پرورش اپنے متعلق کر لی۔ اب علی محمد کے آغوش تربیت میں تھے۔

یہاں پر ایک دفعہ یہ نظر ڈال لو کہ اس خاندان کی زمین شرف کس آسمان تک پہنچ چکی ہے اور اُس کے قدیم روایات کس درجہ شاندار ہیں۔

(۱) کعبہ جو تمام عرب کے اجتماع کا مرکز ہے وہ بنایا ہوا ہے ان کے دادا حضرت ابراہیم کا

(۲) ان کے مورث اعلیٰ جناب اسمٰعیل اللہ کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے "ذبیح خدا" کہلائے یہ قربانی کا جذبہ اس خاندان کا ورثہ ہے۔ عبدالمطلب اور ان کے فرزند عبداللہ نے اسی سبق کو دہرا کر ثابت کر دیا۔

(۳) تمام قبائل مضر کی شیرازہ بندی کا فخر ان کو حاصل ہے۔

(۴) خانہ کعبہ کے محافظ اور موسم حج کے منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں تمام عرب کی مرکزیت حاصل ہے۔

(۵) اندرونی اور بیرونی معاملات میں عرب قوم کی لیڈر شپ اور نمائندگی ان کا حصہ ہے

(۶) وہ غریبوں کے ملجا و ماوی اور قحط سالی وغیرہ کے ایسے سخت اوقات میں مسکینوں کی خبر گیری کرنے والے ہیں۔

(۷) وہ اسم اور مسمّٰی دونوں حیثیتوں سے سردار (سیّد) مانے جاتے ہیں۔

(۸) وہ ایک ہی وقت میں جنگ کے میدان کے شہسوار اور روحانی عالم کے ہمراز ہیں ابرہہ کی جنگ میں عبدالمطلب کا طریقہ بیکار اس کا گواہ ہے۔

(۹) انھوں نے مظلوم کی حمایت اور حق کی طرفداری کا بیڑا اُٹھایا اور اس بارے میں تمام قریش کی رہنمائی کی تھی۔

یہ تھے وہ نمایاں خصوصیات جو گزشتہ تاریخی واقعات سے نمایاں طور پر اس خاندان کے لیے ثابت ہیں۔

۵ "رحمت ایزدی اس خاندان کے اتنے ہی اقتدار پر بس کرنے والی نہ تھی بلکہ وہ اس مقدس خاک پر ایک ایسا آفتاب چمکانا چاہتی تھی جس کی بڑھتی ہوئی شعاعیں حیات انسانی کے ناپید اکنار میدان سے گزرتی ہوئی قیامت کے دامن سے جا لپٹیں"!

چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈانواڈول تھی۔ جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین مکہ سے ظاہر ہوی تھیں مگر رفتہ رفتہ اُس کی روشنی شرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے لئے بھی بنی ہاشم کا گھرانا منتخب ہوا۔ وہی عبداللہ کا یتیم محمد مصطفےٰ جس کی سچائی اور امانتداری کو تسلیم کیا جا چکا تھا اس پیغام کا حامل قرار پایا۔ اس پیغام کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی تھی اور اپنے ہاتھ کے تراشے ہوے بتوں کی پرستش کو مٹانے کا اعلان کیا گیا تھا مگر یہ بت سونے چاندی پتھر ہی کے ہونا ضروری نہیں ہیں بلکہ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان بھی صنم ہے جبکہ وہ الوہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور دنیا کو اپنے سامنے سرنگون ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت جبکہ پیغمبر نے اس پیغام اسلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ان کے چچازاد بھائی حضرت علی کی عمر ۱۰ برس کی تھی۔ یہ عمر بچپن ہی کی ہوتی ہے اور اس سن میں انسان تربیت سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ علی کی تربیت پیغمبر ہی کر رہے تھے اس لیے مجھے کہنے دیجیے کہ اب رسول کی آغوش میں دو چیزیں پرورش پا رہی تھیں ایک اسلام اور دوسرے علی۔ علی اور اسلام میں وہی وابستگی تھی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

---

۵ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

[۵] تین برس تک آنحضرت نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ کو ادا کیا مگر اعلائے کلمۃ اللہ میں اخفا، و رواداری مناسب نہ تھی لہٰذا صاف حکم آیا "فاصدع بما تؤمر" اور "انذر عشیرتک الاقربین"۔ ان آیات کے نزول کے بعد فرض ہو گیا کہ تبلیغ کھلم کھلا کی جائے اور "عشیرتک الاقربین" ہی سے شروع کی جائے۔ چنانچہ حضور نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا یا معشر القریش اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں کیونکہ ہم تم کو سچا جانتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا۔ بقول مولانا شبلی "یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جو حضور نے فرمایا" اس پر سارا مجمع جس میں آپ کے اعمام بھی تھے سخت برہم ہو کر چلے گئے مگر آپ اس ناکامی سے بددل نہ ہوئے اور چند روز کے بعد ہی آپ نے حضرت علی سے ارشاد فرمایا کہ دعوت کا سامان کرو۔ بقول مورخ ابو الفدا حضرت نے حضرت علی سے کہا کہ "ایک صاع (تقریباً ڈیڑھ یا پونے دو سیر مروجہ) کھانا پکواؤ اور اس کے اوپر بکری کی ران رکھو۔ اور ایک پیالہ میں دودھ بھرو" اس طرح بیں تمام آپ کے اعزا مدعو کئے گئے۔ آنحضرت نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بار گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دیگا۔ تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعتہً علی نے اٹھ کر کہا گو مجھ کو آشوب چشم ہے گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا اب مسلمانوں کی جماعت چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے نہایت دلیری سے حرم کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا جو کفار کے نزدیک حرم کی سب سے بڑی توہین تھی اس لیے دفعتہً ایک ہنگامہ ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت کے ربیب حارث بن ابی ہالہ نے حضرت کو بچانا چاہا لیکن ان پر اتنی تلواریں پڑیں کہ شہید ہو گئے اسلام کی راہ میں یہی پہلے شہید ہیں۔

اس کے بعد سے بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع ہو گئی اور رؤسائے قریش نے ابو طالب سے آکر اس کی شکایت کی۔ پہلے تو ابو طالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر جب نزاع بڑھی

---

[۵] میرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔

تو ایک جماعت اکابر قریش بطور وفد ابو طالب کے پاس پھر آئی۔ اس وفد میں عتبہ بن ربیعہ شیبہ، ابو سفیان، عاص بن ہشام، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے نہایت صاف الفاظ میں اور سختی سے کہا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہماری قوم کو گمراہ کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اس لئے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے ابو طالب اس دھمکی سے وقتی طور پر خائف ہو گئے۔ سوائے آنحضرت کو سمجھانے کے کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ حضرت سے عرض کیا "اے پیارے بھتیجے۔ میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں" آپ نے دیکھا کہ اب ان میں بھی تحمل نہیں ہے۔ پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔

اس جواب کو سنکر ابو طالب کا دل ہل گیا اور آنحضرت سے کہا کہ جاؤ اب تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ حضرت کا یہ استقلال اور اہل قریش کی اسی مناسبت سے تکلیف دہی برابر جاری رہی۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ شخص جاہ و ثروت اور نام و نمود کی خواہش سے ایسا ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی جانب سے عتبہ بن ربیعہ کو حضرت کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اے محمد آخر تم چاہتے کیا ہو؟ مکہ کی ریاست؟ یا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ یا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ پورا مکہ تمھارے زیر فرمان ہو جائے لیکن تم ہمارے مذہب میں دخل نہ دو لیکن حضرت نے ان سب فضول سوالوں کے جواب میں قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ دیں جن کا اثر عتبہ پر اتنا ہوا کہ اس نے قریش سے جا کر کہدیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں، کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے ہے کہ تم اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب ہوں گے تو اس میں بھی تمھاری عزت ہے ورنہ عرب اُن کو خود فنا کر دیگا قریش نے یہ رائے منظور نہ کی اور سخت تنفر و تشدد جس کو آجکل کی اصطلاح میں بائیکاٹ اور نان کوآپریشن کہتے ہیں جاری رکھا"

مگر ابوطالب نے حضرت محمد مصطفےٰ کی حفاظت میں جان کو جان نہ سمجھا بلکہ اپنی اولاد کو بھی رسول پر جان نثاری کی عادت ڈالی۔ اُس وقت جب یہ لوگ شعب ابی طالب میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن شب کو اچانک حملہ کر کے حضرت محمد مصطفےٰ کو قتل نہ کر دے ابوطالب آپ کو ایک بستر پر رہنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو باری باری آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو اُن کے بستر پر منتقل کر دیتے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد کے بدلے جو بھی ان کا فرزند قتل ہو جائے کوئی پرواہ نہیں مگر رسول کی جان بچ جائے۔ یہ ذوق قربانی کیا فراموش ہونے کے قابل ہے؟ یہ کس کی خاطر تھا؟ چاہے کہیے محمد کی خاطر اور چاہے کہیے اسلام کی خاطر۔

تین برس کے مکمل محاصرہ کے بعد اس قید سے نجات ملی مگر ؎ "عرب عدم تشدد کے قائل نہ تھے۔ وہ اس کو جہل اور بزدلی سمجھتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں پر سخت سے سخت مظالم شروع کئے اور حضرت ان سب مصائب و آلام کو نہایت جوانمردی اور استقلال سے برداشت کرتے تھے۔ یہ مصائب اور پریشانیوں کا زمانہ ہنوز ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۰ نبوی میں یعنی بعثت سے دسویں برس حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال تھوڑے ہی دن کے آگے پیچھے سے ہوا۔ ان دونوں آدمیوں کی رحلت سے حضرت محمد مصطفےٰ کو سخت رنج و ملال ہوا۔ اسی سے آپ اس سنہ کو "عام الحزن" (رنج کا سال) فرماتے تھے" اب آپ کے لیے وہ سپر جو ہر سخت موقع پر آپ کے سامنے آجاتی تھی یعنی ابوطالب کی قدیمی وجاہت بھی باقی نہ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مکہ کی ایذا رسانی آپ کو حد سے زیادہ بڑھ گئی یہاں تک کہ سب آپ کی جان لینے کے درپے ہوئے اور ایکا ہو گیا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ مجبور ہو کر آپ کو اپنے پیدائشی وطن مکہ کو خیرباد کہنا پڑا اور مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسی کا نام "ہجرت" ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے چچازاد بھائی علی بن ابی طالب کو ہدایت کی کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر علی بن ابیطالب اپنی جان کو حفاظت رسول میں سپر بنائے ہوئے اُن کے بستر پر آرام کرتے رہے۔

مدینہ میں پہونچنے کے بعد بھی پیغمبر اسلام کو مخالف گروہ نے اطمینان کی زندگی بسر کرنے نہیں دی

؎ میرزا محمد عسکری صاحب (بی اے)

اور متعدد مرتبہ بڑی بڑی فوجوں کے ساتھ آپ پر چڑھائی کی بدر و احد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ ان میں مخالف طاقتوں نے ایکا کر کے حضرت محمد مصطفٰے کے مشن کو شکست دینا چاہی مگر سچائی کی طاقت کو شکست نہ دے سکے۔ ان لڑائیوں میں محمد مصطفٰے کی حمایت میں علی مرتضیٰ کی تلوار اسلام کے نام کے ساتھ اپنی یاد قائم رکھے گی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کا اتحاد اور زیادہ مضبوط بنانا تھا حضرت محمد مصطفٰے کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہرا جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی اتنی عزت کرتے تھے جتنی کسی باپ نے اپنی بیٹی کی عزت نہیں کی ہو یعنی جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اُن بلند اوصاف کا جو اس مقدس خاتون کو حاصل تھے۔

عل ۱ عرب میں قدیم زمانہ سے بڑا جذبہ پاکیزگی خاندان کا پایا جاتا تھا اُن کا خیال تھا اور بہت حد تک صحیح تھا کہ انسان میں اچھائی اور بُرائی خون اور نطفہ میں ہوتی ہے اور نسلاً بعد نسل چلا کرتی ہے۔ اس وجہ سے وہ شجروں پر بہت زور دیا کرتے تھے اور وہ نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھے جاتے تھے، مرنے والے سردار کی شجاعت، تہور اور عقل اُسکے ساتھ قبر میں دفن نہیں ہو جاتی تھی بلکہ وہ ایک لافانی وراثت میں تبدیل ہو جاتی تھی جس سے اُس کی نسلیں متصف نظر آتی تھیں، ایسے لوگوں کی لڑکیاں فطرۃً بہادروں کی مائیں ہوتی تھیں۔ بہرحال عربوں میں سب سے بڑی ممکن عزت یہ ہوتی تھی کہ اُس کی رگوں میں خالص عربی خون دوڑ رہا ہو۔ عرب کی کسی معمولی خاتون کی شادی عجم کے بادشاہ کے ساتھ بھی ذلت ہی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اور اس بات پر ضد کرنے سے ایک دفعہ خسرو کے آخری بادشاہ کو اپنے تخت اور اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسلام نے اگرچہ اس بارے میں نگاہ میں وسعت پیدا کی اور صرف خاندانی امتیاز کو قابل وقعت نہیں قرار دیا مگر اس کا قائم مقام اُس نے صفات اور اعمال کو قرار دیا اور خاندانی بلندی کے ساتھ صفات کی رفعت کا خیال ایک مستقل نصب العین بن گیا۔ رسول محض عرب ہی نہیں تھے بلکہ عرب کے روشن ترین اور معزز ترین قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نسل در نسل اخلاق کی پاکیزگی اور فیاضانہ سیرت اس خاندان کی طرۂ امتیاز تھی۔

عل ۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی (ایڈوکیٹ)

اس خاندانی اختصاص اور تربیت کے پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی عزیز اور صاحب صفات بیٹی کے لیے موزوں تریں کفو کے کس قدر متجسس ہوں گے۔ خصوصًا وہ لڑکی جس کے ذریعہ سے اُن کی نسل دنیا میں چلنے والی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کردی گئیں۔ رسول کی نظر غور کرتے وقت ہر مرتبہ ایک ہی آدمی پر پڑتی تھی اور وہ علی کی ذات تھی۔ آپ کہا کرتے تھے کہ میں اور علی ایک ہی نور سے ہوں اس لیے فاطمہ کے لیے اگر کوئی موزوں کفو ہو سکتا تھا تو وہ محض علی ہی اور کوئی نہیں۔

اس نسبت میں کسی تلاش، کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہ تھی اور نہ کسی بات کا خطرہ تھا ابوطالب کے احسانات اور مراعاتیں رسول کے پیش نظر تھیں۔ وہ اپنے چچا کی عنایتوں کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ علی کی بھی خدمتیں اور اسلام کی ترقی میں کارگزاریاں بالکل ظاہر تھیں اسلیے پیغمبر نے طے کر لیا اور رسمی پیغام کے بعد اپنی بیٹی علی کے عقد میں دیدی۔

اب آپ جانتے ہیں فاطمہ کون ہیں؟ پیغمبر اسلام کی دختر اور علی کون ہیں؟ محافظ اسلام مجاہد اسلام بلکہ فدیۂ اسلام۔ ان ہی دونوں علی اور فاطمہ کے فرزند تھے حسین۔

اب کیا حسین بُھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟!

علہ حسین جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے قربانی و فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی ؟

حسین نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سُنتے تو رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیم خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔

ہمارے پردادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جد بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلق خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے اس لئے اگر خلق خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے تنگ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں۔

علہ مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب

حسین کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر پتھر کھائے اور مصیبتیں اٹھائیں میرے نانا رسول اللہ نے اور پیغمبر اسلام کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابو طالب اور جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر لیٹے تھے میرے باپ علی بن ابی طالب۔ پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لیے جہاد کیا انہی میرے بابا علی بن ابیطالب نے۔ کیا ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسین یہ نہ سوچتے ہوں گے کہ اگر کبھی اسلام پر وقت پڑے اور سچائی خطرے میں آجائے تو مجھے بھی یہی کرنا چاہیے۔

بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو اُن میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارناموں کے کرنے کا مل جائے۔ حسین بچپنے سے ولولہ رکھتے تھے منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں کی ہمدردی کا کوئی موقع پیش آئے اور مجھے بھی اپنے خاندانی روایات کو زندہ کرنے کا موقع مل جائے۔ یقیناً [۱] "امام حسینؑ کو وہی کرنا چاہیے تھا اور کیا جو اُن کے آبا و اجداد کر گئے تھے!"

---

[۱] علامہ ہندی مدظلہ

دوسرا باب

ولادت، ماحول اور اس کے اثرات، تربیت اور ابتدائی زندگی

سنہ ۴ھ	سنہ ۱۱ھ

حضرت محمد مصطفےٰ کو مکہ کی سرزمین چھوڑ کر مدینہ آئے ہوئے چوتھا برس تھا کہ حسین دنیا میں آئے [۱]۔ بروایات فریقین ۳ شعبان سنہ ۴ ہجری بروز پنجشنبہ آپ کی ولادت ہوئی نوید ولادت پر حضور (پیغمبر اکرم) تشریف فرما ہوئے۔ بیٹے کو گود میں اٹھایا۔ پیار کیا۔ داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منھ میں دی۔ ساتویں دن دو بکروں کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا گیا۔ بالوں کو چاندی کے ہم وزن فرمایا۔ چاندی خیرات کردی اور ایک گوسفند کی ران قابلہ (اسماء بنت عمیسؓ) کو مرحمت فرمائی (حاکم)۔

آپ کی پیدائش سے آپ کے نانا رسول اللہ، باپ علی مرتضیٰ اور ماں فاطمہ زہرا سب کو بڑی خوشی ہوئی اور خاندان میں یہ ایک قابل شکریہ اضافہ سمجھا گیا۔

پیغمبر اسلام کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی، اب ان دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی ایک حسن دوسرے حسین اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار پایا۔ ایک طرف نانا کہ جو بانی اسلام تھے اور دوسری طرف باپ کہ جو مجاہد و محافظ اسلام تھے ان کے خدمات اور کارگزاریاں آنکھوں کے سامنے تھیں۔

[۲] تاجدار رسالت نے اپنے مبعوث ہوتے ہی سب سے پہلی کوشش یہ کی تھی کہ عرب کی جہالت شعار قوم کے دل سے کفر و شرک کی سیاہی دھو کر اس میں توحید کا نور بھرا جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اُن کے اخلاقی رستوں سے وہ کانٹے صاف کئے جو ایک ایک قدم

---

[۱] مولانا عینی شاہ صاحب نظامی [۲] مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی۔

پر انسانیت و روحانیت کے پیروں کو لہو لہان کر رہے تھے۔ انھیں حقوق الناس کا فلسفہ سمجھا کر
جائز و ناجائز میں تمیز کرائی۔ بنی نوع انسان کی مساوات پر توجہ دلاتے ہوئے معاملات
میں عدل و انصاف کی ہدایت کی۔ مال غیر میں تصرف کو ناجائز قرار دیکر حقوق کی نگہداشت
کے آئین تعلیم کیے۔ جنگجوئی و سفاکی سے روک کر درشت طبیعتوں میں نرمی پیدا کی۔ غرضکہ یہ اور اس
قسم کی ہزار ہا باتیں تعلیم کر کے اُن کو اخلاق و عادات حسنہ کے سانچے میں ڈھال دیا۔ رحمۃ للعالمین
نے صرف تعلیم ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ جو کچھ اوروں سے کرانا چاہا پہلے اُسے خود کر کے دکھلایا۔ اس
طرح دنیا میں انسانیت کی جتنی خوبیاں ہیں سب آپ نے عرب میں اپنی تعلیم کے ذریعہ سے شائع کیں۔
دنیا میں ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور انسانی مشترک حقوق
میں بھی تفریق قرار دیدی مگر پیغمبر نے قولی اور عملی تعلیم کے ذریعہ سے پست جماعتوں کے
معیار کو اونچا کیا۔ آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن سیاہ رنگ کے حبشی بلال کو مقرر کیا جن کی آپ
اتنی عزت کرتے تھے جتنی بڑے بڑے ذی عزت خاندانوں کے لوگوں کی بھی نہ کرتے ہوں گے
آپ کی محبوب اور بزرگ مرتبہ بیٹی فاطمہ زہرا جن کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ ان کی
تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، اپنے گھر کا کاروبار اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں ایک مدت تک آپ کے
پاس کوئی عورت گھر کے کام کاج کے لیے نہ تھی خود ہی چکی پیستی تھیں اور خود ہی چرخہ کاتتی تھیں
کھانا پکاتی تھیں اور گھر میں جھاڑو دیتی تھیں بہت عرصہ کے بعد رسُول نے اپنی اس پیاری بیٹی
کو ایک کنیز عطا کی جس کا نام فضہ تھا تو یہ ہدایت کر دی کہ پورا کام برابر فضہ سے نہ لینا بلکہ ایک دن
گھر کا کاروبار تم کرنا اور ایک دن فضہ سے کام لینا۔ یہ وہ مساوات کی تعلیم ہے جو تاریخ
میں فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے۔ مال دنیا تو تھا نہیں۔ جو کچھ ہوتا غریبوں اور محتاجوں
کے کام آتا۔ خود فاقوں پر فاقے کرتے مگر سائل خالی ہاتھ واپس نہ کیا جاتا۔ اکثر اپنے سامنے
کا کھانا اٹھا کر دیدیا جاتا۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو فاطمہ زہرا کی چادر یہودیوں کے یہاں گروی ہونے
جاتی اور کسی طرح غریبوں کا کام بنایا جاتا۔ مسجد میں پانچوں وقت نماز جماعت۔ پیغمبر کے بصیرت
آفریں مواعظ اور خطبے مسلمانوں کا ذوق و شوق اور جوش و خروش۔ مکان میں رات دن
عبادت و ذکر الٰہی کی آوازیں، فاطمہ زہرا کا یہ عالم کہ محراب عبادت میں کھڑی ہو جاتی ہیں

تو وہ روحانی مسرت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے کہ چہرہ کا رنگ چمکنے لگتا ہے۔ علی بن ابیطالب کی یہ کیفیت کہ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں تو حیرت انگیز استغراق اور محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ عورتیں مسائل دینیہ دریافت کرنے فاطمہ کے پاس آتی ہیں۔ علی دین اور دنیا کے مہمات میں رسول کے ترجمان ہیں۔ تکبیر کی صدائیں۔ وحی کی آیتیں۔ غزوات کے تذکرے۔ اسلام کو ترقی دینے کے مشورے۔ ہر وقت یہی ذکر۔ یہی فکر۔ یہی قصے۔ یہی کہانیاں۔

لہ "یہ تھا وہ نورانی اور روحانی ماحول جس میں حسین نے پرورش پائی تھی۔ بچپن سے ماں باپ اور نانا کا برتاؤ جو کچھ دیکھتے چلے آ رہے تھے وہی لوح خیال پر نقش ہوتا چلا جاتا تھا اور اسی نورانی مسالے سے حسینی کیرکٹر کی عمارت بلند ہوتی چلی جاتی تھی۔ وہ اکثر دیکھتے تھے کہ ماں باپ فاقہ سے نڈھال پڑے ہیں اور نانا بھی اس حال میں ہیں مگر بیت المال کے خزانہ میں سے ایک پائی بے استحقاق اپنے صرف میں لانا گوارا نہیں کرتے۔ یہیں سے انھیں حق العباد کی نگہداشت کا سبق ملا ہوگا۔ جب دیکھتے ہونگے کہ وہ مقدس نانا جو اسلامی دنیا کا تاجدار ہے فقرائے صفہ سے بر سر خاک زانو سے زانو ملائے بیٹھا ہے تو کیا مواسات و مساوات کی امنگ دل میں نہ پیدا ہوتی ہوگی۔ رات رات بھر محراب عبادت میں کھڑے ہونے سے جب رسول کے پائے اقدس کو متورم پاتے ہوں گے تو کیا عبادت کا شوق دل کو نہ گدگداتا ہوگا۔ جب فقرا و مساکین کی حالت پر ماں باپ اور نانا کو روتا پاتے ہوں گے تو غربا پروری کی تعلیم نہ ہوتی ہوگی؟ جب یہ دیکھتے ہوں گے کہ بزرگوں کو حق بات سے ہٹانے میں دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور انسانوں کی بڑی سے بڑی طاقت کامیاب نہیں ہوتی تو کیا حق کی عزت اور باطل سے نفرت دل میں نہ پیدا ہوتی ہوگی؟ الغرض یہ تھی وہ اخلاقی و روحانی تعلیم جس کی فضا میں رہ کر حسین نے پرورش پائی تھی۔ معمولی عقل کا آدمی بھی اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ان حالات میں رہتے ہوئے حسین کے کیرکٹر میں کیسی غیر معمولی روشنی پیدا ہو گئی ہوگی۔"

لہ "جس بچہ کی تربیت اور اٹھان اُن ہاتھوں میں ہو جن کا نظریہ بگڑی ہوئی عمرانی زندگی سے تصادم کا ہو اور مضر عمرانی خصائل کو سُدھارنا اپنا فرض انسانی

لہ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہی   لہ علامۂ ہندی مدظلہ

قرار دے رکھا ہو اور اس اصلاح میں ہر مصیبت و تکلیف کے خیر مقدم کے واسطے تیار رہے اور عملاً ان تکالیف و مصائب کے نمونے تاریخ میں چھوڑ جائیں ۔ اس بچہ کو تم سمجھ سکتے ہو کہ کس ذہنیت کا حامل ہوگا ۔ امام حسین کی پرورش و تربیت انہی ہاتھوں میں ہوئی تھی اسلیے وہ یقیناً عام عربی ماحول سے علیحدہ تھے " ۔ ؎ "پیغمبر نے حسین کی تربیت صرف اس طرح نہیں کی تھی جس طرح ایک نانا ایک نواسے کی تربیت کرتا ہے بلکہ پیغمبر کی تربیت میں سب سے پہلے اور سب کے آخیر میں جو نکتہ ملحوظ تھا وہ یہ تھا کہ وہ پیغمبر ہیں اور وہ اپنے نواسے کو اپنے عقائد اور اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے تیار کر رہے ہیں "۔

پیغمبر کا مقصد قرآن کے اعلان کے مطابق کیا تھا؟ تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت۔ آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے۔ حکمت و اخلاق کے اصول کے مطابق حکمت عملی اور تربیت و تہذیب کے ترتیب وار تین درجے ہیں پہلے "تہذیب نفس" یعنی خود اپنی ذات کی تکمیل ۔ دوسرے "تدبیر منزل" یعنی اپنے گھر والوں کی تعلیم و تربیت ۔ تیسرا درجہ ہے "سیاست مدن" یعنی اہل ملک اور اہل قوم اور تمام دنیا کی رہنمائی ۔ ان میں سے ہر ایک درجہ عقلی طور سے دوسرے پر مبتنی ہے اگر پیغمبر اپنے گھر والوں ہی کی تعلیم و تربیت کے فرض کو نظر انداز کر دے تو اس کے تعلیمات کا عموم خلق پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا خود حضرت محمد مصطفٰےؐ نے اس کا عمومی اعلان کیا ہے کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی محدود حلقہ میں حکمران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے متعلقہ افراد کے متعلق جواب دہ ہے" پھر کیسے ممکن ہے کہ خود رسول اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرتے اور اپنے متعلقہ افراد کی تعلیم و تربیت کو نظر انداز کر دیں ۔

حضرت محمد مصطفٰےؐ کے بیٹے سب کمسنی کے عہد میں دنیا سے اٹھا لیے گئے تھے ۔ آپ کی کائنات زندگی اولاد کی حیثیت سے لڑکی اور نواسوں میں منحصر تھی ۔ اس لیے آپ کی پوری کوشش تدبیر منزل کی حیثیت سے انہی اشخاص پر مرتکز ہو گئی تھی ۔ آپ ان کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا رہے تھے اور ان آئینوں میں اس طرح جلا دے رہے تھے کہ آپ کی سیرت کا پورا

؎ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

نقشہ ان میں اتر جائے۔

اس تربیت کے انداز خاص تھے۔ رسول اپنے ان اہلبیت کی ذرا ذرا سی بات کی نگرانی کرتے تھے یہاں تک کہ بہت سی وہ باتیں جو عام اشخاص کے لیے معافی کے قابل سمجھی جاتی ہیں انہیں حضرت محمد مصطفےٰ اپنے اہلبیت کے لیے معاف نہ کرتے تھے اور ذرا سی بات پر بھی تنبیہ کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں اس وقت پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) حضرت محمد مصطفےٰ اپنی محبوب بیٹی فاطمہ زہرا کے گھر پر آتے ہیں۔ دروازہ پر ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ فوراً واپس جاتے ہیں۔ فاطمہ زہرا کو علم ہوتا ہے کہ میرے بابا تشریف لائے تھے مگر اندر نہیں آئے۔ دروازہ ہی سے واپس گئے۔ فوراً سمجھ جاتی ہیں۔ اُس پردہ کو اتارتی ہیں اور پھر وہی معمولی پُرانا بوسیدہ پردہ دروازہ پر ڈال دیتی ہیں اب رسول دوسرے وقت تشریف لاتے ہیں اور بیٹی سے ملاقات فرماتے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ قیمتی پردہ دروازہ پر آویزاں کرنا اسلامی شریعت کے خلاف بات نہیں ہے مگر پیغمبرؐ اپنے اہلبیت کے معیار زندگی کو ایک مثالیہ درجہ پر قرار دینا چاہتے تھے۔ آپ اُن کے لیے اتنے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

(۲) ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سیدۂ عالم نے اپنے لیے ایک گردن بند اور دو گوشوارے سونے کے بنوائے پیغمبر تشریف لائے ان زیوروں پر نظر پڑی تو کبیدہ خاطر ہو کر بیٹی کے پاس سے چلے گئے۔ سیدہ مزاج نبوت سے واقف تھیں۔ فوراً سمجھ گئیں۔ گردن بند کو رسول کی خدمت میں بھجوایا اور کہا کہ اسے راہ خدا میں دیدیجئے۔ رسول اللہ بہت خوش ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا فعلت خذ اھا ابو ھاہ جو میں چاہتا تھا وہی کیا۔ میری جان اس پر فدا ہو جائے“۔ اس کے بعد فرمایا کہ دنیا کا حاصل کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ مجھے نہیں منظور کہ میرے اہلبیت لذائذ دنیا سے فائدہ اٹھائیں۔ (صواعق محرقہ ص۱۰۹)

(۳) ایک عرصہ تک فاطمہ زہرا کے پاس گھر کے کاروبار کے لیے کوئی خادمہ نہ تھی۔ ایک مرتبہ مال غنیمت میں کچھ کنیزیں آئیں حضرت علی نے فاطمہ کو مشورہ دیا کہ تم جا کر اپنے باپ کے پاس اس مال غنیمت میں سے ایک کنیز طلب کرو۔ فاطمہ رسول کی خدمت میں حاضر ہوئیں

اپنا حال پیش کیا کہ جھاڑو دیتے دیتے چکی پیستے پیستے کس طرح لباس میلا ہو گیا ہے اور ہاتھ زخمی ہو گئے ہیں۔ خواہش کی کہ ایک کنیز اس مال غنیمت میں سے مجھے مرحمت فرمایئے۔ یہ خواہش سیّدہ کی کوئی غیر مشروع بات نہ تھی۔ نہ رسول کو اس کے پورا کرنے میں کوئی امر مانع تھا مگر پیغمبر کو اپنی بیٹی کی اخلاقی تربیت مقصود تھی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے بیٹی کنیز لو گی یا تمھیں ایک تسبیح ایسی تعلیم کر دوں جس کا خدا کی بارگاہ میں بڑا مرتبہ ہے؟ سیّدہ کی ذہنیت اور مذاق طبیعت کا امتحان تھا۔ مادّی آرام اور اخروی فائدہ کا موازنہ تھا۔ سیّدہ نے فوراً دوسرے پہلو کو اختیار کیا عرض کیا مجھے تسبیح تعلیم کر دیجیے میرے لیے بہتر ہے رسول نے سیّدہ کو وہ ورد تعلیم کیا جو تسبیح فاطمہ زہرا کے نام سے مشہور ہے۔

ان واقعات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبر اپنے اہلبیت کی سیرت زندگی کی کس اعلیٰ معیار پر تشکیل فرما رہے تھے۔

بیٹی کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے میں رسول اللہ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ سیّدہ طبقہ خواتین کے لیے ایک اعلیٰ مثال بن گئیں اور اسی اعتبار سے رسول نے ان کی نسبت ارشاد کیا کہ سیدۃ نساء اھل الجنۃ یعنی بہشت کی عورتوں کی سردار۔ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ بہشت اسلامی تعلیم کے مطابق صرف اچھے اعمال کا نتیجہ ہے فاطمہ کو اہل بہشت کی سردار کہنے کا مطلب صرف یہی ہے کہ فاطمہ اُن اعمال و افعال میں جو بہشت کے حصُول کا ذریعہ ہیں تمام خلق کی عورتوں کی پیشوا، رہنما اور سردار ہیں۔

اب اس بیٹی کے ذریعہ سے قدرت نے رسول کی آغوش میں دو بیٹے عطا کیے ایک حسن اور دوسرے حسین تو کیا ممکن ہے کہ رسول ان کی تعلیم و تربیت میں اس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معلم اخلاق کے، بحیثیت بزرگ خانداں کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا؟ ہرگز نہیں۔

آپ نے بچپنے ہی سے ان بچّوں کی تعلیم و تربیت ہر طرح سے اپنے ذمہ لی اور رات اور دن، تنہائی میں اور لوگوں کے مجمع میں یہاں تک کہ عبادت کے عالم میں اور خطبہ کی حالت میں بھی ان کو اپنے پاس رکھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کو ٹوکا روکا اور ان کی تربیت اُن

معیار پر شروع کی جس معیار پر وہ اپنے اہلبیت کو پہونچانا چاہتے تھے۔ اس کا نمونہ علامہ ابن حجر مکی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ کسی جگہ سے تصدق کے خرمے رسول کی خدمت میں آئے۔ اس وقت حسن آپ کی گود میں بیٹھے تھے بچے نے ایک خرما اُٹھا کر اپنے مُنھ میں رکھ لیا۔ رسول اللہ نے اُنگلی سے خرما حسن کے منھ سے نکال کر پھینکا اور فرمایا " تھوکو تھوکو۔ صدقہ ہم پر حرام ہے"

شرع کا قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کمسنی کے عالم میں فرائض کی پابندیاں بچہ پر عائد نہیں ہیں مگر رسول اپنے بچوں کی عملی تربیت کے ذمہ دار تھے اُنھوں نے اس بارے میں فرو گذاشت جائز نہیں سمجھی۔

حسین بھی اسی آغوش میں پل رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے نانا کے طرز عمل کو، فرائض کے بارے میں آپ کے اہتمام کو اور اسلام کے متعلق آپ کے انہماک کو غور سے دیکھا اور خوب اندازہ کر لیا کہ رسول اللہ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنے اسلام اور اُس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبر تیار ہوں گے کہ ہم کو اُس پر نثار کر دیں۔ ایک موقع آگیا ایسا جہاں پیغمبر نے عملی طور پر اس کو دکھلا دیا

عـہ واقعہ یوں ہے کہ ۱۰ھ میں رسول نے نجران کے نصاریٰ کو مدعو کیا تاکہ وہ اسلام قبول کریں اُنھوں نے اپنے چودہ آدمیوں کو رسول کا امتحان لینے کیلئے بھیجا۔ پہلا سوال رسول سے جناب عیسیٰ کے متعلق پوچھا گیا۔ قرآنی وحی نے اس کا جواب یوں دیا " یقیناً خدا کے نزدیک عیسیٰ کی مثال حضرت آدم کی سی ہے اُس نے اُن کو مٹی سے بنایا اور کہا ہو جا۔ اور وہ ہو گئے، یہ سچ ہے تمھارے خدا کی طرف سے لہذا شک و شبہہ میں نہ پڑو۔" آخر میں جب بات بہت بڑھی اور نصاریٰ کا وفد دلائل کے ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوا تو پیغمبر کی جانب سے روحانی مقابلہ کی دعوت دی گئی۔ وہ روحانی مقابلہ جس کا نام ہے " مباہلہ "۔ قرآن میں اُس کی ہدایت پیغمبر کو مخاطب کر کے اس طرح ہوئی ہے:-

فمن حآجک فیہ من بعد ما جآءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا و ابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین (یعنی) " اگر یہ لوگ تم سے اُلجھتے رہیں بعد ایسے یقینی دلائل کے جو پیش ہو چکے

عـہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ۔

تو کہدو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر خدا کی طرف رجوع کریں اور اس کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر"۔ نصاریٰ اس پر راضی ہو گئے۔ دوسرے دن نبی چلے اس صورت سے کہ حسین گود میں ہیں حسن نانا کی انگلی پکڑے ہوئے چل رہے ہیں۔ پشت پر جناب فاطمہ ہیں اور آخر میں علی ہیں۔ نجران والے یہ منظر دیکھکر مرعوب ہو گئے اور کچھ شرائط کے ساتھ صلح پر آمادہ ہو گئے یعنی یہ کہ نصاریٰ معینہ خراج ہر سال دیتے رہیں گے اور اس کے عوض میں رسول اُن کو انہی کے مذہب پر قائم رہنے دیں۔ رسول نے اسے منظور کر لیا۔

کھُلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبر اس مہم کے لیے تنہا جا سکتے تھے اور جو کچھ بھی اس مہم کا مقصد تھا وہ تنہا آپ کی ذات سے حاصل ہو سکتا تھا۔ آپ کی دعا کی قبولیت خدا کی بارگاہ میں آمین کی محتاج نہیں تھی پھر رسول اللہ اپنے ساتھ ان اہلبیت کو لے گئے کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک تعلیم و تربیت کا انداز تھا۔ وہ ابھی سے ان اپنے خاندان والوں کے کاندھوں پر ذمہ داری کا بار ڈال رہے تھے۔ وہ ان کو اپنے کار رسالت کی تکمیل میں عملی طور پر شریک کر رہے تھے اور گویا اُن کو بتلا رہے تھے کہ دیکھو اگر حفاظت اسلام کی ضرورت ہو تو مجھے تم ہی سے اُمید ہو سکتی ہے میرے اس مشن کی تکمیل سب سے پہلے تمہارا ہی فرض ہے۔ وہ گویا ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کے کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں میں نہ موجود ہوں تو تم اسی طرح حفاظت اسلام کے لیے نکل کھڑے ہونا جس طرح میں نکلا ہوں۔ پیغمبر نے اپنے اس عمل سے صاف واضح کر دیا کہ اسلام کے مفاد کی خدمت کے لیے آپ اپنے مرد، عورت، جوان، بچہ کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتے اور وقت آنے پر ہر ایک کو اس کام میں لگا دینے پر تیار ہیں۔ بے شک اس سے خاندان کی ہر فرد کو ایک احساس پیدا ہوا اور وہ احساس قائم رہا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ان میں سے جتنا کوئی بچہ کمسن تھا اُسی کا لانا اس روحانی مقابلہ میں عام فطری معمول کے خلاف تھا اور اس لیے ضرورت پر مبنی تھا۔ شاید یہ قدرت کا انتظام اس مستقبل کی تمہید تھا کہ جو ان میں سب سے کمسن ہے اُسی کو عملی طور پر اس سبق کے دُہرانے کا موقع ملے گا جسے پیغمبر نے آج پیش کیا ہے۔ وہ سب سے کمسن بچہ جو اس یادگار موقع پر

لایا گیا تھا کون تھا؟ وہ حسین تھے جن کی عمر اس وقت چار یا پانچ سال سے زیادہ نہ تھی جن کو رسول اپنی گود میں لے کر میدان مباہلہ میں آئے تھے۔ بے شک حسین نے سمجھا اور یاد رکھا کہ نانا نے آج کون سی مثال قائم کی ہے۔ وہ منتظر ہو گئے اور برابر منتظر رہے کہ کب وہ وقت آتا ہے جب اسلام کی حفاظت کیلیے مجھے اپنے جوانوں، بچوں اور عورتوں کو سب کو لے کر میدان جہاد میں آجانا پڑیگا

حضرت محمد مصطفےٰ سے بڑھ کر کوئی شخص جوہر شناس نہیں تھا انھوں نے اپنے اہلبیت میں سے ہر ایک کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا اور سمجھ لیا کہ آپ کے تعلیمات کی حفاظت ان کے ذریعہ سے ہوگی اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی امت کو ہدایت کی کہ میرے اہلبیت کی پیروی کرتے رہنا کبھی فرمایا کہ "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہلبیت" کبھی فرمایا کہ "میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس کشتی پر سوار ہوا اُس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا" اس ذیل میں آپ نے اپنے دونوں نواسوں حسن اور حسین کی خط پیشانی میں اُن کے مستقبل کی تحریریں بھی پڑھ لیں۔ آپ نے یہ محسوس کر لیا کہ ان بچوں میں اس چھوٹے سے سن میں میرے تعلیمات کا انعکاس کس شدت وقوت کے ساتھ ہے اس لیے آپ ان سے انتہائی محبت رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی محبت کی تاکید کرتے تھے اور خدا کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں (دیکھیے صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص۱۱۴ و ۱۱۵ روایات احمد بن حنبل، بخاری، ترمذی، ابن حبان، ابن ماجہ، حاکم وغیرہ)

اس کے علاوہ آپ نے ان کے بارے میں مختلف حدیثیں ارشاد فرمائیں جن میں سے کچھ دونوں بھائیوں کے بارے میں مشترک طور پر ہیں اور کچھ حسین کے ساتھ مخصوص ہیں۔

؎ "قدیم علماء میں بہت سے محدثین نے ان کلمات کو جمع کیا ہے جو صاحب وحی نے حسین کے بارے میں مختلف اوقات میں استعمال کیے تھے۔ احمد بن حنبل وغیرہ کی کتابیں ہم کو ضرور اس موضوع میں مدد دینگی۔ ہمارے معاصرین میں بھی ایک مغربی محدث استاذ سید احمد الصدیق الحسنی نے ایک رسالہ فضائل حسین میں لکھا ہے"

؎ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری

دونوں بھائیوں میں مشترک حدیثوں میں سے ایک یہ ہے کہ فرمایا پیغمبرؐ نے "حسن و حسین جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں"۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہوگا کہ ان کے طرز عمل کی پیروی ہی رضائے الٰہی کی باعث ہو سکتی ہے، وہ رضائے الٰہی جو بہشت کی اصلی دولت ہے۔ اور خاص حسین کے بارے میں جو حدیثیں ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں"۔ یعنی میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسین کی بدولت قائم رہے گا۔

؎ "اگر آپ علم نفسیات جاننے والے سے پوچھیں گے کہ بچپن میں ذہنیت کس طرح سے بنتی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سات برس کی عمر ایسے نقش لے لیتی ہے۔ ایسی باتوں کو سمجھ لیتی ہے اور ایسی باتوں کو صاف دیکھ لیتی ہے جو عام طور سے جوان نہیں دیکھتے۔ سات برس کے بنے ہوئے نقش مرتے وقت تک قائم رہتے ہیں۔ رسول اللہ نے پورے اعتماد سے یہ کہا ہوگا کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ حسین ان الفاظ کو نہیں بھولے۔ موقع کے منتظر تھے کہ کون سا وقت آئے گا کہ میں رسول اللہ کی اس بات پر عمل کر سکوں کہ "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں"۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ رسول اللہ کتنا بھروسا رکھتے تھے حسین پر۔ سات برس کے بچے کے لیے یہ کسی معمولی جذبات اور معمولی دماغ کا نتیجہ نہیں تھا۔ رسول اللہ اس بچہ میں وہ عادتیں دیکھ رہے تھے جو آگے بڑھ کر اُس کو دنیا کی نجات دہندہ بنانے والی تھیں۔ اس علم کے ساتھ رسول نے کہا تھا کہ "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں"، جس کے کانوں میں یہ آواز پہونچا دی گئی تھی وہ کیسے بھول سکتا تھا؟"

حسین سات برس کے قریب اس لطف و محبت، خوشی اور دلجوئی کی بے پایاں فضا اور اس روحانی ماحول و تربیت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ربیع الاول ۱۱ھ کے شروع میں حضرت محمد مصطفےٰ کی وفات ہوئی اور حسین اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہو گئے۔

؎ سید احتشام حسین صاحب مابلی ایم۔ اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔
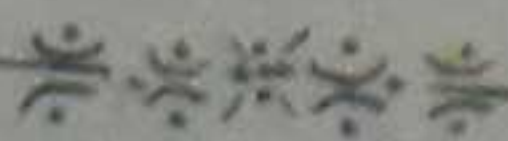
تیسرا باب

امام حسین کی زندگی کا دوسرا دور ۔ نانا کی وفات کے بعد، باپ کی تربیت اور صحبت اس زمانے کے اہم واقعات تجربات اور نفسانی اثرات

سنہ ۱۱ ھ	سنہ ۴۰ ھ

حضرت رسول کی وفات تمام خاندان کے لیے ایک بڑا روح فرسا حادثہ تھی۔ وہ انسان کامل وہ تھا جس کے اخلاق و اوصاف نے دوست اور دشمن کے دل کو مسخر کر لیا تھا اس لیے اُسکے دنیا سے اُٹھ جانے کا احساس ہر فرد بشر کو موجود تھا اور اسلامی گروہ کی ہر فرد جتنا تعلق پیغمبر سے رکھتی تھی اُس اعتبار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہی تھی تاریخیں تو یہاں تک بتلاتی ہیں کہ بعض آدمی آپ کے حادثۂ وفات سے دیوانے ہو گئے، بعض شہر سے نکل گئے اور بعض بیمار ہو گئے۔ ایسی بیماری جس نے انھیں قبر تک پہونچا دیا۔

پھر جب غیروں کا یہ عالم تھا تو رسول کے اہلبیت کے غم و الم کا اندازہ کہاں کیا جا سکتا ہے خصوصاً حسین جنکے ساتھ پیغمبر کی شفقت کا انداز ہی ایک نرالا تھا۔ وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا، سینہ پر لٹاتا تھا اور کاندھے پر چڑھاتا تھا۔ جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسین کی گوارا نہ کرتا تھا آج حسین آنکھیں پھرا پھرا کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبر کی ان غیر معمولی محبتوں کو دیکھکر، نیز آپ کے ان متواتر اعلانات کی وجہ سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اُسے حسین سے محبت کرنا چاہیے، عام مسلمان

جو بھی رسول کے ساتھ عقیدت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور اُن کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبر کے ان فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیازمندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبر کی تیوریوں پر بل دکھائی دینے لگتے تھے۔ ایک کھلا ہوا ثبوت اس کا اُس واقعہ سے ملتا ہے جب رسول اپنے اس بچہ کو کاندھے پر سوار کیے ہوے تھے اور ایک صحابی نے یہ کہدیا کہ "اے حسین کتنا اچھا مرکب ہے تمھارا" رسول نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے؟" یہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخور رکھنے والے مسلمان یا آپ کے چشم وابرو پر چلنے والے نیازمند حسین کی خاطرداری اور ان کے ساتھ اظہار محبت میں ذرا بھی فروگذاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسین ایک چراغ تھے جس کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکر لگاتے تھے عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی اور محبت کا ایک آسمان تھا جو اُن کے سر پر سایہ افگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہی۔ وہ انقلابات کا مجموعہ ہی۔ آج وہ مرکز جس کی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوے تھی قبر میں پہونچ چکا تھا۔ وہ ایک گیا گیا کہ حسین کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہو گیا جس کے حسین خوگر ہو گئے تھے۔ صبح ہوئی اور رسول نے دروازہ پر آکر آواز دی "انما یرید الله لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" اے اہل بیت محمدؐ نماز کا وقت آگیا۔ سب فوراً اٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسین نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہونچے۔ مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبر نے نماز پڑھائی۔ ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبر کے خطبے۔ شریعت اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفراء کا ورود۔ مختلف جماعتوں کی جنگی سرگرمیوں کا تذکرہ۔ اور اس کے ساتھ مدافعتی انتظامات دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزائیں۔ زکوٰۃ وخمس اور اموال غنیمت کا آنا اور مقررہ اصول و قواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اُس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے

حسین اپنے نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور آنکھ کھول کر اسی عالم سے روشناس ہوئے تھے اور سات برس تک اسی کے عادی رہے تھے۔ اب پیغمبر کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ انقلاب اور عظیم الشان انقلاب۔ پھر سیاسی اقتدار کے خاندان سے ہٹ جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکار رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے سے تبدیل ہو گئی اور وہ ماحول جس میں حسین زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ اب کیا تھا؟ نمازوں کا وقت آتا تھا مگر دروازہ پر نانا کی صدا نہ آتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ بلال کی اذان کی آواز تک جس کے سننے کے عادی ہو چکے تھے اب کانوں میں نہ آتی تھی کیونکہ پیغمبر کے بعد بلال نے عہد کر لیا کہ اب میں کسی کے لیے اذان نہ کہوں گا۔ وہ مدینہ چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ حسین دوڑ کر ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوائے اوقات نماز کے ہر وقت اُن کا رونے کا مشغلہ ہے۔ کچھ دن تک تو گھر پر رویا کرتی تھیں۔ پھر اس خیال سے کہ اہل محلہ کو میرے رونے کی آواز سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ جنۃ البقیع میں چلی جاتی تھیں اور اُس قبرستان میں باپ کے غم میں گریہ کرتی رہتی تھیں۔ حسین باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے کہ اُنھوں نے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک گوشے میں بیٹھے قرآن کے متفرق اجزا کو جمع کرتے رہتے ہیں اور کوئی پوچھتا ہے تو فرماتے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن کو اُس کی اصلی ترتیب اور شان نزول کے مطابق جمع نہ کر لوں۔ کیا اس صورت حال کو دیکھ کر حسین کا دل نہ گھٹتا ہوگا؟ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندھیرا ہے جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہر حال اپنے باپ کے طرز عمل سے اس وقت اُنھوں نے یہ سبق حاصل کر لیا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حسین نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجیے جو آپ کا واقعی حق ہے۔ اُٹھیے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں۔ اور نمائشی بھی۔

ایک طرف رسول کے چچا عباس بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ - میں تمھاری بیعت کرلوں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑیگا اور وہ کہیں گے کہ پیغمبر کے چچا نے اُن کے ابن عم کی بیعت کرلی پھر کسی کو عذر نہ ہوگا - اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب ہے اور وہ آکر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے دوسرے خاندان نے غلبہ حاصل کرلیا خدا کی قسم میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار و پیادہ سے بھر دوں گا - مگر وہ جذبات سے بلند، وہ خود غرضی کے لوث سے پاک، وہ اسلام کا سچا محافظ اور فرض شناس انسان ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آتا - وہ ابوسفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیتا ہے کہ وہ خدا کی قسم تو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کا دشمن رہا ہے؟ حسین کو اس سے بھی یہ سبق ملا اور بہت قوت کے ساتھ ملا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں، ہمارے ذاتی مفاد کو نقصان پہونچے مگر ہم کو ہمیشہ اسلام کے مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اسی کے ساتھ ایک یہ بات بھی دماغ کے کسی زاویہ میں جاگزیں ہوگئی کہ ابوسفیان اور اُس کے خاندان کے لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان رسانی کا اندیشہ موجود ہے۔ یہ بھی چاہے اس وقت اور چاہے اس کے بعد کبھی جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہو آپنے غور کیا ہوگا کہ اسلام کو اُس کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں اتنا نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہونچ سکتا ہے - مثال میں یہی واقعہ ہے کہ اگر اس وقت ابوسفیان کا منتر کارگر ہوگیا ہوتا اور علی بن ابیطالب اُس کی امداد پر بھروسہ کرکے کھڑے ہوجاتے تو اسلام آج ہی اُس ہولناک خانہ جنگی میں مبتلا ہوجاتا جس کی آندھیوں سے اُس کا چراغ جھلملا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجاتا۔ حسین نے یہ بھی آج ہی کے واقعہ سے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہمیں اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے اور کوئی ایسا موقع نہ آنے دینا چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے۔

افسوس ہے کہ رسول کے بعد چند ہی مہینوں کے بعد موت کے ہاتھوں نے حسین سے اُن کی ماں کو بھی چھین لیا - فاطمہ زہرا کی وفات سے علی بن ابیطالب اور بھی زیادہ دل شکستہ ہوگئے اور حسن و حسین کی ناز برداریوں کا مرکز بالکل ختم ہوگیا - مہر و محبت کی دنیا ان کے لیے ویران

نظر آرہی تھی اس لیے کہ وہ ماں بھی جو ان کے آرام کے لیے اپنی تکلیف بھول جاتی تھی اب جدا ہو چکی تھی۔ اب ان کے لیے مدرسۂ تعلیم اور گہوارۂ تربیت صرف ایک تھا اور وہ بزرگ مرتبہ باپ کی ذات۔ سات برس کی عمر کے بعد سے بلوغ کے زمانہ تک اور بلوغ کے زمانہ سے کامل جوانی کی انتہا تک وہ وسیع اور طولانی مدت ہے جس میں حسین اپنے باپ علی ایسے حکیم الٰہی اور عالم ربانی اور معلم اخلاق انسانی اور مجموعۂ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ یاب ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس وقت سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں اور نوجوانی کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہو کر اُس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے۔ حسین کے لیے ان تمام منازل کی تکمیل علی بن ابیطالب کی نگرانی میں ہوئی۔ اُس حالت میں کہ جب اُن کے لیے سیاسی مشاغل بھی نہ تھے کہ جو اُن کی توجہ کو تقسیم کرسکتے گویا اُن کے آفتاب تربیت کی کرنیں خط نصف النہار سے اپنے فرزندوں پر بالکل سیدھی پڑ رہی تھیں اور اُس سے جتنی بھی روشنی ان کے شفاف اور آئینہ آسا ضمیر میں پیدا نہ ہوئی ہو کم ہے۔

حسین نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علی بن ابیطالب باوجودیکہ زمانہ کی سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں، کسی مہم کے متعلق مشورہ میں، کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اُن کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور اُن سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا عذر امداد دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام جذباتی انسانوں کے رویہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے امیدوار ہوں محروم کر دیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے اور اگر اُس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مدد طلب کیجائے تو وہ اپنی سابقہ رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دینگے۔ حسین نے اپنے باپ کے طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کر دیے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد اور مسلمانوں کو حقیقی فائدہ پہونچ سکتا ہو تو فوراً ہمیں اس موقع پر اپنے فرض کو انجام دینا چاہیے اور

اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا زمانہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مسلمانوں کے فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اسلامی مملکت فارس اور روم کی شہنشاہیتوں کو شکست دے چکی تھی۔ بہت سے مورخین کا یہ بیان ہے کہ اس دور میں یزدجرد بادشاہ عجم کی بیٹیاں اسیر ہو کر دار الخلافت میں لائی گئیں۔ یہ منظر حسین ایسے گوش و ہوش رکھنے والے انسان کے لیے بڑا عبرتناک تھا سلطنت دنیا کی بے ثباتی اور عالم کے انقلاب کا یہ ایسا مرقع تھا جو ہر ذی حس انسان کو متاثر بنا سکتا تھا۔ حسین اس سے صرف متاثر نہیں ہوئے بلکہ ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت جبکہ غنیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کنیزی میں لے لیں۔ علی ایسے سردار عرب اور سردار قریش کا عالی دماغ شاہزادہ یہ چاہتا تھا کہ انھیں لونڈی نہ بنایا جائے بلکہ عجم کے ملک کی شاہزادی کو عرب کی شاہزادی بننے کی عزت دی جائے اور اسے خاندان رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ شاہزادی جس کا نام شہر بانو یا شاہ زناں مشہور ہے حسین کے عقد میں آئی اور اس طرح حسین نے اپنے نانا کی اس تعلیم کو زندہ رکھا جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔ تیسری خلافت کے موقع پر وقت ایسا آیا کہ علی ابن ابیطالب اس اسلامی جاہ و جلال والی حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو ان میں منحصر کر دیا تھا مگر حسین نے دیکھا اور پورے طور پر اس سے سبق حاصل کیا کہ ان کے بلند ہمت اور مستغنی باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دیدیا صرف اتنی سی بات پر کہ وہ کتاب اور سنت کے علاوہ کسی دوسری چیز پر بیعت لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ ایک بڑے اصول اور نظریہ کا سنگ بنیاد تھا اور وہ یہ کہ وہ حکام اسلام کی سیرت کو اس حد تک قابل قبول مانتے تھے جس حد تک وہ کتاب اور سنت کے مطابق ہو۔ کتاب اور سنت کے آگے کسی خلیفہ کی سنت پر عمل کی شرط کو وہ منظور نہیں کرتے تھے۔ اس طرح یہ خلافت کا ہما جو ان کے سر ہمایوں پر چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے ان سے علیحدہ ہو گیا حسین نے اس سے سبق حاصل کیا اور بڑا نتیجہ نکالا جس پر ان کے آئندہ تمام اقدامات کی بنیاد قائم ہوئی اور وہ یہ کہ شریعت اور حکام اسلام کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں

حکومت وقت کا آئین اور اس کا عمل عین شریعت نہیں ہے بلکہ شریعت کو مقتدا ہونا چاہیے اور حکومت کے عمل کو اس کا ماتحت ہونا چاہیے۔ جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے۔ اس طرح اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف ہو اور آئین شریعت میں تبدیلی کا باعث ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اپنی امکانی طاقت سے اس کے تحفظ میں کوشش کرے۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں حسین اپنے والد بزرگوار حضرت علی کی معیت میں مکہ معظمہ کے حج کی طرف متوجہ ہوئے مگر آپ سقیا اور عرج کے درمیان میں تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبداللہ بن جعفر آپ کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علی کو بھی خبر دی گئی۔ آپ اسماء بنت عمیس کو لے کر تشریف لائے۔ تقریباً بیس[2] دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیس[3] دن تک بیمارداری ہوتی رہی تب آپ صحیح و سالم ہو کر مدینہ واپس آئے۔ (جامع البیان طبری ج ۲ ص ۱۴۰)

حضرت عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گزرا مسلمانوں کو شکایتیں پیدا ہوئیں اور وہ شکایتیں شورش کی حد تک پہونچیں حسین نے دیکھا کہ ان کے باپ علی بن ابیطالب نے ان شورشوں کو بڑھانے کے بجائے جو خود غرض آدمی کا شیوہ ہونا چاہیے پوری کوشش کے ساتھ ان کے فرو کرنے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کرائی اور مخالف جماعت کو سمجھا بجھا کر منتشر کیا مگر مروان کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر باغیوں نے خلیفۂ وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت بھی حضرت علی بن ابیطالب نے یہ ہمدردی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے تو آپ نے حسن اور حسین اپنے ان ہی دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصر حکومت کے اندر پہونچا دیا۔ اس سے حسین کو بہت سے سبق حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ ہم امن و امان کے محافظ ہیں۔ ہم کو کبھی شورش انگیزیوں میں حصہ لینا نہیں چاہیے بلکہ ہم کو جہاں تک ممکن ہو ایسی صورتیں پیدا کرنا چاہئیں کہ امن عامہ کو صدمہ نہ پہونچے۔ دوسرے یہ کہ مفاد عامہ کے تحفظ میں اپنی ذاتی رنجشوں اور شخصی فائدوں کا کوئی لحاظ نہیں کرنا چاہیے تیسرے یہ کہ مصیبت کے وقت

ہر ایک کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیے اور جہاں تک اپنے سے ممکن ہو اس کی امداد کرنا چاہیے۔ بھوک و پانی کی تکلیف میں کسی کا مبتلا ہونا ہرگز برداشت نہ کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ نظم حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور شورش کا پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ باغیوں کی جماعت نے دارالحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین کر دیا اور اُن کی شمع حیات کو خاموش کر دیا۔ عبرت کی بات ہے کہ اتنی بڑی اسلامی سلطنت کا مُسلم الثبوت فرماں روا خود اپنے دارالسلطنت میں مٹھی بھر پردیسی باغیوں کی جماعت میں محصور رہا اور آخر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس دارالسلطنت کے لوگوں میں جو پیغمبر کا دارالہجرت تھا اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہل حل و عقد خلیفہ گری کے کام کا اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی جوش مقاومت پیدا نہ ہوا اس سے زیادہ عبرت کی یہ بات ہے کہ اس عظیم المرتبت خلیفۃ المسلمین کی لاش دو دن تک بے گور و کفن رہی اور بلوائیوں کے ڈر سے کسی کو دفن کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر میں بڑی بیکسی کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان سے الگ خاموشی سے دفن کیے گئے۔

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان اور وہ بھی حسین کا ایسا بلند دماغ رکھنے والا کس قدر اہم نتائج اخذ کر سکتا تھا؟ سلطنت دنیا کی بے ثباتی۔ جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد۔ مدینہ کے لوگوں کی بے حسی۔ اسلامی مرکزیت کا کمزور ہو جانا اور مسلمانوں میں نفسانیت اور خود غرضی کا دور دورہ نیز مروان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے سینہ پر اس گھاؤ کا لگنا اور اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسین نے دیکھا اور ان میں سے ہر ایک بات کو یاد رکھا اس طرح کہ اپنی آیندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کے لیے آپ کو مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب میں بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علی بن ابی طالب کے چہرہ پر جم گئیں۔ انھوں نے آپ کے پاس آکر خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی خواہش کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی اور اب اس وقت حسین کوئی بچہ نہ تھے کہ حالات کو سرسری نگاہ سے دیکھتے بلکہ وہ ۳۲ برس کے کامل انسان تھے

اور یقیناً معاملات پر رائے قائم کرنے میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تقریباً برابر کے حصہ دار
تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ اُن کے والد بزرگوار کوشش کے ساتھ اس موقع کو ٹال دینا چاہتے ہیں
باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ اُن کو خلق خدا کی ہدایت اور اُن کے نظم ونسق کی درستی کے ذمہ دار بننے
کی ایک تڑپ رہی ہے اور وہ اس بارے میں اپنی اہلیت وصلاحیت اور استحقاق کا اعلان کرتے
رہے ہیں لیکن آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو وہ مسترد کر رہے ہیں اور اس کے لیے کسی
طرح تیار نہیں ہیں۔ حسینؑ نے ممکن ہے باپ سے دریافت کیا ہو یا نہ دریافت کیا ہو اور خود سمجھ گئے
ہوں کہ اس کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت عمالِ حکومت کے رویہ کی بدولت
مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویہ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت بہت حد تک
دنیاوی اقتدار سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت وقیصریت کے آثار اس میں نمودار
ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اُس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبرِ اسلام نے
دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر علی بن ابیطالب قائم تھے۔ اس لیے وہ خوب جانتے تھے کہ اگر میں
اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ ساز کر کے ہوا کے رُخ پر چلنا پڑیگا
اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ ستیز کروں گا۔ ٹھیک
اگر میں ذمہ داری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت میں
خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا وجود ناکامیاب سمجھا جائے گا۔ آپ نے پورا انکار کیا۔
مگر مسلمانوں کا اصرار انتہائی حدود تک پہونچا ہوا تھا اور وہ اتمام حجت کی صورت اختیار کر گیا تھا
یعنی علی بن ابیطالب پر یہ ذمہ داری عائد کی جا رہی تھی کہ دنیا آپ سے ہدایت و اصلاح کی
طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں۔ ایک داعیِ حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلق خدا
پر بے اعتمادی کی آڑ پکڑ کر اُن کی خواہشوں کو ٹھکرا دے اور اُن کی ہدایت کی ذمہ داری کو پورا
کر کے اُن پر حجت کو تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علی بن ابیطالب کو اس ذمہ داری کو قبول
فرمانا پڑا۔ بے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو
جب تم ذمہ داری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اُسی پر تمھیں چلاؤں گا
اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پرواہ نہ کروں گا۔ لوگوں نے اس کا اقرار کر کے علی بن ابیطالب

کی بیعت کی اور آپ خلیفۃ المسلمین قرار پا گئے۔ اس سے حسین کو ایک طرف یہ درس ملا کہ دنیا کی
فضا اب ہمارے حکومت و اقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس طرح ملک گیری اور حصول اقتدار
کا جذبہ اگر ہوتا بھی تو دل سے دور ہو گیا۔ دوسری طرف یہ تعلیم حاصل ہوئی کہ اگر خدا کے بندے
وفاداری کے عہد کے ساتھ ہم سے رہنمائی کے طالب ہوں تو چاہے ہمیں ان کی سچائی پر کتنا ہی شبہہ
یا بے اعتمادی ہو اور چاہے ہمیں اس کے نتیجہ کے ناسازگار ہونے کا پورا پورا اندازہ ہو مگر ہمارا
فرض یہ ہے کہ اتمام حجت کی خاطر ہم اُن کے عہد و پیمان کو باور کریں اور ان کی خواہش رہنمائی کی
تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔ انتظار کیجیے اُس وقت کا جب حسین حرف بحرف اپنے باپ سے
حاصل کی ہوئی اس تعلیم پر عمل کریں گے۔

خلافت کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد وہی ہوا جس کو حضرت علی ابن ابیطالب سمجھے
ہوئے تھے۔ وہی ہوا کہ دنیا آپ کے احکام کی پابندی اور آپ کے تعلیمات کی پیروی کے قابل ثابت
نہیں ہوئی۔ آپ کی مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ آپ کے خلاف قتل خلیفہ کا غلط الزام تراشا گیا
اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔ سب سے پہلے طلحہ اور زبیر نے ام المومنین
عائشہ کو آمادہ کر کے جمل کے معرکہ میں صف آرائی کی۔ وہ لوگ جو پچیس ۲۵ برس تک حضرت
علی کو میدان جنگ سے بالکل الگ تھلگ خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے انھیں یقین
ہو گا کہ حضرت علی کسی نہ کسی طرح معاملہ کو رفع دفع کر دیں گے اور جنگ کی نوبت نہ آئے گی مگر
دنیا نے دیکھا اور حسین نے خصوصیت کے ساتھ دیکھا کہ وہی علی بن ابیطالب جو اپنی تلوار کو
نیام میں رکھ چکے تھے اتنے طویل زمانہ تک کہ جس میں آپ کی جوانی گزر کے بڑھاپا آ گیا تھا۔
آج ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہونے کے بعد آئین و اصول کی حفاظت کے لیے ذرا بھی فریق
مخالف کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں اور ضرور انتہائی کوشش
کرتے ہیں کہ فریق اپنی کج رفتاری کو چھوڑ کر صحیح راستے پہ آ جائے مگر جب وہ اپنے غلط راستے سے
نہیں ہٹتا تو وہی تلوار جو بدر۔ احد۔ خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی جمل کے
میدان میں چمکنے لگتی ہے لمحہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہاتھ ہے اور وہی ہاتھ کی صفائی ہے۔ وہی
دل ہے اور وہی دل کی طاقت ہے۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق مخالف کی شکست پر ختم ہو جو

علی بن ابیطالب اپنے مخالف فریق کی سردار حضرت ام المومنین عائشہ سے وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کرتے ہیں جیسا کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا گیا ہوگا۔

حسین یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور اپنے دل پر نقش کرتے ہیں۔ بابا نے ۲۵ برس خاموشی سے کیوں گزارے، ایک دم جنگ کے میدان میں کیوں کود پڑے؟ اب تو آپ کا سن بھی لڑائیوں کی امنگوں کا متقاضی نہیں ہے۔ اُنسٹھ برس کی عمر ہے۔ بے شک حسین نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ حقیقۃً ہمارا حرکت سکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے۔ حصول اور فرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور سن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اٹھانے پر آمادہ کر رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا چاہیے اور اگر فرض ہمارا اقدام عمل کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر ہمیں عزم وارادہ کے قدموں پر کھڑا ہو جانا چاہیے اور وہ کچھ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت کا تقاضا ہے۔

اس فتنہ کے فرو ہوتے ہی دوسری اُس سے زیادہ سخت فتنہ کی آندھی شام سے اٹھی جس نے اسلامی مملکت میں تاریکی پھیلا دی وہ امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کی بغاوت تھی جس نے صفین کی خونریز شکل اختیار کی۔ اس جنگ کے آغاز اور اثناء اور انجام میں بہت سے جاذب توجہ امور پیش آتے رہے۔

معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی کا نہر فرات پر قبضہ کر لینا اور حضرت علی کے لشکر پر پانی بند کر دینا۔ مجبوراً آپ کا پانی کی خاطر حکم جنگ دینا، آپکے لشکر کا ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لینا اور یہ ارادہ کرنا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اُس نے ہم پر بند کیا تھا مگر حضرت علی بن ابیطالب کا اس کو گوارا نہ فرمانا اور کہنا کہ پانی مشترک چیز ہے، سب کو پانی پینے کی اجازت ہونا چاہیے حسین نے اس سے یہ سبق ضرور حاصل کیا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے اور اُس کے کمینہ طرز عمل کا معاوضہ اُسکے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرتے رہنا چاہیے۔

جنگ صفین میں حسین دیکھ رہے تھے کہ اُن کے والد بزرگوار کو مسلمانوں کی خونریزی سے کتنی تکلیف ہے۔ وہ پکار پکار کر امیر شام سے کہہ رہے ہیں کہ اس سے کیا فائدہ ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ تم نکل آؤ میدان میں اور میں نکل آؤں اور بس اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے مگر امیر شام نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے علی جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں کے آگے آگے تھے۔ اُن کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے اس لیے ذرا بھی اُن کو جھجک نہ تھی۔ اُن کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اُس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ آغوش مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بے شک وہ اُس موت کو ناپسند کرتے تھے جو زندگی کے ساتھ بستر راحت پر ہو چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہو تو اپنی موت مروگے اور قسم اُس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلواروں کی آسان ہیں فرش خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے چنانچہ اُن کا طرز عمل ہمیشہ اسی کا مظہر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو عمر انتہائی عزیز ہوتی ہے۔ رسول کا ارشاد کہ علی میرے بستر پر سو رہو اور علی کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا۔ اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھنچی ہوئی تلواریں لیے قتل پر آمادہ ہیں مگر وہاں راہ حق میں موت کوئی چیز ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس جنگ صفین میں آپ کا عمل اسی بے پروائی بلکہ شہادت کی آرزومندی کا مظہر تھا۔ ملاحظہ کیجیے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر ج ا ص ۴۱۱ ـ ۴۱۲ اور نیشاپوری کی غرائب القرآن ج ا ص ۳۳۹ "علی بن ابیطالب صفین کی جنگ میں صرف ایک کرتا پہنے ہوئے گردش کرتے تھے۔ آپ کے فرزند امام حسن نے عرض کی کہ بابا یہ تو جنگ کرنے والوں کا انداز نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! تمھارے باپ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کہ موت اُس پر گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔ پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں اور جن کے سامنے یہ سیر ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں انھیں موت کا اندیشہ کیسے رہ سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حسین مثل اپنے بھائی حسن اور محمد بن حنفیہ کے اس جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ برابر حصہ لے رہے تھے اور بڑے بڑے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے چنانچہ ابو حنیفہ دینوری

نے "الاخبار الطوال" ص۱۸۴ میں ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے جبکہ امیر المومنین کے لشکر کے بڑے حصہ نے شکست کھائی تھی لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے علی کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور جگر افراد۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو میسرہ کی جانب متوجہ کیا اور اُدھر قبیلۂ ربیعہ کے لوگ تھے جو اب تک اپنی طرف کے دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علی کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے حسن اور حسین اور محمد حنفیہ ہیں اور تیر علی کے کان کے پاس سے اور کاندھوں کے پاس سے گزر رہے ہیں مگر آپ کے بیٹے بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے ہیں اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیا یہ جذبۂ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علی کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علی کے یہ بہادر بیٹے موت کی پرواہ سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی جنگ میں حسین نے ایک اور منظر کا بھی اپنے باپ کے مشاہدہ کیا۔ وہ یہ کہ عین موقع جنگ پر آپ کی نگاہ آفتاب پر ہے۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ علی نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا یہ نماز کا وقت ہے؟! جنگ تو ہو رہی ہے! آپ نے فرمایا کہ اور ہم لڑ کا ہے کے لیے رہے ہیں۔ اسی نماز کے لیے تو جنگ کر رہے ہیں۔

حسین نے اس تعلیم کو محفوظ کر لیا کہ نماز اتنا اہم فرض ہے کہ کسی وقت نظر انداز نہیں ہو سکتا تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو جب نماز کا وقت آئے تو ہمیں لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر کو وہ وقت آ گیا کہ حضرت علی بن ابیطالب نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کر کے ہی جنگ موقوف کی جائے۔ ایک دن اور رات مسلسل ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجہ میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے۔ امیر معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا مگر عمرو بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ تھی کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیے گئے کہ یہ قرآن ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے۔ حالانکہ جنگ کی ابتدا ہی میں حضرت

علی بن ابیطالب قرآن کے فیصلہ کی طرف دعوت دے چکے تھے مگر اُس وقت کامیابی کے تخیلات تھے اس لیے علی کی دعوت کو مسترد کر دیا گیا۔ آج صرف شکست کے آخری انجام سے بچنے کے لیے قرآنوں کو سپر بنایا گیا۔ حضرت علی خوب واقف تھے کہ یہ مکاری اور چالبازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مگر آپ کے ساتھ والوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بہت سے لوگ مچل گئے کہ اب تلوار روک لیجیے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہو جانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورت حال تھی جس کو علی ابن ابیطالب گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التوا کا حکم دیا۔ طے پایا کہ ایک ثالث اہل شام کی طرف سے نامزد ہو اور ایک اہل کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہل شام کی طرف سے تو عمر بن عاص ایسا امیر شام کا نفس ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علی بن ابیطالب نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبد اللہ بن العباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے ہمدرد کو مقرر کریں جس پر آپ کو پورا بھروسا ہو تو وہی اپنی فوج والے پھر بگڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ان کو کیسے مقرر کریں آخر حضرت امیر نے انتہائی بددلی کے ساتھ فرما دیا کہ پھر جسے چاہو تم ہی مقرر کرو۔ ان لوگوں نے ابو موسی اشعری کو مقرر کیا جو پہلے ہی حضرت علی کی معاونت اور ہمدردی سے علیحدہ تھا۔ یہ معاہدہ بہت بادل ناخواستہ ہوا مگر مصلحت وقت یعنی اپنی جماعت میں خونریزی کا انسداد اسی پر موقوف تھا۔ یقیناً حسین کے گرم جوانی کے خون کو عام جذبات کی دنیا میں اس کا متحمل نہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو فرض شناس انسان تھے جو اپنے پیشوا اور افسر کے حکم کے مطیع تھے چنانچہ جو معاہدہ کی دستاویز اس تحکیم کے بارے میں لکھی گئی اُس پر ابو حنیفہ دینوری کی تصریح کے مطابق سب سے پہلے گواہ حسن اور حسین فرزندان علی بن ابیطالب تھے (الاخبار الطوال ص ۱۹۸) مگر حسین نے دیکھا کہ باوجود حضرت علی ابن ابیطالب کی اس غیر معمولی رواداری کے پھر بھی ساتھ والے مفسد آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے۔ ابھی گویا معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک جماعت حافظان قرآن کی جس کی پیشانیوں پر نمازوں کے گھٹے تھے۔ جن کی گردنوں میں قرآن حمائل تھے تلواریں کھینچے ہوئے علی کے سامنے آ گئی یہ کہتی ہوئی کہ آپ مشرک ہو گئے

آپ نے آدمیوں کو حکم بنا لیا۔ حالانکہ حکم ہونا خدا سے مخصوص ہے۔ یہ "خوارج" کا فتنہ تھا۔ جس کے لیے جنگ نہروان کی ضرورت پیش آئی۔ حسین نے واقعات کے اس طویل سلسلہ کو بہت غور سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص مخلص، یکدل اور ہم آہنگ نہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہونچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شورشین بالکل ختم نہیں ہوئیں اور آخر انہی خوارج میں سے ایک شخص کے ہاتھوں عین حالت نماز میں حضرت علی بن ابیطالب کے سر پر زہر آلود تلوار لگی اور ۲۱ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کو آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس وقت حسین بن علی چھتیس ۳۶ برس کی عمر کو پہونچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسین نے اپنے والد بزرگوار علی بن ابیطالب سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سُنا اور کیا کچھ سیکھ لیا؟

اُن مسلمہ اعتقادی نظریات سے قطع نظر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت میں حضرت امام حسین کی روحانی عظمت کے متعلق قائم ہیں، عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت بھی یہ اہم تجربات اور یہ گرانقدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسین کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کی بلندی اخلاق و صفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

(چوتھا باب)

امام حسینؑ کی زندگی کا تیسرا دور - باپ کی وفات کے بعد سے اپنے عزمِ جہاد تک

سنہ ۴۰ھ | سنہ ۶۰ھ

جب حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب بستر مرگ پر تھے۔ تلوار کا وار کاری لگا تھا اور زہر کا اثر جسم میں پھیل رہا تھا، زندگی سے مایوسی ہوگئی تھی۔ اس وقت آپ نے حسن و حسین اپنے دونوں صاحبزادوں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا «میں تم دونوں کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلبگار نہ ہونا چاہے وہ دنیا خود تمھاری طلبگار بھی ہو اور کسی دنیاوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مدمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ میں تم دونوں کو اور تمام اپنی اولاد کو اور اعزا کو اور ان لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہنچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور اپنے شیرازہ کو مجتمع رکھو اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہو۔ اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، اُن کی برابر خبرگیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا کیونکہ پیغمبرؐ نے ان کے بارے میں وصیت کی ہے اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا، کوئی تم سے بڑھ کر قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمھارے دین کا ستون ہے اور اپنے خدا کے گھر (خانۂ کعبہ) کا خیال رکھنا، زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا اور دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا اور آپس میں صلۂ رحم رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی اچھی باتوں کی ہدایت اور بُری باتوں سے ممانعت کو ترک نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔ دیکھو اے بنی ہاشم

میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ تم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کر دو! نہیں۔ میرے بدلے میں صرف میرا قاتل قتل کیا جائے اور یہ بھی لحاظ رکھو کہ اگر میں اس ضربت سے جانبر نہ ہو سکوں اور مر جاؤں تو اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگانا اور ہرگز اُس کو مُثلہ نہ کرنا یعنی اعضاؤ جوارح قطع نہ کرنا اس لیے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ خبردار کسی کو مُثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو۔"

نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات پتھر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ یہ صورت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بستر بیماری پر ہے۔ اُس کی موت کا ہنگام قریب ہے، اور اس وقت وہ اپنے تمام اہل بیت میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلا کر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات اُن فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کر سکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آلِ محمدؐ تو دین و شریعت، کتاب اور سُنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفادِ عامہ، مفادِ شریعت اور مفادِ الٰہی سے متعلق ہیں۔ ان وصیتوں کا ہر ہر لفظ سعادت شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہو گیا۔ یہ الفاظ اُن کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہے کہ "فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیاوی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیاوی نقصان کی کبھی پرواہ نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مدِ مقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔" ان الفاظ کو دونوں بیٹوں نے اپنی اپنی زندگی میں حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ پیشِ نظر رکھا اور کبھی یکسر مو اُس سے انحراف نہیں کیا۔ باپ کے یہ الفاظ بھی اُن کے دماغ میں گردش کرتے رہے کہ "آپس میں کبھی اختلاف نہ کرنا۔ قرآن پر سب سے زیادہ عمل کرنا۔ نماز کا خیال رکھنا۔ خانۂ کعبہ کا خیال رکھنا۔"

آئے گا موقع جب آپ کو معلوم ہو گا کہ بھائیوں نے یکجہتی کو کیسے قائم رکھا۔ قرآن پر عمل کس طرح کرتے رہے اور نماز کی اہمیت کو کیسے سخت موقعوں پر پیشِ نظر رکھا اور خانۂ کعبہ کی حرمت

کا کتنا لحاظ رکھا۔

یہ الفاظ بھی اُن کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے کہ "خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے"۔

خصوصیت کے ساتھ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسین کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔

حضرت علی بن ابیطالب کی وفات کے بعد تمام مُسلمانوں نے مل کر آپ کے بڑے فرزند امام حسن کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے پہلا خطبہ جو ارشاد کیا ہے اس میں حضرت علی بن ابیطالب کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کئے آپ کی سیرت اور مال دنیا سے پرہیز کا تذکرہ کیا۔ اور اس وقت آپ پر گریہ کا غلبہ ہوا اتنا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کئے۔ عبداللہ بن عباس نے کھڑے ہو کر لوگوں کو دعوت بیعت دی اور سب نے انتہائی خوشی اور رضامندی کے ساتھ آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اُسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمہیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی۔ سب نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ آپ نے نظم و نسق اور بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا۔ اطراف میں عمال مقرر کیے۔ حکام معین کئے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

ابھی ملک حضرت علی کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسن پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ امیر شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہوگئی اور اُن کے ففتھ کالم کے لوگوں نے اپنی کارروائیاں جاری کر دیں چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں۔ غنیمت ہی کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم

کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسن نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو ایسا ہے تو پھر تیار رہو، یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھکو خبر معلوم ہوئی کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہمیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر اپنی دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے۔" اس خط کے بعد امیر شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی رد و بدل ہوئی۔ بہر حال ان واقعات نے امام حسن اور اُن کے ساتھ امام حسین کو یہ خوب بتلا دیا کہ امیر شام معاویہ کی عداوت حضرت امیر سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ اُن کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ ایک مستقل دشمنی ہے اور اس سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرا امر یہ کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیے جائے پناہ موجود ہے اور اگر دو ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دو آدمی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنھیں کافی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے پھر بھی اس خط کے مضمون اور دوسرے حالات سے حسین دیکھ رہے تھے کہ اُن کے بھائی امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار ہیں اور وہ حق کے بارے میں اُس سے کوئی مراعات کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بے شک حسن کو اور اُن کے ساتھ حسین کو اپنے ملک کی فضائے بے اطمینانی ضرور تھی۔ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ کچھ لوگ حضرت علی کی فوج میں شامل تھے لیکن وہ قرابت، دوستی یا اور کسی وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیر کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی۔ اختلافِ رائے۔ اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزومند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم نے میرا دل پیپ سے

بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا۔ کبھی فرماتے تھے کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمہاری جماعت سے تبادلہ کرے، اُس طرح جیسے سونے کے سکہ کا مبادلہ چاندی کے سکہ سے ہوتا ہے یعنی وہ دس تم میں کے لے لے اور ایک انہوں میں کا مجھے دیدے۔ آپ فرماتے تھے کہ دیکھو اہل شام اپنے لیڈر کی اطاعت کرتے ہیں درانحالیکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کہنا نہیں مانتے درانحالیکہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ باطل راستے پر اپنے لیڈر کی اتنی اطاعت کرتے ہیں جتنی تم حق کے راستے پر اپنے امام کی اطاعت نہیں کرتے۔ آپ فرماتے تھے کہ جب تم لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے چلو گرمی کے زمانے میں تو تم کہتے ہو کہ یہ تو تراتے کی گرمی ہے۔ ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے جاڑے کے زمانہ میں تو کہتے ہو کہ یہ تو کڑاکے کا جاڑا ہے اتنی مہلت دیجیے کہ یہ سردی کم ہو جائے۔ افسوس! جب تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تلوار کی آنچ سے اور اس سے زیادہ بھاگو گے۔

یہی وہ جماعت تھی اب جس کے ساتھ امام حسن کو سابقہ پڑا تھا۔ آپ ان لوگوں کی حالتوں کا خوب اندازہ رکھتے تھے لیکن جب تک صورت حال میں کوئی تبدیلی نہو، آپ کا فرض تھا کہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہیں۔

امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے ضرور کچھ نہ کچھ یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہو گا اس کے علاوہ وہ سمجھتے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علی کی جو ہیبت تمام عرب کے قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اُسی درجہ پر حضرت امام حسن کے لیے ابھی حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے وہ سونچے کہ یہی موقع ہے عراق پر حملہ کر دیا جائے چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لیکر جسر منبج تک پہونچ گئے اس وقت امام حسن نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے گورنروں کو صورت حال کے مقابلہ کے لیے آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کے مشن کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سرد مہری سے کام لیا گیا تھوڑی فوج تیار ہوئی تو اُن میں کچھ طبقہ خوارج میں سے جو کسی نہ کسی حیلہ سے معاویہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل

کے دباؤ سے جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علی اور امام حسن کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ ادھر معاویہ نے عبداللہ بن عامر بن کریز کو اپنا مقدمۃ الجیش بنا کر آگے روانہ کیا اور اس نے عین التمر سے ہو کر انبار میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ ادھر حضرت امام حسن اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور مقام دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں کی خنک طبعی کا مشاہدہ ہوا۔ آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے۔ میں تمھارا اتنا ہی بہی خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیے۔ میں تمھارے بارے میں ایک فیصلہ کی رائے قائم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمھیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کروں۔" آپ کا یہ خطبہ حقیقۃً صحیح صورت حال کے جائزہ لینے کا بہترین ذریعہ تھا۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ وہ لوگ جو خوارج کی رائے رکھتے تھے پکار پکار کر کہنے لگے کہ حسن بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا اور آپ کا مصلا قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ کپڑے لوٹ لیے۔ یہاں تک کہ چادر آپ کے دوش سے اتار لی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آواز بلند کی کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ فوراً یہ دونوں جاں نثار قبیلے ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دور کیا۔ آپ یہاں سے روانہ ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر جراح بن قبیصہ اسدی ایک شخص انھی خوارج میں سے کمینگاہ میں چھپ گیا اور اس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہو گئی۔ قاتل گرفتار کیا گیا اور اسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیاری کی۔ ادھر تو معاویہ نے اپنی بڑی فوج کے ساتھ انبار کا محاصرہ کیا اور ادھر ان کے مقدمۃ الجیش عبداللہ بن عامر کا مقابلہ امام حسن کی فوج کے ساتھ ہوا مگر ابن عامر نے مقابلہ سے گریز کیا۔ امیر شام کو حضرت امام حسن کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا علم ہو چکا تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی حیثیت سے اس وقت

امام حسن کو جنگ نہیں کرنا چاہیے اور یہی وقت ہے کہ حصول اقتدار کے لیے صلح کی پیش کش کر دی جائے مگر اسکے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن کتنے ہی بے بس اور بیکس ہوں مگر وہ علی وفاطمہ کے بیٹے اور پیغمبر کے نواسے ہیں اس لیے وہ کسی ایسے شرائط پر ہرگز صلح نہ کریں گے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ بن عامر کے ذریعہ سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے درپے نہ ہو اور خونریزی کی صورت پیدا نہ ہونے دو۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کو رشوتیں دی گئیں اور کچھ کمزور طبیعت والوں کو اپنی تعداد کی کثرت سے مرعوب کیا گیا اور دوسری طرف حضرت امام حسن کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط کو کہیں اُن شرائط پر میں صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اُن کا خیال صحیح نکلا۔ امام حسن جو اپنے ساتھیوں کی غداری سے پریشان تھے۔ اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبہ بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی تو ہوس کبھی رہی ہی نہیں انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا رہو۔ اب امیر معاویہ نے جواب منھ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا سوائے شخصی اقتدار کی خواہش کے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ نے اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کرکے امیر معاویہ کے پاس روانہ کیے وہ وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امام حسین اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسن کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ان واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اُس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور صحیح اندازہ رکھتے تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اُنھوں نے دشمن سے مقابلہ کے لیے ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال یک قلم دل سے نکال دیا۔ وہ اپنے والد بزرگوار

کے ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ اُن کے سامنے تلواریں کھینچ کر آ گئے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرزِ عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں کس طرح ان کے بھائی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تھی ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسین اپنے بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اُس سخت اور ناگوار موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر اُنھوں نے یقینی حالات کو دردمندانہ طریقہ پر ضرور سُنا اور اُس زخم کو دیکھا ہوگا جو اُن کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آ گیا تھا اور اس کا اثر اُن کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے۔

آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امنِ عالم کے لیے نقطۂ اوّل صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صُلح کے امکانات پیدا ہونے تک ہی اس پے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خودداری کے خلاف نہ سمجھو۔ چاہے جذباتی لوگ اُس پر معترض بھی ہوں اور چاہے اس کے لیے تمھیں اپنے جاہ و اقتدار، راحت و آرام یا کسی دوسرے ذاتی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہر حال تمھارا مقدس فریضہ ہے۔ یہی سبق حسین کو اپنے نانا سے ملا تھا۔ یہی اُن کو اپنے باپ سے ملا تھا اور یہی اب اُن کو اپنے واجب الاطاعت بھائی امام حسن سے مل رہا تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اور اُن کے سامنے دوبارہ آ گئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستے میں دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسا کرو جب تک کہ اُس کے خلاف نتیجہ سامنے نہ آئے۔

حسین اصول اور مسلک کے لحاظ سے امام حسن کے ساتھ بالکل ایک تھے اس لیے آپ نے بھی اس سے کوئی اختلاف نہیں فرمایا۔

ان واقعات اور ان کے بعد کے بہت سے حالات پر تبصرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں واقعہ کربلا کے اسباب کے تحت میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ وہاں ان کے بہت سے جزئیات پر مزید حاشیہ حاصل بحث کا موقع ہوگا۔ یہاں پر تو صرف ان واقعات کو حضرت امام حسین کی زندگی کے اہم تجربات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس لیے اس سے زیادہ لکھنا سلیقۂ تصنیف کے خلاف ہے۔

بہر حال صلح ہو گئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں۔ امیر معاویہ کی شہنشاہی مملکت اسلامیہ میں عمومی طور پر مُسلّم ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز یمن اور ایران وغیرہ نے بھی اطاعت قبول کر لی حضرت امام حسن کو اس صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے جس طرح کے دلخراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا اُن کا برداشت کرنا اُنہی کا کام تھا وہی لوگ جو کل تک "امیر المومنین" کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے آج "مذل المومنین" یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرنے لگے مگر امام حسن نے صبر اور استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن اُدھر کیا ہوا؟ وہاں یہ ہوا کہ امیر شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مستحکم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے نزول اجلال کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو۔ حج کرو۔ یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مُسلّم ہو جائے۔ وہ حسن کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہو گئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسن کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور اُن کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کشائی کرتا۔

اقتدار شاہی کی جرأت اس نقطہ تک پہنچی کہ کوفہ میں امام حسن اور امام حسین کی موجودگی میں امیر شام نے حضرت امیر اور امام حسن کی شان میں ناسزا کلمات استعمال کیے۔ اس موقع پر سکوت کرنا اعتراف و اقرار کا مرادف سمجھا جا سکتا تھا اس لیے فوراً امام حسین بھائی کی جانب سے جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسن نے آپ کو بٹھلا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا۔ حسین نے یقینی اسی وقت سے سمجھ لیا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ممکن ہے کہ اُسی وقت طے بھی کر لیا ہو کہ اب ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہو گا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے۔ نہ وہ ذمہ داریوں کے محل

سے ناواقف تھے۔ اُنھیں اب صبر آزما انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آگے بڑھانا تھا اور اسکے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ وقت کی موجودہ ساکن مگر پر اضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسن نے اس مصالحت اور امور سلطنت سے کنارہ کشی کے بعد کوفہ کا قیام ترک کیا اور اپنے نانا کے جوار میں مدینہ جا کر بس گئے۔ حسین نے بھی بھائی کا ساتھ دیا اور مدینہ ہی میں جا کر قیام فرمایا جب تک کہ زمانہ کوئی دوسرا گُل کھلائے اور حالات کسی حیثیت سے پلٹا کھائیں آئے گی یہ بحث کہ بنی امیہ نے پروپیگنڈا کر کے اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں بھائیوں کے باہمی اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اُن کا شاید مقصد یہ تھا کہ جس طرح حضرت علی بن ابیطالب کے زمانہ میں شام کی حکومت نے یہ سیاسی فتح حاصل کر لی تھی کہ آپ کے بھائی عقیل کو آپ سے جدا کر کے دمشق میں بلوا لیا، اسی طرح اب وہ امام حسن کے مقابلہ میں یہ سیاسی فتح حاصل کر سکیں گے کہ آپ کے بھائی کو آپ سے جدا کر کے اپنے ساتھ ملا سکیں گے مگر اُنھیں نہیں اندازہ تھا کہ وہ عقیل تھے اور یہ حسین ہیں۔ ان کے نفس کی بلندی اور ضمیر کی پختگی ایسے کمزور طرز عمل سے اُتنی بلند ہے جتنی مرکز زمین سے فلک الافلاک کی رفعت۔ یہ جاہ پسند یا آرام طلب یا جذباتی انسان نہیں ہیں جو اس قسم کے پروپیگنڈے کا شکار ہو جائیں قول، عمل، اصول اور مسلک میں وہ اپنے بھائی امام حسن کے ساتھ بالکل متحد تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اُن کے بھائی امام حسن نے اگرچہ فرض کے شکنجہ میں کس کر خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال اُن کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار ورمیان میں آئے گی اور یہ کہ آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہیں ہو سکتا اور وہ اس کے لیے تیار تھے اگر حالات کی رفتار اُنہی کے دور حیات میں اُس آخری نقطہ تک پہونچ جاتی۔ ع۵ وہ اکثر یہ اشعار بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے:۔

من عاذ بالسیف لاقی فرصۃ عجبا	موتا علی عجل او عاش منتصفا
لا ترکبوا السہل ان السہل مفسدۃ	لن تدرکوا المجد حتی ترکبوا عنفا

ع۵ کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی مطبوعہ لیدن ص ۵۳

(یعنی) "جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون اور اطمینان حاصل کرے گا۔ یاد دنیا سے گزر جانا جلدی سے اور یا زندگی ایسی جو عدل و انصاف کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل نہیں کرسکتے ہو جب تک کہ دشوار گزار منزلوں کو طے نہ کرو۔"

انسان کی زبان پر وہی کہاوتیں آتی ہیں اور وہی اشعار اُس کو پسند آتے ہیں جو اُس کی افتاد طبع اور اصول و مسلک کے مطابق ہوں حسین ان اشعار کے معنی خوب سمجھتے تھے اور اس سے اُن کے دماغ میں احساسات کی ایک برقی رو دوڑ جاتی تھی وہ جانتے تھے کہ ہم کو اپنے نصب العین کی بقا کے لیے ایسی ہی غیر معمولی دشوار گزار راہوں کو طے کرنا پڑیگا اور اسکے لیے ہم کو مستعد رہنا چاہیے۔

بہر حال حضرت امام حسن اور اُن کے ساتھ امام حسین معاہدہ کی خلاف ورزی کی رفتار کا مطالعہ کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ایک ایک کرکے ان شرائط کو کس حد تک پامال کیا جاتا ہے اور وہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی کب لیتا ہے؟

اس دوران میں یہ حضرات بالکل ملکی اور سیاسی امور سے بے تعلق رہے مگر امام حسین نے دیکھا کہ اُن کے بھائی حضرت حسن اسکے بعد بھی بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے اسکی مختلف صورتیں تھیں۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے اُن کی رفعت مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندان پیغمبر کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی پاک ہے کہ ان کے خلاف کوئی ایسا الزام جو کھلا ہوا اصول شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی طرح مفید نہ ہوگا اور وہ ہرگز مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جاسکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لگائے گئے جو شرع کے حدود کے اندر تو ہوں مگر عام نگاہوں میں کچھ اچھی حیثیت سے دیکھے نہ جاتے ہوں مثلاً کثرت ازدواج اور کثرت طلاق۔ یہ چیز بجائے خود شرع اسلامی میں جائز ہے لیکن بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسن کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جس سے لوگ حضرت امام حسن کی نسبت کچھ اچھی رائے قائم نہ کریں اسی طرح دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کا پروپیگنڈا اور ایسی

بہت سی چیزیں جو صرف اموی پروپیگنڈا کی پیداوار تھیں۔

دوسرے عمال بنی امیہ اور ان کے ہواخواہوں کا حضرت امام حسنؑ سے برابرتاؤ، سخت کلامی اور دشنام طرازی جس سے کسی وقت مشتعل ہو کر حضرت امام حسن یا بنی ہاشم میں سے دوسرے لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں اور اس سے ایک طرف ان پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا اخلاقی الزام عاید کیا جا سکے دوسرے ان کی خوں ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے۔ اس کا اندازہ امام حسین کے اُن الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے ہیں امام حسن کی وفات کے بعد جبکہ آپ کے جنازہ میں مروان رو رہا تھا۔ امام حسین نے کہا "آج تم روتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم ہی انھیں غم و غصہ کے گھونٹ پلاتے تھے" مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا" اس سے آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام حسن کی نسبت جو کچھ ایذا رسانی کی جاتی تھی اُس کا حسین کے دل پر ایک نہ مٹنے والا نقش قائم ہوتا تھا مگر اس خاندان کا نظم و ضبط دیکھنے کے قابل ہے کہ جب سردار کی طرف سے یہ اصول قائم کیا گیا کہ ہمیں صبر و سکون کے ساتھ قائم رہنا چاہیے تو ہر ایک شخص اُس کا اس طرح پابند ہو گیا کہ ہزار خون کھولے اور دشمن کی طرف سے اشتعال پیدا کیا جائے مگر کیا ممکن کہ کوئی ایسا فعل کسی ایک سے سرزد ہو جائے جو مقررہ اصول و مسلک کے خلاف اور ضبط و انتظام کے منافی ہو

اس انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد بھی امام حسن کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی سلطنت وقت کو جب کوئی بہانہ اُن کے خلاف کھلے ہوئے جور و ستم کا نہ ملا تو خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جا رہا تھا۔ معاویہ کے بیٹے یزید نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن کی زوجیت میں تھی سازباز کر کے ایک لاکھ درہم انعام کا وعدہ کیا اور اُس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوا دیا۔ امام حسن کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے اور حالت بالکل خراب ہو گئی آپ نے اپنے بھائی امام حسین کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو میرے جد بزرگوار رسولِ خدا کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر لوگ مزاحمت کریں تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خوں بھی گرنے نہ پائے تم مجھکو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنۃ البقیع میں دفن کر دینا۔

۲۸ صفر سنہ ۵۰ ھ کو وہ امن و صلح و سلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امام حسین وصیت کے مطابق اپنے بھائی کو غسل و کفن کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسول کی طرف لے چلے۔ بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ اُن کو وہاں دفن کریں گے۔ یہ سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے اور بیچ میں سدِّ راہ ہوئے۔ قریب تھا کہ جنگ کی نوبت آئے مگر امام حسین اپنے بھائی امام حسن کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے آپ نے بتلایا کہ ہم دفن کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف بطور وداعِ آخری روضۂ رسول کی زیارت کرا کر تابوت کو واپس لے آئیں گے۔ بنی ہاشم اس وقت بیچین تھے اور خود امام حسین کے دل میں تلاطم تھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ خدا کی قسم اگر بھائی کی وصیت اور اُن کے اصُول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسے تم حسن کے دفن کرنے سے روک سکتے ہو۔ بہر حال بات رفت و گزشت ہو گئی۔ حسن کو روضۂ رسول پر دفن نہ ہونے دیا گیا اور انھیں جنتہ البقیع میں دفن کیا گیا مگر یقین سمجھو کہ حسین کے دل پر ایک گہرا ناسور تھا جو بنی امیہ کے ظلم و عناد سے ہمیشہ کے لیے پڑ گیا اور جس کا اندمال غیر ممکن تھا۔

اتنے ہی پر اکتفا نہیں ہوئی بلکہ آپ کو یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسن کی وفات پر اظہار مسرت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے۔ اتفاق سے اس وقت ابن عباس دمشق میں تھے۔ انھوں نے یہ الفاظ سُنے تو کہا کہ خوش نہ ہو۔ تم بھی حسن کے بعد عرصہ تک زندہ نہیں ہو گے آخر کو تمھیں بھی یہی دن نصیب ہوگا (الاخبار الطوال ص ۲۲۴)

حضرت امام حسن کی وفات بنی ہاشم کے لیے ایک سخت حادثہ تھی چنانچہ ع۵ اس سانحۂ عظیم پر بنی ہاشم ایک مہینہ کامل سوگوار رہے (حاکم در مستدرک ج ۳ ص ۱۷۳) مگر اس کے بعد بھی امام حسین اُسی راستے پر قائم رہے جو امام حسن نے قائم کر دیا تھا اور اس طرح یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ آپ کو اپنے بھائی سے اصُولی اختلاف تھا اور صرف اُن کے دباؤ کی وجہ سے آپ اُس پر قائم تھے ایسا نہیں بلکہ آپ اُسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحب اختیار ہونے کے بعد بھی اُسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ امام حسن کے بعد اموی اقتدار کی جرأت اور چیرہ دستی اور بڑھ گئی دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۵۱ھ میں حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کا قتل اور عمرو بن الحمق

ع۵ مولانا حسنی شاہ نظامی

کا حکم گرفتاری اور پھر اُن کے سر کا جسم سے جدا کر کے نیزہ پر بلند کیا جانا واقع ہوا۔ کس لیے؟ صرف حکومت وقت کی من مانی کارروائیوں پر اظہار اختلاف اور خاندان رسول کے ساتھ دوستی کے جرم میں۔ اس واقعہ کا امام حسین کے دل پر بڑا اثر ہوا اور آپ نے امیر شام کو اس بارے میں احتجاجی مکتوب روانہ کیا لیکن اُس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔

مجاہدۂ کربلا کے اسباب کے تذکرہ میں ان واقعات پر بسیط تبصرہ کیا جائیگا مگر یہاں تو ان واقعات کو سرسری طور پر صرف اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ تم ان سے حسین کی زندگی کے اس پہلو پر غور کرو کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں ایسے تلخ تجربات کو کس پُرسکون انداز کے ساتھ گزارا اور اس سے اُن کے نفس کی کس پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

وہ اموی سیاست کی رفتار کو برابر ناقدانہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور بالکل خاموش تھے مگر اُس طرح کی خاموشی جس کے سناٹے میں طوفان کی آمد ہوتی ہے۔ وہ ایک جلد باز شخص کی طرح نہیں بلکہ عاقبت اندیش انسان کی طرح صبر و سکون کے لمحات میں اپنے آخری اقدام کی اسکیم مرتب کر رہے تھے اور منتظر تھے کہ وہ وقت کب آتا ہے جب اس اسکیم کے نفاذ کا موقع آئے۔

دس برس کی طولانی مدت اس صبر و سکون اور انتظار میں گزری اور آخر رجب ۶۰ھ میں وہ وقت آیا جب امیر معاویہ کی وفات ہوئی اور معاہدہ کی آخری شرط دم توڑ کر ختم ہوئی شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا مگر اُنھوں نے اپنے بعد اپنے فاسق و فاجر بیٹے یزید کو خلیفہ بنا کر مُسلمانوں کے سر پر مُسلط کر دیا۔ یزید تخت خلافت پر بیٹھا اور وہ حسین سے بیعت کا طلبگار ہوا۔ بس یہ ہے ابتداء واقعہ کربلا کا آغاز جس کے اسباب، تفصیلات اور نتائج آپ کو کتاب کے دوسرے حصہ میں معلوم ہونگے۔

پانچواں باب

امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور مختلف اوصاف

عرب کے فلسفی شاعر نے کہا ہے:۔ ان العظائم کفوٴھا العظماء "بڑے کارناموں کے لیے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں"۔ ایک دوسرے موقع پر وہی شاعر کہتا ہے:۔

علی قدر اھل العزم تأتی العزائم ۔۔۔ وتأتی علی قدر الکرام المکارم
ویکبر فی عین الصغیر صغارھا ۔۔۔ وتصغر فی عین العظیم العظائم

(یعنی) صاحبان ارادہ کی مقدار کے مطابق ہی ہوتے ہیں اُن کے ارادے اور بزرگ مرتبہ اشخاص کے درجہ ہی کے لحاظ سے ہوتی ہیں اُن کی بزرگیاں۔ چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس کی ہمت نہیں کرتا یا کر لیتا ہے تو اُس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھکر اُس پر نازاں ہو جاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اُسے کر گزرتا ہے اور اس پر بھی اُس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اُس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو کربلا کے ایسے عظیم الشان واقعہ کا ہیرو ہونا ہی حسینؑ کے نفس کی بزرگی اور اُن کے کیرکٹر کی بلندی کے متعلق وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے جسے شاید تاریخ کے قلم نے محفوظ نہ کیا ہو یا تاریخ کے صفحات کو اُلٹ کر ہم نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نادر خصوصیات عالم وقوع میں آ نہ سکتے تھے اگر اسکے انجام دینے کے لیے حسینؑ کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعۂ کربلا اس عظمت اور اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی تھی اگر اُس کا تعلق حسین ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

ایک ہی کام نوعیت، اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے مختلف ہو جاتا ہے اپنے کرنے والے کی شخصیت کے

اختلاف سے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے دور میں ایسی صورتیں کئی
دفعہ آئیں کہ ملک کے سب سے بڑے سیاسی قائد نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور موت کے آنے تک کے روزہ
کی نیت کرلی اگر وہ بات حاصل نہ ہو جس کی خاطر ہرتال کی گئی ہی۔ دنیا نے دیکھا کہ اس برت نے
بالا و پائین کے تمام حلقوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور آخر ایک محدود دائرہ میں سہی لیکن
وہ مقصد حاصل ہوتا گیا جس کے لیے یہ برت رکھے گئے تھے مگر کیا یہی نتیجہ حاصل ہو سکتا تھا اگر
یہ کھانا پینا چھوڑ دینے والا کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے ملک میں کوئی عظمت و اہمیت حاصل نہیں
ہے۔ ہرگز نہیں۔ کوئی دوسرا غیر معلوم و غیر مشہور آدمی اگر ایسا کرتا تو فاقوں مر کر جان دیدیتا اور
خودکشی کا مجرم بن جاتا مگر نہ ملک میں کوئی انقلاب برپا ہوتا۔ نہ اقتدار اعلیٰ پر کوئی اثر پڑتا۔ اس مثال
سے آپ نے خوب سمجھ لیا ہوگا کہ محل کے اختلاف اور شخصیت کے تفرقہ سے عمل کی نوعیت اور اسکے
نتیجہ میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہی۔ مذہبی دنیا میں اسکی مثال حضرت عیسیٰؑ کا صلیب پر چڑھنا ہی
کون نہیں جانتا کہ مسیحی مشن نے اپنی تبلیغ میں کتنی اہم کامیابی حاصل کی اس دردناک واقعہ
کی تصویر دکھا کر کہ حضرت یسوع مسیح خدا کے بندوں کو نجات دلانے کے لیے سولی پر چڑھا دئے
گئے۔ جانے دیجیے اس بات کو کہ مسلمان مذہبی طور پر اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے کہ حقیقتہً حضرت
مسیح کی صلیب پر وفات ہوئی ہے مگر جہاں تک عیسائیت کی تاریخ کا تعلق ہے اور ان کی مقدس
مذہبی کتابوں کا انھوں نے اس واقعہ کو بڑی پرتاثیر صورت سے دکھایا ہے اور اسکے ذریعہ سے دنیا
میں اپنے مشن کی اشاعت کی ہی مگر کیا اس صلیب پر چڑھنے کے واقعہ میں کوئی جان رہ جاتی ہی
اگر اس کا تعلق عیسیٰؑ ایسے مقدس اور برگزیدہ انسان کے ساتھ نہ ہو جسے وہ خدا کا اکلوتا
بیٹا کہتے ہیں۔ روزمرہ ہزاروں ڈاکوؤں کو سولی دی جاتی ہی لیکن اُن کے سولی دیے
جانے پر نہ کسی کے منھ سے آہ نکلتی ہے۔ نہ واہ مگر حضرت عیسیٰؑ کی صلیب وہ تھی جس نے ایک قوم
کو زندہ کیا اور آج تک زندہ بنائے ہوئے ہی۔ یونہی سقراط کا جام زہر پی لینا بلکہ خود
ہمارے اسلام کے مقدس رسول کا گھر سے بے گھر ہو جانا یعنی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کرنا
ان تمام واقعات میں تاثیر پیدا ہوئی صرف اُن شخصیتوں کے لحاظ سے جن کے ساتھ اُن واقعات
کا تعلق ہے۔

بے شک ان تمام واقعات میں اور واقعہ کربلا میں ایک بنیادی فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ ان واقعات کی اہمیت اور تاثیر کا راز صرف شخصیتوں میں مضمر ہے لیکن واقعہ کربلا جیسا کہ بعد میں آپ کو معلوم ہوگا خود ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اس کی مثال کوئی مل نہیں سکتی لیکن ان خصوصیات سمیت بھی اس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ حسین ایسے بلند انسان کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بفرض محال کرتا بھی تو اس کی یہ تاثیر نہیں ہوسکتی تھی اس لیے واقعہ کربلا کا وقوع بھی حسین کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اس کی وہ تاثیر بھی جو عالم اسلام میں پیدا ہوئی حسین کے نفس کی رفعت و بلندی اور ان کی شخصیت کی برتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعاکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص عملی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے شخصیت کی رفعت و شہرت اور سربلندی سے اور پھر اس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعہ کربلا نہیں سکتا تھا اور اس میں یہ تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی تھی بغیر امام حسین کی شخصیت کے مگر حسین کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمایان عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کا آفتاب خط نصف النہار پر پہنچ گیا واقعہ کربلا کے سبب سے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اتنی محفوظ نہیں ہے جتنی کہ واقعہ کربلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط و خال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ بھی محفوظ ہیں۔ سبب اس کا صاف ظاہر ہے۔ واقعہ کربلا کے پہلے امام حسینؑ کو مؤرخین کی نگاہ بس اس حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی اولاد میں ان اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ، عصمت اور پاکیزگی کا مجسمہ تھا۔ جیسے ان کے اوصاف و کردار کے متعلق کبھی اجمال اور کبھی کچھ تفصیل کے ساتھ بعض واقعات سخاوت، عبادت، ریاضت و حلم وغیرہ کا تذکرہ کر دیا ہے ویسے ہی امام حسین کے متعلق بھی جستہ جستہ اس قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو سنہ ۶۰ھ کے پہلے تک کیا معلوم تھا کہ یہ انسان ایک ایسے عظیم انقلاب کا بانی ہونے والا ہے جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر ناپید ہوگی

تاکہ وہ ابتدائے عمر سے اُن کی زندگی کے ہر جزئیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور اُنھیں سینہ بسینہ محفوظ کر کے لب بہ لب منتقل کرتے ہوئے کتابوں کے دامن تک پہونچاتے۔

لیکن ایک طرف تو واقعۂ کربلا کے دوران میں تمہیدی یا ضمنی طور پر تاریخ نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر دیے ہیں وہ آپ کے اوصاف و عادات کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہونچایا ہے اُن سے بھی حسینؑ کی عظمت اور اوصاف و کمالات کے متعلق ایک روشن مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ یا شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف و کمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ گاہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراج بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسباب جو کسی شخص کی انسانی عظمت کی تشکیل اور انسانیت کے قصر کی تعمیر کرتے ہیں حسب ذیل تین امور ہیں۔ پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت۔ تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اس کی صلاحیت و استعداد اور فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز اُن صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر پہونچانے کا کام انجام دیتی ہے یا بسا اوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز اُن فعلی کمالات میں پختگی پیدا کر کے ملکۂ ذاتی بناتی اور اُن میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ میں یہ تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ آپ کے خاندانی خصوصیات وہ تھے جن کی نظیر ملک عرب میں پائی نہ جاتی تھی۔ اس کو پہلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ملتی نہ تھی سوائے ظلم و جبر اور قہر و استبداد کے۔ انھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپ کے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے اُن کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ ملاحظہ کیجیے تاریخ میں یہ موقع کہ بنی امیہ کا ظالم تاجدار یزید جس کے حکم سے حسینؑ قتل کیے گئے تھے۔ آپ کے قتل کے بعد جب آپ کے اہل حرم کو مقید کر کے اپنے دربار

میں بلواتا ہے اور گویا اپنی فتحمندی کا مکمل اعلان کرتا ہے تو اُسی وقت اُس کے دماغ کی تاریک فضا میں حسین کے روشن اوصاف کی بجلی تڑپنے لگتی ہے۔ وہ فتح کی ترنگ کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے اہل دربار کی طرف اور کہتا ہے "جانتے ہو یہ مصیبت ان پر کیوں آئی؟ صرف اس لیے کہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے باپ میرے باپ سے بہتر اور ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور ان کے نانا میرے نانا سے بہتر اور یہ خود مجھ سے بہتر ہیں اور خلافت کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں" اب جواب سنیے اور اُن کا یہ کہنا کہ اُن کے باپ میرے باپ سے بہتر تھے تو یہ تو اس سے ظاہر ہے کہ میرے باپ اور ان کے باپ کے درمیان جھگڑا ہوا اور دنیا کو معلوم ہے کہ کس کے موافق فیصلہ ہوا۔" یہ اُس فریب کارانہ سازشی تحکیم کی طرف اشارہ ہے۔ جو جنگ صفین کے بعد ہوئی تھی لیکن دنیا کو معلوم ہے کہ اس کے نتیجہ کو کسی فریق نے بھی تسلیم نہیں کیا اور وہ ایک بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوئی) "بیشک اُن کا یہ کہنا کہ اُن کی ماں میری ماں سے بہتر تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کی بیٹی فاطمہ میری ماں سے بہتر تھیں اور یہ کہنا بھی کہ اُن کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے۔ یہ بھی یقینی ہے اس لیے کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہو وہ ہرگز رسول کا مدمقابل کسی دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا مگر ان کی سمجھ کا پھیر تھا اتنا کہ انھوں نے قرآن کی اس آیت کا خیال نہیں کیا کہ سلطنت کا مالک خدا ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔"

آخر یزید کو کیا ضرورت تھی کہ اپنی فتحمندی کے اس جشن طرب میں حسین کے خاندانی خصوصیات اور اُن کے دعاوی کا تذکرہ کرے جنھیں بہرحال اُسے باوجود دھاندھلی کے فی صدی پچھتر تسلیم کرنا ہے مگر نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں آدمی ایک دماغی کشمکش اور ضمیر کی نیش زنی کے موقعوں پر کیا کرتا ہے۔ یزید کے سامنے حسین کی فضیلت خود اُسکے نفس کو حقیر دکھلا رہی تھی اور جب وہ خود اپنے کو حقیر دیکھ رہا تھا تو اُسے نظر آ رہا تھا کہ میرے دربار کا ہر فرد مجھے یونہی حقارت سے دیکھ رہا ہوگا۔ پھر یہ جاہل اور مغرور آدمی کے کردار کی ایک بوالعجبی ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے نفس کو کسی طرح دھوکا دیتا ہے اور پھر اُسی دھوکے میں دوسروں کو مبتلا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے مدمقابل کی فوقیت کے

خیال کو کسی طرح دماغوں سے نکال دے۔ یہی ایک مضطربانہ کیفیت یزید کی اس گفتار میں مضمر ہے مگر آخر میں ہوا کیا؟ صفات کی جنگ میں یزید کی شکست اور کھلی ہوئی شکست، وہ حسین کے حسب نسب کے مقابلہ میں کوئی بات ایسی نہ پیش کر سکا جو اسے متعلقہ منصب کا اہل ثابت کر سکے۔ اس تمام صدائے بے ہنگام کی آخری تان ٹوٹی صرف اسپر کہ یہ تو سلطنت ہے جس کے پاس پہونچے بس اُسی کا حق۔ اس دلیل کی بنا پر دنیا کے کسی بادشاہ کو ظالم، ناانصاف اور قابل نفرین و ملامت سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ چنگیز ہو چاہے ہلاکو اور چاہے دنیا کا کوئی اور انتہائی ظالم بادشاہ۔

ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو انسان کے حسن فطرت کے ضامن ہیں حسین نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے اُن کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی تھی۔ یہ تفصیل سے آپ کے سامنے دوسرے باب میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دورے گزرنا پڑا تھا جن میں آپ کو جذبات نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑا تھا اس لیے آپ کے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کا اندازہ آپ کو تیسرے اور چوتھے باب سے ہو سکتا ہے مگر اُن کے نتیجہ کو ذرا ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ حسین کو سات ہی برس کی عمر میں اپنے نانا کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور اُس انقلاب کو دیکھا جو رسول کی وفات کے بعد سیاسی مرکزیت کے اس بارگاہ سے ہٹ جانے سے ظاہر ہونا چاہیے تھا۔ یہ وہ موقع تھا کہ بنی ہاشم کے لوگ یا بعض دوسرے افراد اگر حضرت علی بن ابیطالب کو ان کے حقوق یاد دلاتے تھے اور ترغیب دیتے تھے کہ آپ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیے مگر حضرت علی ایسے شجاع اور طاقتور انسان نے مفاد اسلامی کی خاطر صبر و ضبط سے کام لیا تھا۔ یہ زمانہ پچیس برس تک رہا۔ ظرف زماں کا یہ حصہ وہ ہے جس میں حسین نے کمسنی کے حدود کو ختم کر کے نوجوانی کی منزل کو طے کیا اور پورے شباب کے درجہ تک پہونچے۔ عمر کا یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں ولولہ، امنگ اور حوصلہ انسان سے خلاف تدبر اقدامات کرا دیا کرتا ہے مگر تمام ناگوار حالات کے باوجود حسین نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو نظم، اصول اور اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہو بلکہ آپ نے تیسرے باب میں دیکھا ہو

کہ جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ جناب عثمان محصور تھے اور ان پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو حضرت علی نے حسن اور حسین اپنے دونوں فرزندوں کو پانی پہونچانے کے لیے بھیجا تھا وہ باغیوں کی شورش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گئے اور اپنے فرض کو انجام دیا۔ حضرت علیؑ کے دور حکومت میں مخالفوں کی جارحانہ کارروائیوں کے مقابلہ میں حسین شریک رہے اور آپ سُن چکے ہیں کہ حسین نے بعض سخت موقعوں پر جان کو انتہائی خطرہ میں ڈال کر باپ کا ساتھ دیا ہے مگر جب صفین میں قرآن نیزوں پر بلند کئے گئے اور اپنے گرد وپیش کے لوگوں کے اختلاف سے مجبور ہو کر حضرت علی کو جنگ ملتوی کرنا پڑی تو جواں سال حسین نے بلا توقف سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اپنے بھائی حسن کے ساتھ اس معاہدہ پر دستخط کیے جو التوائے جنگ کے لیے تحریر کیا گیا تھا حضرت علی شہید ہو گئے اور ان کی جگہ پر حضرت امام حسن پیشوا تسلیم کئے گئے اور آپ کو اپنے حریف سے صلح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حسین نے بھی اس مصالحت کے شرائط کی پابندی کی۔ دس برس کا زمانہ یوں ہی گزرا اور اس زمانہ میں ایسے واقعات پیش آتے رہے جو پیمانۂ صبر و ضبط کو چھلکا دیں مگر امام حسین نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے معاملات سے کنارہ کش، گوشہ نشین اور خاموش رہتے ہوئے بھی امام حسن زہر سے شہید کئے گئے اور تاریخ کا یہ عبرتناک واقعہ بھی سامنے آیا کہ حضرت امام حسن کو ان کے نانا رسول اللہ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت نہ دی گئی اور مزاحمت کی گئی یہاں تک کہ کہا جاتا ہے جنازہ پر تیر چلائے گئے جن میں سے چند تیر تابوت کو توڑ کر امام حسن کے جسم تک پہونچے مگر بھائی کی وصیت اور حالات کے تقاضے کی بنا پر امام حسین خاموش رہے اور اپنے بھائی کو روضہ رسول سے الگ دوسرے مقام پر دفن کر دیا۔ ان واقعات سے ثابت ہوا کہ حسین کوئی جذباتی انسان نہ تھے وہ متحمل اور صابر تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آ کر کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہونچے جن کے وہ خود اور اُن کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ایسا صلح کل، متحمل، امن پسند انسان کیسے ایک ایسے اقدام کے لیے تیار ہو سکتا ہے جس میں وہ اور اس کے تمام ساتھی ایکدم تہ تیغ ہو جائیں لیکن جب ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسا بھی کر گزرتا ہے۔ اس سے

اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرائض کے مقابلہ میں فنا کر دینے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہونچ سکتا۔

نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا ملکہ یہی وہ ایک جامع اور وسیع مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہو جاتے ہیں مگر حضرت امام حسین کے کمالات و اوصاف کی تشریح کے لیے جب اہل معرفت نے قلم اٹھایا تو اُس پر اجمالی تبصرہ کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زریں روایا سامنے آئے ؎ "ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسین کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے کان عالما بالقرآن عاملا علیہ زاھد اتقیا نقیا ورعا جوادا فصیحا بلیغا عارفا باللہ ودلیلا علیٰ ذاتہ تعالیٰ۔ "وہ قرآن کے عالم اور اس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیزگار، سخی، شیریں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذات الٰہی کا ایک ثبوت تھے"

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں بہ مجبوری اُن الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علماء اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں پھر اُس کا حوصلۂ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اُس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربی نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہہ دیا کان الحسین السبط ایۃ من ایات اللہ "سبط رسول امام حسین خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے" یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلوں سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔

حسین بے شک ذات الٰہی کا ثبوت اور اُس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی حسین کو دیکھ کر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا کلام:۔

؎ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات — کہتا ہو گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات — اک کارساز ذہن ہی اک ذی شعور ذات

سجدوں سے کھینچتا ہی جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہی معبود کی طرف

عبادت آپ کی، وہ جسے عام زبانوں میں عبادت کہا جاتا ہی ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ تھا اس لیے کوئی حرکت وسکون بھی آپ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اُس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ شب وروز میں ایک ہزار رکعت پڑھتے تھے اور اکثر روزے رکھتے تھے۔ ۲۵ حج آپ نے پاپیادہ کیے (تہذیب الاسمار نودی ج ۲)

ایک مرتبہ کا تذکرہ ہی کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں حاجیوں کا قافلہ بھی ان تک پہونچ گیا۔ اب جو ان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً اُن کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اُتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر کچھ لوگوں کی طاقت رفتار نے جواب دیا سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ بزرگ صحابی تھے اُن سے آکر کہا کہ اب تو راستہ چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہی مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں سردار پاپیادہ راستہ طے کریں۔ سعد امام حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگواروں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو اُن کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستہ چلیں اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں بزرگوار سوار ہو جائیں امام حسن نے فرمایا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض ہی قرار دیا ہی کہ ہم خانۂ کعبہ کی طرف اپنے پیروں پر جائیں مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوار شاہزادے ہٹ کر

دوسرے راستے سے روانہ ہو گئے۔

عبادت الٰہی کے ساتھ آپ کو جو دلی وابستگی تھی اُس کا اندازہ آپ کو امام کے اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ۹ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی مہلت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ اس ایک شب کی مہلت لے لو کہ ہم اس کو عبادت و ذکر الٰہی میں گزار دیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اُس کی عبادت و ذکر سے کتنی محبت ہے چنانچہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شب اُنھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کس طرح گزاری تھی۔ تاریخ میں یہی فقرہ ہے کہ لھم دوی کدوی النحل یعنی اُن کے تسبیح و تہلیل اور ذکر و مناجات کی آوازوں سے تاریک سناٹے میں گونج رہی تھی۔ ایسی جیسی شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز سنائی دیتی ہے" اور نماز آپ نے روز عاشورا ایسے سخت وقت میں ادا کی جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر جب نماز ظہر کا وقت آیا تو آپ نے نماز ظہر ادا کی۔ جماعت کے ساتھ اس طرح کہ دو جاں نثاروں کو محافظت کے لیے سامنے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اُسے اپنے سینہ پر روکیں۔ ادھر نماز تمام ہوئی اور اُدھر اُن میں سے ایک صحابی سعید بن عبد اللہ حنفی زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسین نے خالق کی عبادت اور فریضۂ نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔ بے شک یہی وہ بندہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں کہا جائے ؎

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

اسی کے ساتھ وہ فیاض تھے اور خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات بکثرت ہیں۔

خود رسول اللہ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپنے ہی سے اس صفت کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ طبرانی کی روایت کے مطابق آنحضرت نے ارشاد فرمایا:- امّا حسن فلہ ہیبتی وسوددی و امّا حسین فلہ جرأتی و جودی (یعنی) "حسن کے لیے میرا رعب داب اور شان سرداری ہے اور حسین میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے" (صواعق محرقہ ۱۱۴)

ع۵ "حسین فرزند نبی اوصاف نبی کا مالک تھا لیکن خصوصیت سے نبی کے حسین کو اپنی سخاوت وشجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضور کے اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں" ع۶ "آنحضرت کا ارشاد اقدس اما الحسین فلہ جودی لفظ بہ لفظ درست نکلا۔ کاشانۂ امامت پر مسافروں کا اور درویشوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دوران نماز میں ایک دن صدائے فقیر سُنی دو رکعت پر نماز ختم کی اور قنبر سے دریافت فرمایا بیت المال میں کتنی رقم ہے؟ قنبر نے عرض کیا دو سَو درہم اہلبیت کے صرف کے رہ گئے ہیں۔ فرمایا اس صدا دینے والے کی نذر کر دے۔ ہمارا خدا مالک ہے (ابن عساکر)

ایک دن مسجد نبوی میں سُنا کوئی خدا سے دس ہزار دینار مانگ رہا ہے۔ آپ مکان واپس ہوئے اور غلام کے ہاتھ دس ہزار دینار اُس مانگنے والے کے پاس بھجوا دیے (ابن ابی شیبہ)

ایک دن آپنے ایک سائل کو پچاس ہزار درہم دیے اور اُس رقم کے باندھنے کے لیے دوش اقدس سے چادر بھی اُتار کر دی اور اپنے ہاتھوں سے اُس رقم کو اس میں باندھا اور سائل کے دوش پر رکھا۔ قنبر نے عرض کیا شب کے خرچ کے لیے کچھ نہ رہا۔ فرمایا عشاؤنا من اللہ۔ ہمارا شب کا انتظام خدا کے پاس سے ہو کر رہے گا (احیار العلوم)

نجد سے کسی نے خط لکھا "یا ابن رسول اللہ ادرکنی" جواباً آپ نے اس کے پاس دس ہزار درہم بھیجدیے (احیار العلوم)

ایک دن سائل نے صدا دی "حسبتہ للہ یا ابن رسول اللہ" غلام سے دریافت فرمایا کچھ ہے؟ عرض کیا صرف تین سَو دینار ہیں۔ آپنے اُن دیناروں کو کپڑے میں باندھا اور پٹ کی آڑ سے سائل کے حوالے فرماتے ہوئے کہا انی استحیی منک یا عبد اللہ (اے بندۂ خدا میں تجھ سے شرمندہ ہوں (سفینۃ النجاۃ)

مضافات مدینہ میں چار سَو صحابیوں کے ہمراہ کسی دن تفریح فرما رہے تھے۔ ایک راہرو ایک نفیس گھوڑے پر سوار اچھے لباس سے ملبوس سامنے سے گزرا اور آپ کے احباب سے پوچھا یہ جوان کون ہیں جو آنحضرت کا عمامہ بہ سر اور آنحضرت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں

ع۵ مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی لدھیانہ ع۶ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

آپ کے گھوڑے پر سوار اور آنحضرت کی شمشیر لگائے ہیں؟ اصحاب نے کہا تجھے نہیں معلوم یہ حسین فرزند رسولخدا ہیں۔ یہ سوار معاندین جناب امیرؑ سے تھا۔ اُس نے جناب امیر کی بارگاہ میں بیحد گستاخیاں کیں اسپر آپ مسکرانے لگے اور فرمایا اگر دھوپ لگ گئی ہو تو چلا آ اور ہمارے کھانے پینے اور سامان تفریح میں شریک ہو جا اور اگر تو تنگ دست ہے تو یہ دس ہزار دینار لے اور چلا جا۔ اس نوواردنے اشرفیاں سنبھالیں اور کہا قسم بخدا اے حسین میں نے آپ سے بڑھکر کوہ وقار اور جبل حلم کسی کو نہ دیکھا۔ دوستوں نے عرض کیا حکم ہو تو اس کی گردن ناپیں۔ فرمایا نحن الجبال القواصف لا یزعزعنا العواصف "ہم وہ مستحکم کوہ ہیں جن کو ہوائیں ہلا نہیں سکتیں (وسیلۃ النجاۃ ص ۲۷۱)"

عــہ "ایک اعرابی مدینہ میں آیا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ سخی یہاں کون ہے؟ لوگوں نے کہا حسین بن علی۔ سائل حاضر ہوا تو حسین نماز میں مشغول تھے۔ وہ دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور آپ کی مدح میں یہ اشعار پڑھے۔

لم یخب الآن من رجاک ومن ۔۔۔ حرک من دون بابک الحلقۃ

"جس نے آپ کے دروازے کی زنجیر ہلائی اور آپ سے امید لگائی وہ کبھی محروم نہیں رہا"

انت جوادی وانت معتمدی ۔۔۔ ابوک قد کان قاتل الفسقۃ

"آپ ہی ہیں میرے سخی داتا اور میرا آسرا اور آپ کے باپ وہ تھے جو فاسقوں کو قتل کرنیوالے تھے"

لولا الذی کان من اوائلکم ۔۔۔ کانت علینا الجحیم منطبقۃ

"اگر آپ کے بزرگوں کے کارنامے جو ہوے ہیں نہ ہوتے تو ہم سب جہنم میں جاتے"

حضرت نماز سے فارغ ہوے تو غلام سے دریافت فرمایا کہ مال حجاز میں سے کیا باقی ہے؟ عرض کیا کہ چار ہزار دینار۔ آپنے فرمایا ہم سے زیادہ مستحق اس مال کا آگیا ہے۔ پس اپنی عبائے مبارک اتاری اور ان دیناروں کو اُس میں لپیٹ کر دروازہ کے پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور وہ تمام دینار سائل کو عطا فرمائے اور پھر قلت مال کی معذرت ان الفاظ میں فرمائی

عــہ مولانا سید مبارک علی صاحب عالم آگرہ

خذھا وانّی الیک معتذر واعلم بانّی علیک ذو شفقۃ

"لے لو اس کو اور میں تم سے عذر خواہ ہوں اور یقین جانو کہ مجھے تمہارے ساتھ نہایت ہمدردی ہے"

لوکان فی سیرنا الغداۃ عصا امست سمانا علیک مندفقۃ

لکن ریب الزمان ذو غیر والکف منی قلیلۃ النفقۃ

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ زمانہ نے ہم کو تنگدست کر دیا ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو میں باقی نہ رکھتا دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اُس اعرابی نے وہ مال تو لے لیا مگر رونے لگا اس پر حضرت نے کہا کہ شاید یہ مال تمہاری ضرورت سے کم ہے۔ اُس نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ مجکو یوں رونا آیا کہ افسوس ایک روز ان سخی ہاتھوں کو زمین کھائے گی۔"

آپ کا لقب "ابو المساکین" تھا۔ [1] "فی الحقیقت حسین کا لقب "ابو المساکین" صحیح ہے راتوں کو کھانے، روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتے تھے اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہونچاتے تھے جس کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے۔ (شہید اعظم ص ۷۸)

ایک روز دیکھا کہ ایک غلام سر راہ بیٹھا ایک کُتے کو کھانا کھلا رہا ہے۔ اُس سے حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں ایک غمزدہ انسان ہوں۔ میں نے چاہا کہ اس حیوان مخلوق الٰہی کو خوش کروں۔ شاید اس کے بدلے میں خدا میرے غم کو دور فرمائے۔ میں ایک یہودی کا غلام ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اُس سے علیٰحدہ ہو جاؤں۔ اس بیان سے حسینؑ رحم مجسم متاثر ہوے۔ فوراً اُس یہودی کے گھر تشریف لے گئے۔ دو سَو دینار (اشرفی) اس غلام کی قیمت دی اور غلام کو آزاد کر دیا یہودی اس خلق و رحم و بخشش کو دیکھکر حیران ہو گیا اور عرض کی اے فرزند رسول آپکے اس عطیہ و رحم اور عزت افزائی کے سبب میں یہ غلام بھی حضور کی نذر کرتا ہوں اپنا باغ بھی اس غلام کو دیتا ہوں اور آپ کا یہ زر قیمت بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں آپ نے فرمایا کہ یہ روپیہ میں نے تجھکو ہبہ کر دیا ہے۔ یہودی نے عرض کی مولا میں نے یہ رقم بھی اس غلام کو بخشدی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے یہ غلام مع اس مال و باغ

---

[1] ناموس اسلام۔ خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب پٹیالہ

کے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ سبحان اللہ یہ ہے حسین کا رحم و اخلاق۔ یہ ہے حسین کا جود وسخاؔ

عہ۵ عمرو بن دینار کی روایت ہے کہ اسامہ بن زید ایک مرتبہ بیمار ہوئے اور امام حسین عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ اسامہ کہہ رہے ہیں واغماہ (اف کس قدر رنج وغم ہے) حضرت نے فرمایا اے بھائی کیا غم ہے؟ اسامہ نے کہا کہ مجھے اپنے قرضہ کی فکر ہے کہ میں ساٹھ ہزار درہم کا قرضدار ہوں۔ حضرت نے فرمایا وہ قرضہ مجھ پر ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں ادا کر دوں گا اسامہ نے کہا کہ مجھکو ڈر ہے کہ قبل ادا ہونے کے شاید میں مرجاؤں اسپر حضرت نے فرمایا کہ تم ہرگز اُس وقت تک نہ مروگے جب تک میں تمھارا قرضہ ادا نہ کر دوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت نے اُن کی زندگی میں اُن کا قرضہ کل ادا کر دیا۔"

ممکن ہے کہ ان روایات میں سے بعض میں کوئی نقاد روایت و درایت کے لحاظ سے کچھ موشگافی سے کام لے یا کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کوئی ہیرو جب دینی یا دنیاوی اعتبار سے ایک بڑے درجہ پر مان لیا جاتا ہے تو اُس کی نسبت خوش عقیدہ حلقوں میں اسی قسم کے حکایات اکثر مشہور ہو جاتے ہیں مگر اس خیال کے ظاہر کرتے وقت یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کے حکایات غلط طور پر بھی اُسی کی نسبت مشہور ہوا کرتے ہیں جس کے طرز زندگی کی ساخت اُن حکایات کے لیے موزوں ہو۔ یعنی جب تک کسی کے سچے حالات کچھ نہ کچھ اُسی نوعیت کے نہوں اُس وقت تک اُس کے لیے رومانوی واقعات کی پیداوار نہیں ہوتی۔ آخر بڑے آدمیوں میں عبداللہ بن زبیر بھی تو ہیں مگر اُن کی نسبت تاریخ "بخیل" کی لفظ استعمال کرنے میں نہیں جھجکی۔ بڑے آدمیوں میں عباسی خلیفہ منصور دوانقی کی بھی تو شخصیت ہے مگر اس کے لیے بخل کے حکایات رومانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں پھر اگر دینی و دنیوی عظمت کا لازمی نتیجہ ہی یہ ہوتا کہ اُس کے جود وسخا کے حکایات زیادہ مشہور رہیں تو ہر بڑے آدمی کے لیے یہ بات حاصل ہونا چاہیے تھی۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ شخصیت جس کے لیے تاریخ یا سیر کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات درج ملتے ہیں بجائے خود اس صفت میں ایک اعلیٰ درجہ پر فائز تھی جب ہی تو اُسکی نسبت راویوں کو اس قسم کے حکایات بیان کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

عہ۵ مولانا سید مبارک علی صاحب عالم۔ آگرہ۔

عٰ۵ "حسین ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب کسی صاحب ضرورت نے تمھارے آگے دست سوال دراز کیا تو گویا اُس نے اپنی عزت تمھارے ہاتھ بیچ ڈالی اور اس کی قدر نہ کی۔ تمھارا یہ فرض ہے کہ تم اُسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو"!

خلق خدا کی خدمت اور انسانی برادری کے ساتھ ہمدردی ہی کے تحت میں داخل ہے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور ان کی آزادی کی کوشش کرنا۔ یہ وہ چیز ہے جسے اسلام نے خاص اہمیت دی ہے، اُس نے اگرچہ غلامی کو یک قلم ختم نہیں کیا تھا لیکن ایسے اسباب ضرور فراہم کئے تھے کہ اگر اُس کے قانون پر عمل ہو تو ایک وقت میں دنیا کی ہر فرد آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہو سکتی ہے۔ نیز غلامی کی حالت میں اُن کے معاشرتی معیار کو بلند کر کے انسانی شرافت کا احساس پیدا کرایا۔ اسی پر حضرت پیغمبرؐ اور اُن کے خاندان کا عمل بھی قائم رہا۔ وہ غلام اور کنیز سے مثل عزیزوں کے برتاؤ کرتے تھے اور ادنیٰ ذرا سی بات کے بہانہ پر اُسے آزادی کی دولت سے مالا مال کر دیتے تھے۔ حضرت امام حسین کے طرز زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ہیں۔

عٰ۵ "آپ دسترخوان پر بیٹھے کھانا نوش فرما رہے ہیں۔ ایک کنیز کے ہاتھ سے کھانے کا گرم گرم پیالہ آپ کے چہرۂ انور پر گر پڑتا ہے۔ آپ کنیز کی طرف نگاہ گرم سے دیکھتے ہیں۔ وہ فوراً قرآن کی آیت کا یہ ٹکڑا پڑھ دیتی ہے کہ (الکاظمین الغیظ) یعنی "غصہ کو پی جانے والے" حسین فرماتے ہیں "کظمت غیظی" "اچھا میں نے اپنے غصہ کو پی لیا" کنیز دوسرا ٹکڑا آیت کا پڑھتی ہے والعافین عن الناس "لوگوں کو معاف کرنے والے" حسین فرماتے ہیں (عفوت عنک) "میں نے تجھے معاف کیا" پھر کنیز بولتی ہے "واللہ یحب المحسنین" "اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے" حسین فرماتے ہیں انت حرۃ لوجہ اللہ سبحانہ "میں نے تجھے خدائے سبحانہ کی خوشی کے لیے آزاد کیا۔ اس کے ساتھ جو وظیفہ اُس کنیز کا مقرر تھا وہ بھی آپ نے قائم و برقرار رکھا (وسیلۃ النجاۃ ص ۲۰۲)

ایک مرتبہ ایک کنیز ریحاں کے پھولوں کا ایک گلدستہ نذر گزرانتی ہے حسین خوش ہو کر اُس کو آزاد کر دیتے ہیں انس بن مالک پاس حاضر ہیں۔ وہ کہتے ہیں یا ابن رسول اللہ پھولوں کے ایک گلدستہ پر اس قدر قیمتی لونڈی کو آپ نے آزاد کر دیا۔ فرمایا دیکھو خدائے جلیل کا ارشاد ہے اذا حییتم بتحیۃ فحیوا

عٰ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ عٰ۵۲ ناموس اسلام

باحسن منھا اور ردوھا "جبکہ کوئی تمھارے ساتھ کوئی اعزاز کا برتاؤ کرے تو اُس سے بہتر برتاؤ تم اُس کے ساتھ کرو یا کم از کم اتنا ہی کرو" اس کنیز نے اپنی بساط کے مطابق بہترین ہدیہ میرے لیے پیش کیا اب میری جانب سے اس کے لیے اس سے بہتر ہدیہ یہی ہے کہ میں اس کو آزاد کردوں (وسیلۃ النجاۃ ص۲۷۱)

کربلا میں جس طرح آپنے غلاموں اور کنیزوں کی عزت افزائی فرمائی ہے اُس کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا۔

خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی کے اس بہترین جذبہ کے ساتھ آپنے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابل عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اُس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے اس کا بہترین ثبوت وہ واقعہ ہے جسے امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر (ج ۲ ص۲۷۲) میں اور علامہ نیشاپوری نے تفسیر غرائب القرآن (ج ۱ ص۲۳) میں لکھا ہے کہ ایک اعرابی امام حسین کی خدمت میں حاضر ہوا اور تسلیم بجا لایا اور عرض حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپکے جد بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرو یا تو شریف النفس عرب یا سخی سردار یا حامل قرآن یا وجیہ و شکیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفتیں مجتمع ہیں۔ عرب قوم، اُس کو تو شرف آپکے جد بزرگوار سے حاصل ہوا۔ اور سخاوت، یہ آپ کا شیوہ اور خصلت ہے اور قرآن، وہ آپ ہی لوگوں کے گھر میں نازل ہوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپکے جد بزرگوار کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسن و حسین کو دیکھ لینا۔ یہ پُر معرفت تقریر سنکر حضرت نے فرمایا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ اُس نے اپنی حاجت زمین پر لکھدی۔ آپنے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سُنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں ہنر موجود ہے اور میں نے اپنے جد بزرگوار کا ارشاد یہ سُنا ہے کہ احسان بقدر معرفت ہونا چاہیے اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں اپنا ایک تہائی مال دیدوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دیدونگا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دیدونگا۔ میرے پاس مال دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے زر نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اُس نے کہا پوچھیے خدا میری مدد کرے گا۔ آپنے فرمایا بتاؤ کون سا عمل سب میں بہتر ہے؟ اُس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اُس نے کہا خدا پر بھروسا رکھنا۔ حضرت نے فرمایا انسان کی زینت کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو

فرمایا اگر یہ نہ ہو؟ اُس نے کہا کہ پھر مال ہو جس کے ساتھ سخاوت موجود ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اُس نے کہا پھر فقیری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اُس نے کہا تو پھر ایک بجلی گرے اور اُس شخص کو جلا کر خاک کر دے۔ یہ سُننا تھا کہ حضرت کو ہنسی آ گئی اور وہ پوری تھیلی اُس کی جانب پھینک دی۔

یہ طرزِ عمل غربا اور مساکین کو معلوماتِ مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفاتِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے ایسے جس سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے الناس اعداء لما جھلوا "لوگ دشمن ہوتے ہیں اُس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں" وہ روسا اور حکام جو خود علم و ہنر سے بے بہرہ ہوا کرتے ہیں اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر میں علم و ہنر کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے رہنما ہمیشہ افرادِ جامعہ کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علی کی زندگی اسی میں گذری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

جانے دیجیے اُن خطبات اور اشعار کو جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علم الٰہیات اور معارفِ حقہ کے خزانہ دار ہیں اور اُن دعاؤں اور مناجاتوں کو جو آپ کی زبان سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ "صحیفہ حسینیہ" کے نام سے اس وقت موجود ہے اور جو خالق و مخلوق کے باہمی ربط کی بے نظیر آئینہ دار ہیں، اگر آپ جوامع حدیث کی سیر کیجیے تو اُن میں آپ کو مسائلِ فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ سے منقول ملیں گے۔

اُس وقت بھی جب آپ الحرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفرِ غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فرزدق بن غالب شاعر نے ملاقات کی ہے اور اس نے کچھ مسائل آپ سے صید اور مناسکِ حج کے متعلق دریافت کیے ہیں اور اُن کا جواب حاصل کیا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسین پر نثار ہو رہا تھا۔ اُن میں حافظانِ قرآن تھے۔ عالمانِ کتاب اور حاملانِ حدیث تھے۔ ان کے جذبِ دل کشش

کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوائے ایسی ذات کے جو خود ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہو۔

امام حسین، رحمدل بھی تھے، اس کا ثبوت گزشتہ کئی واقعوں سے ہو جاتا ہے مگر اس کا بلند درجہ یہ ہے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھا جاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو فراموش کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ اس کا بہترین اندازہ حُر کے لشکر کے ساتھ آپ کے نیک سلوک سے ہوتا ہے۔ یہ حُر کون تھا؟ آپ کا ایک دشمن تھا جو گرفتار کرنے کے لیے آیا تھا مگر اُس کو اور اُس کے لشکر کو پیاسا دیکھ کر عرب کے بے آب و گیاہ راستوں میں آپ نے اپنے ساتھ کا تمام پانی پلوا دیا اور اپنا اور اپنے ساتھیوں کا بلکہ عورتوں اور چھوٹے بچوں تک کا کوئی خیال نہیں کیا۔

ان تمام بلند صفات کے ساتھ آپ انتہائی متواضع اور منکسر تھے چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ [۵] "نانا کے روضہ سے زیارت کر کے بیت الشرف کو تشریف لے جا رہے ہیں کہ راستے میں چند مسکین غریب فقیر بیٹھے ہوئے ملے جو اپنے بھیک کے ٹکڑے سامنے رکھ کے کھا رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر اُن سب نے پکار کر کہا السلام یا ابن رسول اللہ حسین فوراً اُن فقیروں محتاجوں کے پاس نہایت مسرت، خوش روئی، اور خوش خلقی سے زمین پر بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ بھائیو تم لوگ جانتے ہو کہ صدقہ آلِ محمد پر حرام ہے۔ اس لیے میں تمھارے اس طعام میں شرکت سے معذور ہوں۔ ہاں میں اس لیے کہ تمھارے ساتھ کھانے میں شرکت کروں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ آج تم سب میرے مہمان ہو چلو اور میری دعوت کو قبول کرو۔ سب کو ساتھ لے کر در دولت پر تشریف لاتے ہیں۔ دسترخوان بچھتا ہے سب کو اپنے برابر بٹھاتے ہیں۔ خود شریک ہوتے ہیں اور سب کو نہایت محنت و مشقت سے سیر فرماتے ہیں"

اس تواضع اور خاکساری کے باوجود آپ کے رفعتِ مرتبہ اور بلندی صفات اور جلالت قدر کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوں لوگ نگاہ اُٹھا کر بات نہیں کرتے تھے چنانچہ جب ایک شخص نے امیر معاویہ سے آپ کا پتہ پوچھا تو جواب دیا کہ مسجد نبوی میں داخل ہوتے ہی تمھیں ایک حلقہ نظر آئے گا جس میں لوگ اس خاموشی سے بیٹھے ہونگے گویا اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔ یہی ابو عبداللہ الحسین کا حلقہ ہو گا (ابن عساکر جلد ۴ ص ۳۳۲)

جو لوگ آپ کے خاندانی مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ اور صفات کی برتری کے

---

[۵] ناموس اسلام

قائل تھے۔ (ملاحظہ ہو ابن اثیر جزری کی کتاب "اسد الغابہ" (ج ۳ ص ۲۳۵) مسجد نبوی میں ایک مجمع تھا جس میں ابو سعید خدری اور عبداللہ بن عمرو بن العاص اور بہت سے لوگ موجود تھے اُدھر سے حضرت امام حسین کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیم اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جواب سلام دیا۔ اُس وقت عمرو بن العاص کے فرزند عبداللہ چپ رہے۔ جب سب جواب دیکر خاموش ہو گئے تو اُنھوں نے آواز بلند کی اور کہا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوے اور کہا کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہل زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہل آسمان کا کون ہی؟ سب نے کہا ضرور بتلائیے۔ اُنھوں نے کہا وہ یہی راستے سے گزرنے والا، انھوں نے مجھ سے جنگ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی ہی اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہو جائیں تو یہ میرے لیے سُرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہوگی۔

یہ عبداللہ خاندان بنی امیہ میں زہد اور تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگ صفین میں اپنے باپ عمرو بن العاص کے ساتھ حضرت علی سے جنگ کرنے کے لیے آگئے تھے۔ اُس وقت سے حضرت امام حسین نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی مگر اس کے باوجود اُن کے دل پر حضرت امام حسین کے بلند اوصاف کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

خود امیر شام معاویہ کا واقعہ ہے جو طبری نے درج کیا ہی کہ جب حضرت امام حسین نے اُن کو ایک سخت خط لکھا ہے جس میں اُن کے اعمال و افعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی تو اُس وقت امیر معاویہ کو بڑا ہی غصہ آیا اور سخت پیچ و تاب کھایا۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدی لوگوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا سخت خط لکھیے جو حسین کو خود اُن کی نگاہوں میں ذلیل کر دے۔ معاویہ نے کہا کہ میں جو کچھ لکھوں وہ غلط ہو گا یا صحیح۔ اگر غلط ہو گا تو اُس سے کوئی نتیجہ نہیں میرا ضمیر خود مجھے ملامت کرے گا اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسین میں مجھے ڈھونڈھنے سے بھی کوئی عیب ملتا نہیں۔ پھر میں اُنھیں جواب میں سخت باتیں کس طرح لکھوں۔ یہ حسین بن علی کی راست بازی اور راست کرداری تھی جس کی وجہ سے فریق مخالف کو کوئی انتقادی پہلو نظر نہ آتا تھا۔

اسی راستبازی میں داخل ہے اخلاقی جرأت حسین میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپنے میں حضرت عمر بن الخطاب ایسے پرجاہ و جلال انسان کو منبر پر ٹوک دیا اُس وقت جب اُنھیں

منبر پر خطبہ پڑھتے دیکھا قریب آکر کہنے لگے انزل عن مجلس ابی "اترو میرے باپ کی جگہ سے" حضرت عمر نے فرمایا سچ کہتے ہو صاحبزادے تمہارے ہی باپ کا منبر ہے۔ خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں ہے۔ روایت میں ہے کہ حضرت علی نے فرمایا کہ بخدا میں نے اس بچہ کو یہ ہدایت نہیں کی تھی حضرت عمر نے کہا کہ بخدا ہم بھی آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ مشہور مورخ ابن سعد نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمر نے صاحبزادے کو اُٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور کہا کہ کیا بال ہمارے سروں پر آپ کے باپ کے سوا کسی اور نے اگائے ہیں یعنی جو کچھ رفعت اور بلندی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اُن ہی کے سبب سے ہے۔ (صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی ص۱۰۵)

اسی اخلاقی جرأت کا نتیجہ ہوتا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو شریعت اسلام کا ایک بنیادی حکم ہے یعنی اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت حسین کو اس کا بچپنے سے شوق تھا نہ صرف یہ کہ وہ کھیل کود سے متنفر تھے جیسا کہ حذیفہ بن یمان صحابی رسول بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسین کو کھیلتے ہوئے بچوں کے ساتھ دیکھا۔ بچے کھیل رہے تھے مگر حسین دیوار سے لگے کھڑے تھے (اعلام الوریٰ) بلکہ کسی کو غلط کردار کرتے دیکھ کر ٹوکنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بے شک اس کے ساتھ اخلاق اور طریق حکمت و موعظہ حسنہ کا لحاظ تعلیم قرآن کے مطابق مقدم سمجھتے تھے جس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ؎۵ "ایک روز حسن و حسین دونوں بھائی ایک پیرمرد کے پاس سے گزرے جو غلط وضو کر رہا تھا یہ خیال ہوا کہ اس کو ہدایت کرنا ضروری ہے مگر اس بڈھے شخص کو ٹوکنا اور صاف صاف یہ کہنا کہ تم جاہل مسئلہ ہو اور وضو سے واقف نہیں ہماری کمسنی کو دیکھتے ہوئے تہذیب کے خلاف اور اس کی دل شکنی کا باعث ہے آخر آپس میں مشورہ کر کے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُس بڈھے کے پاس گئے اور کہا کہ اے میاں بزرگ ہم دونوں بھائیوں میں یہ بحث ہے کہ کون وضو ٹھیک کرتا ہے تو ہم آپ کے سامنے وضو کریں، آپ ہمارے درمیان فیصلہ کر دیجئے اور بتا دیجئے کہ کون وضو صحیح کرتا ہے۔ اُس نے کہا بہتر آپ وضو کیجیے میں بتلا دوں گا۔ دونوں صاحبزادوں نے اس کے سامنے وضو کرنا شروع کیا۔ وضو تمام ہوا۔ بوڑھے نے دیکھا تو دونوں کا بالکل ایک انداز ہے۔ فوراً اسے توجہ پیدا ہوئی۔ اُس نے

؎۵ ناموس اسلام

کہا صاحبزادو میں سمجھا آپ کا کیا مطلب ہے۔ آپ دونوں کا وضو ٹھیک ہے میں نے ہی وضو غلط کیا تھا۔ اب میں دوبارہ وضو کئے لیتا ہوں" اس طرح فرض بھی ادا ہو گیا۔ اخلاق بھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ پھر جب بچپنے میں تعلیم وارشاد اور اصلاح خلق کا یہ جذبہ تھا تو عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس میں کتنی ترقی ہوتی گئی ہوگی۔

راست بازی اور راست کرداری کا بڑا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکۂ کربلا کے پہلے مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورت حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بتا کر ساتھ والوں کو حفاظت جان ومال کے لیے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم واستقلال اور ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دیدی مگر جو رستا پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کر دیا تھا اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔

اُنھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ اُن کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے ؎ "اُنھوں نے اپنی فطرت کو ایسے سانچہ میں ڈھالا تھا کہ انسان ہوتے ہوئے انسان سے برتر زندگی گزاری اور کوئی ایسا فعل صادر ہی نہ ہوتا جو مثال ہو کر نہ رہتا امام حسین کا قول تھا کہ غصہ کرنا کتے کی عادت ہے۔ اسی لیے ایک ایسے موقع پر جب کوئی انسان غصہ سے آگ بگولا ہو گیا امام حسین نے فرمایا لا یدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب (وسیلۃ النجاۃ) یعنی جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں ملائکہ قدم نہیں رکھتے۔ مطلب یہ تھا کہ غصہ کر کے انسان کو کتا نہیں ہونا چاہیئے"

حضرت امام حسین کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا اُن میں سے ایک

؎ سید ارشاد حسین صاحب آنریری اے وکیل رائے بریلی

نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یک جان و یک دل ہو کر اُن کے مقصد کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔

ان واقعات پر تفصیلی تبصرہ اور کربلا کے واقعہ کے جزئیات سے انسانیت کی جس معراجِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے وہ دوسرے حصّے کے ساتویں باب میں آپ کے سامنے آئے گا مگر یہاں بھی گزشتہ واقعات و حالات سے آپ کو ایسے صفات نظر آ گئے جو حسین کو دنیائے انسانیت کا ایک معیاری نمونہ ثابت کر دیتے ہیں اور اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ حسین میں جاذبیت صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ بے گناہ قتل ہو گئے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہر انسان کی فطرت ہے بلکہ اُن کے اوصاف و کمالات جو اُن کے واقعات زندگی سے ظاہر ہیں اُن کی جانب تمام انسانی برادری کے دلوں کو موڑتے ہیں اور ہر باخبر اور کشادہ دل انسان اس پر مجبور ہے کہ وہ حسین کو عزّت کی نگاہ سے دیکھے اور ان کی عظمت کا اعتراف کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ ؏ حسین کی ساری زندگی اور اس زندگی کے تمام محاسن واقعۂ کربلا کے لحاظ سے ایک دیباچۂ کتاب، ایک تعلیمی دور، عظیم الشان عملی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ایسی عادت پڑ جائے کہ گالیاں دینے والے گالیاں دیں اور گالیاں کھانے والا ماتھے پر بل نہ لائے بلکہ اُس کے چہرہ پر تبسّم کی لہر دوڑ جائے۔ جب تلخ و تند گفتگو کے جواب میں نرم و شیریں الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہو جائے۔ تب ہی تو کربلا کی ایذا سہنے کیلئے جگر آئے گا۔ جب کربلا کے پہلے صبر و حلم و بردباری اور خلق عظیم کی عادت پڑ گئی تب کربلا کے معرکۂ امتحان میں قدم رکھا تاکہ پائے ثبات میں لغزش نہ ہو۔

؏ سید ارشاد حسین صاحب ازہر

(حصّۂ دوم)

واقعۂ کربلا کے اسباب و تفصیلات

(تمہید)

ع "تاریخ کے واقعات مثل روز مرّہ کے واقعات کے یا تو اتفاقی واقعات ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ قطعی اسباب کے نتائج کے برخلاف ہنگامی طور پر بغیر کسی پیش بندی کے وقوع میں آئے ہوں۔ قسمت کے سبب واقع ہوئے ہوں یا پھر مشیّت الٰہی کا نتیجہ ہوں۔ بہر حال جو صورت بھی سمجھ لیجیے اُن واقعات کا ظہور اُس مبہم قوت کا نتیجہ ہوگا جو اکثر ہمارے بہترین تخمینوں اور نہایت احتیاط سے مرتب کردہ اسکیموں کو منقلب کر دیتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کے قطعی تسلسل کا نتیجہ ہوں گے۔ ممکن ہے اس کہنے پر اکتفا کر لی جائے کہ تاریخ میں اتفاقی واقعات کا فقدان ہے اور اس کے تمام واقعات کی تحلیل کرنے کے بعد ہم یقین کر سکتے ہیں کہ وہ قطعی اسباب و علل ہی کی بنا پر ظہور پذیر ہوئے لیکن ایسا کہہ دینا جلد بازی اور غلطی کا مرادف ہوگا۔ اس لیے کہ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ تاریخ میں ایسے اتفاقی واقعات بھی پیش آئے ہیں جن کے صحیح وجوہ کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

مثلاً فرانسیسی انقلاب اور اس کے ساتھ کے انتہائی مظالم، اُس کے کورانہ سب و شتم، اُس کے ناپاک غصہ کی لہر اور اُس کے انسانیت و اخلاق سوز واقعات کا سبب عوام کے اُس شدید کرب و بےچینی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو صدیوں سے مطلق العنان طبقہ امرا کے پیروں تلے پیسے جانے کی وجہ سے پیدا تھی لیکن اسکے فوراً ہی بعد نپولین کی درخشندہ اور مستعجل حکومت میں حریت عوام پر پہلے سے زیادہ مصائب و شدائد کی بارش ہونا اور پھر بھی نپولین کا ایک ہیرو اور نجات دہندہ کی حیثیت سے پوجا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسکی تعبیر کیونکر کی جائے گی؟ ایک دوسری مثال لیجیے اور وہ یہ کہ ہم یہ

ع ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی

مان لیتے ہیں کہ مور لوگوں کا اسپین سے نکالا جانا اُن کے آپس کے جھگڑے، آپس کے بغض و حسد اور خود موری حکمرانوں کی کمزور اور متنزلزل حکمت عملی کا نتیجہ تھا لیکن عبدالرحمن جس کے زیر قدم سارا یورپ تھا اور جس کے بہادر اور قوی ہیکل سپاہیوں کے لیے فرانس کی تسخیر ایک معمولی کام تھا، وہ چارلس مارٹل کے ہاتھوں کیوں شکست کھا گیا؟ اسے ہم سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ اب جب یہ بات مُسلّم ہوگئی کہ تاریخی واقعات یا تو اتفاقی ہوتے ہیں اور یا یقینی اسباب کے ماتحت ظہور میں آتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعۂ کربلا کوئی اتفاقی واقعہ تھا یا یہ کہ وہ بدیہی اسباب کے ایک قطعی تسلسل کے ماتحت ظہور میں آیا دوسرے الفاظ میں آیا وہ ایک انتہائی جوشیلے گورنر کے مظالم کا نتیجہ تھا جو اپنے شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا یا یہ کہ اس واقعہ کے اسباب ذرا گہرائی میں ہیں؟ جواب کے لیے ہمیں اُس زمانہ کی سیاسی اور سماجی کیفیت کا جائزہ لینا پڑیگا اُن تمام واقعات کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا جو کہ اس واقعہ عظمےٰ کا مقدمہ تھے اور تب ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ واقعۂ کربلا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا ——"

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک واقعہ کے بہت سے اسباب ہوں یعنی سب نے مل کر اُس کے وجود کی تشکیل کی ہو اور ان اسباب میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض تمام جماعتوں کے نزدیک قابل قبول ہوں اور بعض کسی خاص جماعت کے نقطۂ نظر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہماری کتاب چونکہ ایک بین الاقوامی ادارہ کی ترجمان ہے اس لیے ہمیں واقعۂ کربلا کے اسباب کا وہی پہلو پیش کیا جا سکتا ہے جو صرف تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے کسی شخص یا طبقہ کے اس حق پر ضرب نہیں لگ سکتی کہ وہ اپنے ذاتی معلومات یا تحقیقات یا مُسلّمات کی بنا پر اس بارے میں کچھ اور بھی خیال کرتا ہو۔

ہم واقعۂ کربلا کو جس حیثیت سے دیکھتے ہیں اور جس کے تسلیم کرنے پر ہر شخص مجبور رہے وہ یہ ہے کہ واقعۂ کربلا اُس انقلابی کشمکش کی ایک کڑی ہے جو اسلام کا پیغام پہونچنے سے دنیا میں اور بالخصوص ملک عرب میں پیدا ہوگئی تھی اور جس میں پیغمبر اسلام کا تصادم ہوا تھا اُن طاقتوں سے جو اُن کے اصلاحی مقاصد میں سدّ راہ بن کر کھڑی ہوئی تھیں —— اس تصادم کی ایک خاص صورت تھی جو کربلا کے میدان میں واقعۂ کربلا کے شکل میں پیش آئی لیکن جس کی صورت انوکھی اور اپنے طرز میں بالکل نرالی تھی۔ جب ایسا ہے تو ہمیں واقعۂ کربلا کے اسباب سمجھنے کے لیے اُس انقلاب کی کیفیت دیکھنا ضروری ہے جو اسلام کے آنے سے دنیا میں پیدا ہوا تھا۔

ع۵ "آئیے بعثتِ رسول سے قبل کے عرب یعنی ایامِ جاہلیت کی سیر کریں اس لیے کہ بغیر اس کے اسلام کے ابتدائی دور میں عرب کے خیالات اور اُن کے رجحانات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے گا۔

ظہورِ اسلام سے تقریباً ایک صدی قبل کا زمانہ جو "ایامِ جاہلیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہی بالکل غلط طریقہ پر سمجھا گیا ہی۔ مسلم مورخین نے اسلام کے قبل کے عرب، اُن کے رسم و رواج، اُن کے عادات و اطوار اور طرزِ بود و باش کو نہایت جوش سے ساتھ بُرا بھلا کہکر اُس زمانہ کے عربی سماج کو مسخ کرکے پیش کیا ہی۔ اُنھوں نے عربوں کو صرف بربریت پسند اور تمدن و تہذیب سے بیگانہ ثابت کیا ہی۔ جن کا محض یہ شغلہ تھا کہ وہ ذرا سے اشتعال پر قتل کردیں، انتقامی خونریزی سے لطف اندوز ہوں، شراب کباب میں مست ہوں مطلق العنان شہوت پرستی کریں، جوا کھیلیں اور اپنے دشمنوں کے اونٹوں اور عورتوں کو چرائیں یا اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کردیں۔ جو لوگ واقف ہیں کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ تھا، کاروبار اور تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا اُن کو عربوں کی مذکورہ بالا تصویر کتنی غلط معلوم ہوگی! وہ لوگ جنھوں نے حمیری بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ سے اُن کی تاریخ کا علم حاصل کیا ہے، کتبوں اور روایتوں سے معلومات فراہم کی ہیں، سدِ مارب، باغِ شداد اور تختِ بلقیس ملکۂ سبا کا ذکر سنا ہی وہ ان مسلم مورخین کی روایتوں کو کتنا مبالغہ آمیز سمجھیں گے! اگر کوئی شخص اس بات کا خیال کرے کہ شمالی عرب جنوبی عرب کی تہذیب و تمدن سے بالکل غیر متاثر رہا اور بالکل عالمِ بربریت میں پڑا رہا تو اس شخص کی غلط فہمی کا ازالہ یوں ہو سکتا ہی کہ وہ ایامِ جاہلیت کی شاعری کو ایک نظر دیکھ لے جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اُن کی شاعری یہ بھی ظاہر کردیگی کہ ایامِ جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے بھی حامل تھے، مثلاً بہادری، سخاوت، مہمان نوازی، وفاداری، راستبازی، شوہری محبت اور برادری انس وغیرہ، خلاصہ یہ کہ شاعری اُن کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اُس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب اگرچہ سادہ اور الھڑ تھے لیکن شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری بالخصوص اُن میں سے چند کی، اس بات کو بھی ظاہر کردیگی کہ اگرچہ وہ اُس زمانہ کے دو الہامی مذہبوں کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بُت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ ان دونوں مذاہب کے خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے

ع۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

اُن کا اعتقاد تھا کہ ایک خدائے توانا ہی جس تک وہ اپنے بتوں کے ذریعہ سے پہونچ سکتے ہیں۔ ظہور اسلام سے کچھ ہی قبل موحدین کا بھی ایک گروہ عرب میں نمودار ہو چکا تھا جو اپنے کو "حنیف" کے نام سے یاد کرتے تھے اور بُت پرستی کو معیوب سمجھتے تھے۔ جب ہم قدیم عرب کے اس خیال پر غور کرتے ہیں کہ کعبہ ابراہیم اور اُن کے بیٹے اسمٰعیل کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور جس کا ذکر قرآن میں "انسانوں کا پہلا (متبرک) گھر" کے نام سے ہوا ہے۔ نیز یہ کہ عربوں کی اکثریت جناب اسمٰعیل کی نسل سے تعلق رکھتی ہے تو ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو سکتا کہ عربوں نے ازمنۂ قدیم کے روایات کو محو کر دیا ہوگا اور اپنے آباؤ اجداد کے تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی سوسائٹی انحطاط پذیر تھی۔ یعنی اگرچہ اُس میں کچھ عمدہ قدیم خوبیوں کا شائبہ موجود تھا لیکن زیادہ تر اس میں بُری عادتیں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ وحشی اقوام کی طرح بالکل سادہ اور معصوم نہ تھے بلکہ اُن کی مثال اُس جماعت کی سی تھی جو کہ اچھے دنوں سے دوچار ہونے کے بعد اپنے قدیمی خصوصیات و شرافت کو پس پشت ڈال کر برباد ہو رہی ہو۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرض حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت اُن کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ اُن کے کاروان حجاز اور عراق اور شام میں اب بھی اسباب سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب اُن میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غربت نے انھیں حریص بنا دیا تھا۔ اُن میں خدا کا ایک دھندلا اور مدھم تخیل موجود تھا لیکن اُن کے بُت اُن کے نزدیک زیادہ مقدس تھے وہ ایک صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ سے متنفر رہنا چاہتے تھے جب وہ "شعلہ در آگ"، یا اُس منحوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام بچے پیدا ہوتے ہیں تشبیہ دیا کرتے تھے لیکن اُن کے ملک کی نوعیت اور خود اُن کی غربت اُن کو مجبور کرتی تھی کہ وہ اپنے ہمسایہ کے مال پر دست تطاول دراز کریں۔ وہ اپنے مردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام کشی کی عادت سے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلاً بعد نسل برابر خونریز جنگیں ہوا کرتی تھیں جن سے کہ سیکڑوں گھروں کو موت اور رنج و غم کا مزہ چکھنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے اس لیے کہ وہ اُن کے جگر کے ٹکڑے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ

اُن کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیز بنا دی جائیں، یا اُن کے رحم وکرم پر ڈال دی جائیں اور اس لیے وہ اُن کی موت کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے بہترین علاج سمجھتے تھے —"

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ دورِ بربریت و وحشت سے گزرتی ہوئی قومیں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ اُن کے دلوں پر جیسا نقش بٹھلایا جائے وہ سادگی سے اُتر آئے گا اس لیے کہ اسکے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے مگر عربوں کی تمدنی خرابیاں وہ تھیں جو خود مادی ساخت کے تمدن اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انھوں نے عربوں کی افتادِ طبع کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساسِ برتری قومیت سے منتقل ہو کر جب انفرادیت کی طرف آتا ہے تو اُس کا نتیجہ ہوتا ہے باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی یہ بات عربوں میں انتہا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ جسٹس امیر علی تحریر کرتے ہیں "کلٹ قوم کی نفرت سیکسن قوم سے، آئرلینڈ والوں کی انگریزوں سے، پولینڈ والوں کی رشین قوم سے صدیوں کے مظالم اور بدنظمی سے ظاہر ہے جس کے ماتحت کمزور قوم کراہ رہی تھی۔ سیاسی رقابت کلید ہی شدید نفرت کی۔ یورپ میں رسم و رواج کا اختلاف اور بسا اوقات پیدائش کا اختلاف دو قوموں کے میل جول میں ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے جو کہ بجبر ایک ہی حکومت کے محکوم بنا دیئے گئے ہوں لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ چند صدیوں کے اختلاف و نزاع کے بعد وہ آپس میں مل جل گئے ہیں، محمدؐ سے قبل عربوں کی حالت پر یہ کلیہ منطبق نہیں ہوتا رسولؐ کے ظہور سے بہت قبل ہی حمیری زبان جو کہ سامی اور ملکی زبان سے مرکب تھی خالص عربی کو اپنی جگہ دے چکی تھی۔ یہ خالص عربی زبان بنی مضر بولا کرتے تھے جنھوں نے کہ عوام پر دماغی تفوق حاصل کر رکھا تھا بقیہ تمام عرب لب و لہجہ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ایک مشترک زبان بولتے تھے۔ اُن کے رسم و رواج، خیالات، مذاق سب یکساں تھے لیکن ان تمام باتوں میں یکسانیت کے باوجود ان کے قبائل میں اختلاف و افتراق نہایت نمایاں اور غیر معمولی تھا۔"

اسی احساس برتری میں انفرادیت کے غلبہ کا نتیجہ تھا کہ مساوات انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی اور غلبہ، طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اُس کے قبیلہ کے سیکڑوں بیگناہ

آدمیوں کو مار ڈالا جاتا تھا تب سمجھتے تھے کہ اُس کے خون کا بدلا ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا، ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی کی بناء پر وہ امتیازات قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

عا "گالی لاوم فرانسیسی فاضل، مسٹر لیبان، مسٹر ڈوزی، اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے فاضل مصنف مسٹر لارڈس لکھتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی قسمتیں روم اور ایران کے ہاتھوں میں تھیں یہ دونوں حکومتیں یورپ اور ایشیا کا گلا گھونٹ رہی تھیں سیاسی خانہ جنگیاں، مذہبی فتنہ سامانیاں قہر کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ نہ کوئی سیاسی وحدت تھی۔ نہ کوئی دینی تنظیم۔ رہزنوں اور غارتگروں اور مردم خواروں کے صفات انسانی فضائل میں شمار ہوتے تھے۔ اس وقت ان کی عظمت کا معیار یہ تھا کہ ان کی تلوار کی باڑھیں زیادہ تیز تھیں اور جنگ کے قیدیوں کو یہ جس طرح چاہتے تھے معذب کر سکتے تھے۔ حکام رعایا کے احساسات کے قائل نہ تھے۔ عوام کو ایک بے جان مخلوق سمجھتے تھے جس کے وجود کی مصلحت ہی یہ ہے کہ وہ امراء کی مرضی میں کام آئے۔ مظلوم انسانیت میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان چیرہ دستیوں کے مقابلہ کے لیے خم ٹھونکتی"

عا "اس وقت کی دنیا کا اگر نقشہ سامنے رکھا جائے تو عجیب و رنگی نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو دنیا کے مختلف ممالک اپنی تہذیب، تمدن، معاشرت، فلسفہ، اور ایجادات سے جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر دوسری طرف چند امراء کے سوائے ہر ملک میں عام خلق خدا پریشان و سرگردان پھرتی ہے کہیں پتھر کے دیوتاؤں کے سامنے انسانی خون بہایا جا رہا ہے۔ کہیں اللہ کے بندوں کو شودر کہکر بھیڑ بکری کے مانند ذبح کیا جا رہا ہے۔ کہیں آتشکدوں کی روشنی میں اندھیر۔ انسانوں کو اپنی عیش پرستی اور ہوس رانی کی قیمت قرار دیا جا رہا ہے۔ کبھی اپنے اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے آدمیوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مسل کر پھینک دیا جاتا ہے اور کوئی اُف تک نہیں کر سکتا۔ کوئی اُٹھتا ہے

عا مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری عا آغا طاہر نبیرۂ آزاد دہلوی

اور ایک خونخوار جماعت تیار کر کے اللہ کی زمین کو فتح کر کے اس کے بندوں کو غلام بناتا چلا جا رہا ہے۔ کسی کی جنبش ابرو انسانوں پر قتل عام کا فرمان جاری کر کے انسانی خون کا دریا بہا رہی ہے۔ اپنی ہم جنس عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھ کر اتارا اور پہنا جا رہا ہے۔ اگر کہیں غیرت نے جوش مارا تو زندہ بیٹیوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ اگر آنکھیں بند کر کے تصور کریں تو انسان نہیں بلکہ بھیڑیے ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے دکھائی دینگے۔ انسانیت کے درد و محبت کے بجائے ان کے چہرے جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، خیانت، ظلم و جور کے آئینہ دار نظر آئیں گے۔"

عـ۱ "عرب میں کوئی خاص مذہب نہیں تھا۔ ان میں مختلف مذہب کے لوگ آباد تھے۔ عرب بت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے اور کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی۔ واضح رہے کہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے اور بتوں کی ۳۶۰ تعداد سے بھی مطلب یہی تھا۔ تاہم وہ اور دوسرے مذاہب سے بھی نابلد نہیں تھے اس لیے کہ کعبہ جو عربوں کی قومی زندگی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس میں یہود، مجوس، اور نصاریٰ کے ٹھٹھ لگے رہا کرتے تھے مگر یہ مذاہب بھی پستی کی طرف مائل نظر آ رہے تھے۔ ان کے اعمال ناشائستہ، ان کی دوسرے طبقوں سے بیگانگی، ان میں رواداری کا فقدان اور آپس کی خونریزی ایسے واقعات تھے جو عربوں کے دماغ پر کوئی افادی اثر پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان مذاہب کا ظلم و استبداد بھی حد سے متجاوز ہو چکا تھا اور فطرت انسانی کسی ایسے انسان کی خواہاں تھی جو ان کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔"

ایسے وقت میں عـ۲ "محمد بن عبد اللہ پہلو میں ہمالیہ پہاڑ کا ایسا مضبوط دل اور طوفانی سمندروں کی طرح زلزلہ افگن ہمت لے کر اٹھے اور قربانی کی تیز و تند لہروں سے جاہلانہ تمدن کی کثافتوں کو بہالے گئے۔ ذہنی و عملی انقلاب پیدا ہو گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق نوع کے مکمل ضابطے بن گئے اور مردہ انسانیت کے چہرہ پر زندگی کی رعنائیاں دوڑنے لگیں۔"

عـ۳ "ان کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ وہ محض وحشی لوگوں کو متمدن نہیں بنا رہے تھے

عـ۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ پٹنہ　　عـ۲ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری
عـ۳ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سُدھارنا چاہتے تھے۔ ان کا کام اُن تمام عقائد و توہمات، رویاد مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں۔ رسول اُن لوگوں کو بردباری، خاکساری، عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے جن کے نزدیک شرافت کمزوری کی دلیل سمجھی جاتی تھی اور انتقام نہ لینا نہایت ذلت اور کمزوری کی علامت متصور ہوتا تھا۔ رسول اُن لوگوں کو مساوات اور اُخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کی نہایت سختی کے ساتھ حفاظت کیا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کی اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کردی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے قماربازی بند کردی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل و جود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخرب اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہوسکتا ہے اور یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں سے برتری کا دعوےٰ کرسکتا ہے"۔

عـہ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولتمندوں کے زیر حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغام آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے دعویدار تھے۔ آزادی گروہ امرار کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقہ پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لیے اُن کے مالکوں کے مظالم اور خلاف انسانیت بیرحمانہ سلوک سے۔ آزادی طبقۂ نسواں کے لیے اُس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کردی گئی تھیں۔ آزادی عام انسانوں کے لیے اُن قیود سے جن میں وہ ذات پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے اُن کی حیات اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے۔ گروہ انسانی اس طرح اپنی

عـہ خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر

خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے عظیم المرتبت شاعر اور فیلسوف اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے:-

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود ماند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و سلطان و پاپا و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

اسلام نے اسے ایک پیغام آزادی سنایا، حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کئے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے غرباء مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جو اب تک بڑی بے دردی سے پیسا جا رہا تھا نئی امیدوں اور اپنے کارآمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا۔

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد بندگاں را مسند خاقاں سپرد
اعتبارِ کار بنداں را فزود خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید بندہ را باز از خداونداں خرید
حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ
عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوش او وا کردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہونچانا چاہتا تھا!

اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ سوائے اس کے مساوات قائم کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ

نہ تھا۔ دولت ایک خارجی شے ہے۔ ممکن ہے مساوات قائم کرنے کے لیے آپ دولت کو برابر تقسیم کردیں لیکن بازوؤں کی طاقت، موروثی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح ہو گی؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں ہے اس لیے اُس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تا کہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اُس نے غور کیا اور صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہے؟ احساس اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اس کے اجزا میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعوے رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں۔ ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصور رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورث اعلیٰ کی نسل سے ہیں، ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہیں؟ اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگت اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور پر منسوب ہو سکیں۔ دوسری لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایکا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک ملک والوں کے درمیان رابطۂ اتحاد قائم ہوا تو دوسرے ملک والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آرہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد قائم ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا

ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گورے لوگوں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اٹھی اس نے ادھر والوں کو تو متحد کیا اور ادھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحاد افراد کی بنیاد اتحاد مرکزی پر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے، اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کے بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر پھر کچھ رہے نہیں اس لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے کوئی مادی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہوگی وہ محدود ہوگی اور محدود ہونے کے ساتھ اس میں قریب و بعید کم اور زیادہ کے حدود پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادی بلند و بالاتر طاقت سے وابستہ کیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہی ہے جسے اسلام نے معبود برحق اور خدائے کل بتا کر سب کا قبلۂ مقصد بنا دیا ہے اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں افراد جامعہ میں احساس اخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی شے ہے۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورث اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادر وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یک جہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن جائیں، یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

عـ۵ "توحید کے تخیل نے ایک طرف نوع انسانی کو ایک ایسی ارفع و اعلیٰ نوع قرار دیا جس کیلئے دریاؤں، پہاڑوں، آگ، سورج، سانپ، ہاتھی وغیرہ تمام انواع و اقسام کی مخلوقات کو اپنا معبود قرار دینا ایک ناقابل تلافی جرم ہو گیا۔ دوسری لفظوں میں انسان کو یہ سبق پڑھایا کہ کوئی مخلوق یا بالفاظ دیگر کوئی موجود مادی اس کی اہلیت نہیں رکھتا کہ انسان کا معبود بن سکے اور اس کا مالک کہلائے

عـ۵ سید مقصود حسین صاحب نجم امروہوی

دوسری طرف "حکمت عملی" میں اسی تخیل نے "مساوات"، "حریت" اور "انصاف" کا سبق پڑھایا یہی تخیل کہ ایک "مادی مخلوق" انسان کی مالک قرار نہیں پا سکتی جب سوسائٹی کے مروجہ اصول و قوانین کو اس کے ماتحت جانچا گیا تو اسی نے انسانی مساوات اور انسانی آزادی کی بنیاد ڈالی۔ اسلام کی آمد کے وقت قبیلہ وارانہ سوسائٹی کا رواج تھا۔ ہر قبیلہ پر اُس کا سردار قابض ہوتا اور مختلف قبیلے ہر وقت اپنی اپنی برتری کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ توحید کی تعلیم نے اس جنگ و جدل کا خاتمہ کیا اور انسان کو یہ سبق پڑھایا کہ تمام انسان ایک ہیں۔ ان کا مفاد ایک ہے اور ان کی مضرت بھی ایک ہی ہے۔ سرداران قبیلہ کی فوقیت ایک غلط چیز ہے اور انسان کی قبیلہ وارانہ تقسیم کا نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس طرح اسلام کی آمد نے قبیلہ وارانہ نظام کے محدود تخیل سے یک بیک انسان کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ تک پہونچا دیا۔"

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغائرت برتی تھی۔ اُنھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اُس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کو ذکر کرتے ہوئے ایک طنز یہ انداز میں اس سے مخالفت کی اور اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس بلکہ مسلمانوں کو اقوام عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ھو ربنا وربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیار امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نئی قدر امتیاز کی قائم ہو گئی اور وہ یہ کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ؁ "ایک انسان کو دوسرے انسان پر نسل، رنگ یا وطنیت کی بنا پر نہیں فضیلت حاصل ہوتی بلکہ اعمال و افعال کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ مفاد مجموع کے لیے کارآمد اور ارتقائے تمدن کے ممد و معاون افعال اعمال حسنہ قرار پائے اور عمرانی

؁ سید معصوم حسین صاحب نجم امروہوی

زندگی کو مضرت پہونچانے والے کام افعال قبیحہ قرار پائے۔ یہ تمام انقلاب اسلام کی آمد سے ظہور پذیر ہوا جس کی بنیاد "توحید" کے تخیل پر تھی۔ ؂۱ "اس انقلاب کی صحیح تصویر کھینچی تھی جعفر بن ابی طالب نے بادشاہ حبش کے دربار میں جبکہ انھوں نے کہا "اے بادشاہ جہالت وبربریت ہم پر محیط تھی۔ ہم بُت پرستی کیا کرتے تھے۔ ہماری زندگی نہایت ناپاک تھی۔ ہم میں انسانیت واخوت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ "قوت حق ہے" ہمارا قانون ونظام تھا لہٰذا خدا نے ہم ہی میں سے ایک ایسے شخص کو پیدا کیا جو صحیح النسب، خوش اخلاق اور پاک کردار ہے۔ اُس نے ہمیں توحید کی تعلیم دی اور شرک سے محفوظ رکھا اُس نے ہمیں بُت پرستی اور جھوٹ سے منع کیا فرائض کی انجام دہی کی طرف رغبت دلائی رحم کرنے کی ترغیب دی اور حق ہمسایہ کی عظمت جتائی، اُس نے ہمیں عورتوں کو حقیر سمجھنے سے روکا، اور یتیموں کا مال غصب کرنے سے منع کیا۔ اُس نے ہمیں برائی سے پرہیز اور اچھائی کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت کی۔ اُس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور دیگر امور شرعیہ کے لیے حکم دیا۔"

؂۲ "مسٹر باسورتھ اسمتھ صاحب ایم۔اے اپنی کتاب "محمد اینڈ محمڈن ازم" میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ سب سے بڑا ہے اور اس کے سوا اور کوئی شے بڑی نہیں ہے۔ یہی مسلمانوں کا مذہب ہے اسلام یعنی انسان کو چاہیے کہ خدا کی مرضی پر توکل کرے اور ایسا کرنے میں نہایت خوش ہو۔ یہی مسلمانوں کا طرز زندگی ہے۔"

لالہ لاجپت رائے صاحب اپنی کتاب "سوانح عمری سوامی دیانند" صفحہ ۵۷ میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس وقت بھارت ورش میں مذہبی کمزوری اپنا پاؤں جما رہی تھی۔ اُس وقت عرب کے ریگستان میں ایک مہا پرش (عظیم الشان انسان) ایک عجیب وغریب مذہب کی تعلیم دے رہا تھا۔ اسلام کی وحدانیت کیا ہے؟ ایک آتش خیز پہاڑ تھا جس کی اُبلتی ہوئی لہر کے سامنے نہ بُت پرستی ٹھہری نہ انسان پرستی ٹھہری، نہ عیسٰی پرستی، جہاں جہاں تک یہ لہر پہونچی راستے میں صفائی کرتی چلی گئی۔"

اس نظریۂ توحید سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ؂۳ "متحدہ انسانیت کے اسلامی تصور نے عربوں کو نئی زندگی کا پیامبر بنا دیا جس نے

؂۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ　؂۲ نامُوس اسلام　؂۳ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

اُن کے اقتصادی مسائل کو بھی تشنہ نہ چھوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب نے اُن پر بہت سی پابندیاں عائد کرکے اُن کی بے اعتدال زندگی کو نئی قیدوں میں جکڑ دیا لیکن انھیں دور تک ایک شاندار مستقبل کا رستہ دکھا دیا۔ قوم میں عملی مساوات کو مکمل اور کارآمد بنانے کے لیے رسول نے سود خواری کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا۔ آزاد تجارت کا اصول جاری کیا گیا تھا اور غلہ کی گرانی کے زمانہ میں غلہ کو آئندہ منافع کی امید پر چھپا کر رکھنا بہت بڑا جرم قرار دیا گیا تھا۔ ان باتوں نے عربوں کے محدود تصورِ حیات کو اُن کے چھوٹے چھوٹے قبائلی مسائل سے ہٹا کر بڑے بڑے ملکی اور اقتصادی مسائل میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں تاریخ کے ارتقاء کے راہبر تھے اور اگر حالات صحت بخش اور متوازن رفتار سے چلتے رہتے تو وہ ترقیاں جن سے اسلامی ممالک آج بھی محروم ہیں کب کی اپنا اثر ڈال چکی ہوتیں"۔

(۲) اخلاق پر بہت زور دے دیا گیا یہاں تک کہ بانی اسلام نے اپنا مقصدِ حیات ہی یہی قرار دیا اور اعلان کیا انّما بعثت لاتمّم صالح الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انّما بعثت لاتمّم حسن الاخلاق یعنی "میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے"۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۲۸) مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ تمھیں تمھارے اعمال کی سزا نہ ملے گی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائیگا۔ مسلمان وہ ہے جو احکام خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مسلم کی شان نہیں ہے۔ جو حق ہو اُس کے آگے سر خم کرنا اسلام کا درس ہے۔ تم اس کے پیرو جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اس کے احکام کی تعمیل کرو ورنہ اُس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ اُمتِ مرحومہ میں شامل ہونے کے قابل۔

؏ "واشنگٹن ارونگ کے خیال میں رسول کا "نظریۂ خیرات" ہمدردی، اور رحمدلی کے بڑے حدود کو محیط تھا۔ رسول کہا کرتے تھے کہ ہر اچھا کام خیرات ہے۔ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا خیرات ہے۔ انسان کا انسان کو عمدہ کاموں کی ترغیب دینا خیرات ہے۔ بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرنا خیرات ہے۔ اندھوں کی مدد کرنا، راستے سے پتھر اور کانٹوں کو دور کر دینا۔ یہ سب خیرات ہی کے ضمن میں آتے ہیں۔ رسول زبان کی خیرات پر جو بہت ضروری ہے اور جس کی

؏ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہی بہت زور دیا کرتے تھے۔ ابو جاریہ جو کہ بصرہ کے باشندہ تھے مدینہ میں جب آئے تو رسول سے کچھ اخلاقیات کے ملتجی ہوئے۔ رسول نے انھیں ایک چیز بتائی اور وہ یہ کہ کسی کی برائی نہ کیا کرو۔ ابو جاریہ کا بیان ہی کہ اُس روز سے میں نے کسی شخص کو چاہے وہ آزاد ہو یا غلام بُرا بھلا نہیں کہا۔ اسلامی قوانین زندگی کے اخلاقیات اور تواضع کے آخری حدود تک پہونچے ہوئے ہیں۔ اسلام کی ہدایت یہاں تک ہی کہ کسی گھر میں داخل و خارج ہوتے ہوئے لوگوں کو سلام ضرور کرو۔ اپنے دوستوں جان پہچان والوں اور راہگیروں کو سلام کر لیا کرو۔ سوار کو چاہیے کہ پیادہ کو سلام کرے۔ جو گزر رہا ہو اُسے بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرنا چاہیے ایسا کوئی مذہب نہیں ہے جس میں حیوانی زندگی کے لیے اتنے مُستند دستور العمل موجود ہوں قرآن حکیم کا ارشاد ہی کہ زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں اور کوئی طائر نہیں مگر یہ کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ہیں اور خدا ہی کی طرف پلٹیں گے۔" آگے واشنگٹن اردنگ لکھتا ہی کہ مشرق میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہی جو جانوروں پر مظالم کو روکے۔ اس کا سبب تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ چند سال کے قانون نے جس بات کے لیے اب کوشش کی ہی وہ بہت زمانہ ہوا عرب کے عظیم المرتبت پیغمبر نے انجام دیدیا تھا"

(۳) معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات اور اصلیت میں ایک ہی ہیں (خلقناکم من نفس واحدۃ) قبائل کی طرف اُن کا انقسام صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہی (انا جعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا) مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہی (لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی) فضیلت بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ وابستہ ہی۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے مؤذن اپنا بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہی کہ اذان دے! تو قرآن کی آیت اُتری (یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، اُنمیں کوئی فرق نہیں (اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ۲۳۵)

(۴) ع۵ اسلامی سیاست سے پہلے عرب میں جتنی حکومتیں ہوئیں وہ ایسی ہی تھیں جیسی

ع۵ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

عموماً دنیا میں ہوا کرتی ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ پیغمبر اسلام نے اس استبدادی حکومت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ چاہتے تھے نہ صرف عرب میں بلکہ تمام دنیا میں الوہی سیاست قائم کریں"۔

مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی فرماتے ہیں "اسلام دراصل حکومت الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے اسلامی حکومت کا دارومدار عدل و انصاف پر قرار دیا گیا ہے چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ (سورۂ نساء) ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (مائدہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لیس لاحد علیٰ احد فضل الا بدین وتقویٰ"۔

ع۵ "ماہرین علم النفس جانتے ہیں کہ ہر تمدن کی بنیاد تین اصولوں پر قائم ہے۔ مذہب، فنون لطیفہ سیاست جن میں سے مذہب کی طاقت باقی دو اصولوں سے مسلمہ طور پر زائد ہوتی ہے۔ اسلامی تمدن کے بانی نے اس مغائرت کو مٹا کر یہ چاہا کہ فنون لطیفہ اور سیاست کی جگہ بھی مذہب ہی کو حاصل ہو تاکہ قوت میں انتشار نہ ہو اور دین و دنیا ایک ہو کر باہمی تصادم کی خلش مٹ جائے۔ شک نہیں کہ خواہش ہر تمدن کے بانی کی یہی ہوتی ہے کہ وہ محکم اصولوں کی تلاش و جستجو کرے۔ بانی اسلام نے ایسا ہی کیا لیکن قابل ستائش وہی مؤسس و قائد ہے جو

(۱) اپنے اصولوں کو ہموار سطح پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

(۲) جو بیشتر سہولتیں عملی راستوں میں پیدا کر دے۔

(۳) جو تمام انقلابات کے مقابلہ کے واسطے غیر متزلزل اصول بتا دے۔

(۴) جو تمام طبائع اور فطرت کے اقتضاء کے مناسب اصول وضع کرے۔

(۵) جو دوسروں کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کو کم سے کم گنجائش دے۔

(۶) جو دوسروں سے خود بھی بلا وجہ تصادم و مزاحمت نہ کرے۔

(۷) جو کسی فرد یا افراد سے مخصوص نہ ہو۔ عام مخلوقوں کی احتیاج کو پورا کرے۔

ع۵ علامہ ہندی

(۸) جس میں دین و دنیا میں ایک دوسرے سے مزاحمت نہو۔

اسلام کو انہی خصوصیات کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ مذہب اسلام نے سیاسیات اور فنون لطیفہ کے صرف اُن شعبوں کو رد کیا جو امور رہشت گانہ کے خلاف ہیں نہ کہ عام امور مثلاً گانا، بجانا، آلات لہو کا استعمال اور اُن کا بنانا بیچنا اسلام نے حرام قرار دیا ہے محض اس لیے کہ دنیا سعی و کوشش جد و جہد، عمل، محنت و مشقت، جفاکشی کے لیے بنائی گئی ہے۔ سستی، کاہلی، لہو و لعب، بیکاری اور قوائے بہیمیہ کو ہیجان میں لانا بدترین شے ہے۔ بت تراشی کو اسلام نے حرام قرار دیا اس لیے کہ یہ بت پرستی کا ذریعہ بنتی ہے جو انسانی شرافت و خودداری کے خلاف ہے۔ لیکن ان سے بہتر اور مفید شعبوں کا اسلام نے خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ بہت سے غیر منکشف اسرار کو بتاکر نوع انسانی کی توجہ اس طرف مبذول کی تاکہ ان کو اختیار کرکے انسانی ضروریات کے دسترس کو محدود فضا سے باہر لایا جائے۔ اسی طرح سیاسیات۔ مذہبی عبادات سے لے کر معاملات تک ہر شے میں سیاسی و اجتماعی پہلو مضمر ہیں اور اسلام کا کوئی اصول بھی سیاست سے خالی نہیں مگر اسلام میں ہرگز اُس سیاست کو جگہ نہیں مل سکتی جہاں خود غرضی ہو، چالاکی ہو، حیلہ سازی ہو، سرمایہ داری ہو یا مزاحمت ہو؛

غرض یہ ہے کہ اسلام میں سیاست "حصول اقتدار کے کامیاب ذرائع کے استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک و ملت کے صحیح نظم و ضبط اور امور خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی۔ مثال میں خود حضرت پیغمبر کی ذات گرامی ہے۔ باسورتھ اسمتھ لکھتا ہے۔ "سیاسی رہبر اور مذہبی پیشوا یعنی قیصر اور پوپ دونوں کے فرائض محض ایک شخص انجام دے رہا تھا۔ وہ پوپ ضرور تھے لیکن پوپ کی ریاکاریوں سے پاک وہ قیصر بے شک تھے لیکن کثرت افواج سے بے نیاز۔ بغیر کسی مسلح فوج کے، بغیر کسی دنیاوی محافظ کے، بغیر کسی محل کے اور بغیر کسی معینہ آمدنی کے۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے کا مدعی ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی طرف کا بھیجا ہوا بادشاہ تھا تو یہ صرف محمدؐ کی ذات ہے۔ وہ بغیر ذرائع کے تمام قوتوں کے مالک تھے خطابات اور رسمی باتوں سے بلند تھے اور دربار کی آداب و قواعد سے الگ تھے۔ وہ حق کے طالب تھے۔ لباس اور قوت کے مشتاق نہ تھے۔ اُن کی اندرونی اور بیرونی دونوں زندگیاں یکساں تھیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے "عدیم المثال خوش قسمتی سے تاریخ میں محمدؐ ایسی کوئی ایک

ہستی بیک وقت تین فرائض انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی یعنی یہ کہ محمد ایک قوم کے بانی ہوئے ہیں۔ ایک سلطنت کے بانی ہوئے ہیں اور ایک مذہب کے بانی ہوئے ہیں۔ ایسی مثال کوئی دوسری نہیں مل سکتی۔"

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ محمد مصطفےٰ نے اُس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "اُن کو ہر شخص پر خود اُس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے" کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قرشی عورت کا بیٹا ہوں جو شوربے میں روٹی چور کر (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی (طبقات ابن سعد ج ا قسم ا مطبوعۂ لیدن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۴)

یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں شریعت الٰہیہ کی رہبری سے الگ حکمران کا کوئی مستقل تخیل پیدا نہ ہو اور سوائے خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

ع۱ "چونکہ رسول اللہ کی تعلیم آسان اور دل میں اُتر جانے والی تھی "جیو اور جینے دو" کے زرین قاعدے اس میں پوشیدہ تھے، نیک دل لوگ جوق در جوق اسی دین میں آنے شروع ہو گئے" اس کے علاوہ ع۲ "عوام کو جذب کرنے کے لیے اسلام نے بہت سی جاذب چیزیں پیش کیں اور قدیم روایات وخصوصیات کو ترک کر دینے پر اُن کو خوب دولت وثروت دی۔ اسلام نے اُن کے تحفظ اور بچاؤ کا بندوبست کیا۔ سوسائٹی میں اُن کے وقار کو اتنا بلند کیا جس کا کہ خیال وہ ایام جاہلیت میں کبھی بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسلام نے غریب ترین انسان کو انتہائی دولتمند کے برابر قرار دیا۔ غلامی کی بدنصیبی کی زحمتوں میں کمی پیدا کرائی اور عورتوں کے مرتبہ کو بلند کرایا ان باتوں سے عربوں نے شروع میں تامل واکراہ کیا اور وہ متزلزل وغیر مطمئن رہے لیکن پیغمبر کی پکار نے رفتہ رفتہ ان کے دلوں کو مسخر کر لیا اور وہ بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے" اور وقتی طور پر اور ایک دم سے اُس نے قوم میں ایک ایسی کایا پلٹ کر دی جسے حیرت انگیز کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ع۳ "پیغمبر کی تاریخ تربیت کا نمایاں ترین معجزہ یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کے کانوں میں زندگی

ع۱ آغا طاہر نبیرۂ آزاد ع۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ع۳ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

کے معنی اپنے خاص انداز سے اس طرح ڈال دیئے کہ ہر مُسلم کو اُس کے اعتماد نفس اور ایمان نے سَو سَو آدمیوں کے مقابلہ میں بنا دیا تھا۔ اسلام نے ہر مُسلم پر واضح کر دیا تھا کہ زندگی کا آخری مقصد عمل اور بنی نوع انسان کو مجموعی حیثیت سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ راستے پر لگانا ہے "ع۵ آنریبل سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد کی جلد دوم کے صفحہ ۲۶۹ و ۲۷۱ مطبوعہ ۱۸۶۱ء میں تحریر کرتے ہیں کہ" ہجرت سے تیرہ برس پہلے تو مکہ ایسی ذلیل حالت میں بیجان پڑا تھا مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا کہ سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بُت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی اور اپنے اعتقاد کے مطابق وحی الٰہی کی ہدایت کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ اُس قادر مطلق سے بکثرت و بہ شدت دعا مانگتے۔ اُسی کی رحمت پر مغفرت کی امید رکھتے اور حسنات و خیرات اور پاکدامنی اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اب اُنھیں شب و روز اُسی قادر مطلق کا خیال تھا اور یہ کہ وہی رزاق ہمارے ادنیٰ حوائج کا بھی خبر گیراں ہے"

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی عمارتی تشکیل کا تعلق ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں یہ خواب ایک مطابق تعبیر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے آگیا اور لاکھوں آدمی اُس کے تسلیم کرنے والے اور اُس کو حق کہنے والے ہو گئے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس انقلاب کے پیدا کرنے میں رسول کو کتنی دقتیں درپیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت پسندی یا قدامت پرستی کے امتیازات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری "آفتاب کی روشنی سب کو نہیں بھاتی۔ چمگادڑ کے لیے مہر نیمروز کی شعاعیں اور تیروں کی بارش یکساں ہے۔ اس کی آنکھوں کا ہر ستارہ تاریک رات کی اندھیاری ہے جس میں چاند مُنھ لپیٹے پڑا ہو اور تارے آنکھ موندے سو رہے ہوں۔ اسی طرح اصلاح و ہدایت کا خیر مقدم سب انسان ایک طرح نہیں کرتے"۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ اُلفت رکھتے ہیں اس لیے اُنھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بغض للّہی" ہوتا ہے "بغض للّہی" کا مطلب ہے کہ چاہے اُس انقلاب کا اُن کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور اُنھیں اُس سے کوئی نقصان بھی نہ پہونچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے مفاد

ع۵ ناموس اسلام

قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور انھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ یہ منافع خواہ مالی حیثیت کے ہوں یا وجاہت و اقتدار کی حیثیت کے۔ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اُس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اُس سے مختلف طرح کے ذاتی نقصانات بہت سی قسم کے لوگوں کو پہونچ رہے تھے یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے اُن مہاجنوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنے ہوس دولتمندی کے پورا کرنے پر تھی، پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو اور ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو مقناطیسی کشش کے ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر مہاجن اور سرمایہ دار لوگ خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ جبکہ اُن کی زندگی کا دارومدار جن لوگوں کے روپیہ پر تھا اُنھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی یہ تعلیم کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اعمال و فرائض کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہو سکتا اُن لوگوں کے اقتدار پر کاری ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی جائداد پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریۂ تفوق و امتیاز بدل کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبانِ اقتدار جتنے تھے وہ چونکہ اسلامی معیار عزت کے لحاظ سے (۰) کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے اور جو لوگ پردیسی ہونے کی وجہ سے یا غریب ہونے کی وجہ سے یا اُن لوگوں کی نگاہ میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ اُٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جاتے تھے وہ بڑے صاحب عزت ہو گئے اس لیے کہ وہ عمل کی کسوٹی پر پورے تھے اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں درجۂ کمال پر فائز تھے یہ بات اُن لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیسے گوارا ہو سکتی تھی جو اب تک عزت کی مسند پر اطمینان کے ساتھ براجے رہے تھے اور جو خلق خدا کو خدا کے بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

چنانچہ ع۵ مکے کے باشندوں میں اسلام اس نئی روح کے پھونکنے اور اخلاق کا یہ نیا معیار

ع۵ خواجہ غلام السیدین صاحب

قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ نفسیات کے اس بڑے تجربہ اور تمدن کی اس نئی تنظیم کو ردِ عمل اور ظلمت کی خوفناک طاقتوں سے تصادم پیدا ہوا۔

"اسلام کے بنیادی اصولوں کی اجنبیت اور ندرت ایسی چیز نہ تھی جس نے کہ انھیں رسول کے خلاف بغاوت پر مائل کیا ہو بلکہ جو چیز اس بغاوت کا سبب ہوئی وہ یہی کہ اسلام اُنھیں سدھارنا چاہتا تھا، ان کے سماج کی پوری عمارت کو نئے طریقہ سے بنانا چاہتا تھا اور اُن کی مرغوب ترین رسموں کو فنا کر دینا چاہتا تھا جس طرح یہودی فقہا نے عیسیٰ کے خلاف بغاوت کی تھی جو کہ انہی میں سے ایک تھے اور اُن کے فلاح و بہبود کے خواہاں تھے بس اسی طرح رسول سے بھی مقابلہ کرنے والے عرب انتہائی غیظ و غضب، بغاوت کے پورے عزم اور شدید قسم کے مظالم کے لیے تیار تھے جس طرح کورانہ سب و شتم اور نفرت نے یہودی پادریوں کو جناب عیسیٰ کے خون کا پیاسا کر دیا تھا اسی طرح عرب میں ایک خاندان جو کہ رسول سے برسرپیکار ہو گیا اگرچہ کسی مذہب کے ارکان پر مشتمل نہ تھا۔ تاہم اپنے ذاتی اغراض و مقاصد رکھتا تھا جس کو کہ اسلام اُن سے سلب کرنا چاہتا تھا پہلے تو انھوں نے (بخیال خود) اس "معمولی انسان" اور "پاگل شاعر" کی بات پر قطعاً توجہ نہ کی بلکہ وہ رسول کا مضحکہ اڑاتے اور طنز و استہزا کرتے رہے لیکن انھیں بہت جلد ہی احساس ہوا کہ یہ "پاگل شاعر" بہر حال نرا پاگل ہی نہیں تھا اور یہ کہ اس کے الفاظ اُن کی قوت و اقتدار کو صدمہ پہنچانے کے لیے کافی ہیں وہ نہایت تفکر و تشویش کے ساتھ رسول کے پیروؤں کے بڑھتے ہوئے حلقے کو دیکھ رہے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ چھوٹی سی نالی چشمہ کی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور بہت جلد اپنے سیلاب میں اُن کو اور اُن کے مقاصد کو بہا لے جائے گی وہ اب نہایت شدت اور انہماک کے ساتھ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے کوشاں ہوئے اُن کی مخالفتیں استحکام حاصل کرتی گئیں اور اُن کی دشمنی رسول کی ہر نئی کامیابی کے ساتھ بڑھتی گئی۔" ان کے ہاتھوں پیغمبر کو غیر معمولی تکالیف اور شدائد کا سامنا کرنا پڑا جن کا آپ نے غیر معمولی استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مکہ کی آپ کی زندگی ان دکھ بھری داستانوں سے بھری ہوئی ہے اس مخالف جماعت میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے بہت پیش پیش قبیلۂ بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا جو امام حسین کے قاتل یزید کا دادا ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت

ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

بہت قدیمی تھی۔ اتنی قدیمی کہ عوام نے اُس کو ایک طبعی اور قدرتی بات سمجھ لیا اور اس کے لیے یہ حکایت بیان کی جانے لگی کہ ابوسفیان کا پردادا عبد شمس اور بنی ہاشم کے مورث اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انگلی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چپکی تھی۔ مجبوراً تلوار لائی گئی اور درمیان سے کاٹ کر الگ الگ کئے گئے اس وقت کاہنوں نے کہدیا کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی۔ یہ حکایت درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہی کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی جڑ پکڑ لی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں عبد شمس اور ہاشم میں جنگ یا منازعت کی کوئی مثال نہیں ملتی بے شک عبد شمس کے بعد امیہ کی طرف سے مخاصمت کی ابتدا نظر آتی ہی جبکہ وہ اپنے چچا حضرت ہاشم کے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اُس نے ایک شکست خوردہ فریق کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ حال ہو گئے۔ حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں سے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اُس کی روٹیاں پکوائیں اور اُنھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ ان روٹیوں کو اُنھوں نے چورا کرایا اور ان اونٹوں کو نحر کر کے شوربا تیار کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں انڈلوا کر وہ تمام روٹیوں کا چورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا اس کھانے کو عرب میں "ثرید" کہتے تھے۔ اس طرح اُنھوں نے تمام مکہ کے لوگوں کو کھانے سے سیر کیا اتفاق سے اسی کے بعد ابر آیا۔ پانی برسا اور قحط سالی دور ہو گئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو "ہاشم" کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنی ہیں روٹیوں کا چورا کرنے والا شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ عبد اللہ بن زبعری نے کہا ہے :-

عمرو العلیٰ ھشم الثرید لقومہ ورجال مکۃ مسنتون عجاف

"بلند مرتبہ عمرو نے (یہ ہاشم کا اصلی نام ہی) اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے اُنھیں کھانا کھلایا اس حالت میں کہ تمام مکہ کے لوگ قحط سے بھوکے اور تباہ حال ہو رہے تھے"

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اُس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اُسے غیرت دامنگیر ہوئی اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اُتارنے کی کوشش کی مگر اتفاق سے وقت کی بات یا یوں کہئے کہ دل کی بات کہ وہ ہاشم کی نقل اُتارنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا اور

اُس کا یہ طرزِ عمل تمام قریش میں اُس کی رُسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی تصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اُس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحب فخر و لائق عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن لوگ منتخب کئے جاتے تھے جو علم قیافہ اور نجوم میں بھی بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے اُمیہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر آپ کو معلوم ہے کہ لوگ ان باتوں سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو تاننا شروع کر دیا اور مجبور کیا۔ آخر آپ کو بھی جوش آگیا اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمین مکہ میں نحر کئے جائیں۔ اور دس برس کے لئے وہ مکہ سے جلاوطن ہو جائے۔ اُمیہ اس شرط پر رضامند ہو گیا اور قبیلۂ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا۔ اُس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اُمیہ کے خلاف کیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کئے اور اُنھیں نحر کرا کے پھر تمام اہل مکہ کی دعوت کر دی اور اُمیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ ہاشم اور اُمیہ کے درمیان پہلی عداوت تھی (طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن (ہالینڈ) ج ا قسم اص ۴۳ و ۴۴)

اب عرب قوم کی کینہ پروری تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ کیا یہ داغ اُمیہ اور اُسکی اولاد کے دلوں سے مِٹ سکتا تھا؟ پھر جبکہ بنیاد اُس کی حسد پر تھی اور حسد کی بنیاد فریق مقابل کی رفعت اور امتیاز کے حصول پر، اور اس رفعت اور امتیاز میں اُس فریق کے اُس کے بعد اضافہ ہوتا جائے تو شکست خوردہ فریق کے حسد میں بھی اُسی تناسب سے اضافہ ہونا ناگزیر ہے اور اس حسد کے شعلے جتنے بھی اُٹھ سکتے ہوں وہ اُٹھتے رہنا لازمی ہیں۔

یہ بھی ایک بات آپ کو اس واقعہ میں ملے گی کہ اسی وقت سے اُمیہ کی خصوصیت شام سے اور ہاشم کی خصوصیت حجاز سے قائم ہو گئی ہے۔ اس کا تاریخ کے آئندہ دور میں اس صورت سے قائم رہنا چاہے اتفاق کہہ لیجیے اور چاہے اس کی کوئی دوسری تاویل کر سکتے ہوں تو کیجیے۔ آپ کو واقعہ

کے لحاظ سے اس کا پورا حق حاصل ہے۔

عـ۱ "بار بار شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیہ نسلی طور پر عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور اُن کے اندر دنائت، فریب، احساس کمتری اور دوسرے اس طرح کے مرکبات پیدا ہو گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کے یہاں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں سامنے سے مقابل پر حملہ کے لیے نہیں اُٹھتیں بلکہ وہ بغل سے یا پیچھے سے حملہ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر خاموش معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کا ہر قدم کسی سازشی حکمت عملی کے لیے اُٹھتا ہے۔"

بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افراد عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابل غور بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔

عـ۲ "رسالہ تنزیہ الانساب میں جس کے مصنف مولوی محمد ماہ عالم صاحب چشتی ہیں حصہ دوم باب چہارم میں ابو سفیان کے نسبی سلسلہ کے متعلق لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ عبد الشمس کا کوئی فرزند امیہ نامی نہ تھا۔ ہاں ایک غلام ذکوان نامی تھا جس کو امیہ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اصابہ ابن حجر عسقلانی جلد اول ص۲۱۵ میں ہے کہ جب ثوب دربار معاویہ میں پہونچے تو انھوں نے اثنائے کلام میں معاویہ سے کہا کہ تم لوگ جھوٹا دعوے کرتے ہو کہ امیہ عبد الشمس کا بیٹا تھا بلکہ حقیقت میں ذکوان غلام عبد الشمس تھا جس کو حقیر سمجھکر لوگ امیہ کہتے تھے۔ کتاب روض الانف سہیلی میں ہے کہ ایک بار معاویہ نے دغفل صحابی سے جو بہت کبیر السن تھے پوچھا کہ آپ نے حضرت عبد المطلب کو بھی دیکھا تھا انھوں نے کہا ہاں دیکھا تھا وہ شیخ جسیم و وسیم تھے۔ ان کے دسوں بیٹے تاروں کی طرح گھیرے رہتے تھے۔ پھر معاویہ نے پوچھا کہ آپ نے امیہ کو بھی دیکھا تھا۔ کہا ہاں دیکھا تھا، وہ چندھا، کنجا اور بدشکل عبد الشمس کا غلام تھا۔ معاویہ نے کہا وہ عبد الشمس کا بیٹا تھا۔ کہا ہاں تم لوگ ایسا ہی کہتے ہو مگر حقیقت میں وہ ذکوان غلام عبد الشمس تھا اور اسی کو اُمیہ کہتے تھے۔"

عرب قوم کے یہ تاثرات بنی امیہ دیکھتے تھے اور گھبرا گھبرا کر بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہوتی تھی۔ عـ۳ "بنی ہاشم کی ہر ترقی بنی امیہ کی اُمنگوں کا تابوت بنتی جا رہی تھی۔ انھیں یہ اچھا تھوڑی معلوم ہوتا تھا کہ عبد المطلب کو "سید العرب" کہا جائے یا خانۂ کعبہ

عـ۱ سید احتشام حسین صاحب بالی ایم اے عـ۲ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی عـ۳ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں یا عرب کے دور دراز کے لوگ جب آئیں تو عبدالمطلب ہی کا پتہ پوچھتے ہوے آئیں۔ لیکن ہونا یہی تھا — محمد مصطفیٰؐ بھی اُٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی چوٹ تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے! مولانا شبلی سیرۃ النبی جلد اول ص۱۵۸ پر لکھتے ہیں کہ "آنحضرت کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت کی مخالفت کی" حقیقۃً ع۱ "اب اس کا موقع نہیں رہ گیا تھا کہ بنی امیہ خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوے بیٹھے رہیں اور بنی ہاشم کو عزت کے ساتھ ترقی کی روشن منزل میں قدم رکھتے ہوے دیکھیں اور خود اپنے کو وقار و عزت کی مسندوں سے برطرف پائیں۔ ان کا دنیاوی اقتدار، عرب میں اُن کا سیاسی اثر اور اُن کے تمام ذاتی اغراض اس وقت خطرہ میں تھے اور اس لیے انھوں نے شدید مخالفت کا محاذ اسلام کے خلاف قائم کر دیا اور اس نئے مذہب کی ترویج و اشاعت میں روڑے اٹکانے لگے" اس وقت بنی امیہ کے روایتی خصوصیات کا ورثہ دار ابوسفیان ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ ع۲ "اُس نے دیکھا کہ محمدؐ کی آواز نے سارے عرب کو ہلا دیا ہے۔ اس وقت وہ اگر محمدؐ سے ٹکرائے گا تو سارا عرب اُس کو پہچان لے گا اس لیے اُس نے عرب کے اوباشوں کو اکٹھا کیا اور سب کو حضرت محمدؐ کے خلاف اُبھار دیا" آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں جسم پر پتھر مارے گئے۔ سر پر کوڑا پھینکا گیا۔ نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس سلسلے کے کچھ واقعات کا تذکرہ پہلے حصہ میں آ چکا ہے۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھا تو حضرتؐ کے چچا ابوطالب نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ ع۳ "ابوطالب کا رسول کو آخری مرتبہ پھر پناہ دینا تھا کہ ان قریشیوں میں بے حد خفگی بڑھ گئی اور اسی کو بہانہ بنا کر ابوسفیان نے اپنی جماعت کو تیار کر کے تمام قریش سے ہاشمیوں کا بائیکاٹ کرا دیا اور ایک عہدنامہ جاری کیا گیا جس کی رو سے ہاشمیوں سے نہ شادی بیاہ جائز ہوگا اور نہ اُن کے ساتھ تجارت جائز ہوگی یہاں تک کہ ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہونچنے نہ دیا جائے گا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال یعنی ۶۱۶ء کا ہے" تین برس کے بعد یہ بائیکاٹ ختم ہو گیا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے تو کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ابوطالب اور خدیجہ کی وفات کے بعد اس مخالفت نے

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی ع۲ مولانا مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری
ع۳ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

امتاز ور پکڑا کہ آپ کو ختم کر دینے کی پوری اسکیم تیار کر لی گئی۔ جس کے بعد مجبوراً آپ کو اپنے دیس سے نکل کر پردیس کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔

مدینہ میں آکر بھی مخالفین نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ایک طرف تو اُن لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانے لگے۔ حالت یہ تھی کہ عہ "قریشیوں نے جن مردوں اور عورتوں کو اسلام قبول کرتے ہوئے دیکھا اُنھیں عرب کی چلچلاتی دھوپ اور تپتی ریت کی نذر کر دیا جب وہ شدت تشنگی سے جاں بلب ہو جاتے تو اُن کے سامنے بت پرستی کی قدیم رسموں کی طرف پلٹنے یا پھر موت قبول کرنے کی تجویز پیش کی جاتی۔ ایسے لوگوں میں سے ایک **بلال** بھی تھے جو حبش کے پہلے ثمر اور اسلام کے پہلے مؤذن "کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اُن کا مالک **امیہ بن خلف** ہر روز بطحا کی تپتی ریگ پر اُنھیں لٹا کر ایک بھاری پتھر اُن کے سینہ پر رکھتا تھا لیکن اذیت رسانی کی یہ تمام تدبیریں بے سود ہوتی تھیں۔ بیچارے **یاسر** اور اُن کی زوجہ **سمیہ** کی ظلم وستم سے زندگی ہی ختم کر دی **عمار** کو بھی سخت تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔"

دوسری طرف آپ کے جائے پناہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ اُن لوگوں کے گھر بار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدان مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آکر ہوئی **بدر** کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے صرف تین سو تیرہ (۳۱۳) آدمی جن کے اندر سوار ہونے کو صرف دو (۲) گھوڑے اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلوار نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دئیے۔ حضرت **حمزہ بن عبدالمطلب** حضرت **عبیدہ بن حارث** اور حضرت **علی بن ابیطالب** نے وہ کارنمایاں دکھلایا کہ مخالفوں کی ہمت پست ہو گئی اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہونچا کہ حضرت **عبیدہ** اس جنگ میں شہید ہو گئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ عہ۲ اس میں **ابوسفیان** کو محض اپنے بیٹے **حنظلہ** کی وفات ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا بلکہ اُس کا ایک دوسرا بیٹا **عمرو** بھی قید کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح اُس کی بیوی **ہندہ** کو بھی اپنے باپ **عتبہ** اور اپنے

عہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ عہ۲ سید امتیاز حسین صاحب

بھائی ولید کا ماتم کرنا پڑا۔ ابوسفیان نے دو سو تیز سواروں کو اکٹھا کیا اور ان میں ہر ایک کو ایک بوری ستو کی دی۔ جب وہ بڑھا تو اس نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک سر میں تیل نہ لگائے گا، ڈاڑھی میں خوشبو نہ لگائے گا اور نہ کسی عورت سے مطلب رکھے گا جب تک کہ وہ رسول سے مڈبھیڑ کرکے علی اور حمزہ کو قتل نہ کرے۔ مدینہ کے حدود میں تقریباً تین میل پہونچ کر اس نے رسول کے دو پیرووں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ رسول مع اپنے پیرووں کے جنگ کے لیے نکل پڑے ابوسفیان مقابلہ کے وقت اپنے تمام قول و قسم کو بھول گیا اور گھوڑے کو مہمیز دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ فوج والوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ستو کی بوریوں کو اپنے پیچھے پھینک کر بھاگے اس جنگ کو اسی وجہ سے "جنگ سویق" کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سویق کے معنی ستو کے ہیں۔

ہجرت کے تیسرے سال اسلام کے لیے وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحد کی جنگ کہتے ہیں عکرمہ بن ابی جہل۔ ابوسفیان اور ہند کو اس وقت تک کہاں چین پڑتا جب تک کہ وہ مدینہ والوں سے انتقام نہ لے لیں۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں ان کی فوج میں قریشیوں کے علاوہ خاندان کنانہ اور تہامہ کے قبیلے بھی شامل تھے۔ فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے جن میں سات سو زرہ پوش تھے عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے افسر تھے اور خاص بات یہ ہے کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہند چل رہی تھی جس کے ہمراہ پندرہ مکہ کی عورتیں تھیں یہ ان کے ہاتھوں میں ڈھول تھے اور میدان جنگ میں وہ ڈھول بجا بجا کر بہادروں کی ہمت افزائی کر رہی تھیں۔ ہند کے یہ اشعار اس موقع کے بہت مشہور ہیں۔

نحن بنات طارق   نمشی علی النمارق

ان تقبلو انعانق   او تدبروا نفارق

فراق غیر وامق   (استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۷۸۶)

"طارق" ستارے کی صفت آتی ہے اور اس لیے اگر یہ اشعار خود ہند ہی کے نظم کیے ہوئے ہیں تو یہ معنی ہیں کہ ہم حسن و جمال میں یا بلندی مرتبہ میں ستارہ ہائے فلک کی لڑکیاں ہیں، ہم ناز و نعمت سے ریشمی گدوں پر چلنے پھرنے والیاں ہیں۔ اگر تم دشمن کے مقابلہ میں پیش قدمی کرو گے اور آگے بڑھتے جاؤ گے تو ہم تمھیں اپنے گلے سے لگائیں گے اور اگر تم ہٹ پھر جاؤ گے تو ہمیشہ کے لیے ہم تم سے الگ

ہو جائیں گے، ایسا الگ ہونا جس کے ساتھ مہر و محبت کا کوئی جذبہ باقی نہ رہے گا۔" مگر سہیلی مصنف روض الانف کا خیال ہے کہ یہ شعر جو ہند گا رہی تھی خود اس کے نہیں ہیں بلکہ وہ اس کے پہلے کی ایک اس کی ہمنام ہند بنت طارق بن فیاض الاودیہ کے اشعار ہیں جو اس نے فرس وایاد کی جنگ میں کہے تھے۔ اس صورت میں طارق شاعرہ کے باپ کا نام ہے اور مطلب بالکل صاف ہے۔ ہند کا گانا ان اشعار کو بطور تمثیل اور مناسبت موقع کے تھا۔

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ع۵ "جب یہ فوج ابواء نامی قریہ سے گزر رہی تھی جہاں کہ رسول کی ماں آمنہ دفن تھیں تو اس وقت ہند نہایت مشکل سے ان کی بوسیدہ ہڈیوں کے ساتھ بے حرمتی کرنے سے روکی جا سکی اور احد کی جنگ میں جب رسول کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو یہ ہند جذبۂ انتقام میں اپنی صنف بلکہ انسانیت کے حدود سے گزر گئی۔ اس نے اس بربریت کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہ کا پہلو چاک کرا کے ان کا جگر نکلوایا اور اسے منہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلوبند اور سینہ بند بنایا۔"
مولانا شبلی سیرۃ النبی ص ۲۷۳ میں لکھتے ہیں "خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بدلا لیا۔ ان کے کان ناک کاٹ لیے ہند (معاویہ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا حضرت حمزہ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے اتر نہ سکا اس لیے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو "جگر خوار" لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔" ابن عبد البر نے تو یہ روایت تک لکھدی ہے کہ اس نے حضرت حمزہ کے جگر کو بھون کر کھا لیا (استیعاب مطبوعہ حیدرآباد دکن ج ۲ ص ۷۸۶) آپ اس سے اس عناد اور دشمنی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں بنی ہاشم، پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں بھی آخر میں بنی ہاشم کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت میں واپس گئے۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسول کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے ایک دفعہ آخری کوشش انھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

اُن کو مل سکتی تھیں سب کو متحد کیا یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے وہ اُس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی جتھہ بندی کی وجہ سے "جنگ احزاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہی مگر وائے ناکامی کہ اس مرتبہ بھی شکست کا روز بد دیکھنا نصیب ہوا اور اُن کا وہ مایۂ ناز سورما جو اکیلا ایک ہزار آدمیوں کے مقابل سمجھا جاتا تھا علی بن ابیطالب کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اُترا۔ ابوسفیان کو باحال خستہ و تباہ مکہ واپس جانا پڑا۔ اور اب ہمت مقابلہ و لشکر کشی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے ہوئے تھے وہ بھر تھوڑی سکتے تھے۔

پیغمبر اسلام نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکین قریش کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوتی تو آپ نے مکۂ معظمہ کے حج کا ارادہ کیا۔ ع۵ "مہاجرین کو اپنے وطن مالوف سے نکلے ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ وہ جلاوطنی کے عالم میں مصائب و آلام کے خوگر بن چکے تھے اور انھوں نے اپنی سب چیزوں کو اسلام کی خدمت کے لیے تج دیا تھا۔ مگر چونکہ وہ انسان تھے۔ اُن کے دلوں میں بھی آرزو ہوسکتی تھی کہ وہ اپنی جائے پیدائش تک جہاں وہ زندگی کا زیادہ حصہ گزار چکے تھے ایک مرتبہ اور پہونچ جائیں اُن کے دل میں یہ خیال برابر آتا ہوگا کہ وہ کسی طرح اپنے وطن مکہ کو جائیں چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہی کہ جب رسول نے خانۂ کعبہ کے طواف کا عزم لوگوں پر ظاہر کیا تو ہزاروں مہاجرین نے لبیک کا نعرہ بلند کیا لہٰذا مارچ ۶۲۹ء میں رسول اپنے متبعین کے ساتھ مکہ کو روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسول کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ مکہ کے باہر رسول کا راستہ روکنے کے کوشاں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے آپ کو اس شہر مکہ میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے آپ کے ان لوگوں کے قلبی عناد کی کیفیت کا اندازہ پورے طور پر ہوسکتا ہے مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسول نے اُن سے صلح کی خواہش کی۔ بڑی وقت کے بعد ایک صلح نامہ مرتب ہوا جس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) رسول اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر حج کئے ہوئے واپس جائیں۔

(۲) دس سال تک آپس میں جنگ نہ ہو۔

(۳) اگر کوئی مکہ والوں میں سے جا کر مسلمانوں میں شامل ہو جائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

وہ اُسے واپس کردیں۔

(۴) اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آجائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۵) عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار ہے کہ چاہے وہ رسول کے ساتھ معاہدہ کرلیں یا مکہ والوں کے ساتھ ہو جائیں۔

(۶) سال آئندہ مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکیں گے۔

(۷) مسلمان اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ آسکتے ہیں یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھکر۔"

پیغمبر نے اس لیے کہ جارحانہ حملہ کا الزام عائد نہ ہو ان غیر منصفانہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مشرکین حقیقۃً اپنے جذبۂ عناد سے مجبور تھے وہ واقعی اپنی آنکھوں سے آپ کو خانۂ کعبہ کے پاس باطمینان اپنے طریقہ کی عبادت کرتے نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے تین دن کے لیے شہر خالی کردیا اور رسول اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔

میور نے لکھا ہے "وہ منظر کتنا عجیب و غریب تھا کہ جو اس وقت وادی مکہ میں نظر آرہا تھا، ایسا منظر جو دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ قدیم شہر تین روز تک اپنے تمام باشندوں سے خالی ہوگیا ہے جن میں بلند و پست سب ہی شامل ہیں۔ ایک ایک مکان ویران ہے اور جب وہ جارہے ہیں تو وہ نئے لوگ جو مدتوں سے جلاوطنی میں دن گزار رہے تھے خوشی خوشی اپنے بچپن کے خالی مکانوں کی طرف دوستوں کے ساتھ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور تھوڑے سے معین وقت کے اندر ہی حج کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ شہر کے بیرونی باشندے بلندیوں پر چڑھ کر نیچے اپنے نئے مہمانوں کی آمد و رفت کو دیکھ رہے ہیں جو رسول کی قیادت میں خانۂ کعبہ کا طواف کررہے ہیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر رہے ہیں۔"

پیغمبر نے حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے اور قبیلۂ خزاعہ کو جو رسول کا حلیف ہوا تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تہ تیغ کردیا۔ پیغمبر کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف

قبیلہ کی امداد کے لیے فوراً روانہ ہو گئے ۔ اب بھی رُخ مکہ ہی کی طرف تھا مگر تیور بدلے ہوئے تھے مشرکین میں طاقت مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں ۔ اُنھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھے اور رسول فاتحانہ شان سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ۔ عــه "جس شہر کو ابھی آٹھ برس ہوئے رنج و حسرت کے ساتھ چھوڑا تھا وہی شہر اللہ نے نہایت برتری اور کامیابی کے ساتھ آپ کے قبضہ میں دیا ۔ بڑے بڑے سخت اور متعصب اکابر قریش مسلمان ہوئے بعض دباؤ سے ، بعض اپنی خوشی سے اسلام کی حقانیت اور جاہ و جلال کو دیکھ کر ۔ اب حضور انور کا رحم و کرم ملاحظہ کیجیے کہ اُن لوگوں کو جن سے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچی تھیں ، جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا تھا فتح مکہ کے وقت ان کی تمام خطائیں معاف کر دی گئیں ۔ فتح کے موقع پر جب لوگ بیعت کر رہے تھے آپ نے اُن سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو ۔ سب نے جواب دیا خیراً اخ کریم و ابن اخ کریم "ہمیں اچھائی ہی کی امید ہے ۔ آپ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے فرزند ہیں" آپ نے فرمایا اذھبوا فانتم الطلقا "جاؤ تم لوگوں کو چھوڑ دیا" اس کے بعد حضور نے بیت اللہ کا طواف کیا اور جو تصویریں خانہ کعبہ میں بنی ہوئی تھیں ان سب کو محو کر دیا ۔"

عــه۲ "اسٹینلی لین پول لکھتا ہے " اب رسول کے لیے اپنی خون کی پیاسی طبیعت کے مظاہرہ کا وقت آگیا تھا ۔ اُن کے ستانے والے اب ان کی مٹھی میں تھے ۔ کیا اب رسولؐ کا فرض تھا کہ اُنھیں کچل ڈالیں ، اُن کو شکنجہ میں کسوائیں اور اُن کے ساتھ اسی طرح ظالمانہ سلوک کریں جیسا کہ اُنھوں نے آپ کے ساتھ کیا تھا ۔ اب انسان اپنے اصلی رنگ روپ میں ظاہر ہو گا ۔ آؤ ہم اُسے متوحش نگاہوں سے دیکھیں اور شرم کا نعرہ پہلے ہی سے لگا دیں لیکن یہ سب کیا ؟ سڑک پر کیوں خون کا دھبا تک نہیں ہے ؟ کہاں ہیں ہزاروں انسانوں کی لاشیں جو ذبح کر ڈالے گئے ہیں ؟ یہ ایک واقعہ ہے کہ محمد کی سب سے عظیم فتحمندی کا وقت وہی ہے جس وقت کہ اُنھوں نے اپنے نفس پر بھی عظیم فتح حاصل کی ۔ رسول نے نہایت فراخ دلی سے قریشیوں کے تمام افعال قبیحہ اور ایذا رسانیوں کو جو کہ اُنھوں نے آپ کے خلاف جائز رکھی تھیں معاف کر دیا ۔ رسول کے مجاہدین نے بھی اُن ہی کی پیروی کی اور نہایت امن و آشتی کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے ۔ نہ کسی کے مکان کو لوٹا اور نہ کسی عورت کی تذلیل کی ۔" باشعور سمجھنے

عــه مرزا محمد عسکری صاحب بی اے ۔ عــه۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ۔

کہا ہے "محمد کی فتح مکہ کو ماریس کے داخلۂ روم سے موازنہ کرو اور بعد کے تمام واقعات کا ایک دوسرے سے تقابل کرتے جاؤ اپنی اپنی قوت کو نئے سرے سے حاصل کرنے کے بعد دونوں کے اقدامات کو الگ الگ دیکھو اور بس۔ تب تم عرب کے پیغمبر کی فیاض و بلند اور رواداری طبیعت کا اندازہ کر سکتے ہو۔" عا۱ مخالفین ناامیدی کی حالت میں حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ان کی قوت جواب دے چکی تھی اور باوجود اسکے کہ ان کے دلوں میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن ان کی زبانوں پر اسلام کا نام تھا۔"

اب بنی امیہ کے سرگروہ ابو سفیان نے بھی اسلام قبول کر لیا عا۲ "دوسری لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ابو سفیان نے اس انقلاب کا ساتھ دینے کے لیے ارادہ کر لیا جو انکی ذاتی امنگوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔" اور سُنیے کہ ابو سفیان کی بیوی ہند نے بھی جس کے انتقامی جذبات کی تصویر آپ جنگ اُحد میں دیکھ چکے ہیں اسلام قبول کر لیا! مولانا شبلی سیرۃ النبی ص۲۸۰ میں لکھتے ہیں "ہند فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے"

تاریخ میں ابو سفیان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ اُسے لکھنا ضروری ہے :-

حضرت عباس بن عبدالمطلب اور ابو سفیان میں پرانے زمانہ کی دوستی تھی۔ عباس نے اس کے پہلے بھی بارہا سمجھانے کی کوشش کی تھی اور رہا تھا کہ ابو سفیان اسلام قبول کر لے مگر نتیجہ میں ناکامی ہوئی اب حضرت رسول کی فتح مکہ کے لیے جو روانگی ہوئی اور آپ سرزمین مکہ کے قریب پہنچے تو حضرت عباس نے ابو سفیان سے کہا کہ چلو میں تمھیں اپنے بھتیجے کے لشکر کا تماشا دکھلاؤں۔ اُسے ساتھ لے کر مکہ سے باہر ایک پہاڑ کی بلندی پر چلے گئے اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں رسولؐ کی فوج اُس طرف سے گزرنے لگی حالت یہ تھی کہ لشکر اسلام مختلف قبائل اور جماعتوں کے لحاظ سے علیحدہ دستوں کی شکل میں اپنے اپنے سردار کی قیادت میں آ رہا تھا اور ہر دستہ کے بعد دوسرا دستہ اتنا پر شکوہ اور شاندار معلوم ہوتا تھا کہ ہر مرتبہ ابو سفیان گھبرا کر پوچھتا تھا کہ کیا یہی تمھارے بھتیجے کا لشکر ہے اور عباس ہنس کر کہہ دیتے تھے کہ نہیں یہ تو فلاں سردار کا جتھا ہے۔ یہاں تک کہ سب کے آخر میں حضرت پیغمبر خاص بنی ہاشم کے گروہ کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے اور جناب عباس نے بتلایا کہ اب یہ میرے بھتیجے کا خاص دستہ ہے۔ ابو سفیان پر اس منظر کو دیکھ کر بڑی

عا۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب عا۲ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

ہیبت طاری ہوئی اور اُس نے کہا پھر اب؟ حضرت عباس نے کہا اب کیا سوائے اس کے کہ اسلام قبول کرو۔ اُس نے کہا کیونکر؟ آپ نے کہا میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میں جانتا ہوں کہ میرا بھتیجا کریم النفس ہے وہ تمہارے اسلام کو قبول کرے گا چنانچہ حضرت عباس ابوسفیان کو لے کر رسول کے لشکر میں پہونچ گئے اور خیمۂ حضرت کی طرف متوجہ ہوئے مُسلمانوں کا دل ابوسفیان کے ہاتھوں اتنا دکھ چکا تھا کہ جونہی حضرت عمر کی نظر ابوسفیان پر پڑی فوراً تلوار لے کر جھپٹ پڑے اور کہا میں اس دشمن خدا کو قتل کرونگا مگر حضرت عباس نے منع کیا اور کہا ہمیں خدمت رسول میں پہونچنے دو۔ اُن سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے چنانچہ یہ دونوں پیغمبر کے پاس حاضر ہوئے۔ مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں "ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اُس کے قتل کی دعویدار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرت کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبی) تھی اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں۔" (سیرۃ النبی جلد ا ص ۳۷۶) چنانچہ عباس نے سفارش کی اور ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔

اس واقعہ سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ فوج کی ہیبت سے آدمی سر جھکا سکتا ہے، ہاتھ روک سکتا ہے ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے بلکہ اپنا گلا تک کاٹ سکتا ہے مگر اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت سے تبدیل نہیں کر سکتا وہ نفرت و دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات کے ہو چکا ہے کیا فوجی مظاہرہ کے اثر سے محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ بیشک اعتقادی طور پر ممکن ہے یہ مانا جائے کہ اس بارے میں رسول اللہ کا کوئی خاص اعجاز ظاہر ہوا۔ ہمیں اس اعتقاد کے متعلق تبصرہ کا اس تاریخی کتاب میں کوئی حق نہیں ہے اور اگر کچھ علما اس کے قائل ہیں تو ہم اُن کی رائے اور خیال کا احترام کرتے ہوئے اُس کا انکار نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر اس طرح کا کوئی معجزہ ثابت نہ ہو تو عام اصول فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ صرف اتنا کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدہے کی طرح سامنے موجود تھا اب مار آستین بنکر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہہ نہیں

کہ دشمن کی یہ صورت اُس صورت سے زیادہ خطرناک ہے، جبکہ وہ خنجر بکف گلا کاٹنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا ہو۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی خیال تھا ان کے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علی بن ابیطالب کا آپ نے فرمایا تھا ما اسلموا ولکن استسلموا "یہ لوگ حقیقۃً اسلام نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کے سامنے اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور بس"۔ عہ ماحول اور واقعات نے انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ رسول کے احکام کے سامنے گردن جھکا دیں لیکن باطن میں اُن میں سے اکثر پہلے ہی کی طرح مشرک رہے۔ منافقت کی صورت خاص اُن لوگوں کا حصہ تھی جنھوں نے کہ فتح مکہ کے بعد جب رسول کا اقتدار حجاز اور عرب کے بڑے حصے پر قائم ہو چکا تھا تب اسلام قبول کیا تھا۔

قرآن مسلمانوں کو بالتکرار ان منافق مسلمانوں سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں اگرچہ وہ ظاہر میں مسلمانوں ہی کے ایسے ہیں اور ان کے قلب بد اعتقادیوں سے بھرے پڑے ہیں ان منافقین کی تعداد اتنی کثیر ہوتی جاتی تھی کہ رسول کو اس سے بےحد تردد و تفکر ہوتا تھا اور مجبوراً انھیں ان کے خلاف سختی برتنا پڑتی تھی۔ اگرچہ عموماً رسول کی طبیعت صلح پسند اور رنیک تھی، وہ صلح کے پیغمبر تھے اور اس وقت تک جنگ سے پرہیز کرتے تھے جب تک کہ انھیں مجبوراً جہاد نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ رسول غالباً یہ بھی امید کرتے تھے کہ وہ اپنے اخلاق اور کردار سے اُن کے دلوں کو تسخیر کرلیں، اُن کے قلوب نرم ہو جائیں اور اُن میں حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اپنے اس خیال میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں اکثر دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ لہٰذا بنی امیہ اس نئے مذہب کی کینت سے خوش نہ تھے جس میں کہ فرقوں اور قبیلوں کے امتیازات کی کوئی اہمیت نہ تھی اور جس کا صدر اُن کے حریف قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور اُن کے خاندانی شرف اور ضدی احساسات کی نظروں میں قابل نفرت تھا۔

یہی فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے مخالفین میں صرف ایک بنی امیہ ہی تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں اور بھی بہت سے منتشر خاندان اور قبائل ایسے تھے جو کہ اسلام کے دشمن تھے۔ ان قبائل میں زیادہ تر خانہ بدوش عرب بدو شامل تھے جو اسلام کے پیغام کو سمجھنے کی قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ اس نئے مذہب کے اصول اُن کے مشرک دماغ میں جو کہ صحرائی روایات کے عادی ہو چکے تھے بمشکل تمام گھر کر سکتے تھے۔

عہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

وہ کسی قسم کی پابندی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ صدیوں تک وہ آزادی کی زندگی بسر کر چکے تھے جس میں وہ سوائے شیخ قبیلہ کی اطاعت کے اور کسی کی اطاعت جانتے نہ تھے۔ جہاں وہ سوائے اُن قوانین کے جو کہ بالو کے تودوں اور صحرا کی صاف ہوا کے ساتھ عرب کے مطلق العنان خطوں میں اُنہی کے درمیان تشکل ہوتے تھے اور کسی قانون کو مانتے نہ تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد بزکوہی کی طرح آزاد رہے تھے اور اپنے دشمنوں پر شیر دلی سے حملہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف معمولی بادشاہوں مثلاً حیرہ اور غساں ہی کا مقابلہ کیا تھا بلکہ قیصر و کسریٰ کی طاقت و قوت کو بھی پامال کر دیا تھا۔ ان جبروت اور وحشت کے مجسمہ صحرائی انسانوں پر اسلام قیود عائد کرنا چاہتا تھا جسے وہ ہرگز خوشی سے قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے مقابلہ کیا اور پوری طاقت صرف کر دی۔ قرآن نے ان کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ "کفر میں بعید شدید تھے" لیکن بنی امیہ ہی کی طرح یہ خانہ بدوش بھی اسلام کی ترقی میں سدباب نہیں ہو سکے تھے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن کی حالت نازک ہی اور بہتر یہی ہے کہ وہ اسلام کے سامنے جھک جائیں۔ مجبوراً اُنھوں نے اسلام قبول کیا لیکن اس نئے مذہب کی رُوح یکبارگی ان کے رگ و پے میں سرایت نہیں کر سکی تھی۔ اُن کے لیے اسلام ایک نئی، اجنبی اور ناخوشگوار چیز تھی جسے اُنھوں نے مجبوراً قبول کیا تھا۔"

اس طرح کے لوگ جو شکوہ و دبدبہ سے متاثر ہو کر مُسلمان ہوئے تھے اُن کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہی یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبۂ انتقام اور اسکے ساتھ ساتھ ڈر جس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہونچادیں اور اگر اُس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اُن خصوصیات امتیازی کو تبدیل کر دیں جو اُس نے قائم کئے ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہونچا ہے اور اسلام کے پردے ہی میں سہی، اُن حدود و امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اُن کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی عہ "ان سب کی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ ان کو عام مُسلمانوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہونے دیا جاتا تھا نہ ان کو مُسلمانوں پر حاکم بنایا جاتا تھا بلکہ اکثر تحفہ تحائف دے کر اُن کی دلجوئی بھی کی گئی تاکہ یہ لوگ اپنے ظالمانہ انداز بھول جائیں اور یہ نہیں تو ان کی آیندہ نسلیں اسلام میں رہ کر امن و امان کی زندگی اختیار کر لیں اور سچے مُسلمان بن جائیں۔"

عہ آغا محمد طاہر صاحب

مگر ان کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو اُن کے چہرے خوشی سے کھِل جاتے اور کبھی جذبات دلی زبان سے بھی کھُل جاتے تھے چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ جنگ حنین میں جب مسلمانوں کی اکثریت میدان جنگ سے پسپا ہوئی تو ابوسفیان نے کہا بس جادو ختم ہو گیا (مدارج النبوۃ)

بے شک پیغمبر کے بعد اُن کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی پوری امید تھی۔ عہ[۱] "رسول نے دوسری ربیع الاول ۱۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ قریش نے اُس نوزائیدہ مسلم ریاست کے لیے حضرت ابوبکر کو جو اس وقت سن رسیدہ شخص تھے منتخب کیا" اس وقت ابوسفیان نے سب سے پہلا حملہ اسلام پر کیا اس طرح کہ وہ آئے حضرت علی بن ابی طالب کے پاس اور کہنے لگے کہ غضب کی بات ہی تمھاری موجودگی میں اس سند خلافت پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جما لیا۔ خدا کی قسم اگر تم کہو تو میں تمھاری مدد کے لیے مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔ اگر علی کی جگہ کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا حربہ وہ کاری تھا کہ اسلام کی بنیاد آج ہی ہل جاتی مسلمان اسی وقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا مگر وہ نور الٰہی سے دیکھنے والے نباض فطرت علی تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور ڈانٹ کر جواب دیا کہ تو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کا دشمن رہا تصدیق کیلیے ملاحظہ ہو استیعاب ج ۱ مطبوعہ حیدر آباد دکن صفحہ ۲۴۵ و ج ۲ ص ۶۱۷ وصواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۳۷)

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب انھوں نے چولا بدلا اور اُدھر جا کر ملے۔ مذکورۂ بالا واقعہ کے بعد اس ملنے کی حقیقت کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں مگر ذمہ دار افراد غالباً اس واقعہ پر مطلع نہیں تھے اس لیے انھیں اپنی اس روش میں کامیابی ہو گئی عہ[۲] "خوش قسمتی سے مسلمان جو کہ درحقیقت راستباز اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بھی جو کہ نیم مسلم تھے ان سب کو کچھ دوسری چیزیں اس وقت اپنی توجہ منعطف کر لینے کے لیے مِلیں۔ وہ اب ایک مشترک سردار کے ماتحت ایک متحدہ جماعت کی حیثیت رکھتے تھے جن کے سامنے ایران اور یونان کے وسیع اور دولتمند مقبوضات موجود تھے یہ وہ ممالک تھے جنھوں نے ایک وقت میں ساری متمدن دنیا کو اپنے ہی اندر سمو لیا تھا لیکن آج اخلاقی حیثیت سے پست اور سیاسی حیثیت سے کمزور ہو گئے تھے اسلامی سپاہی اُس جوش و خروش میں پر بوکھ

عہ[۱] ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)، عہ[۲] ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

جس کی مثال نوع انسان کی تاریخ میں نادر ہے ان قدیم تہذیب کے مراکز پر مثل باز کے حملہ آور ہوئے اور فتح وظفر کے نشہ سے مخمور ہو کر وقتی طور پر اپنی نجی اور ذاتی جنگوں اور نزاعوں کو پس پشت ڈال دیا۔"

یہی ہنگامہ خیز دورہ تھا جس میں اولاد ابو سفیان کو دمشق میں اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ع۱ "حضرت ابوبکر نے ملک شام پر فوج کشی کا تہیا کیا اور یزید بن ابی سفیان کو تقریباً ستائیس ہزار لشکر پر امیر مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے حصوں پر عمرو بن العاص ولید بن عقبہ۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ شرجبیل بن حسنہ۔ عکرمہ بن ابی جہل۔ عبیدہ جراح کو سپہ سالار مقرر کیا اور خالد بن الولید کو حکم بھیجا کہ فوراً عراق سے مہم شام کی کمک پر پہونچو چنانچہ وہ بھی تقریباً چھ سات ہزار فوج کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے وہاں پہونچ گئے امیر الامرا یزید بن ابی سفیان کے ساتھ سہیل بن عمرو اور اُن کے ایسے شیوخ قریش مشیر تدبیر تھے سپاہ قیصر روم اور لشکر عرب سے ملک شام میں متعدد لڑائیاں ہوئیں اور عرب نے بتدریج ملک شام کو آخر سنہ ۱۵ ہجری تک تمام فتح کر لیا اور شروع سے برابر ہر خطۂ مفتوحہ زیر نگین خاندان ابی سفیان آتا رہا اور یزید بن ابی سفیان بالاستقلال فرماں روا رہے۔"

ع۲ "علامہ ابن عبد البر استیعاب جلد اول ص ۲۵۳ پر لکھتے ہیں کہ ذی الحجہ سنہ ۱۹ ہجری میں یزید نے دنیا سے رحلت کی۔ حضرت عمر کے پاس اُن کی خبر وفات ایسے وقت پہونچی جب ابو سفیان دربار خلافت میں موجود تھے۔ حضرت عمر نے خط پڑھ کر ابو سفیان کو تعزیت پیش کی۔ بیٹے کی خبر موت سُنکر ابو سفیان کو سب سے پہلے دمشق کی حکومت ہی کا خیال آیا۔ پوچھا کہ آپ یزید کی جگہ پر کس کو مقرر کر رہے ہیں حضرت عمر نے فرمایا اُس کے بھائی معاویہ کو۔ ابو سفیان نے خوش ہو کر کہا کہ حضور نے قرابت داری کے حق کا لحاظ رکھا۔ امیر معاویہ کو والی دمشق تسلیم کرنے کے ساتھ ہزار اشرفی ماہوار گورنری کی تنخواہ بھی مقرر ہوئی۔"

ممکن ہے کہ وہی تالیف قلب والی مصلحت اس میں بھی مضمر ہو اور ممکن ہے کہ ایک خطرناک عنصر کو حجاز کے مرکزی مقاموں سے دُور کرنے کی یہ صورت نکالی گئی ہو مگر سیاست کی دنیا میں بہت سے نتائج توقع کے خلاف برآمد ہوا کرتے ہیں۔

ع۱ دورِ استبداد۔ سید غضنفر علی صاحب مرحوم   ع۲ ناموس اسلام ج ۲

بنی امیہ میں سے بعض افراد کو مستثنیٰ کرنے کے بعد یہ کہنا کسی طبقہ کے نزدیک قابل انکار نہیں ہو سکتا کہ اس جماعت کا شام میں اقتدار قائم ہونا گیا تھا کہ ان کی امید کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اُن کی نیتیں کیا تھیں اور اصلی مقصد کون سے پیش نظر تھے۔ مگر اُن کو جمہور مسلمین کی بیزاری کے خوف سے احتیاط کی سخت ضرورت تھی۔ ”گندم نما جو فروش“ لوگوں کے منصوبوں کی تکمیل موقوف ہوتی ہے اس پر کہ ایمانداری کی نقاب اُن کی اصلیت کے چہروں پر پڑی رہے مگر دل کی باتیں فطرۃً کبھی کبھی زبان پر آہی جایا کرتی ہیں اُن میں سے چند مثالیں ہمارے سامنے تاریخ میں ابتک محفوظ ہیں جن کی صحت کی ذمہ داری اُن ہی مورخین پر ہے۔

پہلے جنگ یرموک میں جبکہ مسلمانوں کا مقابلہ سلطنت روم کے لشکر سے تھا اور معرکہ کارزار گرم تھا۔ اُس وقت ابو سفیان دُور سے کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا جب رومیوں کو غلبہ حاصل ہوتے نظر آتا تھا تو کہتا تھا ایہ بنی الاصفر یعنی شاباش اے ملک روم کے بہادرو اور جب مسلمانوں کو ذرا تقویت حاصل ہوتی تھی تو ابو سفیان کی زبان سے حسرت و یاس کے ساتھ یہ شعر نکلتا تھا۔

وبنو الاصفر الملوک ملوک — الروم لم یبق منھم من کور

مطلب یہ تھا کہ ہائے افسوس کہ سلطنت روم کے پر شوکت بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے نظر آتا ہے۔ عبد اللہ بن زبیر نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیر سے بیان کیا اُس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔ زبیر نے کہا خدا اسے غارت کرے۔ یہ نفاق سے باز نہ آئے گا۔ کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں۔ (استیعاب)

اس سے زیادہ تعجب خیز واقعہ دوسرا ہے جو اگر صحیح ہے تو اُس کی بنیاد اس بات پر مبنی سمجھی جا سکتی ہے کہ بے دین آدمی ہر ایک کو اپنا سا سمجھتا ہے اور ہر ایک کی دینداری کو نمائشی خیال کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کے چشم و چراغ تھے، اس لیے ابو سفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی قوت کے ساتھ ابلے کہ تاب نہ رہی۔ آپ کے خلیفہ ہونے کی خبر سُنی تو ابو سفیان آپ کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا اُس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہونچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ

یہی دنیاوی سلطنت۔ رہ گیا بہشت و دوزخ۔ اُس کو میں کچھ نہیں سمجھتا (استیعاب)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اُس کا مقولہ اپنی زبان میں یوں لکھا ہے:۔

"نیست آں مگر ملک و من در نمی یابم جنت را و نہ نار را"۔ یہ سُنکر حضرت عثمان نے ڈانٹ کر اُس کو اپنے پاس سے نکلوا دیا۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت عثمان نے اُس کی اس بات چیت کو ضرور انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا مگر اس کے باوجود ابوسفیان کے خاندان کے لوگوں نے حضرت عثمان کی نیک دلی سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور آخر میں حضرت عثمان کی جان لینے کے بھی باعث ہوئے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب اپنی انگریزی کتاب "ٹریجڈی آف کربلا" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر کے بعد ریاست کی باگ حضرت عثمان کے کمزور ہاتھوں میں پڑ گئی جو ایک نیک اور شریف آدمی تھے مگر حکومت کی بھاری ذمہ داری کے قابل نہیں تھے۔ یہ ان ہی کے دور سلطنت کے اثنا میں ہوا کہ اسلامی دنیا تقسیم ہوگئی دو فرقوں میں جو پھر کبھی متحد نہیں ہوئے۔ اُن کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے زیادہ بداطوار لوگ تھے جو صرف شخصی ترقی کا لحاظ کرتے تھے۔ اور اسلام کے مفاد کو بالکل بھولے ہوئے تھے بعض اُن میں سے مذہب کے ایک ہلکے سے ملمع کے باوجود درحقیقت مشرکین سے بہتر نہیں تھے۔ حضرت عثمان کے بہت سے مقربین کے افعال جو خط نصف النہار پر پہونچ گئے تھے۔ مدینہ کے بلوہ اور اُن کے بدنصیب قتل کے باعث ہوئے"۔

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی کتاب "محرم نامہ" میں جس کا دسواں ایڈیشن مطبوعہ دہلی ۱۳۴۸ھ میرے پیش نظر ہے لکھا ہے:۔ "ان کو (حضرت عثمان کو) ان کے قبیلہ بنی امیہ کے شریر آدمیوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا اور ان کی خلافت سے خوب فائدے اُٹھانا شروع کئے۔ یہ بات دوسرے قبیلوں کے صحابہ اور ان مستحق لوگوں کو ناگوار ہوئی جن کا حق بنی امیہ کے غیر مستحق لوگوں کے سبب مارا جاتا تھا۔ مروان بن الحکم بنی امیہ میں بہت ہی خود غرض اور شریر آدمی تھا۔ یہی حضرت عثمان کی شہادت کا باعث ہوا اور اسی نے حضرت عثمان کو دوسرے صحابہ کی اچھی نصیحتوں پر عمل کرنے نہ دیا"

اس خاندان کے بعض دوسرے لوگ بھی ایسے ہی ناقابل اطمینان کیرکٹر کے تبلائے جاتے ہیں اور اُن کے دل میں بھی ویسے ہی جذبات معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ع۵ "عراق میں لشکر عجم پر

ع۵ دور استبداد مؤلفہ سید غضنفر علی صاحب مرحوم

عمر بن العاص نے شبخون مارنے کا قصد کیا۔ قیس بن ہبیرہ مانع ہوئے کہ سپاہ بمقابلہ دشمن کم ہے عمر بن العاص برہم ہو گئے اور کہا کہ میرے معاملہ میں تم کو دخل دینے سے واسطہ؟ قیس نے کہا میں امیر لشکر ہوں اور یہ بھی نہ ہوتا تو بھی میں تم کو اس بیجا جسارت سے روکتا۔ عمر بن العاص نے کہا قیس یہ زمانہ جس میں تم امیر بنے ہو کیا برا زمانہ ہے۔ اگر میں تمھارا یہ دین چھوڑ کر اپنے دین قدیم کی طرف پھر جاؤں اور اس اپنے پرانے دین پر لڑ کر مر جاؤں تو یہ امر مجھکو اس سے زیادہ پسند ہے کہ تم دوبارہ پھر کبھی مجھ پر امیر بنو۔ (طبری ج ۴ صفحہ ۱۰۲ ۱۴ھ)

ہر مسلمان اپنے اسلامی جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے اس مقولہ کی اسپرٹ کے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے

مغیرہ بن شعبہ جب حکومت کوفہ پر منجانب حضرت عمر مامور تھے تو وہاں اظہار فخر کے لیے لوگوں سے کہدیا کہ رسول اللہ کی قبر میں ان کی نعش مطہر اتارنے کے لیے میں بھی داخل ہوا تھا اور پھر سب کے بعد قبر سے باہر آیا۔ شیوخ کوفہ جب موسم حج میں مکہ میں آئے تو انھوں نے بہ قصد تصدیق حضرت علی سے اس واقعہ کا ذکر کیا حضرت علی نے فرمایا کہ مغیرہ نے غلط بیانی سے کام لیا (طبری ج ۳ ص ۲۰۵ ۱۱ھ)

بعد وفات حضرت عمر جب اہل شوریٰ باہم صلاح کے لیے حجرہ ام المومنین عائشہ میں مجتمع ہوئے تو عمر بن العاص اور مغیرہ دونوں در حجرہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ سعد بن ابی وقاص نے کنکریاں مار کر ان کو وہاں سے اٹھا دیا اور فرمایا یہ دونوں چاہتے ہیں کہ کہتے پھریں کہ ہم بھی حاضرین مجلس شوریٰ میں تھے (طبری ج ۵ ص ۳۶ ۲۳ھ)

جلسہ عام میں جب عبد الرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کے انتخاب کا اعلان کیا تو مغیرہ نے ان سے کہا کہ آپ نے خوب انتخاب کیا اور پھر حضرت عثمان سے عرض کیا کہ آپ کے سوا اگر کسی اور کے ہاتھ پر عبد الرحمٰن بیعت کرتے تو ہم کبھی راضی نہ ہوتے۔ عبد الرحمٰن نے یہ فقرہ سنکر کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ اگر میں کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرتا تو تم بھی اسی کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اس سے یہی باتیں بناتے (طبری ج ۵ ص ۳۸ ۲۳ھ)"

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اونچے طبقہ میں ہمیشہ مشکوک نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان پر کوئی اعتماد و اطمینان نہ تھا۔

مقاصد چاہے جو کچھ ہوں مگر واقعہ یہ ہوا کہ اس خاندان کی حکومت کا شام میں قائم ہونا تھا کہ

اُنھوں نے ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش شاہانہ رکھی۔ کوئی سیاح اگر ممالک اسلامیہ کا سفر کرتا اور حجاز میں شہنشاہ اسلام یعنی خلیفۃ المسلمین کے دربار کو دیکھتا اور پھر شام جا کر ایک صوبہ کے گورنر کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکّر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اُس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلالت کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پیغمبر اسلام کے جاری کیے ہوئے طرز زندگی سے مانوس صحابۂ کرام کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصُول قدر و قیمت اور معیار عظمت جو اُس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا فنا ہو جائے گا۔ ع۵ "موطا امام مالک وغیرہ میں ہے کہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے ابو درداء صحابی نے منع کیا اور کہا ہم نے رسول اللہ سے سُنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے معاویہ نے کہا میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سُنکر ابو درداء نے کہا کیا خوب! میں تو رسول اللہ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں ہونگا اس کے بعد ابو درداء مدینہ چلے گئے اور حضرت عمر سے جا کر یہ سب حال بیان کیا۔ حضرت عمر نے معاویہ کو تنبیہی فرمان بھیجا اور لکھا کہ اس طرح کا عمل خلاف حکم رسول بیع و شراء میں ہرگز نہ کیا کرو۔ علامہ زرقانی اور نسائی وغیرہ صحیح اسناد سے لکھتے ہیں کہ عبادہ بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیع و شرا کے معاملہ میں اسی طرح کا قصہ ہوا تھا۔ اور معاویہ نے اُن کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح بُرا نہیں سمجھتے۔ عبادہ نے کہا میں تو رسول خدا کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو خدا مجھے اس جگہ سے نکالے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہوں گا جس پر تم حاکم ہو۔ اس کے بعد عبادہ مدینہ چلے گئے۔ حضرت عمر نے پوچھا آپ کیوں چلے آئے؟ اُنھوں نے تمام قصہ بیان کیا حضرت عمر نے فرمایا نہیں نہیں آپ وہیں تشریف لے جائیے۔ وہ مقام اور زمین جہاں آپ جیسے لوگ نہ ہوں بڑی خراب ہے۔ اس کے بعد معاویہ کو حکم بھیجا کہ تم عبادہ بن صامت پر امیر اور حاکم نہیں ہو۔ جو عبادہ کہیں اُس پر لوگوں کو چلاؤ۔ بے شک عبادہ امین ہیں" (دراسات اللبیب صفحہ ۲۴۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستاران شریعت میں اس وقت سے

ع۵ ناموس اسلام

شروع ہوگئی تھی۔

علہ "حضرت عمر ملک شام میں تشریف فرما ہوئے تو صبح و شام معاویہ جب اُن کی ملاقات کو آتے ہر وقت جدا تازہ جلوس سواری ہوتا۔ حضرت عمر نے اس شان و شکوہ کو مشاہدہ فرما کر صرف اتنا اُن سے ارشاد فرمایا کہ صبح کو اور جلوس ہوتا ہے اور شام کو اور۔ اور یہ بھی تذکرہ کیا کہ سُنتا ہوں کہ ہر صبح کو تمہارے برآمد ہونے سے پہلے تمہارے دروازہ پر اہلِ حاجات کا مجمع تمہارا منتظر رہا کرتا ہے معاویہ نے جواب دیا کہ دشمن یعنی قیصر روم قریب ہے اور اُس کے جاسوس یہاں پھیلے ہوئے نگرانِ حال ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوب شان و شوکتِ اسلام دیکھیں حضرت عمر نے فرمایا یہ مرد دانا کا کید اور زیرک و ہوش مند کا فریب ہے۔ معاویہ نے کہا آپ جو فرمائیے اُس پر کاربند ہوں۔ حضرت عمر نے ارشاد کیا کیا خوب؟! حالت تو یہ ہے کہ جس امر میں بقصد اعتراض تم سے سلسلۂ کلام شروع کرتا ہوں تم مجھکو ایسا متحیر بنا دیتے ہو کہ کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کیا کہوں اور کیا کروں (طبری ج ۶ ص ۱۸۴)

حضرت عمر کا دورِ حکومت ہمگی کچھ اوپر دس برس ہے۔ اتنی سی مدت میں ترقی و تنزل کا یہ منظر مشاہدہ میں آتا ہے۔ حسن بصری ایک مبسوط روایت میں ظاہر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے دورِ اسلام کو اونٹ کی عمر سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام کی ترقی کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب اسپر حالتِ تنزل طاری ہوگئی اور قریش دنیا کی دولت پر ٹوٹ پڑے۔

حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں آہیں بھر کے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا تھا کہ قریش میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی دولت و حکومت اُسی کو مل جائے ـــــ تاریخ خمیس میں بحوالہ دول الاسلام ذہبی لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے عہد میں وفورِ دولت کا یہ حال تھا کہ دار الخلافہ مدینہ میں ایک گھوڑے کی قیمت ایک ایک لاکھ اور ایک باغ کی قیمت چار چار لاکھ درہم تک پہونچ جاتی تھی۔ بنی امیہ کے ایک طبقہ نے حضرت عثمان کے عہد میں تو وہ مطلق العنانی دکھلائی کہ پناہ بخدا اور اس طرح وقارِ خلافت کو بھی نقصان پہونچایا اور رعایائے ملک کو بھی اور تنظیم اسلامی کو بھی۔ یہ لوگ ایسے جوڑ توڑ کیا کرتے تھے کہ جس سے ملک کو پیہم نقصانات ہی پہونچا کرتے تھے مثلاً عبداللہ بن ابی سرح نے یہ فقرہ تراشا کہ عمر بن العاص مصر کے گورنر نے رقم خراج گھٹا دی۔ حضرت عثمان نے فوراً عمر کو معزول کر کے عبداللہ بن ابی سرح کو اُن کی

علہ دورِ استبداد

جگہ بھیجدیا۔ عبد اللہ نے دکھانے کو جس طرح بنا خوب خراج وصول کیا حضرت عثمان نے تعریفاً عمر سے کہا دیکھو اب وہ اونٹنی خوب دودھ دینے لگی عمر نے برجستہ کہا کہ جی ہاں اُس کا بچہ بھی تو مر گیا یعنی خراج زیادہ وصول ہوا تو کیا۔ رعایا تباہ اور ملک کی سرسبزی بھی رخصت ہوگئی ——— حضرت عثمان نے ۲۷ھ میں عمر بن العاص کو حکومت مصر سے معزول کیا تھا اُس وقت سے وہ جب موقع و محل پاتے حضرت عثمان پر طعن و تشنیع کرتے رہتے تھے اور مدینہ چھوڑ کر فلسطین میں جا بیٹھے اور حضرت خلیفہ ثالث کے خلاف ساز شیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ممالک محروسہ کی رعایا بگڑ کھڑی ہوئی اور حضرت عثمان پر چڑھائی کردی۔ حضرت عثمان نے یہ حالت مشاہدہ کرکے معاویہ والی شام کو یہ فرمان بھیجا "اہل مدینہ کافر ہوگئے، اور انھوں نے اطاعت حکومت سے سرکشی اختیار کرلی اور بیعت کو توڑ ڈالا۔ یعنی ایمان شکنی کی تم کو لازم ہی کہ اپنی چھاؤنی سے جنگ آوران ملک شام کو تند رفتار مرکبوں پر ہمارے پاس روانہ کردو" یہ فرمان جب معاویہ کے پاس پہونچا تو انھوں نے اس کی تعمیل میں تساہل سے کام لیا بلکہ نتیجہ کے منتظر ہوگئے (طبری ص ۱۱۵ ۳۵ھ) حضرت عثمان نے اسی مضمون کے فرمان دیگر عمال کو بھیجے جو اکثر بنی امیہ ہی میں سے تھے اور مدد مانگی مگر کوئی مدد کو نہ پہونچا۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ جیسے یہ لوگ خود منتظر تھے کہ شورش بڑھے اور اپنے اپنے صوبوں پر خودسرانہ قابض ہو جائیں۔ آخر اہل شورش نے حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا جب آپ کے قتل کی خبر عمر بن العاص کو پہونچی تو بفخر کہا میں ابو عبد اللہ ہوں جو ٹھان لیتا ہوں بغیر کئے نہیں رہتا۔"

سلطنت دمشق نے اتنے عرصہ میں پوری قوت حاصل کرلی تھی اور انھوں نے جس نیت سے بھی ہو اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کی بنیادیں قائم کردی تھیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد اپنی کتاب الحریت فی الاسلام ص ۲۶ میں لکھتے ہیں "خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور فتن و بدعات شروع ہوتا ہے جنھوں نے نظام حکومت اسلامی کی بنیادیں متزلزل کردیں۔" اسی تمدن کا نتیجہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار نظرانداز ہوگئے اور وہ امتیازات ختم ہوگئے جو اسلام کے سادہ اور غربا پرور اصول نے قائم کئے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ہی حضرت ابوذر غفاری کا جلاوطن کیا جانا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ اُس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو انھیں اس وقت اسلامی ملک میں نظر آرہی تھی۔ حالت یہ تھی کہ ع۵ "قبرص اور صقلیہ کی

ع۵ مولانا سید ابن حسن صاحب رضوی جارچوی ایم اے ایم ادایل

دولت قصر دمشق کی زینت بنی ہوئی تھی۔ افریقیہ کی لوٹ مار کا سامان نذر تعیش ہو رہا تھا اور بنی امیہ میں سے غیر ذمہ دار افراد خدا کے مال کو (حضرت علی کی لفظوں میں) اس طرح کھا رہے تھے جیسے اونٹ فصل بہار کی گھاس کھاتا ہے" رسول کا بڈھا صحابی ابو ذر غریب مسلمانوں کو بھوکا مرتے دیکھتا تو کیا کرتا۔ دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتا پھرتا تھا جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم" وہ لوگ جو سونے چاندی کو خزانوں میں سمیٹ کر رکھتے ہیں اور راہ خدا میں صرف نہیں کرتے انہیں عذاب دردناک کی مبارکباد دو" لا یحسبن الذین یبخلون بما آتاھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ " نہ خیال کریں وہ لوگ جو خدا کی عطا کی ہوئی دولت کے ساتھ بخل کرتے ہیں کہ وہ اُن کے لیے کچھ اچھی بات ہے نہیں بلکہ وہ اُن کے لیے بہت بُرا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ اس بخل کی ہوئی دولت کے طوق ان کے گلوں میں ڈالے جائیں گے"

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے چنانچہ جب امیر معاویہ نے قصر خضرا کی تعمیر کی تو ابوذر سے پوچھا کیوں اسے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذر نے فرمایا اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذاتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا (کتاب البلدان۔ ابی بکر احمد بن محمد ہمدانی معروف بابن الفقیہ مطبوعہ لیڈن ۱۳۰۲ء صفحہ ۱۵۶)

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مزاج قیصریت اس کا کہاں تحمل کر سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذر شام سے مدینہ بھیج دیے گئے اور وہاں سے جلا وطن کر دیے گئے ؏ "وہ حسرتناک منظر تھا جب علی اپنے برسوں کے مصاحب اور جاں نثار کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہے تھے۔ گریہ گلوگیر ہو رہا تھا۔ آواز بمشکل نکلتی تھی پھر بھی حضرت نے اپنے آپ کو سنبھالا اور فرمایا" اے ابوذر تم ان لوگوں سے خدا کے لیے ناراض ہوے تھے۔ بس اُسی سے معاوضہ کی امید رکھو۔ یہ لوگ تم سے اس لیے ڈرتے تھے کہ کہیں تمہاری باتوں کی وجہ سے دنیا ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے اور تم اپنے دین کے بچانے کی

؏ مولانا سید ابن حسن صاحب جارچوی

خاطر اُن سے خائف تھے پس تم اُس چیز کو جس کی وجہ سے یہ تم سے خائف تھے (یعنی دنیا) ان ہی
کے ہاتھ میں چھوڑ دو اور اُس چیز کو لے کر بھاگ جاؤ جس کے متعلق تم ان سے ڈرتے تھے (مطلب یہ ہے
کہ دنیا کو ان کے لیے چھوڑ دو اور دین لے کر یہاں سے نکل جاؤ) اگر تم بھی ان کی طرح دنیادار ہو جاتے
تو وہ بھی تمھارے دوست بن جاتے اور اگر تم بھی اُن کے ساتھ اُس دنیا کے حصّہ دار ہو جاتے تو وہ
تم سے مطمئن ہو جاتے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ ربذہ کی ویران بستی میں ایک لاش پڑی تھی جس کے
سرہانے ایک عورت اور ایک لڑکی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اشکبار بیوی کفن کی فکر میں اپنی جھونپڑی
سے اٹھی اور سرِ راہ آکر بیٹھ گئی۔ مالک اشتر ایک قافلہ کے ہمراہ اتفاقاً اُدھر سے گزر رہے تھے، روتی
ہوئی عورت کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور دریافت حال کیا۔ مصیبت زدہ عورت نے کہا، "لوگو! رسول کے
مظلوم صحابی ابوذر نے غربت کے عالم میں وفات کی، وہ دیکھو ان کا لاشہ بے گور و کفن پڑا ہے۔ مالک اشتر
اور اُن کے ساتھی چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ اُن کی نگاہ کے سامنے ابوذر کی مظلومی کا نقشہ کھنچ گیا
کفن و دفن کے بعد مالک اشتر نے یہ دعا مانگی "خدایا ابوذر تیرے رسول کا صحابی تھا، وہ تیری کتاب
اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا تھا، اس نے تیری راہ میں جہاد کیا اور مرتے دم تک جادۂ اسلام نہ ہٹا۔
مدینہ سے تھوڑی دور پر ربذہ کے کھنڈرات میں اب تک ابوذر کی قبر موجود ہے جس پر حسرت و یاس
نوحہ خوانی کرتی ہے اور خلوت و تنہائی پاسبانی۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر یا تھکا ماندہ زائر جب اُدھر سے
آنکلتا ہے تو بدو عربوں کے بچے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے مٹی کی اس ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں
جہاں دنیائے اسلام کا وہ مساوات پسندی اور حریت کا علم بردار آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے"۔

یہ حکومت دمشق کی سیاست ملوکانہ کے خلاف پہلی قربانی تھی جو رسول کے مقدس صحابی حضرت
ابوذر غفاری نے پیش کی۔

ظاہر ہے کہ جب سرمایہ داری بڑھے گی تو سرمایہ دارانہ تعیش کا پیدا ہو جانا لازمی ہے چنانچہ واقعہ
ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت ہو گئی تھی اور اگر کوئی دیندار مسلمان یا رسول
کا صحابی "نہی عن المنکر" کے اسلامی فرض کے ماتحت اس پر ٹوکتا تھا تو سیاست کے شکنجے میں کسا جاتا تھا
چنانچہ علامہ ابن اثیر جزری اسد الغابہ (ج ۳ ص ۲۹۹) میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری
حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے تو انھوں نے دیکھا کہ

اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جارہی ہیں۔ عبدالرحمن آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے نیزہ سے اُن مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر امیر معاویہ کو پہونچی تو انھوں نے کہا چھوڑ دو اس بڈھے کو اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے مشکوں میں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اصابہ (ج ۲ ص ۲۰۱) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

یاد رکھیے کہ یہ ابوذر غفاری یا عبدالرحمن بن سہل انصاری اپنی فرض شناسی کی بنا پر اسلام کے قائم کردہ حدود و امتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ سیاست کے حدود میں وہ بالکل کم حقیقت اور بے وقعت ہو گئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقرر کردہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہو گئے۔

ایک مسلمان اپنی خاص عقیدت کی بنا پر اس نتیجہ کو غیر شعوری سمجھ سکتا ہے یعنی وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ سیاست وقت کا مقصد براہ راست یہی نہیں تھا کہ اسلام کو نقصان پہونچایا جائے مگر ہو یہی رہا تھا اور اس بنا پر جو شخص اس عقیدت کو نہیں رکھتا وہ اس کو دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے چنانچہ ع۱ "یورپ کے مورخین کی شہادتیں ہیں جو صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ بنی امیہ کا برسر اقتدار ہو جانا درحقیقت اسلام کی شکست اور ایام جاہلیت کے کفر کی فتح تھی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ بنی امیہ اسلام کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ صرف اس لیے ہو گئے تھے کہ مشین کے کسی پرزے پر قابو پا کر اسے اپنے مصرف میں لائیں گے چنانچہ امیر شام نے شہنشاہیت کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اس شاہی نظام کی بنیاد ڈالدی جس کا جواز اسلام سے نہیں مل سکتا۔ یہ جگہ بہت پیچیدہ سوالات پیدا کرتی ہے۔ کیا شاہی نظام اس وقت قائم کرنا درست نہ تھا؟ یہ تاریخی طاقتوں کو دیکھتے ہوئے خالص مادی نقطۂ نظر سے ترقی پسندی تھی یا رجعت پسندی؟

تاریخ کے بعض طالب علم جو مادی تضاد کو اس کی تمام پیچیدگیوں میں نہیں دیکھتے شاید یہ کہیں کہ اسلام نے قومی اتحاد کے سانچے میں عربوں کو ڈھال کر ایک شاہی نظام کے لیے راستہ کھول دیا تھا کیونکہ اس اتحاد کی شیرازہ بندی اسی طرح ممکن تھی۔ یہ خیال حکومت اسلامی کے جمہوری نقطۂ نظر کے

ع۱ سید احتشام حسین صاحب ایم۔ اے

مطابق شاید صحیح ہوتا اگر بنی امیہ نے اپنے دبے ہوئے جذبات کو قومی شیرازہ بندی سے اوپر رکھا ہوتا۔ اگر اُنھوں نے صحیح بنیاد پر اسلامی اصولوں کی ترویج، اسلامی مساوات کی تلقین، اسلام کی سادہ زندگی کو اپنا شعار بنالیا ہوتا۔ ایک طرح کی شاہی یقیناً اُس وقت کچھ زیادہ غلط نہ تھی لیکن شاہی کو قیصر و کسریٰ کی شاہی نہیں اسلام کی سرداری اور سروری ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات بہت زیادہ فرق پیدا کرتی ہے کیونکہ معاویہ اور یزید کی شاہی تو بڑے پیمانہ پر ایک قبیلہ کی سرداری سے ملتی جلتی ہے، اُسے اسلام کی شیرازہ بندی سے کوئی تعلق نہ تھا۔" عہ "دورِ بنی امیہ میں مذہب کے عروج و ارتقا کا نظریہ اس قدر بدل گیا کہ اموال کی فراوانی، افرادِ ملت کی کثرت مذہب کی ترقی و کامیابی سمجھی جانے لگی۔ چاہے افرادِ ملت توحید صحیح سے بھی آشنا نہ ہوں ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس نے قانون دفاع کے بجائے جنگ و غارت گری کا نام جہاد رکھدیا۔ اس وقت سے سیاست اصل شریعت سمجھی جانے لگی۔"

کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر اسلام کے بعد پیغمبر کے گھرانے کے لوگ جنھیں برابر وہ اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنھیں اُنھوں نے اپنے مقاصد سے پورے طور پر آگاہ کردیا تھا اور اُن کی عملی تربیت بھی اس طرح کردی تھی کہ وہ اپنے اقوال و افعال سے اُن مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں، اسلامی انقلاب اور اُس کے خصوصیات و امتیازات کے محافظ تھے۔ دنیا میں عالی شان محل تعمیر ہو چکے تھے لیکن ان کا وہی چھوٹا سا مکان تھا جس میں انھیں پیغمبر نے رکھدیا تھا۔ دنیا کے محلات میں ریشمی پردے دروازوں پر ہو گئے تھے مگر ان کے دروازے پر وہی پھٹا ہوا پردہ اب بھی نظر آتا تھا دنیا کے جسم پر حریر و دیبا نظر آتا تھا لیکن یہ کھدر کا ملبوس اب بھی زیب تن کرتے تھے۔ دنیا مفتوحہ ممالک کی دولت سے چین کرتی اور عیش و عشرت میں زندگی گزارتی تھی مگر یہ اب بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کھانا اور مالِ حلال کی تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور جو دولت بھی ملتی اُسے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی نذر کردیتے۔ ان میں ذمہ دار ہستی حضرت علی بن ابیطالب کی تھی۔ اروِنگ نے لکھا ہے:۔ "علی ابتدائی قابل ترین مسلمانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے کہ اپنے مذہبی تقدس کو رسول کی صحبت سے نشو و نما دی تھی اور جنھوں نے آخر وقت تک رسول کی

عہ مولانا نعمت امام صاحب حنفی (پھلواری ضلع پٹنہ)

سادہ زندگی کا اتباع کیا۔" اور اس بنا پر ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علمبرداروں میں کشمکش لازمی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت عثمان کے بعد مسلمانوں نے آپ کو خلافت کی زمام سپرد کی اور آپ کو بالاتفاق شہنشاہ اسلام تسلیم کیا تو شام کے حاکم امیر معاویہ نے آپ کی خلافت کو پسند نہیں کیا کیونکہ ع۱ "جب حضرت علی رسول کے چوتھے خلیفہ ہوئے تو ہوا کا رُخ بدل گیا۔ آپ شاہانہ اقتدار کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کے وقت یہودیوں کے باغوں میں پانی دے کر اپنی روزی پیدا کرتے تھے مگر قومی خزانے میں ہاتھ نہ لگاتے تھے اب یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی فرد یا کوئی جماعت بیت المال سے بے استحقاق متمتع ہو سکے۔ چنانچہ سرداران عرب کو جو وظیفے بیکار مل رہے تھے وہ سب آپ نے بند کر دیے۔ حضرت علی حضرت ہاشم کے پرپوتے اور پیغمبر عرب یعنی حضرت محمدؐ کے چچازاد بھائی تھے۔ اولاد ہاشم کی حکومت یوں ہی بنی امیہ کے لیے قابل برداشت نہ تھی اُس پر حضرت علی کی سخت گیری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کی چنگاریاں دہکتے دہکتے جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بنی امیہ نے حاکم شام امیر معاویہ کی سرکردگی میں حضرت علی سے بہت سی لڑائیاں لڑیں۔" "یہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ع۲ "معاویہ بن ابی سفیان حضرت عمر کے زمانہ سے حاکم شام تھے جہاں انھوں نے اپنی قوت کو بہت مستحکم کر لیا تھا۔ حضرت عثمان کے بدقسمت قتل نے انھیں ایک اچھا موقع دیا جس سے فائدہ اُٹھانے میں اُنھوں نے دیر نہ کی۔ اُنھوں نے فوراً مقتول خلیفہ کا بدلا لینے کی غرض سے علی کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اُنھوں نے عثمان کی خون آلود قمیص اور اُن کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی اُنگلیاں دمشق کے منبر سے دکھا کر شامیوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا جو کہ اس المناک منظر کو دیکھ کر اس قدر روئے کہ اُن کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ مجمع کا یہ غم و غصہ اور جذبۂ انتقام کسی حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن یہ بات بہت مشکوک ہے کہ معاویہ کی بغاوت بھی اسی حقیقی اور صحیح جذبۂ انتقام کے ماتحت تھی۔ اُن کا علی کو قتل میں شامل کرنا اور اُن کو باغیوں کے بھڑکانے اور پناہ دینے کا مجرم قرار دینا اس بات کو یقینی طور سے ظاہر کرتا ہے کہ معاویہ نے قتل عثمان کو اپنے مقاصد کے حصول کا ایک بہانہ بنایا تھا اس لیے کہ اس شورش اور بغاوت کے زمانہ میں جو کہ قتل خلیفہ

ع۱ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے ع۲ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

کی صورت میں ظاہر ہوئی حضرت علی کا رویہ نہایت ممدوح اور پاک و صاف تھا۔ آپ نے یک گونہ
اس تباہی کے روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن آخر میں آپ اُس غم و غصہ کے سیلاب کو، جو
روز بروز خلیفہ کے خلاف قوت حاصل کرتا جاتا تھا روکنے سے مجبور ہو گئے۔ بہر حال جو صورت بھی
ہو معاویہ نے اتحاد بین المسلمین کو فنا کر دیا اور اُن کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی جو اُس وقت سے
آج تک پُر نہ ہو سکی! ؏ "السٹر نے لکھا ہے: - اگر علی کو اطمینان سے حکومت کی جانے دی گئی
ہوتی تو اُن کے صفات حمیدہ، اُن کا استقلال اور اُن کے کردار کی بلندی قدیم جمہوریت اور اُس کے
سادہ طریقوں کو لافانی زندگی دیدیتیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت اور اس کے علاوہ جب کبھی بھی مقابلہ پڑا ہے دنیا میں آل رسول
کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی نفسیاتی بھی
اور نسلی بھی۔ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور
اُس نے امتیاز صرف فرائض انسانی کی بنا پر قرار دیا تھا بشتر کہ دولت جو مال غنیمت سے حاصل ہوتی ہے
اُس کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف
تھی اور اسلام کے محافظین اس کے قریب نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے آل رسول کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ
میں روپیہ جمع کر کے دولتمند بنیں اور خصوصیت سے اُن لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے اُن
کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی اُمید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علی بن ابیطالب
جو کچھ بیت المال میں آتا ہی روز کا روز تقسیم کرتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے ہیں
اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علی نے مسلمانوں کے مال کو پہنچانے
میں مستحق لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔ (استیعاب جلد ۲ مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۴۷ و صواعق محرقہ ص ۷۷)
اصفہان سے مال آتا ہے۔ اُس وقت اتفاق سے سات آدمی صاحب استحقاق موجود ہیں۔ آپ نے
تمام مال کے برابر سے سات حصے کر دیے اور ایک روٹی بھی اُس مال میں نظر آگئی تو اُس کے بھی سات
ٹکڑے کر کے ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی
کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر مثلاً اُس روٹی کو کسی ایک حصہ میں شامل کر دیا جاتا

؏ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

تو شریعت کے قانون کے مطابق کوئی جرم نہیں تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیت عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت علی بن ابیطالب تو عوام کی ذہنیت مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے۔ اس لیے آپ کو ایسی چھوٹی باتوں کا بھی خیال ضروری تھا۔ ع۵ "اعتراض ہوا کہ علی سب کو ایک نظر سے کیوں دیکھتے ہیں تو علی نے ان لفظوں میں جواب دیا جو تاریخ عالم میں ہمیشہ یادگار رہیں گی لو کان المال لی لسویت بینھم فکیف وانما المال مال اللہ "میرا بھی مال ہوتا تو میں برابر ہی تقسیم کرتا اور یہ تو ہے ہی خدا کا مال" الا وان اعطاء المال فی غیر حقہ تبذیر واسراف وھو یرفع صاحبہ فی الدنیا ویضعہ فی الاخرۃ " یہ یاد رکھو کہ بغیر استحقاق کے کسی کو مال دیدینا فضول خرچی میں داخل ہے۔ آج ممکن ہے کہ ایسا کام کرنے والا بڑا بن جائے مگر مستقبل میں وہ پست ہی رہے گا"

انتہا یہ ہے کہ اسی مساوات پسندی پر حضرت علی سے اُن کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کو تمام مسلمانوں سے زیادہ کچھ دیا جائے اور حضرت علی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنا ذاتی حصہ آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ اُنھوں نے کہا اس میں میرا کیا بھلا ہو گا۔ آپ نے کہا مجبوری ہے۔ ایک دن جب بہت اُنھوں نے اصرار کیا تو فرمایا آج آدھی رات کے بعد آئیے گا۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہوئے ہوں کہ اُس وقت آؤں گا تو علی پرائیوٹ طور پر میری کوئی خاص امداد کریں گے۔ آئے وہ اُس وقت پر، حضرت اُن کو لیے ہوئے بازار میں آئے دوکانیں بند تھیں۔ آدمیوں کی آمد و رفت موقوف ہو گئی تھی اور شہر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ حضرت علی نے کہا دیکھیے یہ وقت اچھا ہے۔ ان دوکانوں میں سے کسی ایک کا قفل توڑ لیجیے اور جو کچھ ملے لیجائیے عقیل نے کہا واہ تم مجھے چوری کی تعلیم دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا اور آپ بھی تو مجھ سے یہی چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے اموال میں سے چُرا کر آپ کو دیدوں۔ ایک روز ایسا ہوا کہ جب عقیل نے بہت پریشان کیا تو آپ نے لوہا گرم کر کے عقیل کے جسم سے ملایا۔ وہ تڑپ گئے کہ تم مجھے جلائے دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو دنیا کی آگ ہے۔ آپ تو مجھے آخرت کی آگ میں جلانا چاہتے ہیں غرض یہ باتیں تھیں کہ عقیل آپ سے جدا ہو کر امیر شام کے پاس چلے گئے۔ وہاں اُن کی بڑی

ع۵ مولانا سید ابن حسن صاحب جارچوی

آؤ بھگت ہوئی اور اپنی ایک بڑی سیاسی فتح سمجھی گئی کہ علی کے بھائی اُن سے ٹوٹ کر ہمارے پاس آگئے (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۷۹) پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر۔ اس کے برخلاف دوسری طرف ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا مُنھ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اُسے مالامال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ ان کا ساتھ دیتے یا اُن کا؟!

دنیا کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے، اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس طرح اُس کی شان قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں حضرت علی کی یہ کیفیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہے جو بغیر اس تلوار کے فروخت کیے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سوائے شام کے تمام عالم اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی۔ (استیعاب ج ۲ ص۴۷۲) ہر ایک حریص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اُس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہے۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی مرعوب ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیر اپنی حکومت کے زمانہ میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ میثم تمار کی دوکان پر خرید و فروخت کریں۔ بازار میں قنبر کو ساتھ لے کر گئے اور دو پیراہن خرید کیے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا سات درہم کا پیراہن قنبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قنبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دیتا کہ میں مساوات کے پھیلانے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علی کا مقصد یقیناً یہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا، سُننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچّوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا قنبر! تم نوعمر ہو تمھیں وہی پیراہن اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیا میں یہی پہن لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہل دنیا کہاں کر سکتے تھے اور اُن کے دل پر ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے اُن تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس کے پہلے برسرِ اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے ہی میں اُن میں سے ہر ایک کے اقتدارِ رفتہ کا قیام منحصر تھا۔ اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا چنانچہ عـ۵ جب حضرت علی نے مروان بن حکم، سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کو بلوایا اور اُن سے اپنی اطاعت قبول نہ کرنے کے اسباب پوچھے تو ولید نے جواب دیا کہ اے ابوالحسن ہم آپ کی بیعت کیونکر کر سکتے ہیں۔ آپ نے ہمارے پر و بال قطع کر دے ہیں۔ اور ہمارے سینوں میں حسد کی آگ روشن کر دی ہے، آپ نے میرے باپ کو جنگِ بدر میں قتل کیا اور سعید بن العاص کے باپ کو بھی جنگِ بدر میں قتل کیا۔"

یہ بھی ہے کہ اسلام نے اپنے اصولِ مساوات کی تلقین سے خود اُمتِ عربیہ کا بحیثیت اُمت بھی امتیازِ خاص ختم کیا تھا اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے اُنھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کر دی اور موالی اور اعجام کی کو دبانے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش کا قدرۃً یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہو جائیں۔ بنی ہاشم اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری نہیں کر سکتے تھے اس لیے عرب کی جانبداری کا پہلو ان کا کمزور تھا۔ اس کی تصدیق آپ کو ہو سکیگی اس سے کہ اس کے بعد جب بنی امیہ کے خلاف ہاشمیین نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیادت و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد اور عناد تھا۔ اس لیے وہ نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا، ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی

عـ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

بنا پر جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ بھی اُن ہی کی پیروی کرتے تھے۔ کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجہ میں قید ہوتے ہیں۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ جب امیر شام نے حضرت علی بن ابیطالب سے مقابلہ کیا تو امیر شام کا لشکر تعداد میں حضرت علی کے لشکر سے نمایاں طور پر زیادہ تھا۔ مگر ؏۱ حضرت علی اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور فنون جنگ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ میدان ہمیشہ اُنہی کے ہاتھ رہا۔ جب تیر و شمشیر سے مقصد حاصل نہ ہوا تو عیاری اور مکاری کے حربے استعمال ہونے لگے۔" چنانچہ قرآن نیزوں پر بلند کئے گئے اور کہا گیا کہ بس کتاب اللہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے

؏۲ "آج کل کے متعلم تاریخ کو یہ بات بعید خلاف قیاس معلوم ہوگی کہ حضرت علی کی جماعت میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے اس تجویز کو مان لیا اور اُس جال کو نہ دیکھا جو اس کے نیچے بچھا ہوا تھا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں ظاہر پرست راسخ العقیدہ حضرات کی ایک بڑی جماعت شامل تھی جو کہ خدا کے کلام پر فیصلہ کی خواہش کو رد کر دینا انتہائی بیدینی اور گناہ خیال کرتے تھے۔ یہ بھی اغلب ہے کہ حضرت علی کی فوج میں کچھ ایسے غدار بھی ہوں جو کہ دشمن کے مقصد سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے ان سادہ لوح اور بھولے بھالے انسانوں پر مذہبی احساسات کا جادو چلائیں۔ علی خود اس چال کی کنہ سے پوری طرح واقف تھے اور وہ کسی طرح اس تجویز کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ لیکن اُن کے ساتھ والوں میں عمر بن العاص کی چال پر وہ مذہبی جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ انھیں لڑائی بند کرکے اپنے سردار مالک اشتر کو میدان جنگ سے واپس بلا لینا پڑا۔ اب یہ بات طے پائی کہ جانبین کی طرف سے ایک ایک حکم معین کر دیا جائے اور یہ دونوں حکم علی اور معاویہ کے درمیان قرآن کی رو سے فیصلہ کریں۔ تحکیم میں حضرت علی کی رائے پر عمل نہ کیا گیا اور ابو موسیٰ اشعری ان کے نمائندہ قرار دیئے گئے۔ یہ معزز ضعیف العمر انسان عمر بن العاص نمائندۂ معاویہ کے پاسنگ کے مقابلہ میں بھی نہ تھے جب یہ دونوں کچھ مہینے کے بعد اپنا اپنا فیصلہ دینے کیلئے کوفہ اور دمشق کے درمیان بمقام دومتہ الجندل جمع ہوئے تو ابو موسیٰ سے فریب کے ساتھ علی کے خلاف فیصلہ لے لیا گیا اور عمر عاص نے اپنا فیصلہ معاویہ کی موافقت میں دیا۔" ٹریجڈی آف کربلا کی لفظوں میں "جنگ صفین کا نتیجہ ایک گورکھ دھندا سا

؏۱ سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ادیب ؏۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

ہو گیا۔ معاویہ کا اقتدار شام میں قائم رہا جبکہ حضرت علی حجاز اور عراق پر حکمران تھے۔"

پھر حضرت علی کا ارادہ تھا کہ دوبارہ شام پر فوج کشی کریں مگر آپ نماز صبح کے وقت مسجد کوفہ میں اپنے معبود کے سجدہ میں شہید کر دیے گئے۔ آپ کی شہادت کا اثر عالم اسلام بلکہ دوسری قوموں پر بھی کیا پڑا۔ اس کے لیے ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں ؎۱ "پروفیسر ایم جی رنالڈ اپنی مشہور کتاب "روحانیت اور اسلام" کے تیسرے باب کے آخر میں لکھتے ہیں "جو مرتبہ دنیا میں علی کو ملا ہے وہ آج تک کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ حضرت علی نے روحانیت کے ساتھ دنیا پر حکومت کی اور اہل دنیا کو امن و سلامتی کے ساتھ حکومت کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ ان کی شہادت کے روز جہاں کوفہ کے کلمہ گو روئے وہاں سب سے زیادہ عیسائیوں نے بکا کی۔ علی کے مرنے پر ہزاروں یہودی اور عیسائی عورتیں اور بچے جو بے وارثی کے عالم میں محض ان کے دست فیض سے پرورش پاتے تھے محروم ہو گئے اور بھوکے پیاسے مارے مارے پھرنے لگے۔ جب بیت المقدس میں بطریق اعظم کو شہادت علی کی خبر پہونچی تو دو دن تک اس مبارک شہر کے گلی کوچوں میں افسوس و حسرت چھائی رہی۔ بطریق اعظم کی آنکھوں سے اس سانحہ میں آنسو نہ تھمے۔" ۱۹۱۰ء میں ریورینڈ میجر ان ہال نے حضرت علی کی شہادت پر تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے۔ "حضرت علی کے اُٹھ جانے سے دنیائے روحانیت حکومت سے خالی ہو گئی حضرت علی تمام عالم کے لیے مشعل ہدایت تھے۔ ان کا وجود دوسری اقوام کے لیے بھی امن و سلامتی اور رحمت کا باعث تھا۔ افسوس ایک باغی کی تلوار نے دنیا کی امن و سلامتی کو آغوش لحد میں سُلا دیا۔ دنیا میں حضرت علی سے بڑھکر ہر دلعزیز کوئی دوسرا نہ ہو سکا۔ اگرچہ اُن کا جنازہ رات کو اٹھا مگر اُس وقت بھی کوفہ کے تمام گلی کوچے عیسائی، یہودی اور آتش پرست سوگ نشینوں سے بھرے پڑے تھے اور وہ ہمیشہ اس طرح روتے رہے جیسے کوئی اپنے باپ کو روتا ہے۔" ؎۲ حضرت علی کی شہادت سے بنی امیہ کا رستہ کسی قدر صاف ہو گیا لیکن بنی ہاشم تقدس، روحانیت، علم اور اخلاق میں بنی امیہ سے کہیں افضل تھے اور رسول کی قرابت کا شرف انہی کو حاصل تھا۔ اس لیے روحانی سیادت کا بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو جانا اب بھی مشکل تھا چنانچہ حضرت علی کے بعد اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسن خلیفۂ رسول تسلیم کر لیے گئے۔ امیر معاویہ کا آبائی اور ذاتی تجربہ بتا چکا تھا

؎۱ ناموس اسلام ؎۲ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

کہ بنی ہاشم کے مقابلہ میں تلوار اٹھانا بے سود ہے۔ اس لیے انھوں نے امام حسن کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام کچھ ایسا تھا کہ اگر آپ منظور نہ کرتے تو حب جاہ کی تہمت اور خونریزی کے الزام سے بچنا مشکل تھا شرائط صلح بھی بُرے نہ تھے۔ بہرحال مصلحت وقت سمجھ کر امام حسن نے صلح کر لی۔

اس صلح کے اسباب اور بہت سے حالات کا بیان پہلے ہو چکا ہے اور اس صلح پر مزید تبصرہ ابھی آئندہ مناسب موقع پر آئے گا۔ یہاں تو ہم صرف اس صلح کے شرائط کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ انہی شرائط کی روشنی میں پھر ہم شام کی حکومت کے عمل اور اُس کی رفتار کو جانچ سکیں۔ اس صلحنامہ کے مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر ۸۱) میں درج کئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسول اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے۔

(۲) یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علی کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں اُن کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

(۵) یہ کہ معاویہ حسن بن علی اور اُن کے بھائی حسین اور کسی کو بھی خاندان رسول میں کوئی نقصان پہونچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔" یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسن نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کیلئے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے تصادم نہیں رکھتے تھے۔ ان کی لڑائی جو کچھ بھی تھی وہ اصول شریعت و مذہب کے لیے حضرت امام حسن نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیر شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپنے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلم بنا دی کہ اصول شریعت اور ہے اور آئین حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی

جس کے لیے آلِ محمد برابر کوشاں رہے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکام اسلام کا طرزِ عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا اور گویا فریقِ مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک جو کچھ حکومتِ شام کا رویہ رہا ہے وہ کتاب اور سنت کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریق میں بنائے مخاصمت ہوں۔ اگر حکومتِ شام کا سابقہ طرزِ عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ ان کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ امیرِ شام اپنی زندگی بھر کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا جو اس کے خلاف کرتا اس لیے آپ نے آیندہ کے لیے جانشین بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

حضرت امام حسن کی طرح اُن کے چھوٹے بھائی امام حسین بھی اس صلح سے متفق تھے اور اُن کی رائے بھی حالاتِ وقت کو دیکھتے ہوے امام حسن کی رائے سے متحد تھی۔ ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو "الاخبار الطوال" مصنفہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری متوفی ۲۸۱ھ (مطبوعہ مصر ۱۳۳۰ھ) صفحہ ۲۲۲۔ وہ لکھتے ہیں کہ حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسین کے پاس آے اور کہا آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دستکشی کر لی۔ اچھا اب آپ بذاتِ خود آج ہماری بات مان لیجیے پھر کبھی نہ مانیے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسن کو تو اس صلح کے راستے پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر جمع کیجیے اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ بس امیرِ شام کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ہم اچانک تلواریں مارتے ہوے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسین نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، ہم عہد کر چکے اور قول و قرار ہو چکا۔ اب عہد شکنی ممکن نہیں۔ اور ملاحظہ ہو۔ علی بن محمد بن بشیر ہمدانی، یہ بھی اُسی جماعت میں سے ہیں جو صلح پر معترض تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہونچا اور امام حسن کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اُس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا السلام علیک یا مذل المؤمنین "سلام ہو آپ کو اے مومنین کو ذلیل کرنے والے"۔ آپ نے فرمایا وعلیک السلام بیٹھو میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو اُن کی

عزت رکھ لی اور اُن کو خونریزی سے بچالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے"۔ اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اُٹھ کر امام حسین کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسن کی بیان کی۔ آپ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت امام حسن) نے تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اُس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے"۔

سمجھے آپ امام حسین کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اُس وقت لے گا جب امیر معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا کہ جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آیندہ چل کر تم کو اس انسان کے تدبر کی داد دینا پڑے گی۔ جس نے بیس برس پہلے یعنی ۴۱ھ کے آئینہ میں ۶۰ھ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسین کی پیش بینی آیندہ چل کر حرف بحرف پوری ہوئی۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی سیاسی قوت بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ اُن کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بھی بالکل دور ہو گیا تھا اور انھیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع تھا۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کی لفظوں میں "اس طرح امیر معاویہ مطلق العنان مالک ہو گئے اُس اسلامی سلطنت کے جو اب پھیلی ہوئی تھی مغرب میں بحر روم سے لے کر مشرق میں ماوراء النہر تک (ٹریجڈی آف کربلا) اب طنطنۂ حکومت کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ولی نعمت حضرت عمر بن الخطاب کی عظمت و شخصیت کا بھی انکار تھا اور اُن سے مقابلہ کا دعویٰ تھا۔ اس واقعہ کا ثبوت صحیح بخاری کتاب المغازی اور شرح علامۂ قسطلانی سے ہوتا ہے عکرمہ نے عبداللہ بن عمر کی زبانی بیان کیا ہے کہ میں اپنی بہن ام المومنین حفصہ کے پاس گیا اُس وقت وہ غسل سے فارغ ہو کر اپنے بال درست کر رہی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا آپ نے لوگوں کی حالت دیکھی؟ امر خلافت کے لیے کیا کر رہے ہیں اور ہمارا ذکر بھی نہیں کیا جاتا! (شارح بخاری لکھتے ہیں یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب معاویہ کے لیے خلافت پر بیعت ہو چکی تھی) حضرت حفصہ نے بھائی سے کہا کہ تم لوگوں سے جا کر ملو وہ تمھارے منتظر ہونگے اور تمھارے نہ جانے اور نہ ملنے سے تفرقہ کا اندیشہ ہے۔ یہ خبر شاید امیر معاویہ کو بھی پہنچ گئی۔ اُنھوں نے عبداللہ بن عمر کی موجودگی میں خطبہ پڑھا اور کہا "جو شخص میری خلافت کے

بارے میں کچھ کلام کرنا ہو وہ ذرا اپنی صورت تو دکھائے۔ ہم اُس سے اور اُس کے باپ سے زیادہ اس منصب کے حقدار ہیں۔ یہ تھا عبد اللہ بن عمر پر طنز جس میں حضرت عمر پر بھی حملہ تھا حبیب بن مسلمہ نے بعد میں عبد اللہ بن عمر سے کہا آپ نے جواب دیا! عبد اللہ نے کہا کہ میں نے جواب دینا چاہا تھا کہ اس خلافت کا تم سے زیادہ حقدار وہی تھا جس نے تم سے اور تمھارے باپ سے اسلام پر جنگ کی تھی یعنی حضرت علی مگر تم نے اُن کی خلافت تسلیم نہ کی اور اُن کا مقابلہ کیا مگر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے اس جواب سے ہنگامہ پیدا ہو جائے اور خونریزی کی نوبت آئے اس لیے میں نے صبر سے کام لیا اور خاموشی اختیار کی "

اس نہیب حکومت کے بعد پھر کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر معاویہ نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا معاہدہ کے مکمل ہونے اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ہی نخیلہ میں جا کر یہ اعلان کر دیا کہ یہ سب حصول اقتدار کی ترکیبیں تھیں۔ اب کہاں کا معاہدہ اور کہاں کے شرائط چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا۔

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنت رسول پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہی اور اہلسنت کے نقطۂ نظر سے حضرت رسول اللہ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک خلافت راشدہ رہی ہی اور یہ تیس برس کی مدت ختم ہو جاتی ہی حضرت امام حسن کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت و جہانبانی اور دنیاداری ہی۔ خلافت راشدہ نہیں ہی۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا سنت رسول اور راشدین و مہدیین خلفاء کی سیرت پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ امیر معاویہ کی حکومت خلافت راشدہ کے حدود سے خارج ہوتی۔ عمر بن عبد العزیز تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہی کہ اُن کا زمانہ خلافت راشدہ سے ملتا جلتا ہی مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر امیر معاویہ کے دور حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہی اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ "خطائے اجتہادی" اور "خطائے منکر" کی بحثیں علماء کے درمیان کی ہیں اور معتقدات و مسلمات سے متعلق ہیں۔ تاریخ کا کام واقعات کو محفوظ کرنا ہی۔ نیتوں کی بحث اس دائرہ سے خارج ہی۔ آخر دینوری، طبری، دیار بکری، ابو الفداء، ابن اثیر، ابن حجر، ابن عبد البر، ملا علی متقی، حافظ سیوطی

وغیرہ وغیرہ بھی کچھ نہ کچھ معتقدات تو رکھتے ہی تھے مگر ان کا قلم تاریخی واقعات کے درج کرنے سے نہیں جھجکا ممکن ہے کہ ان واقعات کی کوئی تاویل اُن کے دل میں ہو مگر اس سے اصل واقعہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑ سکتا نیتوں کے ساتھ تعلق ہے تو آخرت کے جزا و سزا اور نجات یا عدم نجات کا مگر خارجی نتائج تو واقعات کی خارجی کیفیت کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اس لیے واقعات کے استنتاج اور تحلیل و تعلیل میں جو تاریخ کا مطمح نظر ہوتا ہے نیتوں کی بحث بالکل دور از کار اور خارج از مبحث ہے۔

ذیل کے واقعات جو یہاں درج کئے جاتے ہیں وہ اُن ہی سابق مورخین کی صدائے بازگشت ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ "حسن ظن" کے لیے اس کے بعد بھی گنجائش باقی رہے گی جس طرح پہلے باقی تھی،

ان میں سے ایک بات بھی سیاسی مصالح سے زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بتا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے تفصیل اس کی جیسا کہ "الاخبار الطوال" میں ہے یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک ثقفی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلدہ کی کنیز تھی حارث نے اس کو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا مغیرہ بن شعبہ جب حضرت عمر کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ جب حضرت علی بن ابیطالب خلیفہ ہوے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا جب جنگ صفین در پیش ہوئی تو معاویہ نے زیاد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوارہ کا لڑکا اور نفاق کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے، حالانکہ میرے اور اُس کے درمیان رسول اللہ کے چچازاد بھائی نوے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوے موجود ہیں خدا کی قسم اگر اُس نے ادھر کا رُخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوے سامنے موجود ہونگا اور بڑی شدید جنگ کرونگا معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا جب حضرت امیر شہید ہو گئے اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیاد اصطخر میں قلعہ بند ہو گیا معاویہ نے اُسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آ جاؤ۔ جو کچھ تم کہو گے وہ میں تمھیں دوں گا چنانچہ زیاد معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اُس کا رسوخ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ

معاویہ نے اُسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور ہو بھی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم حضرت شہنشاہ اسلام اور خلیفۃ المسلمین کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اس کی عزت کیا ہو سکتی ہے۔ معاویہ نے کہا کہ یہ میرے باپ ابوسفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے دی؟ ابو مریم سلولی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا اس نے کہا کہ ابوسفیان میرے شراب خانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اُس رات اُس کی دلچسپی کی باعث ہو۔ میں نے سمیہ کو اُس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابوسفیان اور سمیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوئے اور اُن تعلقات سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلۂ بنی مصطلق میں سے جس کا نام یزید تھا گواہی دی کہ میں نے ابوسفیان کو یہ کہتے سنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہے۔ لیجیے دعویٰ ثابت ہو گیا اور زیاد حضرت خلیفہ کے برادر محترم قرار پا گئے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابۂ کرام میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش وللعاھر الحجر یعنی بچہ اصلی شوہر کی طرف منسوب ہو گا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار کے سننے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اُن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس ذریعہ سے اُنھوں نے زیاد کو اور اُس کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔ اسی زیاد کا نو فرزند عبید اللہ بن زیاد تھا جس کے ہاتھوں بعد میں قتل حسین کی ایسی مہم سر انجام پا سکی۔

اور سنیے:۔ ایک شخص تھے حتات بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی۔ حضرت رسول اللہ نے ان میں اور معاویہ بن ابی سفیان میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات جیسی اسلام نے ایک مرتبہ مہاجرین میں اور ایک مرتبہ مہاجرین و انصار میں کی تھی۔ سب ہی کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا تھا، حضرت حمزہ کو زید بن حارثہ کا، حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کا، حضرت عثمان کو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کا، طلحہ کو زبیر کا۔ اور حضرت علی کو پیغمبر نے خود اپنا بھائی قرار دیا تھا۔ ایسی ہی مواخات آپ نے حتات اور معاویہ میں قرار دی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نسبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عملدرآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اُس کے نسبی ورثہ تک پہونچائی جائے۔ اُس مذہبی بھائی کو نہیں

جو مواخات کے ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہو مگر اتفاق کی بات کہ یہ حتات امیر معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور اُن کا وہیں انتقال ہو گیا تو امیر معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا یہ کہکر کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اسپر بھی مسلمانوں میں شور ہوا یہاں تک کہ فرزدق نے اس بارے میں شعر بھی کہے

ابوک و عمی یا معاوی اورثا تراثا فیحتاز التراث اقاربہ

فما بال میراث الحتات اکلتہ و میراث صخر جامد لک ذائبہ

فلو کان ھذا الامر فی جاھلیۃ علمت من المرء القلیل حلائبہ

ولو کان فی دین سوی ذا شنئتم لنا حقنا او غص بالماء شاربہ

(یعنی) تمھارے باپ نے اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ میراث قرابتداروں کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حتات کی میراث تو تم نے نوش جاں فرمائی اور ابو سفیان کی میراث تمھاری ہی ملکیت قرار پائی پس یہ معاملہ اگر زمانہ جاہلیت کی رسم میں داخل ہے تو ہمیں اُس کا علم ہونا چاہیے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو ہمیں بھی ہمارا حق ملنا چاہیے نہیں تو یہ تمھیں ہضم نہیں ہو سکتا (اسد الغابہ ج ا ص ۳۷۹) مگر تاریخ نہیں بتلاتی کہ امیر معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حتات کے ورثہ کو اُس کا معاوضہ دیا گیا ہو اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلاف شریعت رواج پا رہی تھیں ع « ملا محمد معین اپنی کتاب دراسات اللبیب ص۲ » میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے زکوٰۃ فطرہ کے متعلق کہا ہماری رائے میں زکوٰۃ فطرہ دو مد سمراء شام ہے یعنی شام کے گیہوں دو مد۔ ابو سعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مقرر کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اسپر عمل کرتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عہد رسول میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جو یا کھجور یا زبیب اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو انھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مد گندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے۔ ابو سعید خدری کا قول تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کرونگا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سن کر کہا "بئس الاسم الفسوق بعد الایمان یعنی ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت برا ہے۔ مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے"

ع ناموس اسلام

"مقدام بن معدی کرب کی گفتگو جو امیر معاویہ سے ہوئی ہے اُس میں اُنھوں نے کہا تمھیں خدا کی قسم بتاؤ کیا رسول اللہ نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے۔ پھر مقدام نے کہا کیا آنحضرت نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور اُن کا پہننا ممنوع نہیں قرار دیا تھا۔ معاویہ نے کہا ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدام نے کہا پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمھارے گھر میں دیکھتا ہوں"

"اس کے علاوہ شریعت اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت رو بقبلہ یا پشت بقبلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے حضرت ابو ایوب انصاری جب شام میں پہونچے تو تمام پیشاب اور پاخانہ کے مکانات کو رو بقبلہ پایا۔ اُنھوں نے استغفار پڑھ کر مُنھ پھیر لیا (دراسات اللبیب ص ۱۳۹)"

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک الخ ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریم اور اصحاب کبار برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو امیر معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو تلبیہ سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی آواز نہیں سُنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس اپنے خیمہ سے نکلے اور پکار کر لبیک اللھم لبیک اور کہا اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرغم ہو۔ ان لوگوں نے محض علی کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے۔ اس طرح کی تین روایتیں ابن عباس کی کنز العمال میں درج ہیں جنہیں ابن عباس نے بد دعا دی ہے اس بنا پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علی عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے یہ ضد محض ضدِ حضرت علی بن ابی طالب سے بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہو گئی چنانچہ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (ج ۱ صفحہ ۱۰۶) میں لکھتے ہیں کہ حضرت علی نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے اس لیے جب بنی امیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو اُنھوں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علی کے آثار باقی نہ رہیں۔

کنز العمال ملا علی متقی ج ۴ صفحہ ۲۱۰ میں ہے کہ مدینہ میں امیر معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء باجماعت پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عمداً چوری کی ہے یا بھول گئے ہو۔ بسم اللہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کی اور اُس نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

اس کے ساتھ ہی صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۶ اور صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۹ سے مندرجہ ذیل روایات کو

ملاحظہ فرمائیے:- عمران بن حصین نے حضرت علی کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علی جب سجدہ سے اُٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ صحیح مسلم ج ا ص ۱۶۹ میں ہے:- مطرف کا بیان ہے کہ میں نے اور عمران بن حصین نے علی بن ابیطالب کے پیچھے نماز پڑھی پس جب علی سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اُٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ بے شک انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفےٰ والی نماز پڑھائی ہے۔ یا یہ الفاظ کہے کہ انھوں نے ہم کو حضرت رسول کی نماز یاد دلائی۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسول روتے تھے اور افسوس کرتے تھے۔ دیکھو علامہ ابن القیم اغاثۃ اللھفان صفحہ ۱۰۸ میں لکھتے ہیں:- ایک روز ابو درداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ ہم ان لوگوں میں کوئی امر بھی محمدؐ کا نہیں پاتے، سوائے اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں۔ امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے۔ انمیں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ ہم انس بن مالک کے پاس دمشق میں گئے تو ہم نے انس کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں ہم عہد رسول اللہؐ میں پاتے تھے، اب ان میں سے ایک بات بھی نہیں دیکھتے سب مفقود ہیں مگر یہ نماز رہ گئی ہے۔ سو وہ بھی ضایع کردی گئی ہے (صحیح بخاری جلد ا ص ۳۹۵)

حافظ سیوطی کا ایک رسالہ ہے اوائل کے نام سے جسمیں انھوں نے تمام وہ باتیں درج کی ہیں جنھیں امیر معاویہ نے ایجاد کیا تھا اور وہ پہلے خلفاء کی سیرت سے علٰحدہ تھیں۔ منجملہ اُن کے لکھا ہے کہ معاویہ وہ اول شخص ہیں جو صفا و مروہ کے درمیان سوار ہو کر چلے۔ وہ اول شخص ہیں جنھوں نے علی الاعلان نبیذ یعنی جو کی شراب پی اور گانا سنا اور جنھوں نے مٹی کھائی اور مٹی کھانا مباح قرار دی۔" اس آغاز کا انجام اگر یزید کی شراب خواری اور رقص و سرود کے ساتھ فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبیعی رفتار کے لحاظ سے قابل تعجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (مطبوعہ لیدن صفحہ ۱۰۹) میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ

نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پہرہ دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے علامہ جرجی زیدان تمدن اسلام میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے خز و دیبا کے بیش قیمت اور شاندار لباس پہننے میں رومیوں کی پیروی کی تھی (تمدن اسلام مترجمہ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ص۹۷)

مذکورہ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھکر اگر عقیدت دامنگیر نہ ہو تو انسان یہ نتیجہ نکال لے گا کہ ابوسفیان کی اولاد کو بنی ہاشم سے ایک موروثی عداوت جو تھی اُس کی بنا پر وہ اُن کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے مجبوری یہ تھی کہ ان کی حکومت اسلام کی بنا پر تھی اس لیے اُنھیں پیغمبر اسلام کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے احساس اور اُس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ امیر معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے معمر آدمی سے ملاقات کا جو گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضر موت میں ایک شخص ہے جس کی تین سو برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اُس کے پاس آدمی بھیجے اور اُسے بلوایا جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے۔ اُس نے کہا امد بن ابد۔ معاویہ نے اُس سے عبدالمطلب اور امیہ وغیرہ کے حالات پوچھے۔ پھر کہا تم نے محمدؐ کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سُنکر حیرت ہوئی اور اُس نے کہا ومن محمدؐ یعنی محمد کون؟ انھوں نے کہا "وہی رسول اللہ" اُس نے کہا پھر تم نے پہلے ہی اُن کا نام اُس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا جس کا خدا نے اُنھیں مستحق قرار دیا ہے کیوں نہیں کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ملاحظہ ہو اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ا ص۱۱۵)

اس سے زیادہ حیرت خیز وہ ہے جسے علامہ ابن تیمیہ نے "صارم مسلول" میں لکھا ہے کہ ایک روز معاویہ کے دربار میں ابن اشرف یہودی کے قتل کا ذکر ہو رہا تھا تو بنیامین یہودی نے کہا ابن اشرف کے ساتھ غداری کی گئی اور اُس کو فریب سے قتل کیا گیا۔ امیر معاویہ سُنتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ محمد بن مسلمہ انصاری کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے معاویہ تمھارے روبرو رسول اللہ کی توہین کی جارہی ہے دغا کا الزام لگایا جاتا ہے اور تم سُن رہے ہو؟! (النصائح الکافیہ ص۹۰)

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ اسلامی دربار میں خلیفۂ وقت کو رسول اللہ کہکر

سلام کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کو سزا تو در کنار معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی جاتی۔ اس واقعہ کا تذکرہ مشہور مؤرخ محمد بن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں ۳۰ھ کے واقعات کے ذیل میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ عمر بن عاص اہل مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دار الخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ عمر بن عاص معاویہ سے کچھ برسر پرخاش تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اُسے خلیفہ کہکر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اُس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا، اسکی وجہ سے تمھاری ہیبت اُس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ امیر معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ذہانت سے عمر عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور دربانوں سے کہا میرا خیال ہے کہ نابغہ کے لڑکے (عمر عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہوگا لہذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اُس کی جان کی خیر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب بجا لایا کہ السلام علیک یا رسول اللہ بس پھر کیا تھا سب نے اس کی موافقت کی اور جو آیا اُس نے معاویہ کو رسول اللہ کہکر سلام کیا (تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۸۴ مطبوعہ مصر)

مثل مشہور ہے الناس علی دین ملوکھم "لوگ بادشاہوں کے طریقہ پر چلتے ہیں" اگر حکومت کی یہ روش ہو تو عام افراد کی نظر میں رسول اور شریعت رسول کی کیا عزت باقی رہ سکتی ہے جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ حکومت کی طرف سے مذہب کا نیلام کرایا جاتا ہے اور تھوڑے سے سکوں کے عوض دین و مذہب کی خریداری ہوتی ہے تو لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ اس سے مقصود میرا اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جو استیعاب (مطبوعہ حیدرآباد دکن ج ۱ ص ۱۴۲) میں درج ہے کہ حتات مجاشعی اور جاریہ بن قدامہ اور احنف یہ تینوں آدمی امیر معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے جاریہ اور احنف کو روپیہ حتات سے زیادہ دیا۔ حتات نے آکر شکایت کی کہ آپ نے اُن دونوں کو مجھ پر ترجیح دی۔ امیر معاویہ نے کہا کہ ان دونوں سے میں نے اُن کا دین خرید کیا ہے حتات نے کہا پھر مجھ سے بھی میرا دین خرید لیجیے۔ (مزید تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ۱ ص ۳۷۹) یہ حتات وہی ہیں جنکی وراثت کا قصہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے ع۱ "علامہ مسعودی مروج الذہب

ع۱ ناموس اسلام

ج ۲ ص۵۲ پر معاویہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اہل شام کی اطاعت و فرمانبرداری معاویہ کے ساتھ اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ جب علی سے جنگ کرنے کو صفین جارہے تھے تو ان سب کو جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھادی اور سب نے خوشی سے پڑھ لی۔

آثار بنی ہاشم کے مٹانے کی سعی تعمیری یادگاروں تک بھی پہونچی چنانچہ جب امیر معاویہ نے حج کیا تو واپسی میں مدینہ بھی گئے اور منبر رسول کو اُس کی جگہ سے حرکت دی، چاہتے تھے کہ اُسے شام لے جائیں اُسی وقت سورج کو گرہن ہوا جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا معاویہ نے رسول اللہ کے شہر اور اُن کے دار الہجرت میں بڑا حادثہ رونما کیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے اسی سال امیر معاویہ لقوہ میں مبتلا ہوئے (کتاب البلدان مطبوعۂ لیدن (ہالینڈ) ص۲۴)

اول کی نسبت آخر کے ساتھ دیکھتے جایئے۔ مدینۂ رسول کے ساتھ اسی اقدام کی انتہا یزید کی جانب سے واقعہ حرہ میں مدینہ کی بے حرمتی پر ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ شہدائے احد کے متبرک قبور کے کھودنے کا حکم دیا گیا

ع۵ ،، منہاج النبوۃ ج ۲ ص۲۹۴ میں ہے کہ جب معاویہ نے احد میں نہر نکالنے کا حکم اپنے عامل مدینہ کے پاس بھیجا ہے تو معاویہ کو لکھا گیا کہ یہ نہر کسی طرح جاری نہیں ہوسکتی جب تک شہدائے احد کی قبروں پر سے نہ گزرے۔ معاویہ نے لکھا کہ قبریں کھود ڈالو اور شہیدوں کو دوسری جگہ لے جاؤ۔ علامہ تاج الدین سبکی نے شفاء السقام میں لکھا ہے کہ جب معاویہ نے نہر نکالی اور شہیدوں کو ان کی قبروں سے نکالنے کا حکم دیا تو ایک پھاوڑا حضرت حمزہ کے قدم میں لگا اور خون اُس سے جاری ہوا (تاریخ خمیس ج ۱ ص۴۹۸)

حضرت علی بن ابیطالب کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بنا پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصول اسلام کے علمبردار تھے اس لیے سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کی جائے۔ قتل حضرت عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی ص۳۳ (مطبوعۂ مصر) میں مروان بن الحکم کی زبانی منقول ہے اُس نے کہا کہ کوئی شخص علی سے زیادہ حضرت عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا کسی نے کہا کہ پھر تم لوگ منبروں پر انہیں گالیاں کیوں دیتے ہو؟ اُس نے کہا بغیر اس کے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوسکتا۔

ع۵ ناموس اسلام

پھر جبکہ نصب العین یہ تھا اور مذہب و دیانت کی بے وقعتی کا وہ عالم تھا اور رسول اللہ کے عظمت و احترام کا نگاہوں میں وہ حال تھا اور احکام شریعت میں تراش خراش کا وہ نقشہ تھا تو کتاب اور سنت پر عمل کی شرط کا انجام ظاہر ہے۔

دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے انجام کو ابھی رہنے دیجیے اس وقت تک کے لیے کہ جب تک امیر معاویہ کے دور کا اختتام ہونے لگے۔ اس وقت آپ کو اس شرط کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

تیسری شرط یہ بھی کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی، اس کا تفصیلی حال دیکھنا ہو تو عراق میں زیاد بن سمیہ کی حکومت کے واقعات کا مطالعہ کیجیے۔ یہ زیاد وہی ہے جس کے بھائی بنائے جانے کا واقعہ پہلے مذکور ہو چکا ہے عـ۵ " زیاد ۴۵ھ میں بصرہ کا گورنر معین ہوا، وہاں اس نے نہایت سختی سے حکومت کی۔ ۵۰ھ میں جب مغیرہ کا انتقال ہوا تو زیاد کو کوفہ کی بھی گورنری دیدی گئی۔ وہ چھ مہینے بصرہ میں اور چھ مہینے کوفہ میں رہتا تھا۔ اس کی حکومت کو دہشت اور سہر اس کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس پر ذرا بھی شبہہ ہو تا کہ وہ بنی ہاشم کی طرف رجحان رکھتا ہے اسے قتل کرا دیتا اور اکثر لوگوں کی آنکھیں نکلوا لیتا تھا۔ انکھوں میں سلائیاں پھروا دیتا تھا اور سولیاں دلواتا تھا ـــــ ۵۳ھ میں اس کی ایک انگلی میں زہر باد ہو گیا جس سے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ابو حنیفہ دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۲۲۷) میں لکھا ہے کہ جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے معاویہ کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ یہ خط میں اس وقت لکھ رہا ہوں کہ جب میں موت اور حیات کے درمیان ہوں۔ میں نے کوفہ کا حاکم عبداللہ بن خالد بن اسید کو اور بصرہ کا سمرہ بن جندب فزاری کو بنا دیا ہے والسلام۔" بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کسی ایک جگہ کا حاکم اپنے بیٹے عبیداللہ کو کیوں نہیں بناتے؟ وہ ان دونوں آدمیوں میں سے کسی سے کم نہیں ہے۔ زیاد نے کہا کہ اگر اس میں کچھ بہتری ہوگی تو اس کے چچا امیر معاویہ خود ہی خیال کریں گے اس کے بعد زیاد کا انتقال ہو گیا عبیداللہ بن زیاد نے نماز جنازہ پڑھی اور وہ مقابر قریش میں دفن ہوا آٹھ مہینے تک عبیداللہ بن خالد بن اسید اور سمرہ بن جندب کوفہ اور بصرہ کے حاکم رہے۔

عـ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

پھر معاویہ نے عبیداللہ بن زیاد کو بصرہ کا اور نعمان بن بشیر انصاری کو کوفہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ جب سے نعمان کوفہ کے حاکم ہوئے تب سے اُس ظلم و جور اور خونریزی میں کمی ہوئی لیکن عبیداللہ بن زیاد اپنے باپ ہی کے طریقے پر حکومت کرتا تھا اور نہایت سختی سے رعایا کے ساتھ پیش آتا تھا۔

ع۵ "زیاد کا اسسٹنٹ سمرہ بن جندب کو بنایا گیا تھا ان کے ہاتھوں بصرہ اور کوفہ میں آٹھ ہزار مسلمانوں کا خون بہا۔ ابو سوار کا بیان ہے کہ سمرہ بن جندب نے ایک دن میں میری قوم کے ۴۷ آدمی ایسے قتل کیے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے (طبری ج ۶ ص ۱۳۲۔ کامل ج ۳ ص ۲۳۳)

چوتھی شرط یہ تھی کہ حضرت علی کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

حجر بن عدی اور اُن کے پانچ ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں مگر اُن کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ محب اہلبیت تھے اس لیے اُن کے واسطے نہ حلم میں گنجائش تھی۔ نہ رحم و کرم اُن پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔

یہ حجر بن عدی کون تھے؟ استیعاب میں ہے کہ یہ صحابۂ کرام کے ممتاز افراد میں محسوب تھے۔ ان کے بارے میں زیاد نے امیر شام کو شکایت کا خط بھیجا۔ حکم دیا گیا کہ انھیں شام کی طرف روانہ کر دو۔ یہ بارہ ۱۲ آدمی تھے جو لوہے میں جکڑ کر شام کی طرف بھیج دیے گئے۔ معاویہ نے چھ آدمیوں کو قتل کیا اور چھ آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ حجر بن عدی اُن میں سے تھے کہ جو قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہر دلعزیزی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب زیاد کی مخبری کی اطلاع حضرت ام المومنین عائشہ کو پہونچی تو آپ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ امیر شام کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر و اصحابہ یعنی حجر اور اُن کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن اُس وقت پہونچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے عبدالرحمٰن نے معاویہ سے کہا آپکے پاس سے کہاں چلا گیا تھا ابوسفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اُس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپنے اُن کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور وبا و طاعون

ع۵ ناموس اسلام

سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔ امیر شام نے طنز یہ طور پر جواب دیا کہ تمھارا ایسا کوئی مشورہ دینے والا موجود نہ تھا عبدالرحمٰن نے کہا اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابل تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کرکے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے"

حضرت عائشہ کو اس حادثہ کی اطلاع پہونچی تو اُنھوں نے فرمایا "اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور اُن کے اصحاب کو گرفتار کرا کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جا سکتے تھے۔ لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعروں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جا سکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں اب ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو اُن سے کوئی فائدہ ہے اور نہ اُن سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو ہوتی ہے۔ چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں"

جب معاویہ مدینۂ رسول میں آئے اور حضرت عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ام المومنین نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا اچھا پھر چھوڑ دیجیے مجھے اور حجر کو، خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ آپ بازار میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو آپ بیچین ہو گئے نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

حضرت حسن بصری کے متعلق مذکور ہے کہ ان کے سامنے حجر کے قتل کا تذکرہ ہوا تو اُنھوں نے کہا وائے ہو اُس پر جس نے حجر اور اُن کے اصحاب کو قتل کیا"

ایک بزرگ تھے ربیع بن زیاد حارثی جو معاویہ کی طرف سے خراسان کے حاکم تھے انھیں جب حجر بن عدی کے قتل ہونے کی خبر پہونچی تو اُنھوں نے کہا "خداوندا اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اُس کی روح کو قبض فرمالے۔ ابھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے تھے کہ ان کی روح نے جسم سے جدائی اختیار کی۔

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ جب حجر بن عدی کو سزائے موت سنائی گئی تو انھوں نے کہا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اجازت ملی۔ اُنھوں نے دو رکعت نماز اختصار کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد کہا کہ اگر تم کو یہ خیال پیدا نہ ہوتا کہ میں قتل کے خوف سے نماز میں طول دے رہا ہوں تو میں نماز اتنی جلدی ختم نہ کرتا۔ محمد بن سیرین سے سوال کیا جاتا تھا کہ مقتول کو اپنی موت سے پہلے نماز پڑھنا چاہیے یا نہیں تو وہ جواب دیتے تھے کہ خبیب اور حجر دونوں نے اپنے قتل کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی تھی اور یہ دونوں فاضل شخص تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ اُن کا فعل ہمارے لیے سند ہے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد یحییٰ بن سلیمان سے دریافت کیا کہ کیا حجر بن عدی مستجاب الدعوۃ تھے تو اُنھوں نے کہا ہاں اور افاضل اصحاب رسول میں سے تھے۔

خود امیر معاویہ کو بعد میں حجر کے بیگناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوے اور تکلیف زیادہ ہوی تو ایک روز عبد اللہ بن یزید اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے دیکھا کہ آپ بہت مضطرب ہیں اُس نے (خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت؟! اگر مر گئے تو جنت میں پہونچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ امیر معاویہ نے کہا "خدا رحمت نازل کرے تمھارے والد پر وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے (اصابہ ج ۳ ص ۱۵۶) طبری نے لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات قریب ہو نچا تو اُنھوں نے تین مرتبہ کہا یوم لی من ابن الادبر طویل (یعنی) حجر بن عدی کے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہے (طبری ج ۶ ص ۱۵۶) حزن و مشقت کی دنیا طولانی ہوتی ہے جس طرح راحت و مسرت کی مختصر، لہٰذا مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا ہے

عمرو بن الحمق الخزاعی ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبر نے سلام کہلوایا تھا اور اس لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور آخر میں ان کا سر تن سے جدا کیا گیا اور تاریخ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سر جو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بلند کیا گیا وہ ان کا سر تھا۔

ان واقعات سے شیعیان علی میں تلاطم برپا ہو گیا اور حضرت امام حسین پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۲۲۶) میں لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور اُن کے اصحاب قتل

ہو گئے تو اہل کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشراف اہل کوفہ میں سے حضرت امام حسین کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا انا للہ و انا الیہ راجعون اور یہ واقعہ آپ کو بہت شاق ہوا مگر آپ جلد باز انسان نہیں تھے۔ آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آئندہ حالات کا بےچینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ حضرت امام حسین کے پاس شکایت لیگئے ہیں اور آپ نے بھی ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے تو انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں، اس بنا پر انھوں نے آپ کے نام ایک تہدیدی خط لکھا اس کے جواب میں اب حضرت امام حسین خاموش نہ رہ سکتے تھے آپ نے ایک ایک کر کے امیر شام کی جو خلاف ورزیاں معاہدہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا اور اس پر سخت احتجاج فرمایا اس خط و کتابت کو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ معاویہ امام حسن اور امام حسین یا کسی کو بھی خاندان رسول میں سے کوئی نقصان پہونچانے کی کوشش نہ کرینگے نہ خفیہ طور پر، نہ علانیہ اور کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہ کیا جائے گا۔ اس شرط کی خلاف ورزی کا اظہار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے ثبوت بہم پہونچانا بہت دشوار ہے۔ بہر حال یہ تو تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امام حسن زہر سے شہید کئے گئے اور یہ بات بھی سب مورخین لکھ دیتے ہیں کہ یہ زہر دمشق سے بھیجا گیا تھا۔ اختلاف بس اتنا ہے کہ یہ یزید نے لبطور خود روانہ کیا تھا یا امیر معاویہ کے ایما سے تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی وفات کی خبر پر شام کے قصر میں تکبیر کی صدا بلند ہوی اور اظہار مسرت کیا گیا ابن خلکان لکھتے ہیں کہ جب امام حسن بیمار ہوے تو مروان نے معاویہ کو اس کی اطلاع دی۔ انھوں نے لکھا کہ روزانہ کی ان کی بیماری کی کیفیت سے مجھے اطلاع دیتے رہو۔ جب آپ کی وفات ہوگئی اور معاویہ کو خبر پہونچی تو قصر خضرا سے ان کی تکبیر کی صدا بلند ہوی اور اس پر تمام اہل شام نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا جب امیر معاویہ محل میں گئے تو فاختہ بنت قرظہ نے کہا خدا حضور کو خوش رکھے۔ یہ کس لیے آج تکبیر کہی تھی۔ انھوں نے کہا حسن نے انتقال کیا۔ فاختہ نے کہا افسوس فاطمہ کا بیٹا دنیا سے اٹھے اور آپ تکبیر کہیں! امیر معاویہ نے کہا میں نے کچھ طعن و تشنیع یا کسی کی دلآزاری کے لیے تکبیر نہیں کہی بلکہ میرے دل کو

زہر امام مسموم

ایک بڑے خطرہ سے اطمینان حاصل ہوا اس لیے میں نے تکبیر کہی (حیوٰۃ الحیوان ج ا ص۱۵)

اتفاق سے ابن عباس اس زمانہ میں شام میں تھے۔ امیر معاویہ نے انھیں بلوا بھیجا اور اس سانحہ کی اطلاع دی اور کچھ طعن وتشنیع کے الفاظ کہے ابن عباس نے کہا اُن کی وفات کے طعنے نہ دیجیے۔ آپ بھی اب کچھ زیادہ دنیا میں رہنے والے نہیں ہیں (الاخبار الطوال ص۲۲۴) ع۱ "تیسیر الباری" میں ہے کہ خبر وفات امام سُن کر معاویہ نے سجدہ کیا اور اظہار مسرت کر کے یہ بھی کہا کہ حسن ایک انگارہ تھے جس کو خدا نے بجھا دیا۔ دراسات اللبیب میں اس کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ ع۲ "مقدام بن معدی کرب جو رسول کے اصحاب میں سے تھے اور عمرو بن ابی سفیان دونوں امیر معاویہ کے پاس موجود تھے کہ معاویہ نے مقدام سے کہا آپ کو معلوم ہوا کہ حسن بن علی کی وفات ہو گئی؟ مقدام نے افسوس کے ساتھ کہا انا للہ وانا الیہ راجعون معاویہ نے کہا مقدام! کیا تم حسن کی وفات کو مصیبت خیال کرتے ہو؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں؟ حسن وہ ہیں جن کو رسول اللہ اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حسن مجھ سے ہے اور حسین علی سے ہے یہ سُن کر معاویہ نے کہا حسن کا وجود ایک آگ کی چنگاری تھا جس کو خدا نے بجھا دیا"

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ خبریں صدیوں کی مسافت طے کرتی ہوئی ہم تک پہونچ گئیں تو کیا مدینہ میں حضرت امام حسین تک نہ پہونچی ہونگی۔ آپ کے دل پر ان خبروں سے جو کچھ گزری ہوگی اُس کا اندازہ ہر حساس دل کر سکتا ہے مگر وہ با اصول، متحمل اور ضبط و برداشت کے خوگر انسان تھے جنھیں اس پر بھی کوئی جوش نہ پیدا ہوا اور اُن کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیجان پیدا بھی ہوا۔ اس کا تذکرہ شیخ مفید اپنی کتاب ارشاد (مطبوعہ ایران ص۲۲۰) میں ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ جب حضرت امام حسن کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسین کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت کو توڑ کر آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ جو ہو چکا ہے اُس کا توڑنا میری طرف سے صحیح نہیں ہے جب تک کہ پورا موقع گزر نہ جائے۔ بے شک جب معاویہ کا انتقال ہوگا تو پھر میں اس معاملہ میں دوبارہ غور کروں گا۔

ع۱ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن) ع۲ ناموس اسلام

دینوری نے الاخبار الطوال (ص۲۲۱) میں لکھا ہے کہ اہل کوفہ کو امام حسن کی وفات کی اطلاع ہوئی تو بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے امام حسین کو خط تعزیت لکھا اور جعدہ بن ہبیرہ مخزومی نے جو بڑے ہی اہلبیت کے مخلص اور دوست تھے آپ کو لکھا کہ یہاں کے شیعہ سر اٹھائے ہوئے آپ کی طرف نگراں ہیں اور آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے آپ نے تحریر فرمایا کہ تم لوگ سب زمین سے چپاں ہو جاؤ اور گھروں میں چھپ کر بیٹھ رہو اور حکومت کی بدگمانی سے بچتے رہو جب تک کہ معاویہ قید حیات میں ہیں اس کے بعد اگر میں زندہ ہوا تو پھر تمھیں اپنی رائے سے اطلاع دوں گا۔ والسلام

دیکھ رہے ہیں آپ اس انسان کی رائے کی پختگی کو؟! جو بات دس برس پہلے آپ نے امام حسن کی صلح کے وقت فرمائی تھی وہی اس وقت امام حسن کی وفات کے بعد کہہ رہے ہیں اور وہی اب اس وقت سے دس برس کے بعد جب امیر معاویہ کی وفات ہوگی تو آپ کے طرز عمل سے ظاہر ہوگی۔ اس کے بعد بھی کیا کہا جاسکے گا کہ آپ کا طرز عمل جو آئندہ ہونے والا ہے وہ ہنگامی حالات یا کسی وقتی جوش کا نتیجہ ہے جبکہ بیس برس پہلے سے آپ اس کا پتہ دے رہے ہیں اور درمیان میں بھی اُسی رائے پر پختگی کے ساتھ قائم معلوم ہوتے ہیں اور آپ کے بعد کا طرز عمل اُس کے مطابق ہے — ہرگز نہیں، صاف ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل اسباب علل کی رفتار کے صحیح اندازہ کا نتیجہ اور حکمت وتدبر اور انتہائی غور وخوض کا قطعی تقاضا تھا۔ آپ برابر امیر معاویہ کی وفات کا حوالہ صرف اُس شرط کے انجام کی تکمیل کے لیے دیتے تھے جس میں یہ تھا کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد دوسرے شخص کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اسی شرط کی خلاف ورزی پر معاہدہ کی ہمیشہ کے لیے موت ہوتی ہے اور اسی کے بعد اصولاً حضرت امام حسین معاہدہ کی پابندی سے آزاد اور صورت حال میں انقلاب پیدا کرنے کے حقدار تھے۔

یہ چیز کہ خوف ودہشت نہ پیدا کی جائے گی۔ حضرت امام حسین کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ حکومت کی بدگمانی سے ڈرتے رہو۔ معلوم ہوتا ہے جاسوسوں اور مخبروں کی سرگرمیاں اور حکومت کی اُن خبروں کے مطابق تشدد کی پالیسی کس شدت وقوت کے ساتھ جاری تھی اس کا اندازہ امیر معاویہ کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے امام حسین کو لکھا ہے

اور جس کا جواب آپ نے بڑی بے نظیر اخلاقی جرأت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ نیز اس سے کہ اُس زمانہ میں راویانِ احادیث روایت تک حضرت علی بن ابیطالب سے نہ کر سکتے تھے چنانچہ حضرت حسن بصری سے دریافت کیا گیا کہ آپ اکثر احادیث رسول اللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں حالانکہ اُس زمانہ میں آپ کا سن اتنا نہ تھا کہ آپ خود حضرت کی زبانی احادیث کی سماعت کرتے۔ حسن بصری نے سائل سے جس کا نام یونس بن عبید تھا کہا کہ تم نے مجھ سے وہ بات پوچھی ہے جو آج تک کسی نے دریافت نہ کی تھی اور اگر تمھیں مجھ سے اتنی خصوصیت حاصل نہ ہوتی تو میں تمھیں اس کا جواب نہ دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسے زمانہ میں ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو جو حدیث تم مجھ سے سنو کہ میں کہتا ہوں۔ رسول اللہ نے فرمایا، وہ اصل میں میں نے حضرت علی بن ابیطالب سے سُنی ہے مگر میں ایسے زمانہ میں ہوں کہ علی کا نام لینا میرے لیے ممکن نہیں (لمعات فریدہ فی المسائل المفیدہ۔ سید ابراہیم راوی رفاعی مطبوعۂ بغداد ص۸۳)

اس فضا اور ماحول اور کیفیت سے ظاہر ہے کہ حکومتِ وقت کا رویہ کیا تھا اور وہ معاہدہ کے شرائط کی کہاں تک پابندی کر رہی تھی۔

حضرت امام حسین ان حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے اور ان سے شدت کے ساتھ متاثر تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا مگر وقت کا انتظار تھا ان باتوں کا ظہور آپ کے اُس خط سے ہوتا ہے جو امیر معاویہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط درج ذیل ہے:-

"آپ کا خط ملا جس میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی آپ کو امید نہ تھی۔ آپ کو جو خبریں پہونچی ہیں وہ آپ کے خوشامدی لوگوں اور چغلخوروں کی پہونچائی ہوئی ہیں جو افترا و بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت آپ سے مخاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور خاموش ہوں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو اور یہ میری خاموشی آپ کے لیے اور آپ کے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ صاحب کیا آپ ہی نہیں ہیں وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا آپ ہی وہ نہیں ہیں جس نے ایسے نماز گزاروں اور پرہیزگاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے اور دین کے

معاملہ میں کسی شخص کی ملامت اور سرزنش کی پرواہ نہ کرتے تھے حالانکہ آپ اُن کے ساتھ بڑی سخت قسمیں کھا کر پختہ عہد کر چکے تھے اور انھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ آپ کی مخالفت کی تھی مگر آپ نے ان کو قتل کیے بغیر چھوڑا۔ کیا آپ ہی وہ شخص نہیں ہیں کہ جس نے عمرو بن الحمق الخزاعی صحابی رسول کو قتل کیا جو ایسے صالح اور عبادت گزار بندہ تھا کہ کثرتِ عبادت سے اس کا جسم گھل گیا تھا۔ بدن ڈھل گیا تھا، قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ آپ نے پہلے ان کو امان دیدی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جاتا تو وہ بھی پہاڑ کی چوٹی سے اُتر کر پاس آ جائے۔ پھر آپ نے کمال جرأت سے اس عہدِ خدا کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا اُس کو مار ڈالا۔ کیا آپ ہی وہ شخص نہیں ہیں جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے ایک غلام علید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابو سفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اُس کا سمجھا جائیگا جو عورت کا اصلی شوہر ہو اور زناکار کیلئے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں، مگر آپ نے اپنی مصلحت کی بنا پر حکمِ رسول کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پیر قطع کرے اور ان کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے اور درختوں کی شاخوں میں لٹکا کر مارے۔ کیا آپ ہی وہ نہیں ہیں جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضرمیین علی کے دین پر ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ علی کے دین پر ہیں ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو۔ اس نے سب کو مار ڈالا اور مثلہ بھی کیا۔ اور یہ جو آپ نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا، اپنے دین کا، اور امتِ محمدی کا خیال کروں اور ان کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت کی تفرق سے پرہیز کروں تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس امت میں آپ کی خلافت و حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور امتِ محمدی کیلئے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں ان امور میں آپ کی مزاحمت کروں، اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربتِ الٰہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کروں اور خاموش ہوں تو اس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اس سے طلبِ رشد و صلاحیت کا طالب ہوں گا۔“

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورا طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کیلئے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم کہی جا سکتی تھی مگر آخر میں وہ وقت آگیا کہ امیر معاویہ نے اپنے بعد اپنے فرزند یزید کو امتِ اسلامیہ کی قسمت کا واحد مالک بنا دیا یعنی اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا اور حضرت امام حسینؑ سے بھی یزید کی بیعت طلب کی گئی یہ تھا وہ موقع کہ اب امام حسینؑ کو اپنی مدتوں پہلے کی سوچی ہوئی مہم کیلئے قدم آگے بڑھا دینا تھا جسے آپ نے اپنا اہم ترین فرض سمجھتے ہوئے آپ نے قدم آگے بڑھایا اور اس طرح اس کی تکمیل کی جو ہمیشہ کیلئے یادگار ہے لیکن وقت اقتضا کی تفصیل کیلئے آئندہ ابواب کا مطالعہ فرمائیے۔

پہلا باب

(یزید کی ولیعہدی)

امیر معاویہ کے لیے اُن کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا۔ جس میں انھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے اور دنیا کی جاہ و حشمت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اُٹھا چکے تھے جس کا اعتراف اُنھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور فرمایا، "خدا کی رحمت ہو حضرت ابوبکر پر، اُنھوں نے نہ دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے اُن کی طرف رُخ کیا اور حضرت عمر، اُن کی طرف دنیا آئی مگر وہ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور حضرت عثمان، اُنھوں نے دنیا میں سے کچھ حصّہ لیا۔ اور دنیا نے اُن سے کچھ حصّہ حاصل کیا لیکن ہم! ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اُس میں رہے۔ (طبری ج ۶ ص ۱۸۶)

مگر انسانی خواہش خود اُس کے مفاد پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی اولاد بھی اُن فوائد سے اُسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ امیر معاویہ بھی اس عام تقاضائے نفس سے مستثنیٰ نہ تھے اگرچہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا مگر وہ اس امر کے لیے بہت فکرمند تھے کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد اس اقتدار کا مالک بنا سکیں جو خود انھیں اپنی زندگی میں حاصل ہے۔ پھر بھی وہ یزید کے افعال و عادات کی وجہ سے اس خیال کو زبان تک لانے میں بڑا پس و پیش کرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہے۔

دل کی بات زبان پر نہ بھی آئے تب بھی آثار و علامات سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ امیر معاویہ کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ امیر معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے مگر اُنھیں بھی اسکے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔

سب سے پہلے جس نے اس تعطل اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والی کوفہ تھے۔ یہ شخص بڑا ہی مدبر تھا اور عرب کے انتہائی چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ پیش آیا کہ کسی بات پر امیر معاویہ مغیرہ سے ناراض ہوئے جس کی بنا پر مغیرہ کو کوفہ کی حکومت سے دستبردار ہونا پڑا۔ مغیرہ نے دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ وہ یزید کے پاس گئے اور اُسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے پدر بزرگوار سے اپنی ولی عہدی کا اعلان کیوں نہیں کراتے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں بے چین نہیں تھا اور اگر اُسے شباب و کباب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اُس کی دیوانہ طبیعت کے لیے "ہوئے بس بہت" سے کم نہ تھا۔ وہ پہونچا امیر معاویہ کے پاس اور ایک لاڈ پیار سے پلے ہوئے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے بضد ہو کر اپنی ولی عہدی کے لیے خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات جو اس بارے میں تھے بیان کیے۔ امیر معاویہ کو تو کبھی ایسی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لیے یزید کا نام پیش کرے گا اُنھوں نے جو مغیرہ کی یہ گفتگو سُنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اُنھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اُن سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ تبلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیاد اس کام کو پورا کر دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کرے معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سُنا اور اُنھیں کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہونچے اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اُنھیں اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے امیر معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکہ جمانا تھا اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے جو خاص بنی اُمیہ کے ہواخواہ تھے اُن کو بلا کر اپنے اس مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ حضرت خلیفۃ المسلمین اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفہ کے لوگ اس ولی عہدی کو تسلیم کر سکیں گے اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد اُن کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولیعہد قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں

شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی جیب خاص یا خزانۂ سرکاری سے ۳۰ ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اور اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں امیر معاویہ کے پاس روانہ کیا۔ وفد نے جیسا سبق اُسے پڑھایا گیا تھا۔ اُسی کے مطابق امیر معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ امیر معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے اُنھوں نے وفد کو مناسب جواب دے کر علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تمہارے باپ نے ان لوگوں کے دین وایمان کو خرید کیا ہے موسیٰ نے کہا تیس ہزار درہم کو (ملاحظہ ہو تاریخ کامل ابن اثیر جزری)

امیر معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ اُنھیں جمہور کی نفرت وبیزاری کا خوف دامنگیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب اُنھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس بارے میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ بہت عرصہ سے ہوگا۔ اب اس خط سے اس خواہش کا اظہار بھی ہو گیا اور یہ ظاہر ہے کہ اب ایک وفادار گورنر کا کیا فرض ہونا چاہیے خصوصاً جبکہ معاملہ اُس کے "بھتیجے" کا ہو۔ مگر معاملہ کی نزاکت اور اس کے تمام پہلو زیاد کو لرزہ بر اندام بنا رہے تھے چنانچہ اس نے اپنے خاص محرم راز علبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا کہ "حضرت خلیفۃ المسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ اُنھوں نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے مگر اُنھیں لوگوں کی نفرت وبیزاری کا خوف ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح جمہور مسلمین متفق کیے جا سکیں اور اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے۔ اور یزید ایک آوارہ اور مطلق العنان شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم میری طرف سے سرکار کے پاس جا کر یزید کے افعال وحالات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کام کو کیجیے۔ تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے بہتر ہے کہ جلد بازی سے کام لیا جائے جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔ (طبری ج ۶ ص ۱۶۹)

عہ "زیاد کی اس صاف اور بے دھڑک رائے کی وجہ سے جو یزید کے متعلق

عہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

امیر معاویہ کے توقعات کے خلاف تھی امیر معاویہ کو گونہ مایوسی ہوئی اور انھوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنی اسکیم کو ایک زیادہ سازگار موقع تک کے لیے ملتوی کر دیں اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے غالباً زیاد کی صاف گوئی کا حوالہ دیتے ہوئے یزید کو حکم دیا کہ وہ اپنی بُری عادتوں کو چھوڑ دے تاکہ کوئی شخص بُرے چال چلن کی وجہ سے اُس کی ولی عہدی کی مخالفت نہ کرے ؎

عـ۱ "ابن مغازلی اور ابن الانباری نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے یزید کو شراب پینے سے روکا اور خفیہ طور پر کہا کہ کم از کم وہ دن کو ایسا نہ کرے تاکہ لوگوں کی نظر میں بالکل حقیر نہ ہو جائے (روض الجنان مولانا اشرف علی مطبوعہ ۱۲۷۷ھ)"

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کینہ یزید کے دل میں زیاد کی طرف سے پیدا ہو گیا بلکہ شاید ممکن کی رقابت کی وجہ سے اُس کا خیال یہ ہوا کہ زیاد نے یہ مخالفت اپنے بیٹے عبید اللہ کے اشارہ سے کی ہے اس لیے وہ عبید اللہ بن زیاد سے بھی بدظن تھا اگر بعد میں قتل حسینؑ کی ایسی مہم کا درپیش ہونا اُسے عبید اللہ کے ملانے پر مجبور نہ کرتا۔

اُدھر مغیرہ کا انتقال ہو گیا اور اِدھر بصرہ میں زیاد کی وفات ہوئی اور اب شاید اس اندیشہ میں کہ رہے سہے اعلیٰ دماغ والے خاص خاص خیر خواہ بھی کہیں راہی ملک عدم نہ ہو جائیں تو اس بڑی مہم کا سرانجام پانا مشکل ہو جائے گا۔ اب امیر معاویہ نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنی تجویز کو پھیلانا شروع کر دیا۔ کوئی شک نہیں کہ مغیرہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کر چکے تھے اور کم از کم ہوا خواہان بنی امیہ کو انھوں نے اسکے لیے تیار کر لیا تھا۔ بصرہ میں بہرحال عبید اللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اُس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہو اور وہاں کی خلقت اس کے باپ سے اور خود اس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا مگر عـ۲ "وہاں کم از کم دو مخالف موجود تھے۔ ایک سعید بن عثمان اور دوسرے عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید ان دونوں کا وجود معاویہ کے لیے باعث تشویش و تفکر تھا" سعید تو مقتول خلیفہ حضرت عثمان کی یادگار تھے جن کے دردناک واقعۂ قتل سے متاثر بنا کر اور

عـ۱ ناموس اسلام عـ۲ سید امتیاز حسین صاحب

اُن کے ساتھ ہمدردیاں پیدا کر کے امیر شام نے اپنی سیاست کے قصر کو بلند کیا تھا اور اہل شام کو حضرت علی کے مقابلہ میں صف آرا کیا تھا۔ آج اگر ذرا بھی اہل شام کو اشارہ مل جاتا کہ سعید بن عثمان خلافت کے طالب ہیں تو سب کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہو جاتیں اور امیر شام اکیلے رہ جاتے اور عبدالرحمٰن وہ فاتح شام خالد بن ولید کے چشم و چراغ تھے مفتوحہ ممالک سب ہی میں خالد بحیثیت فاتح کے ہر دل پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہوتے ہوئے مشکل تھا کہ اہل شام دوسرے کی جانب متوجہ ہوتے۔ امیر شام ان دونوں کی موجودگی میں اگر اپنے بیٹے کو خود نامزد کر دیتے تو شام کے جاہل مسلمان بھی سب یہ کہنے لگتے کہ دیکھیے اپنے بیٹے کی خاطر ایسے قابل اور لائق آدمیوں کو نظر انداز کر دیا۔

امیر معاویہ مدینہ کے لوگوں کی مخالفت یا موافقت پر غور کر ہی نہیں سکتے تھے جب تک کہ شام میں اُن کے لیے راستہ بالکل صاف نہ ہو جاتا اس لیے عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید اور سعید بن عثمان کا سوال اُن کے لیے وقت کا سب سے بڑا سوال بن گیا۔ عـ۱ "ان دونوں کا وجود معاویہ کے لیے باعث تشویش و فکر تھا مگر عبدالرحمٰن کو اُنھوں نے یوں ختم کرایا کہ ایک دفعہ وہ بیمار پڑے معاویہ نے ابن اثال عیسائی طبیب سے مل کر جس کے زیر علاج عبدالرحمٰن تھے دوا میں زہر ملوا دیا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کے دعاوی خلافت ہمیشہ کے واسطے خاک میں دفن ہو گئے" عـ۲ "اس خدمت کے صلے میں علاقہ حمص کا خراج انعام میں بخشا جاتا ہے (کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۲۲۹)

سعید بن عثمان بڑے عقلمند تھے، اُنھوں نے معاملہ کر لیا۔ یزید کی اطاعت کے قبول کرنے پر خراسان کے گورنر بنا دیے گئے۔ تفصیل کے لیے عـ۳ "دیکھو کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ دینوری جلد اول صفحہ ۱۳۰) اس میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے بیٹے سعید جو قریش میں بڑے ہی چلتا پرزہ اور زباں آور آدمی تھے معاویہ کے پاس آئے اور کہا اے امیر المومنین آپ نے کس بنا پر یزید کے لیے بیعت لی اور مجھکو چھوڑ دیا۔ قسم ہے خدا کی آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اُس کے باپ سے بہتر ہیں اور میری ماں اُس کی ماں سے اچھی ہیں اور میں خود اُس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے ہی باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سُنکر امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ اے بھتیجے

عـ۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ عـ۲ ناموس اسلام

تمہارا یہ کہنا کہ تمہارے باپ یزید کے باپ سے بہتر ہیں، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان کی عمر کا ایک دن بھی معاویہ سے بہتر ہے اور تمہارا یہ بیان کہ تمہاری ماں اُس کی ماں سے بہتر اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قرشیہ کی بزرگی کلبیہ پر ظاہر ہے مگر تمہارا یہ کہنا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے تمہارے باپ کا صدقہ ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھ لو کہ یہ تو ایک بادشاہت ہے جس کو اللہ چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ تمہارے باپ قتل ہو گئے تو بنی عاص نے اس حکومت کو آپس میں کھانا چاہا اس وقت اولادِ ابو سفیان کھڑی ہوگئی۔ اس بارے میں ہمیں تم پر فضیلت حاصل ہے لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے میرا گھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔ خیر اسے جانے دو تم کو جو کچھ مانگنا ہو مانگو۔ میں تمہیں دے دوں گا۔ سعید نے کہا یہ سمجھ لیجیے کہ جب تک میں یزید کا حامی و مددگار رہوں گا تو یزید کے لیے میرا ایسا خیر خواہ حاصل رہے گا اور یہ بھی یاد رکھیے کہ میں تھوڑا اسا لے کر راضی ہونے والا نہیں ہوں اگر آپ مجھے خلافت کے لیے پسند نہیں کرتے تو اتنا ہی سہی کہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اُس میں کچھ تو حصّہ میرا بھی رکھیے۔ امیر معاویہ نے کہا اچھا خراسان تم لے لو سعید نے کہا اس کا کیا مطلب ہے کہ میں خراسان لے لوں۔ معاویہ نے کہا یہ تمہارے لیے بطور وظیفہ و صلہ رحم ہے۔ یہ سُنکر وہ معاویہ کی تعریف کے شعر پڑھتے ہوئے باہر چلے گئے اور راضی ہو گئے جب معاویہ نے یہ شعر سُنے اور اُن کی رضامندی دیکھی تو یزید کو حکم دیا کہ اُن کے سفر کے لیے زادِ راہ کا انتظام کرو اور اُن کو خلعت دیا گیا اور تین میل تک اُن کی مشایعت کی گئی اور رخصت کیا گیا۔

شام اور عراق کو ہموار کرنے کے بعد معاویہ نے مکہ اور مدینہ کا خیال کیا ع۵۔ علامہ مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ مروان مدینہ کے حاکم اور گورنر تھے امیر معاویہ نے اُن کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہدی کی بیعت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بیعت کرو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے جب امیر معاویہ کا حکم پڑھا تو غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر میں گئے۔ گھر والوں اور ماننے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج و غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق

ع۵ ناموس اسلام

امیر معاویہ سے خود بات چیت کرنے کو روانہ ہو گئے۔ وہاں پہونچ کر امیر معاویہ سے ملے اس انداز سے چلتے تھے جس طرح دو برابر کے ہم پلہ عزیز رشتہ دار ہوتے ہیں۔ امیر معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوکروں کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آیئے یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں، ایسے لوگ جو آپکے مشوروں میں اور آپ کے کاموں میں آپکے وزیر و مددگار ہیں۔ امیر معاویہ نے کہا مروان خفا نہ ہو، تم بیشک امیر المومنین کی نظیر ہو اور ہر مشکل میں اُس کے پشت پناہ اور مددگار رہو۔ اس لیے یزید کے بعد تم کو ہی یزید کا ولی عہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیال خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوئے۔" مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی کے متعلق ذکر کیا اور کہا امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کا اُسی طرح حکم دیا ہے جس طرح حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کے لیے بیعت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بگڑ گئے اور کہا ابو بکر نے اپنے بیٹے کی بیعت نہیں لی یہ تو کسریٰ وقیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی وزانی کی بیعت نہ کرینگے۔ عبدالرحمٰن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسین، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اُس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ ؏۵ در پردہ اُن کا منشا یہی تھا کہ ان متبرک شہروں میں جن سربرآوردہ مسلمانوں نے ابھی تک اُن کی کوششوں کا مقابلہ کیا تھا اُن کو ہموار کر لیا جائے۔ اُن کا مشن قطعاً ناکامیاب بھی نہ ہوا۔ اس لیے کہ بہت سے لوگوں کو یزید کی جانشینی تسلیم کرنے کے لیے خوشامد اور دھمکی سے تیار کر لیا گیا لیکن اب بھی چند ایسے نفوس رہ گئے تھے جو کسی صورت سے تیار نہ کیے جا سکے۔" امیر معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو دنیائے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطۂ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا ورثہ پہونچتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے ملاحظہ کیجیے:۔

عبدالرحمٰن ——— ابن ابی بکر

؏۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

عائشہ ———— بنت ابی بکر
عبداللہ ———— ابن عمر
حسین ———— ابن علی
عبداللہ ———— ابن عباس
عبداللہ ———— ابن زبیر

ان ناموں ہی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولی عہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی ولی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی نمایندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا اپنا ثبات قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب حضرات کا متفق ہونا خود ایک بڑی فیصلہ کن حقیقت ہے۔

امیر شام نے ان لوگوں کو خوف دلا کر بھی دبانا چاہا اور لالچ دلا کر بھی مائل کرنا چاہا چنانچہ سب سے پہلے [۵] "جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو حسین بن علی سے ملاقات ہوئی حسین کو دیکھ کر امیر معاویہ نے کہا نہ تمہارے لیے خوشی ہو اور نہ مبارکی۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسین نے فرمایا چپ رہو ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں معاویہ نے کہا اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو اُن سے بھی یہی کہا کہ تو ایک چھپے ہوئے مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہو جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دم ہلاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اُس کی دم پکڑ لی جائیگی دور کرو اس کو اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اس کے بعد عبدالرحمن بن ابی بکر ملے۔ اُن کو کہا کہ یہ بڈھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے پھر حکم دیا کہ ان کی سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارو اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا (کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۵۲)

---

[۵] ناموس اسلام

اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافت یزید کے لیے ان بزرگان دین کو ڈرانے دہلانے قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔ تاریخ روضۃ الصفا کے الفاظ یہ ہیں "اگر امام حسین وعبداللہ بن زبیر وعبدالرحمن بن ابی بکر وعبداللہ بن عمر را توفیق رفیق گردد و با یزید بیعت کنند فبہا و الا با ایشاں بکنم آنچہ باید کرد و ازیں نوع کلمات بسیار گفت و تہدید بے اندازہ بر زبان آورد"

حضرت عائشہ نے جو یہ سنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش اُن کی آگ میں جلائی۔ آج مدینہ میں آکر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہونچاتے ہو اور اُن کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو۔ اور فرزند رسول اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم اُن لوگوں میں سے ہو جنھیں رسول نے رحم کھا کر فتح مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں؛

طبری نے امیر معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

امیر معاویہ نے کہا اے عبدالرحمن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی جرأت کرتے ہو۔ عبدالرحمن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ امیر معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمھارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عبدالرحمن نے کہا اگر تم ایسا کروگے تو لعنت خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہو گے (طبری ص۱۷۷)

یہ تو خوف دلانے کی ترکیبیں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختیار کی گئی چنانچہ استیعاب میں عبدالرحمن بن ابی بکر کے حالات میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے بیعت یزید کے لیے ایک لاکھ روپیہ عبدالرحمن بن ابی بکر کے پاس بھیجا مگر اُنھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ ایسا ہی عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے مگر اُنھوں نے بھی یہی فرمایا کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ امام حسین کو بھی بہت کچھ تحفہ تحائف اور زر و مال پیش کیا گیا تھا مگر حسین نے قبول نہیں فرمایا اور واپس کر دیا۔ اس کا تذکرہ طبری تے اپنی تاریخ میں پھر

ابن صباغ مالکی نے فصول مہمہ میں اور مولانا محمد مبین فرنگی محلی نے وسیلۃ النجاۃ میں بھی کیا ہے۔
حضرت عائشہ نے اس مخالفت میں بڑا نمایاں حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبر رسول پر بیٹھے یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ حضرت عائشہ نے اپنے حجرہ سے پکار کر فرمایا کہ خاموش ہو جاؤ کیا کر رہے ہو کیا تم سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ امیر معاویہ نے کہا کہ نہیں، تو ام المومنین عائشہ نے فرمایا کہ پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟ معاویہ یہ سن کر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اتر آئے۔"

یہ بات بالکل پراسرار ہے کہ اسی کے بعد حضرت عائشہ کی وفات ہوگئی۔ کہنے والوں نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے اور ذمہ داری اس کی امیر معاویہ پر عائد کی ہے جس کو حکیم سنائی نے بھی اپنی مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ میں نظم کیا ہے۔ مگر تاریخی قلم کے لیے اس بارے میں کچھ لکھنا ذمہ داری کے خلاف ہے۔

عہ "عام مسلمانوں کے لبوں پر مہر خاموشی لگی ہوئی تھی اور جیسی شدید مخالفت کی امید تھی وہ ان سے عمل میں نہ آئی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو معاویہ نے اس پر زور پروپیگنڈے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے اور اپنے ہوا خواہوں کو امید سے زیادہ انعام و اکرام اور جاہ و منصب دے رہے تھے۔ دنیا طلبوں کو حصول مقصد کے لیے اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ وہ ایمان کو بالائے طاق رکھکر معاویہ کی موافقت کے گیت گانے لگے۔ اب رہا وہ گروہ جو دل سے اس تجویز کا مخالف تھا اور معاویہ کے اس عمل کو قہر آلودہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان کی زباں بندی کے لیے سیاسی تازیانوں سے کام لیا گیا بہت سے بے گناہ ہلاک کیے گئے۔ کچھ زہر سے۔ کچھ تلوار سے، بہت سے قید ہوئے۔ بہت سے ذلیل و رسوا کر کے جلاوطن کر دیے گئے۔ زبردست حکمران کے مقابل میں جب ان بے چاروں کی پیش نہ گئی تو مجبوراً خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔"

مگر یہ صورت حال اس امر کو مشکوک نہیں بنا سکتی کہ یزید کی ولی عہدی اصول شریعت اور آئین اسلام کے خلاف تھی مسلمانوں میں خلافت کے بارے میں تین نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خداوند تعالیٰ کی جانب سے ہے اور نص یعنی پیغمبر کی نامزدگی پر موقوف ہے ظاہر ہے کہ اس لحاظ

عہ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

سے یزید کے لیے کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خلافت کے لیے جمہوری اصول پر انتخاب ہونا چاہیے۔ مگر یزید کے لیے یہ صورت نہ تھی۔ یہاں تو شاہان خود مختار کی طرح وراثت کے اصول پر عمل ہو رہا تھا۔ اور باپ اپنے بیٹے کو صرف بیٹا ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے سر پر مسلط کر رہا تھا۔ اس کو جمہوریت کے اصول سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ خلیفہ وہ ہو سکتا ہے جو تلوار لے کر کھڑا ہو اور بزور بازو اپنا تسلط قائم کرے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں بھی ولیعہدی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہم اس ولی عہدی کے واقعہ کو خود اسی کی انفرادی حیثیت میں دیکھیں لیکن جب ہم اس کے ساتھ حضرت امام حسن کی صلح اور اس کے شرائط کو پیش نظر رکھ لیتے ہیں تو پھر تو اس ولیعہدی میں جواز کا کوئی شائبہ باقی ہی نہیں رہتا۔ حضرت امام حسن کے ساتھ شرائط صلح نامہ میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بجائے کیا ہوگا؟ اس میں تھوڑا سا اختلاف سہی۔ بعض کہتے ہیں یہ شرط ہوئی تھی کہ اس کے بعد خلافت اہلبیت کی طرف راجع ہوگی اور بعض کہتے ہیں یہ شرط ہوئی تھی کہ اس کے بعد عام انتخاب ہوگا اور مسلمان مل کر جس کو منتخب کر لیں گے وہ خلیفہ قرار پائے گا۔ اس اختلاف سے بہر حال یہ امر تو متفقہ ہی رہتا ہے کہ چاہے جو کچھ بعد میں ہو مگر امیر معاویہ کا اپنے بیٹے کو خود نامزد کرنا تو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی ہوتا چہ جائیکہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی مسلمان کے بھی لائق شان نہیں ہیں چہ جائیکہ خلافت کے لیے جو بہر حال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب فرماتے ہیں

"اسلام کے شروع سے حاکم اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا رہا تھا۔ مذہب اور ریاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔ اسی لیے

جتنے سمجھدار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو نازیبا سمجھ رہے تھے اور اُسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

علہ "یہاں صرف حسن بصری کا قول درج کیا جاتا ہی جو تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵ اور ابو الفدا ج ا ص ۱۹۶ میں درج ہی۔ وہ کہتے تھے کہ معاویہ میں چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہی۔ اول اُنھوں نے بزور شمشیر خلافت کو حاصل کیا درانحالیکہ اُس وقت اصحاب رسول جو اُن سے افضل تھے باقی تھے۔ دوسرے اپنے بعد اپنے بیٹے کو جو شرابخوار نشہ باز تھا اور خلاف شریعت محمدی ریشم پہنتا اور طنبور بجایا کرتا تھا مسلمانوں کا خلیفہ بنایا تیسرے زیاد کو اپنا بھائی ابو سفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا ہی کہ بیٹا اُسی کا ہو سکتا ہی جو اصلی شوہر ہو اور زنا کار کے لیے پتھر ہیں۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا" دوسرا قول اُن کا یہ بھی تھا علہ "کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار دو شخص ہیں۔ ایک تو عمر بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کی رائے دی تھی چنانچہ وہ بلند بھی کیے گئے اور دوسرے مغیرہ جس نے کہ معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر مغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب و مشورہ کا اصول قائم رہتا معاویہ کے بعد جو تخت نشین ہوے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال سے اپنے بیٹوں کی بیعت کراتے رہے" ڈاکٹر وحید مرزا صاحب "ٹریجڈی آف کربلا" میں لکھتے ہیں "یزید کی مطلق العنانی اور مذہبی تعلیمات سے کھلی ہوئی بے اعتنائی اُس کے باپ کو خوب معلوم تھی اسی طرح جس طرح اُن کے درباریوں کو معلوم تھی۔ اسی سبب سے جب امیر معاویہ نے اُس کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کرنے کا خیال کیا تو بہت سے اُن کے خاندان کے ہوا خواہوں نے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن معاویہ اپنی ضد پر برقرار رہے اُنھوں نے ایک بدکار شخص کو بحیثیت اپنے ولیعہد اور خلیفہ کے تسلیم کرانے پر مسلمانوں کو مجبور کرنے اور اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کے مرتکب ہونے اور تمام سچے مسلمانوں کی نفرت و دشمنی کے مستوجب ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ باوجود احتجاجات و اعتراضات کے اور باوجود اُس صلحنامہ کی شرطوں سے نمایاں مخالفت کے جو حسن اور معاویہ کے درمیان طے پایا تھا جس کی رو سے

علہ ناموس اسلام علہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

خلافت کو معاویہ کے بعد علی کے خاندان کی طرف عود کرنا چاہیے تھا یزید کو اُنھوں نے رسماً اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس لالچ اور باپ کی اپنے بیٹے کے ساتھ اندھی محبت نے وحدت اسلامیہ کو بہت بڑا دھچکا پہونچایا اور ایک ایسا گھاؤ ڈالا جو کبھی اچھا نہیں ہوا۔"

مسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمایندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج نظر آرہے ہیں۔

امیر معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے زیادہ نمایاں ہستی حسین کی ہے اور اس بنا پر اُنھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ حسین بن علی کو بلوا کر کہا کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہموار ہوچکے ہیں سوائے پانچ آدمیوں کے قریش میں سے جن کی سرکردگی تم کر رہے ہو۔ حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا "میں اُن کی سرکردگی کرتا ہوں؟" معاویہ نے کہا "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں" یہ سُن کر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر اُن سے بیعت کا مطالبہ کیجیے۔ اگر ان سب نے بیعت کرلی تو تنہا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں امیر معاویہ کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ آخر[ع۱] "حجاز کی قسمت کا فیصلہ اپنی آیندہ نسلوں پر چھوڑ کر معاویہ شام واپس آئے چونکہ نہ حیلہ وتدبر سے حصول قوت کے قائل تھے اس لیے اُنھوں نے اس بات پر غور بھی نہ کیا کہ حسین کا یزید کی بیعت نہ کرنا ایک ایسے اہم تاریخی واقعہ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا جو اولاد ابو سفیان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردے گا۔" اگرچہ امیر معاویہ کی حیات میں کسی ایک نے بھی اُن اشخاص میں سے بیعت کی ہامی نہیں بھری مگر حسین میں اور دوسرے بیعت نہ کرنے والوں میں ایک بنیادی فرق موجود تھا وہ جسے ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ٹریجڈی آف کربلا میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "امیر معاویہ نے اپنے ولیعہد کی فرمانبرداری کا مطالبہ اپنے قلمرو کے تمام خاص خاص اشخاص سے جاری کردیا اور ان سب نے بخوشی یا دوسری طرح اپنے بادشاہ کی برتر خواہش کے سامنے سر جھکا دیے۔ سوائے تین آدمیوں کے۔ حسین، ابن زبیر، ابن عباس لیکن جبکہ مؤخرالذکر دونوں آدمیوں کے متعلق یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ معاویہ کا کم وبیش شخصی اغراض کی بنا پر مقابلہ کر رہے ہیں

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

حسین کا امتناعِ قیام معاویہ کی بدعت کے خلاف بہت ہی شریف تر مقاصد کے باعث تھا ابن زبیر اور ابن عباس حجاز میں خود مختار حکمران بننے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اس توقع میں کہ معاویہ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں۔ اُن شورش کے دنوں میں تختِ سلطنت کے حصول کی پیش بندی کر رہے تھے لیکن حسین کا معاملہ اس سے مختلف تھا وہ اس وقت خاندان رسول کے بزرگ مرتبہ سردار اور تسلیم شدہ سچے مذہب کے مجاہد تھے۔ رسول کے مقدس مشن کی حفاظت اور عزت کا لحاظ کون اتنا رکھ سکتا تھا جتنا کہ خود اُن کا نواسا؟ وہ اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے اور اس لیے اُنھوں نے ایک لمحہ بھی اپنے فرض سے جی نہیں چرایا۔ اُنھوں نے صاف صاف یزید کی جانشینی کی تجویز پر منظوری دینے سے انکار کردیا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس انکار کے نتائج خود اُن کے لیے کیا ہوں گے؟ یہ سلطنت کے اقتدار کو بڑی سخت ٹھوکر تھی جسے امیر معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسین بن علی کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سلبی حدود تک محدود رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت و شورش کا الزام عائد کیا جاسکے۔ دوسری طرف عـ۵ "معاویہ خود چونکہ ایک تجربہ کار اور مدبر سیاست داں تھے، اس لیے اُنھوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ معاملہ میں ہاتھ ڈالا تھا اور حسین کو ہموار کرنے میں دو چار دفعہ ناکامیاب ہونے کے بعد اُنھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ حسین کو اُن کی رائے کے خلاف مجبور نہ کیا جائے۔ حسین کے نسب، کردار اور تربیت سے واقفیت کی وجہ سے معاویہ بخوبی جانتے تھے کہ اُن کے لیے جان دے دینا ایک فاسق و فاجر کی بیعت سے آسان ہوگا اور ایسی صورت میں اُن کو قتل کرکے ہی منزل پہ تمام اسکیم ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی معاویہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر حسین سے مداخلت نہ کی جائے تو وقتی طور پر اُن سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُن کی ذہنی تربیت، کردار اور نسبی شرافت

عـ۵ سید خورشید حسین صاحب نقوی (کانپور)

جو اُن کو یزید کی بیعت کرنے سے مانع ہوئی، وہی اُن کو حکومت کے خلاف سازش و بغاوت کرنے سے بھی مانع رہے گی اور اس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لیے وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی کو ممدوح نہ سمجھیں گے جیسا کہ اُن کے باپ حضرت علی نے مدت العمر دنیاوی اعزاز کو نظرِ حقارت سے دیکھا اور اپنے ذاتی حق کے سلب ہونے پر کبھی اعلانِ جنگ نہیں کیا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ محمد، علی، حسن اور حسین کسی نے ذاتی اغراض کی بنا پر کبھی شمشیر کشی نہیں کی"

پھر بھی امیر معاویہ تدبیروں سے غافل نہ تھے اور نہ حسین مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسین چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسین جوش میں اگر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں جو بغاوت کی ذمہ داری اُن پر عائد کر دے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کربلا کی جنگ شروع یہیں سے ہو گئی مگر یہ اس وقت ایک صبر آزما نفسیاتی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر امیر معاویہ کا رشتۂ عمر قطع نہ ہوتا اور نوعمر ناتجربہ کار، غرورِ سلطنت سے بدمست یزید تختِ سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

(دوسرا باب)

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ اور آپ کا قطعی انکار

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ موت اور بیماری کے لیے بھی ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔ ع۵ "مدینہ سے روانہ ہو کر معاویہ شام جا رہے تھے کہ راستے میں اُنھوں نے ایک کنویں سے پانی پیا۔ کہا جاتا ہے کہ پانی کی سمیت نے اُنھیں علیل کر دیا۔ شام تک اُن کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔"

اس وقت اُن کی عمر ۷۵ برس کی تھی۔ دمشق پہونچنے کے بعد اسی مرض کا سلسلہ قائم رہا اور وہی اُن کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔

اُنھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اُس وقت جبکہ صحت سے مایوسی ہو گئی تھی شدید احساس تھا کہ اُنھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت صرف کی ہے اور کس قدر اپنے راحت و آرام اور روپیہ کی قربانی کی ہے اور سب سے بڑی قربانی ضمیر کی قربانی جو روحانی تکلیف کی باعث ہوتی ہے۔ جس کا اظہار اُنھوں نے بصیغۂ راز مروان سے کیا۔ ملاحظہ ہو علامہ ابن حجر مکی کی کتاب "تطہیر الجنان و اللسان" جو اُنھوں نے امیر معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ رونے لگے۔ مروان نے کہا کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا کیا سبب ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اُٹھائی ہو۔ اب سِن زیادہ ہو گیا اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کو حاصل کر لیا (حاشیہ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۵۶)

علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے اُن کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو اُن کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جس نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا (حاشیہ صواعق محرقہ ص۵۸)

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار کیا ہو اور کدوکاوش کی ہو اُتنی ہی اُسے اپنے اُس مقصد کی کامیابی کی فکر زیادہ ہوتی ہے اور اُس میں کسی خلل کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ امیر معاویہ نے یزید کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں اُن کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا تھا، اس کا تذکرہ انھوں نے خود یزید سے کیا اپنے مرض الموت کی ابتدا میں جبکہ انھوں نے اُسے بلا کر کہا:۔ بیٹا میں نے تجھ کو کوچ اور مقام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تیرے لیے تمام سامان مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تیرے لیے خم کرا دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تیرے لیے جھکا دیا اور سب کو تیرے اوپر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمہارے لیے مکمل ہو چکا ہے بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے حسین بن علی اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر (طبری ج ۶ ص۱۷۹)

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا امیر معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اتنا اتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا اُن کی موت کا وقت زیادہ قریب آتا جاتا تھا۔

افسوس ہے کہ وہ یزید جس کے لیے اُنھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا اور دمشق کے باہر مقام "حوارین" پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا امیر معاویہ نے اپنی حالت دگرگوں پا کر اُس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اُس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو اُنھوں نے اپنے پولیس افسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید آئے تو میری وصیت اُس تک پہونچا دینا اور اُسے بتلانا کہ میرا حکم اُس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے جو لوگ

وہاں سے دارالسلطنت میں آئیں اُن کا اکرام و احترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دور ہیں اُن کی بھی وقتاً فوقتاً خبر گیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دستِ و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ اُن میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ بتلادینا کہ مجھے اُس کے خلاف صرف چار آدمیوں سے خوف ہے ایک حسین بن علی دوسرے عبداللہ بن عمر تیسرے عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور چوتھے عبداللہ بن زبیر (الاخبار الطوال ص۲۲۷)

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ امیر معاویہ بستر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ اُن کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا۔ نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ انھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پتھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو چار جو یزید کے لیے اُن کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر حسین کی تھی۔

رجب ۶۰ھ میں امیر معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ اڑتیس برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے اور ۸۰ برس کی عمر میں اب اُن کی وفات ہوئی (کتاب البلدان ابن فقیہ مطبوعہ لیدن ص۱۰۹)

یزید کو اُس کی شکار گاہ میں اس واقعہ کی اطلاع دی گئی جس کو سُنکر وہ دمشق پہونچا ایسے وقت جب امیر معاویہ دفن بھی ہو چکے تھے باپ کی بچھائی ہوئی مسند اُس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اُس کی بیعت کرلی۔

اب ضرورت ہے کہ ہم آپ کے سامنے یزید کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک کی زندگی کا ایک خاکہ اور اُس کے اوصاف و سیرت کا ایک خلاصہ پیش کردیں تاکہ آپ کو مسلمانوں کی قسمتوں کے اس تازہ مالک اور حکومت اسلامی کے جہاز کے اس نئے ناخدا سے تعارف ہوجائے اور آپ مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرسکیں۔

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ٹریجڈی آف کربلا میں تحریر فرماتے ہیں:۔

یزید کی ماں میسون تھی۔ ایک صحرائی عورت جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی اور

اپنی آزادی اور خانہ بدوشی والے گھر کی سادگی کی مشتاق تھی۔ فطری طور پر اُس نے اپنے لڑکے کو کمسنی ہی میں اپنی ہم قوموں کے پاس بھیج دیا کہ بدو عربوں کے درمیان کُھلے ہوئے علاقہ میں اُس کی تربیت کی جائے۔ یزید بڑھا خانہ بدوشی کے نمایاں علامات رکھتا ہوا اور ایک نمونہ ہو کر کافر عربی حکومت کا۔ اُس کے اوصاف یہ تھے کہ وہ خوش دل اور ہشاش بشاش رہتا تھا اور شکار کی تفریحوں اور جام شراب کا دلدادہ، متکبر اور مدمغ شخص تھا۔ وہ برائے نام مسلمان تھا اور اُن ضروری اوصاف سے خالی تھا جن کے موجود ہونے کی اسلامی حکومت کے دنیوی اور روحانی سردار میں امید کی جا سکتی ہے۔"

علامہ دمیری نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میسون بنت بحدل کلبیہ جو یزید کی ماں تھی اپنے حسن و جمال کی بدولت امیر معاویہ کی بہت منظور نظر ہو گئی تھی اور اُنھوں نے اُس کے لیے غوطہ کے مقابل میں ایک قصر کا انتظام کیا تھا جہاں سے اس پرنزہت جگہ کی سیر دور تک ہو سکتی تھی اور اُس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن اور دیبائے رومی کے رنگا رنگ اور منقش فرش فروش مہیا کیے تھے اور بہت سی حسین وجمیل کنیزیں خدمت کے لیے دی تھیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اُتارا گیا مگر یہ سب کچھ اُس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا اس لیے کہ اُسے تو اپنا جنگل اور اس میں چرتی ہوئی بھیڑ بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن کا اتفاق کہ امیر معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون نے ایک بہترین پوشاک پہنی اور قیمتی زیورات زیب جسم کیے اور خوشبوئیں لگائیں اور اس طرح بن ٹھن کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اُس کھڑکی کے سامنے بیٹھی جو کہ غوطہ کے مرغزاروں کی طرف تھی۔ اُس کو وہاں کے درخت نظر آئے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آئی۔ اُس وقت اُسے اپنا نجد کا بادیہ یاد آیا اور اپنی ہمجولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں جس سے وہ بے ساختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے کہا کہ نصیب دشمناں آپ کے رونے کا سبب؟ حالانکہ آپ اس تخت سلطنت پر بیٹھی ہوئی ہیں جو سلطنت بلقیس کا جواب ہے۔ میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھنے لگی جن کا مضمون یہ ہے:- "یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں جو بائی ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں مجھے اس عالی شان

محل سے زیادہ محبوب ہے اور وہ بالوں کی عبا جو میرے جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے مجھے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپیڑے کی صدا مجھے طبلوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتا جو مہمانوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین و لجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا اور میری قوم قبیلہ کا ایک دبلا پتلا حقیر آدمی مجھے ایک سخت بدخو مسٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔"

جب امیر معاویہ آئے تو اس خواص نے یہ قصہ امیر معاویہ سے بتایا یا امیر معاویہ نے یہ اشعار پڑھتے خود سُن لیے۔ اُن کو بڑا غصہ آیا اور کہا اب تو سب اس نے مجھکو سخت بدخو مسٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں ساز و سامان ہے سب کچھ لے لے اور چلی جائے چنانچہ اُسے نجد میں اُس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا اس حالت میں کہ یزید اُس کے پیٹ میں تھا چنانچہ یزید کی پیدائش وہیں بادیہ میں ہوئی۔ دو برس کے بعد جب امیر معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اُس کو وہاں سے بلوا لیا (حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۰) ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (ص ۲۳) میں ان اشعار کا ذکر کیا ہے مگر نظم کرنے والے کا نام درج نہیں کیا۔ عـ۵ "بدو عربوں سے یزید نے وہ تمام خصوصیات و عادات حاصل کئے جو کہ ایام جاہلیت کے عربوں سے مخصوص تھے۔ وہ شکار اور شطرنج کا شوقین تھا۔ خوبصورت عورتوں کا دلدادہ تھا اور شراب جائز رکھتا تھا خود شاعر تھا اور ایسے شاعروں کو دوست رکھتا تھا جو اُسی کی طرح مذہب اور اخلاق سے بیگانہ ہوں۔ اس کے لیے مذہب کا نام صرف زبان خلق سے بچنے کا ایک وسیلہ تھا اور ایک نقاب تھا جو اُس کے گناہوں کو پوشیدہ رکھے۔" وہ اپنے عیش و عشرت میں کسی اصول مذہب کو مخل نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے لیے دنیا سب کچھ تھی اور دین کچھ نہ تھا۔ یزید کا یہ طریقہ صرف اُسی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ ایک بڑی جماعت کا نمائندہ تھا جو ہر طرح سے اسلام کی بیخ کنی کے لیے تیار تھی یعنی اُن ہی منافقین اور مخالفین اسلام کا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اُس کے دور حکومت

عـ۵ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

میں کفر و الحاد، فسق و فجور کے لیے کوئی مانع نہ رہا تھا اور یہ خرابی تمام حکومت اسلامی میں سرایت کرتی جا رہی تھی ؎۱۔ یزید کے حاشیہ نشین اور مشیر کار وہی لوگ تھے جو کسی مذہبی و اخلاقی نظام کے قائل نہ تھے۔ وحشی خصائل کو صرف زندہ نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ انہیں اور زیادہ مستحکم اور منظم شکل دی جا رہی تھی۔ حکومت اور اس کے ارکان سے نیکی و بدی کا شعور مفقود ہو گیا تھا۔ جو فعل اُن کی شہوت کو زیادہ سیراب کرے وہی نیک تھا دوسرے انسانوں کو طفیلیوں کی طرح جینے کی اجازت تھی۔ ہر ممکن تدبیر اختیار کی جا رہی تھی کہ بنی آدم کی قوت تمیز کو مفلوج کر دیا جائے تاکہ حکومت اپنے نگردنی افعال کی باز پرس سے مطمئن ہو جائے۔ نسلی و ملکی و لسانی امتیازات بنی امیہ کے نقطۂ نظر سے قائم کر لیے گئے تھے۔ سرمایہ داری کا بھوت یزید کے سر پر سوار تھا۔ وہ ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، بیٹی بیوی اور "دلنواز محبوبہ" میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔

ایڈورڈ براؤن نے بھی لٹریری ہسٹری آف پرشیا (ص ۲۲۶) میں یزید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ ایک بدویہ ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ صحرا کی کھلی ہوئی ہوا میں اس نے پرورش پائی شکار کا بڑا ماہر و شیفتہ، ایک بلیغ شاعر اور عاشق جانباز، شراب اور دیگر لہو و لعب کی باتوں کا شیدا اور رقص و سرود کا دلدادہ، مذہب سے کوسوں دور تھا۔"

اُس کے اخلاق و عادات کا بیان تقریباً تمام مؤرخین نے اسی قسم کے الفاظ میں کیا ہے۔ ؎۲۔ آسبرن نے لکھا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل ہی یزید نے مومنین کی بڑی تذلیل کی تھی وہ علانیہ شراب پیتا تھا، کتوں سے بے حد شوق رکھتا تھا اور اسی طرح باز اور دوسرے اس طرح کے جانوروں کا بہت شوقین تھا۔" (ص ۱۲۳)

ارونگ نے لکھا ہے کہ خوبیوں کے اعتبار سے وہ بہت ناقص تھا۔ اُس میں شعریت کا خداداد مادہ موجود تھا۔ شام کے عیش و تنعم میں رہنے کا اثر اُس کے ریشمی لباس اور رقص و سرود کے اشتیاق سے ظاہر تھا لیکن وہ بہت ذلیل تھا اس لیے کہ اس میں پست خیالی، کمینہ پن اور لالچ موجود تھا وہ انتہا سے زیادہ شہوت پرست اور شراب و فسق و فجور کا اُس حد تک عادی تھا جو انسان کو انتہائی ذلت کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔"

؎۱ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری ؎۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

جسٹس امیر علی لکھتے ہیں "یزید ظالم اور غدار دونوں تھا۔ اس کی خبیث طبیعت رحم و انصاف جانتی ہی نہ تھی۔ اس کی دلچسپیاں ویسی ہی پست تھیں جیسا کہ اس کے ساتھی پست بد اخلاق اور اوباش تھے۔ وہ مذہبی پیشواؤں کی یوں تذلیل کرتا تھا کہ وہ بندر کو پکڑ کر پہنے علماء و فقہاء کا لباس پہنا کر خوبصورت اور سجے ہوئے گدھے پر بٹھا کر جہاں خود جاتا تھا وہاں لے جاتا" (ص ۹۲

علامہ دمیری نے بھی لغت "فہد" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے (حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۱۸۶) دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بندر کو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ میں اس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا گیا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس بارے میں شعر کہے جن کا مضمون یہ ہے کہ کون میری طرف سے کہدے اس بندر سے کہ جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابو قیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی (حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۱)

ابن الفوطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابو قیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اسے پلایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے:۔ اے ابو قیس اس کی مہار سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔ اس گدھی نے یہ کارنمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی۔ (اعیان الشیعہ ج ۴ ص ۲۹۶)

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شراب خواری اس کی ضرب المثل تھی چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا "سکران" یعنی بدمست رکھ لیا تھا (الاخبار الطوال ص ۲۶۱)

وہ کسی موقع پر مصلحۃً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا چنانچہ جب ولیعہدی کے دور میں امیر معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لئے حج کو گیا تو مدینہ رسول میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جمگھٹے میں شراب کا دور ضرور چلا (کامل ج ۴ ص ۲۳

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا (صواعق محرقہ ص ۱۳۵ مطبوعہ مصر)

اُس کی جرأت و جسارت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اس بارے میں حرمت رسول تک کا پاس نہ کرتا تھا چنانچہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ یزید نے حضرت عائشہ کے حسن و جمال کو سن کر آپ کے بارے میں ہوس کی۔ لوگوں نے جب منع کیا تو وہ باز رہا (مدارج النبوۃ ۱۴۵)

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص ہو بلکہ اُس کے خیالات بھی ایسے تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اُس کے دیوان کے اُن اشعار سے ہوتا ہے۔ جن میں اُس نے احکام شریعت کا مذاق اُڑایا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں غیر واقعی بھی نظم ہو جاتی ہیں اور اُن کے بیانات اکثر تخئیلی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراوش کرتے ہیں جیسا انسان کا مذاق طبیعت ہے۔ ایک دیندار، متقی اور پرہیزگار شخص سے ممکن نہیں کہ وہ اشعار میں خدا یا رسول یا ائمہ دین کے ساتھ اس طرح کی جسارتیں کرے جو انتہائی حقارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی یہی رکھتا تھا۔ دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو۔ خیام سے پہلے یزید کے ذہن میں تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

اقول لصحب ضمت الکأس شملهم　　وداعی صبابات الهوی یترنم

خذوا بنصیب من نعیم ولذۃ　　فکل وان طال المدی یتصرم

"اُن ساتھیوں سے جنھیں ساغر شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق و محبت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا یہ قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش و لذت سے بہرہ ور ہو لو

کیونکہ کتنی ہی مدت طولانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہونا ہے" (صواعق محرقہ ص ۱۳۲)

عہ۱ "نماز اور شرابخواری کا موازنہ کرتے ہوئے اُس نے ایک شعر میں کہا:۔

ماقال ربک ویل للاُلٰئے شربوا بل قال ربک ویل للمصلین

(یعنی) خدا نے شرابخواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے ویل للشاربین کہیں نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو ویل للمصلین کہا ہے" عہ۲ ایک جگہ اُس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے:۔

فان حرمت یوما علی دین احمد فخذھا علی دین المسیح ابن مریم

یعنی اگر دین احمد میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دین مسیح پر ہو کر پی لو"

اُس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نغمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے:۔

معشر الندمان قوموا واسمعوا صوت الاغانی

واشربوا کاس مدام واترکوا ذکر المعانی

شغلتنی نغمۃ العید ان من صوت الاذان

وتعوضت عن الحور عجوزا فی الدنان

"اے حریفان شراب اُٹھو اور گانوں کی صدا سُنو، ساغر شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھکو ستار و سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی پری کو پسند کر لیا ہے"

یوں تو یہ اشعار تفریح طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں حور و قصور کی خبروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے اپنے ان اشعار میں:۔

علیۃ ھاتی واعلنی وترنمی بذلک انی لا احب التناجیا

حدیث ابی سفیان قدما سما بھا الیٰ احد حتی اقام البواکیا

الا ھات سقینی علیٰ ذاک قھوۃ تخیرھا العنسی کرما شامیا"

عہ۱ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری عہ۲ ناموس اسلام

اذا ما نظرنا فی امور قدیمۃ — وجدنا حلالا شربہا متوالیا

وان مت یا ام الاحیمر فانکحی — ولا تاملی بعد الفراق تلاقیا

فان الذی حدثت عن یوم بعثنا — احادیث طسم تجعل القلب ساھیا

ولا بد لی من ان ازور محمدا — بمشمولۃ صفراء تروی عظامیا

(۱) اے نازنیں محبوبہ مجھے گانا اور بلند آواز سے سنا اور گا کر پڑھ۔ مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سُنا ابوسفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اُس کا کارنامہ جہاں اُس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کر دیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے جام شراب پلاتی جا۔ وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگوروں سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی عملدرآمد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا ہمیشہ حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مر جاؤں اے نازنیں محبوبہ تو تو کسی اور سے نکاح کر لینا اور یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی ملاقات بھی ہوگی۔ یہ جو دوسری زندگی کے متعلق تو نے قصے سنے ہوں گے یہ پارینہ قصے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہونچ گیا ہو۔

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اُس کے دل میں جاہلیت کے خیالات اور بدر و احد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفےٰ سے ایک ضد اور کد کا خیال موجود تھا۔ ان کے ساتھ آپ کے سامنے وہ اشعار بھی آئیں گے جو اُس نے قتل حسینؑ کے بعد اور اہلبیت کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس کے بعد یہ سیاست دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشین رسول اور امیر مومنین بھی بن کر بیٹھ گیا تھا۔ اور مسلمانوں کی اکثریت اُس کی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے مزاج اخلاقی پر کیا پڑ سکتا ہے سوائے اس کے کہ ان میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہ حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اور وہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ع۱ (۲) علامہ مسعودی مروج الذہب (ج ۲ ص۹۳) میں لکھتے ہیں کہ یزید کے اہل دربار اور اُس کے گورنروں پر اُسی فسق و فجور کا غلبہ ہو گیا

ع۱ ناموس اسلام

جس کا یزید ارتکاب کیا کرتا تھا یہاں تک کہ اس دور میں مکہ اور مدینہ میں بھی گانے کا رواج ہو گیا اور آلات لہو کا استعمال ہونے لگا اور لوگ شراب کھلم کھلا پینے لگے۔ علامہ بدخشی نے نزل الابرار ص ۹۰ میں بھی یہ عبارت درج کی ہے" اسبرن لکھتا ہے کہ دمشق کے لوگ علانیہ سڑکوں پر شراب پیتے تھے اور اس طرح اپنے پیر طریقت کا اتباع کرتے تھے وہ بھی یزید کی طرح مغنی لڑکیوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے اور مطربوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ساز اور باجے کی آواز برابر سڑکوں پر سنائی دیتی تھی اور کوئی اپنے کان بند نہ کرتا تھا"۔

جسٹس امیر علی نے لکھا ہے کہ شراب نوشی کے مظاہرے عام ہو گئے اور یہ فعل زشت لوگ دارالخلافت کی سڑکوں پر بھی علانیہ کرنے لگے"۔

تخت خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ اس کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، حشم و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کے ساتھ مہیا لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل و دماغ کو پریشان کئے ہوئے اس کی نظروں میں اس تمام جاہ و حشم کو خاک سیاہ بنائے ہوئے تھا اور وہ ان چند آدمیوں کا بیعت سے انکار کہ جن میں اعلیٰ درجہ کی شخصیت حسین بن علی کی تھی۔ یزید کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک تو جولانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ۔ بے زحمت و مشقت کی حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے با اقتدار باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمنڈ اور تمام ملک عرب کے سر اطاعت خم ہو جانے کا غرہ۔ پھر نوکاری ناعاقبت اندیشی، سیاسیات حکومت کی ناشناسی اور نظم سلطنت سے بے خبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کو یاد کرنا، اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا ہونا، یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو ہی جانا چاہئے تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کی اور بالخصوص امام حسین کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی امیر معاویہ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو، مگر امیر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر امیر معاویہ ہی کی زندگی اور طولانی ہوتی تو ان کی طرف سے

ایسا غیر مدبرانہ طرز عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا کہ یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ چاہے غیر شعوری طور پر ہو لیکن امیر معاویہ کا رویہ یزید کی آئندہ اقدامات میں ہمت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر امیر معاویہ کا مدینہ میں پہونچنے کے وقت حضرت امام حسین کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ "تم ایک قربانی کا دُنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔"

بہت ممکن ہے بلکہ یقین کر لیجیے کہ یہ ایک سیاسی دھمکی ہی کی حیثیت رکھتا تھا جس کا نتیجہ عالم وجود میں آنے والا نہیں تھا مگر اس کے سمجھنے کے لیے تو سیاسی دماغ ہی کی ضرورت ہے۔ یزید تو اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمن سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جسے اُنھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا پھر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"، خصوصاً جبکہ آخر وقت تک امیر معاویہ اپنے بعد والے کو ان ہی چند دشمنوں کے خطرہ پر متوجہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ یقینی گزشتہ دھمکی سے جو غلط فہمی یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکی تھی اُس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں یہی اثر پیدا کر سکتی ہیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصد زندگی ہی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ ان چند اشخاص کے خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا اُنھیں موقع نہ ملا وہ اب جواں عزم کی طاقت کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہونچایا جائے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ع۵ یزید میں اپنے باپ کی سی قوت برداشت، رواداری اور سیاست نہ تھی۔ اُس نے یہ چاہا کہ حسین اور دوسرے لوگوں سے جو اپنے انکار پر قائم ہیں بجبر بیعت لی جائے۔ ان تینوں اشخاص یعنی حسین، ابن عباس اور ابن زبیر میں ابن زبیر بیحد حوصلہ مند تھے وہ مکہ اور مدینہ میں ایک خلافت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے اور ایک موزوں موقع کے منتظر تھے اور بعد میں اُنھوں نے خلافت قائم بھی کی۔ ابن عباس بھی اپنے اغراض رکھتے تھے لیکن مقابلتہً وہ زیادہ دور اندیش اور محتاط تھے۔ حسین ان دونوں شخصوں کے برخلاف ذاتی مفاد کی کوئی تمنا نہ رکھتے تھے۔ اُن کا یزید کی بیعت نہ کرنا بالکل خالص مذہبی نقطہ نظر سے تھا

ع۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

اُن کی عمر کافی آ چکی تھی اور وہ سکون و گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی طبیعت جو بیشتر خصائل کی عادی اور انزواپسند ہو چکی تھی دنیاوی شان و شوکت کی خواہاں نہ تھی۔ باپ کے معاملہ میں خلافت کے تجربہ نے اُن کے حوصلوں کو اور بھی سرد کر دیا تھا اور چاہے اسلام کو یزید ایسے حکمرانوں سے بچانے کی اشد ضرورت محسوس کرتے تاہم وہ ملّت اسلامی کو کسی خانہ جنگی میں ڈالنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ مذہب کو سدھارنے اور فائدہ پہونچانے کے لیے صرف خاموش تعلیمات اور ذاتی عمل کو اپنا طریقۂ کار سمجھتے تھے لیکن یزید معاملات کو اپنی حالت پر رہنے کب دیتا۔ حسین حجاز میں اپنے مرتبہ اور اثر کی وجہ سے یزید کے لیے گویا ایک نہایت خطرناک مضبوط حریف تھے۔ وہ حسین کے مستقل اور مصرانہ انکار سے بھنایا ہوا بھی ہوگا، اس لیے اُس نے بیعت کے لیے اور بھی سخت احکام نافذ کیے۔"

اگر وہ اپنے باپ کے آخر وقت موجود ہوتا تو ع۵ "ممکن ہے کہ مرتے وقت معاویہ اُس سے کہہ جاتے کہ ان چار دشمنوں کے مسئلہ کو کیونکر ہاتھ لگایا جائے۔ مگر اب وقت جا چکا تھا یزید اپنے باپ کے خوف و ہراس سے واقعہ کی نزاکت اور عظمت سے واقف ہو گیا تھا لیکن حسین کو نہ مجبور کرنے والی حکمت عملی پر عمل نہ کر سکا اور نہ اسے بہت اہمیت ہی دے سکا۔ یزید کے دماغ میں بس ایک بات گونج رہی تھی اور وہ یہ کہ اب میں ایک پُر شکوہ بادشاہ ہوں جس کے تابع ہزاروں ایسے غلام ہیں کہ اگر وہ حکم دے دے اور انعام مقرر کر دے تو حسین تو حسین، خود رسول کو بھی بے بسی کے عالم میں قتل کرنے میں پرہیز نہ کریں۔ حسین کا تو ذکر ہی کیا اس لیے کہ وہ تو عزلت نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے جن کے پیرو دوں کی تعداد خلافت کے زمانہ میں اُن کے باپ علی کی عظمت کے خلاف بغاوت کرا کے کم ہی کی جا چکی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ معاویہ کے پوشیدہ عمال کے تدبر اور نظام نے علی کے وقار کو کافی صدمہ پہونچایا تھا! یقیناً یہ خطرناک اسکیم تقریباً ایک ربع صدی سے کچھ زیادہ زمانہ تک کامیاب بنائی جا چکی تھی۔ اس طرح یزید نے اپنے کو مطمئن کر کے!" تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہوئے سب سے پہلے جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچازاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مروان کی معزولی کے بعد اس زمانہ

ع۵ سید خورشید حسین صاحب نقوی

میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کہ "امیر المومنین یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بندے تھے جنھیں اُس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا وہ جب تک مقدر میں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہوگئی تو دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خدا اُن پر رحمت نازل کرے کہ اُنھوں نے قابل تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکوکاری کے ساتھ عالم آخرت کو سدھارے۔ والسلام۔

اس خط میں تو صرف امیر معاویہ کے وفات کی اطلاع ہی ایسے رسمی الفاظ میں ہے جو عموماً خبر وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی عہ۱ جس کو آج کل کی اصطلاح میں ڈیمی اوفیشل یا کانفی ڈنشل حکم کہا جا سکتا ہے ولید کو بھیجا گیا "اس کا مضمون یہ تھا کہ حسین اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوئے اُنھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو۔ والسلام"

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورت حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی یعنی حضرت امام حسین کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریک ظلم نہ ہوں اور موجودہ خلیفہ کی خلافت کو تسلیم کر کے اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہونچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منفی طرز عمل اب نبھانا ناممکن ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہے۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

تاریخ حبیب السیر میں تو یزید کے خط کا مضمون صاف یہ لکھا ہے کہ حسین بن علی اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر سے بیعت لو اور اگر وہ منظور نہ کریں تو اُن کے سر قلم کر کے شام کی طرف روانہ کرو۔ (حبیب السیر مطبوعہ بمبئی حصہ اول جلد دوم ص ۲۲۰)

یزید کا خط ولید کو پہونچا۔ عہ۲ ولید باوجود اس کے کہ اسی خاندان کا ایک فرد تھا لیکن وہ یزید کے اس طرز عمل کو ممدوح نہ سمجھتا تھا وہ حسین کے تقدس اور اخلاقی بلندی کے سبب اُنکی عزت کرتا تھا۔ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ اس کام کو کیونکر شروع کیا جائے اس وجہ سے اُس نے مروان بن حکم

عہ۱ ناموس اسلام   عہ۲ سید خورشید حسین صاحب نقوی

سے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا" حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اُس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی پیدا ہوگئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی تھی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے۔ شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرزِ عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اموی سیاست کے خلاف نہو اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلخوری کا کام انجام نہ دے۔ ع۱ "مروان چونکہ خاندان محمدی کا جانی دشمن تھا اس لیے اُس نے صلاح دی کہ تم ابھی ان لوگوں کو بلوا بھیجو اور اُن کو بیعت و اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ابھی اُن کے سر قلم کرا دو۔ اس لیے کہ اگر انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی تو پھر ہر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائیگا۔ اور مدعی خلافت ہو کر ایک بڑی بغاوت برپا کر دے گا" ع۲ "اوپر کے واقعات صاف بیان کرتے ہیں کہ یزید کے خط میں خونیں اقدام کا ذکر ضرور موجود تھا۔ ورنہ ولید کی پریشانی اور مروان کا مشورہ بالکل بے محل ہوتا۔ اگر یزید نے ولید کو محض بیعت کے لیے لکھا تھا تو اس کو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ بس وہ حسین کے قطعی انکار کو یزید کے پاس لکھ بھیجتا۔ اس کے علاوہ مروان خط کے مضمون کے خلاف کاہے کو کوئی دوسری تجویز پیش کرتا۔ ولید کی پریشانی کا سبب محض یہ تھا کہ وہ حسین کے خون سے اپنے ہاتھ کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا تھا"

بہر حال اُس نے مروان کے مشورہ پر اتنا عمل کیا کہ اُسی وقت عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت حسین بن علی اور عبداللہ بن زبیر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں بزرگوار اُس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہونچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے اور وقت ایسا تھا کہ اُس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا اور لوگوں کی ملاقات نہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا سبب کیا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے یہ کیا بات ہے؟

ع۱ سید خورشید حسین صاحب نقوی ع۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

امام حسین نے فرمایا میرا خیال ہے کہ معاویہ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کیلئے بلایا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم لوگ پابند کر لیے جائیں عبد اللہ بن زبیر نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب کیا ہونا چاہیے؟ امام نے فرمایا میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوانمردوں کو جمع کرتا ہوں اور اُن سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں اُن لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کروں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا مجھے اس صورت میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے کہیں آپ قتل نہ کر دیے جائیں۔ آپ نے فرمایا میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا، اتنا سامان کروں گا کہ مجھے خطرہ نہ باقی رہے۔

حضرت امام حسین مکان سے تشریف لے گئے اور اپنے اعزا، اور مخصوصین کو جمع کر کے اُن کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہونچے۔ اصحاب سے فرمایا کہ تم دروازہ پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمھیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ حضرت اندر تشریف لیگئے۔ ولید اور مروان آج خلاف معمول پاس پاس بیٹھے ہوے تھے اور ایک خاموشی تھی کہ جو چھائی ہوئی تھی۔ امام حسین نے اسے دیکھ کر سادگی کے ساتھ فرمایا "اتفاق و اتحاد بہتر نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائے" اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سُنایا۔ غالباً وہی جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا اور اس کے بعد بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام حسین نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون (یہ فقرہ ہے جو ہر مصیبت کے موقع پر کہا جاتا ہے) خدا کا رحم و کرم شامل حال ہو اور تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا ہو۔ رہ گیا یہ امر کہ میں بیعت کروں تو ظاہر ہے کہ مجھ ایسے شخص کی بیعت مخفی طور سے تو ہو نہیں سکتی اور نہ غالباً تم اس کو کافی سمجھو گے جب تک کہ اس کا عام طور سے علانیہ اظہار نہ ہو۔ ولید نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا تو پھر جب تم معاویہ کی وفات کا اعلان کرنا اور تمام لوگوں کو بیعت یزید کی دعوت دینا تو سب کے ساتھ ہم سے بھی یزید کی بیعت کا مطالبہ کرنا تاکہ معاملہ یکساں رہے اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو"

ولید اپنے مقام پر سمجھا ہوا ہوگا کہ امام حسین یزید کی بیعت کا سوال سنتے ہی فوراً مخالفت پر تیار ہو جائیں گے اور بہت سختی کے ساتھ جواب دینگے اور اس صورت میں اُسے فکر ہوگی کہ مجھے یزید کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ اب اُس نے جو امام سے اس طرح کا دفع الوقتی کا جواب سُنا تو وہ اُسے غنیمت سمجھا اور خوش ہو کر اُس نے کہا کہ بہتر آپ واپس جائیے اور سب کے ساتھ پھر آئیے گا۔ مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورت حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اس نے ولید کا یہ روادارانہ طرز عمل دیکھا تو بے اختیار بول اُٹھا "ولید یہ کیا غضب کرتا ہے۔ اگر حسین اس وقت تیرے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہوں بہتر ہے کہ ابھی ان کو گرفتار کرلے اور تیرے گھر سے جانے نہ پائیں جب تک کہ بیعت نہ کریں یا قتل کیے جائیں"

یہ سُن کر امام کو غصہ آگیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا مجال ہے تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے بخدا اور گنہگار ہوا"۔ یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیت میں گھر واپس تشریف لائے۔ مروان نے ولید سے کہا "تم نے میرا کہنا نہ مانا اب ایسا موقع نہ ملے گا"۔ ولید نے کہا مروان یہ کسی اور سے کہو تم نے مجھے وہ صورت بتائی تھی جس میں میرے مذہب کی موت تھی۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں ہو اور میں حسین کو قتل کروں۔ سبحان اللہ میں حسین کو قتل کروں صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں میں بیعت نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسین کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں روز قیامت میزان عمل میں ہلکا ثابت ہوگا۔

عـــہ "یہ بات بالکل ظاہر کر دیتی ہے کہ مدینہ کا گورنر بھی جہاں کہ حسین رہتے تھے اُن کی نقل و حرکت میں کوئی ایسی قابل اعتراض چیز نہ پا سکا جسے کہ وہ اُن کے قتل کا بہانہ بنا سکتا۔ اس کے علاوہ جب مروان سے بھی ولید نے حسین کی بے گناہی کا ذکر کیا تو وہ بھی کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور نہ انھیں سازش و بغاوت ہی کا ملزم قرار دے سکا بلکہ اُس نے ولید کو یہ جواب دیا کہ جب تمھارے خیالات حسین کی نسبت ایسے ہیں تو مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے

عـــہ سید خورشید حسین صاحب نقوی

کہ تم نے انھیں کیوں جانے دیا۔ یقیناً مروان ایسا جانی دشمن اتنی آسانی سے خاموش نہ ہوتا اگر حسین کی ظاہری و باطنی زندگی صاف نہ ہوتی۔"

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد ولید مدینہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور عمر بن سعید الاشدق کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔

ع۵ یہ بھی اس دعوے کی ایک بین دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کے بعد حسین کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا۔" کوئی شک نہیں کہ حضرت امام حسین اس وقت اگرچہ ولید کے پاس سے صحیح سلامت واپس آگئے لیکن آپ کو صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس ہو گیا اور یقیناً اس وقت آپ نے تمام نتائج پر غور کر لیا اور جو کچھ طے کیا وہ پورے نتائج سوچ لینے کے بعد۔

حسین نے اُس وقت چاہے زبان سے نہ کہا ہو مگر یہ طے ضرور کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ ابھی تک دنیا اس نفی کے معنی نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ انکار بیعت کی صورت میں اُن تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسین کے سامنے آئے لیکن حسین جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوت برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہنچ گیا مگر حسین کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے، اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو انھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پر صاف ہو جانا چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کون سا ایسا ناقابل برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسین کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے آپ کو ایک نظر حسین کی اُن ذمہ داریوں پر کر لینا ہو گی جو خاندان رسول کے نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اُن پر عائد تھیں ــــ اور اُن قدیم روایات کو دیکھنا ہو گا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسین کے آبا و اجداد کی وراثت بنی ہوئی تھیں اور جن کے اس وقت حسین حامل تھے اور پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ اس وقت حسین اپنے فرض

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے ــــ یہ بھی آپ کو دیکھنا ہوگا کہ یزید کو حضرت امام حسین سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کد وکاوش کی ضرورت کیا تھی جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اُس کے مُسلّم ہو جانے کے لیے کافی ہے اقلیت کی رائے ناقابلِ اعتبار رہے لیکن یہ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور سے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جائے جبکہ اُس کی طرف سے عملی طور پر کوئی شورش انگیزی نہ کی جا رہی ہو خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود حضرت علی بن ابی طالب کے زمانہ خلافت میں سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور کئی آدمی ایسے تھے جنھیں آپ کی بیعت سے کنارہ کشی تھی مگر کبھی صرف بیعت نہ کرنا کوئی قابلِ سزا جرم نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امیر معاویہ نے مکہ اور مدینہ میں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کیلئے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکہ اور مدینہ کی مردم شماری میں سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جو گھروں میں بیٹھے ہوں گے اور جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہوگی۔ کسی کے لیے بیعت کی ضد نہیں کی گئی اور سلطنت کو اُن سے کاوش پیدا نہیں ہوئی۔ پھر ایک حسین میں کیا بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آجائے اور شاہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے۔ ماننا پڑیگا کہ حسین سے بیعت بحیثیت ملک عرب کی ایک فرد کے نہیں طلب کی جا رہی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ ایک فرد ایک جماعت یا قوم بن جاتی ہے نمائندگی کے اعتبار سے۔ حقیقت یہ تھی کہ حسین فقط حسین نہ تھے بلکہ وہ اُس وقت خاندان رسول میں سب سے بزرگ ہونے کے لحاظ سے اُس ورثہ کے حامل تھے جو اسلامی حفاظت کا پیغمبر کے بعد اُن کی اولاد میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو رہا تھا۔ اور اسی لیے خاندان رسول یا خاندان علی بن ابی طالب میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے، عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے، حضرت عباس بن علی اور اُن کے بھائی بھی تو تھے کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ اُن میں سے کسی کو حسین کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسین کو حاصل تھی۔

یزید کو حسین سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اگر وہ صرف دنیوی قسم کی ایک سلطنت کا مالک ہوتا مگر وہ جس قسم کی سلطنت کا مالک بن رہا تھا وہ تو خلافت اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول کی جانشینی کی حیثیت رکھتی ہے ع۵ اس کا یہ نظریہ تھا کہ روحانی و مذہبی پیشوائی پر سیاسی رہبری مقدم ہو یا دوسری لفظوں میں بادشاہوں کو ہمیشہ مذہبی اختیارات ہونا چاہییں اس کا مطلب کھلے الفاظ میں یہ ہے کہ مذہبی توانین بادشاہ کی خواہشوں کے پابند کر دیے جائیں لیکن اب سوال یہ تھا کہ مذہب کی سچی پیشوائی پر مہر تصدیق کون ثبت کرے؟ کیا یہ فرض شامی و عراقی بھی اور مدنی انجام دے سکتے تھے؟ نہیں۔ ضرورت تھی کہ وہ اس خاندان کے افراد سے اس حکومت کو تسلیم کرائے جو مسلمانوں میں رسول کی دینی وراثت کا حامل سمجھا جاتا ہے اور اس خاندان میں اس وقت سب سے بزرگ حسین کی ذات تھی یہ فرض محض حسین سے وابستہ تھا اور وہی اس کو مصدق کر سکتے تھے یزید اسے بخوبی جانتا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ حسین بحیثیت حسین یزید کی اطاعت قبول کر لیں بلکہ حسین بحیثیت مذہبی پیشوا کے اس کے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے حسین کا بیعت قبول کر لینا اس کا ایک بین ثبوت ہوتا کہ یزید حق پر تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ یزید بادشاہت میں "خدائی اختیار" کا مالک ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو بس یہی ہوتا کہ خلیفہ کے ایک لفظ، ایک حرکت اور ایک قدم پر مذہب کا انحصار ہو جاتا۔ چاہے وہ اسے باقی رکھتا یا فنا کر دیتا۔ یہ وقت حسین کے لیے آزمائش کا تھا۔

حسین سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسن زندہ ہوتے تو بیعت کی خواہش ان سے کی جاتی مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علی ہوتے تو جھگڑا ان سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جد بزرگوار رسول اللہ ہوتے تو اپنی حکومت کے جواز کا جو سارٹیفکٹ بھی حاصل کرنا ہوتا وہ ان سے مانگا جاتا۔ مجھ سے نہ مانگا جاتا مگر اب تو وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا رسول اللہ نہیں ہیں، میرے بابا علی مرتضیٰ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسن مجتبیٰ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسن نے

ع۵ سید اعجاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

اور وہ بیعت کر لیتے۔ میرے بابا علی ہوتے اور وہ سر تسلیم خم کر دیتے اور میرے نانا رسول اللہ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ اُنھوں نے اس سخت احساس ذمہ داری کی بنا پر تمام مشکلات کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

اس مقام پر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسن نے بھی تو یزید کے باپ امیر معاویہ سے مصالحت کر لی تھی، اسی طرح اگر امام حسین صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرز عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنت بنی امیہ کے ہوا خواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کی حکایتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات اور اُس کی رفتار کا مطالعہ اس سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور اُن حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ابنائے زمانہ زیادہ تر جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حد اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاق انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ ابنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالف اس لیے اُن کا طرز عمل اکثر عام افراد انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر اُن پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں، کبھی اُن پر اقدام پسند طبائع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں اعتراض کرتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اس لیے کردی اُن کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔

یہی صورت ہم کو پیغمبر اسلام کے طرز عمل میں ملتی ہے۔ یہی علی مرتضیٰ کی سیرت میں اور یہی اُن کے بعد حسن اور حسین کے طرز عمل میں۔ ع۔۵ چونکہ حضرات سبطین کنار رسول کے تربیت یافتہ ہیں اس لیے کہیں ان کی صلح میں صلح حدیبیہ کی سی دور اندیشی پائی جائے گی تو کہیں جنگ میں جنگ بدر کا سا عارفانہ استقلال اور مجاہدانہ عزم موجود ہوگا۔

تاریخ کے صفحات شہادت دے رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام بدر میں بدر اسلام کو غروب ہوتا

ع۔۵ الحاج نواب سید محمد عباس صاحب طالب صفوی۔ شمس آباد

دیکھ کر آغاز و انجام سے بے پروا ہو کر اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد فی الارض (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد سوم مترجمہ حکیم احمد حسین مطبوعہ الہ آباد ص ۸۱۰) پڑھتے ہوئے ایک ہزار سواروں کے مقابلہ میں صرف تین سو بارہ پیادوں اور ایک سوار کو لے کر مقابلہ کے لیے آگئے اور کچھ اس طرح داد شجاعت دی کہ بڑے بڑے بہادروں کو کہنا پڑا کہ اس روز نہ آپ سے زیادہ کسی سے شجاعت و جرأت ظاہر ہوئی اور نہ ہم میں سے کوئی آپ سے زیادہ دشمن کے قریب رہا (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ترجمہ مولوی محمد ابراہیم مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۱۶۹)

لیکن ایک موقع وہ بھی آتا ہے جب یہی رسول چودہ سو مجاہدین کے ساتھ مکۂ معظمہ کا قصد فرماتے ہیں۔ عکرمہ بن ابو جہل پانچ سو سواروں کی قلیل تعداد کے ساتھ آپ کا مزاحم ہوتا ہے اور پے در پے تین مرتبہ شکست کھاتا ہے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۵۰)

پھر بھی آنحضرت نہ جنگ جاری رکھتے ہیں۔ نہ حج ایسے اہم فریضہ کے لیے جبراً مکۂ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ پسند کریں تو ہم ایک مدت تک کے لیے ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور وہ دوسروں کے مقابلہ میں مزاحمت سے باز آئیں اور مجھے اوروں سے نپٹ لینے دیں اگر مجھے کامیابی ہو تو پھر ان کا اگر جی چاہے نہ بھی اوروں کی طرح ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں اور اگر نہ چاہیں تو اس اثنا میں اُن کو ذرا پنپنے کا موقع تو مل جائے گا (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۶۲) چنانچہ آپ نے خراش بن امیہ کو ان کے پاس صلح کا پیام دے کر بھیجا لیکن نہ صرف قاصد کا اونٹ ذبح کر دیا گیا۔ بلکہ حضرت زنیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی تیروں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس پر بھی پیغمبر مشرکین مکہ پر فوج کشی نہیں کرتے اور دنیا کو دکھا دیتے ہیں کہ جارحانہ اقدام کرنا سچے نبی کی شان نہیں ہے۔ آخر کار مشرکین مکہ کے پتھر دل پر بھی اس صلح و آشتی کا اثر ہوتا ہے اور اُن کے نمائندے صلح نامہ لکھنے کے لیے آتے ہیں۔ رسول کے برادر عم زاد (حضرت علی) صلح نامہ کی عبارت تحریر فرماتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق محمد رسول اللہ زیب قرطاس فرماتے ہیں۔ مشرکین کہتے ہیں کہ ہم محمد کو خدا کا رسول مانتے تو مخالفت کیوں کرتے۔ بہتر یہ ہے کہ "محمد رسول اللہ" کے

بجائے "محمد بن عبداللہ" تحریر کیا جائے۔ رسول اللہ حضرت علی کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ما بہ النزاع لفظ کو محو کر دیں لیکن اُن کو جیات نہیں کہ وہ اس لفظ کو مٹا دیں جس پر ان کے ایمان کا دار و مدار ہے اور بالآخر خود پیغمبر اسلام اس لفظ کو محو فرما کر محمد بن عبداللہ تحریر فرماتے ہیں (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۲) اس طرح دنیا کو دکھا دیتے ہیں کہ رسالت اور امامت کی بنیاد لوگوں کے اقرار یا انکار پر نہیں ہے۔ (صلح حدیبیہ کے شرائط کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے) ان شرائط میں سے یہ بھی تھا کہ جو شخص کفار سے مسلمانوں میں چلا جائے وہ اپنی قوم کی طرف واپس کر دیا جائے اور جو شخص مسلمانوں کا کفار میں آ جائے تو وہ مسلمانوں کی طرف نہ واپس کیا جائے۔ یہ شرط مسلمانوں کو شاق گزری اور بعضوں نے اس میں بحث بھی کی لیکن رسول اللہ سمجھتے تھے کہ یہ صلح لوگوں کے امن اور ظہور اسلام کی باعث ہوگی۔ (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد سوم ص ۱۲۹۰-۱۲۹۱) رسول اللہ اور سہیل بن عمرو اس عہدنامہ کے لکھوانے میں مصروف تھے کہ اتنے میں ابو جندل بن سہیل بن عمرو بیڑیاں پہنے ہوئے وہاں آ گئے۔ ابو جندل کے مشرک باپ سہیل بن عمرو نے بڑھ کر ایک تھپڑ مارا اور گردن پکڑ کر اپنے مسلمان لڑکے کو کشاں کشاں لے چلے۔ ابو جندل نے انتہائی بلند آواز سے چیخنا شروع کیا کہ مجھے میرے ایمان کی وجہ سے اس مصیبت میں ڈالا جا رہا ہے اور خواہ مخواہ مشرکین کے پاس واپس کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر بھی اس فریاد کو سنکر بیتاب ہو گئے وہ ابو جندل کے پاس جا کر اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ان سے کہنے لگے تم صبر کرو۔ یہ قریش مشرک ہیں اور ان کی جان کتے کے برابر ہے اسی کے ساتھ وہ اپنی تلوار کا قبضہ اُن کے نزدیک کرتے رہے خود حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ تلوار لے لیں اور اس سے اپنے باپ کا خاتمہ کر دیں مگر انھوں نے اسے گوارا نہیں کیا کہ اپنے باپ کو خود ماریں۔ (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۲-۳۷۳)

مسلمانوں کے اضطراب کا اندازہ ہو گیا۔ اب دیکھیے کہ صدق مجسم رسول کا رویہ کیا تھا؟ رسول اللہ یہی فرماتے رہے کہ چونکہ ہم نے اہل مکہ سے صلح کر کے معاہدہ کر لیا ہے اس لیے اب ہم اُن کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۲)

ایفائے عہد کی یہی تعلیم تھی جس نے امام حسن ایسے بہادر اور شجاع کو صلح کے بعد اپنے نانا کی طرح صبر کا دامن پکڑے رہنے پر مجبور کر دیا اور باوجودیکہ کوفہ یا قادسیہ کے کچھ لوگوں نے آپ کو "مذل المسلمین" "اسلام کو ذلت دینے والے" کہکر آپ کو صلح کے توڑنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر امام حسن کا قدم وفائے عہد کے راستے پر مضبوطی سے جما رہا۔ صلح حدیبیہ کا بیان ختم ہوا۔ آخر میں اس کے نتائج کے متعلق راس المحدثین امام زہری کی قابل قدر رائے بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ اپنے مفید نتائج کے اعتبار سے اس سے قبل اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوی (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۲۷۵)

آئیے صلح حدیبیہ کی روشنی میں عقل و نقل کی عینک سے صلح امام حسن کو غور سے دیکھیں۔ (اس ذیل میں واقعات اور اُس وقت کی صورت حالات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے) آپ کو جب یہ خبر ملی کہ معاویہ اہل شام کو ہمراہ لے کر اُن پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ اپنے لشکر کے ساتھ تیار ہو کر مقابلہ کے لیے فوراً روانہ ہوے کہنے کو آپ کے ساتھ چالیس ہزار آدمی تھے مگر حقیقت امر یہ تھی کہ چند کامل الایمان ہستیوں کے علاوہ سب کے سب جنگ سے گریزاں تھے۔ اگر مشرکین فارس و روم سے جنگ ہوتی اور آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیاوی بہبود کی امید اور لونڈی غلاموں کی توقع ہوتی تو ایک کثیر تعداد آتش جدال و قتال میں کود پڑتی لیکن لوگ دیکھ چکے تھے کہ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی نے کلمہ گویوں کو لونڈی غلام نہیں بننے دیا تھا۔ پھر کوفی امیر معاویہ سے بارِ دگر کس امید پر جنگ کرتے؟ اس صورت حال کے ساتھ یہ ہوا کہ امیر معاویہ نے خود صلح کا پیغام بھیجا۔ پھر بھی آخری جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ اور ان پرزور الفاظ میں حق و صداقت کی دعوت دی "آگاہ رہو کہ تم میں دو خونریز لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں بہت لوگ قتل ہو گئے۔ کچھ مقتول صفین میں ہوے جن کے لیے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ امداد پر تیار نہیں ہیں اور کچھ رو رہے ہیں جو خون کے بدلے کے طالب ہیں۔ اب اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ کے بھروسے پر تلواروں سے محاکمہ کریں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول

کریں اور تمھاری خوشنودی حاصل کریں (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد چہارم ص ۴۰۳)
جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ ہم حیات چاہتے ہیں۔ ہم حیات چاہتے ہیں آپ صلح کر لیجیے (تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم ص ۲۰۳)

پیمان صلح مستحکم ہونے کے بعد امام حسن نے پھر ایک تقریر فرمائی اور ارشاد فرمایا: "اے لوگو ہم تمھارے امرا ہیں اور تمھارے مہمان ہیں۔ ہم لوگ تمھارے نبی کے وہ اہلبیت ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے اُن سے ہر آلودگی و نجاست کو دُور فرما کر اُن کو پاک کر دیا ہے۔ امام صاحب نے اس فقرہ کو بار بار دُہرایا حتیٰ کہ مجلس میں کوئی شخص ایسا نہ رہا جو رو نہ رہا ہو اور روتے روتے ہچکی نہ لگ گئی ہو۔" (تاریخ کامل جلد سوم ص ۲۰۴)

لیکن ظاہر ہے کہ اعلائے کلمۂ حق کے لیے آہِ سرد و اشکِ گرم کے بجائے خونِ گرم کی ضرورت تھی اور اپنا خون بہانے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر امام حسن نے امیر معاویہ سے صلح کرنے کے بعد امارتِ ظاہری سے کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ امید ہے کہ ان واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد ہر صاحبِ انصاف یہ امر تسلیم کرے گا کہ امام حسن حق و صداقت کے لیے جنگ کرنے سے گریزاں نہیں تھے۔ مگر چونکہ آپ کے لشکر والوں پر حبِ دنیا غالب تھی اس لیے آپ کے لیے صرف دو طریقے باقی رہ گئے تھے۔ پہلا طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپ قلتِ انصار کا خیال کیے بغیر بنی ہاشم کی مختصر جماعت کے ساتھ معاویہ سے جدال و قتال فرماتے مگر یہ طریقہ نامناسب تھا۔ چونکہ امیر معاویہ کے ابتدائی عہد تک احکام اسلام کی علانیہ مخالفت نہیں کی جاتی تھی، اس لیے آپ کے جدال و قتال کو حفاظتِ اسلام کے جذبہ کے بجائے طلبِ ریاست پر محمول کیا جاتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ امیر معاویہ خود پیام صلح روانہ کر چکے تھے اس کے بالکل برعکس یزید کے عہد میں احکام اسلام کی یہ وقعت رہ گئی تھی کہ خلیفۂ وقت علی الاعلان شراب پیتا تھا۔ محرماتِ ابدی کی طرف نگاہ ڈالتا تھا اور اس کا جرنل مسلم بن عقبہ لوگوں کو صرف اس جرم پر قتل کر دیتا تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ اور سُنتِ رسول پر کیوں بیعت کرنے کو کہا (تاریخ طبری جلد دوم حصہ اول ص ۲۲۳) یعنی ایسی صورت میں حضرت سید الشہدا کی جنگ کو کوئی ذی ہوش بھی طلبِ جاہ و ثروت پر محمول نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہی تھا کہ وہ امیر معاویہ کے پیغام صلح کو مسترد

فرمائیں اور جس طرح اُن کے نانا نے مصلحۃً مشرکوں سے صلح کی تھی اسی طرح وہ کلمہ گویوں سے صلح کرلیں اور یہی طریقہ کار امام نے اختیار فرمایا پھر بھی حضرت امام حسین کا یہ کمال تدبر تھا کہ آپ نے لشکر آرائی کے بعد صلح کی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ آپ جنگ سے خائف نہیں تھے۔ نہ کسی قسم کا شک یا ندامت اہل شام پر حملہ کرنے سے مانع تھا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم[۳])

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یار و اغیار سب کو معلوم ہوگیا کہ کون برسر حق تھا اور کون برسر ناحق تھا چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے امیر معاویہ کو بادشاہ کے لفظ سے مخاطب کیا ہے اور امیر معاویہ نے امیرالمؤمنین کہنے کی فرمائش کی ہے تو سعد نے صاف صاف الفاظ میں کہا تھا "خدا کی قسم جس طرح آپ نے خلافت حاصل کی میں کبھی اس کو پسند نہ کرتا ——"

اس کے علاوہ یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام حسنؑ نے اس صلحنامہ کے شرائط کے ذریعہ سے وہ مقصد پورے طور پر حاصل کر لیا تھا جس کے لیے اُن سے اور امیر شام سے جنگ بھی اور جہاں تک آئینی حدود کا تعلق ہے آپ نے اس طرح مکمل فتح حاصل کر لی تھی۔ یقیناً اگر حضرت امام حسن کی جگہ پر امام حسین ہوتے تو آپ کے بھی تدبر کا اقتضا رہی ہوتا جو امام حسن نے اختیار کیا تھا۔

حقیقت امر یہ ہے اور واقعات سے ثابت ہے کہ حسن مجتبیٰ کی صلح ہی مجاہدۂ کربلا کی تمہید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور اُن کا طریقہ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر زخم رسیدہ بیکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، بھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہے تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہو اور اُس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اُسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ

یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کئے جانے پر ممدوح و مستحسن سمجھا جا رہا تھا۔

دشوار گذار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور مؤثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اُسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک مؤثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آگئی تو جلد بازی، غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اُس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اسی کے ساتھ اُس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج و استغاثہ، مصالحت اور معاہدۂ مودت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔ بے شک جب یہ سب ذرائع اختیار کئے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مثل من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ اور فارسی مثل "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکیگا اور اُس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر دوسرے اقدام تک پہونچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغلوب الغضب کہا جائے گا وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع دا جاب اسے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری اور جاں نثاری اور مؤثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال و اعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرماں بردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبر کا پابند ہو تو اُسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا۔ اور حق و راستی پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پُر امن اور صلح پرور وسائل و ذرائع کے پہلے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔ اگر امام حسین ایکا ایکی بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ

آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحاد عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آ کر اپنے تئیں معرض خطر میں کس لئے ڈالا؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب مگر اب یہاں صورت حال یہ تھی کہ امام حسین کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۴۰ھ سے لے کر سنہ ۶۱ھ تک میں اس کا وقت آ گیا۔

شروع شروع میں امام حسن کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسین کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا روبا صلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ پنجۂ انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسین کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

حسین کے سامنے اب صلح کا کوئی سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ صلح کی منزل کو امام حسن طے کر چکے تھے اور اب شرائط صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسین کے سامنے تھی حالانکہ امیر معاویہ اپنے کردار کے لحاظ سے بہ نسبت یزید کے کہیں اونچا درجہ رکھتے تھے پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟

پھر امام حسن نے جو صلح کی اُس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسن مسند خلافت پر متمکن تھے، صلح کے ذریعہ سے آپ نے مسند خلافت کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ماتحت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے تمدن اسلامی کے بارے میں اپنے مسلک اور معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدۂ عدم تعرض کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے علیحدہ ہو گیا تھا اور بس۔ اسی لیے حضرت امام حسن کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنت شام امام حسین سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلب بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عدم تعرض تو ان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضا مند نہیں تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ رہے — امیر معاویہ کا معاہدہ وقتی طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا، بغیر اس کے حضرت امام حسن کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں باعتبار خلافت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی اس کے بعد اُن کو خود اور اُن کے بعد یزید کو شدت کے ساتھ اس کا احساس تھا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیر ممالک اور تسخیر قلوب مختلف چیزیں ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتح ممالک کو فاتح قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے —

عے "طاقت حق ہے" کا اصول محض جسمانی حیثیت سے صحیح ہو سکتا ہے۔ طاقتور کمزور کو فنا کر سکتا ہے، اُسے زنجیر پہنا سکتا ہے قید کر سکتا ہے اور قتل کر سکتا ہے لیکن وہ اُس کے دل و دماغ کی مملکت پر حکومت نہیں کر سکتا۔ جسمانی قوت سے دل و دماغ پر حکومت ناممکن ہے، لوگوں کو خاندان رسالت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے کون روک سکتا تھا، رسول کی طرح اُن کے خاندان والوں کی حکومت بھی عوام کے دل و دماغ پر تھی۔ باوجود اس کے کہ اُن کے پاس فوج نہ تھی، اُن کے محافظ نہ تھے، رہنے کے لیے اُن کے پاس قصر نہ تھے اور نہ کوئی دولت ہی تھی۔ یقیناً اگر کوئی اس بات کے کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اُس نے خدائی طاقت سے حکومت کی تو وہ خاندان رسالت ہی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ وہ بغیر کسی ذریعہ و وسیلہ کے بھی

عے سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

قوت کے مالک تھے۔ خاندان رسالت کی طرف سے یہی خوف ایسا تھا جس کا تجربہ امیر معاویہ اور اُن کے خاندان والوں ہی کو نہیں ہوا تھا بلکہ بعد میں خاندان عباس کو بھی اس کا تجربہ ہوا فاطمہ کی معزز اولاد لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی اور اس کے بر خلاف سلاطین وقت لوگوں کو جسمانی حیثیت سے غلام بناتے تھے" یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے اہلبیت رسول سلطنت دمشق کی نظر میں بہر حال قابل مزاحمت تھے۔ خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔

اس سے آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام حسین کے لیے اُس طرح کی صلح کا کوئی امکان نہ تھا جیسی صلح امام حسن کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اُس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسین کی ہوتی تب آپ بھی اُس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مُسلمانوں میں امن قائم کر دیتے اور حسین کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اُس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسین ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی تھے اُس تمدن اور نظام سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطین دمشق نے قائم کیا تھا — یہ ایسی چیز تھی جو آل محمد کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسین ہوتے یا ان کے بجائے اس وقت امام حسن ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سُنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سُنت پر عمل ہو گا مگر یزید کے دور میں سلطنت کی مطلق العنانی اور خود سری اس درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ بیعت میں کتاب اور سنت کی شرط پیش کرنے پر گردنیں قلم کی جاتی تھیں اور بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں وہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے مدینہ میں یزید بن عبد اللہ بن ربیعہ بن اسود اسی جرم پر قتل کئے گئے کہ وہ کتاب اور سُنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہ تھے (الاخبار الطوال ص ۲۶۱)

ان ہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ آپ کو بعد میں معلوم ہو گا کہ امام حسین کو آپکے اس اقدام کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے مشورے دیے گئے ہیں۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔ یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے یہ کہا گیا کہ کوہ اجا میں چل کر پناہ لیجیے مگر یہ کسی عزیز یا دوست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید

کی بیعت کر لیجئے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یزید کی بیعت امام حسین کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

عــ۵ درِ یزید نے اپنے عقائد اور خیالات کو اس قدر عریاں کر رکھا تھا کہ حسین خدا کے نزدیک اور رسول کی بارگاہ میں اپنے نفس کے لیے کوئی تاویل یزیدی اعمال کی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے حسین نے خیال کیا کہ پیغمبر نے میری تربیت میں جن مقاصد کو ملحوظ رکھا تھا اب وقت آ گیا ہے کہ پیغمبر کی اس تربیت کا نتیجہ ظاہر کروں۔ کس کو نہیں معلوم کہ پیغمبر نے اخلاق فاضلہ کی اشاعت کن کن قربانیوں سے کی تھی۔ اسلامی عمارت کی تعمیر میں بنو ہاشم کے خون کام آئے۔ اسلام نے جن اخلاق فاضلہ کی اشاعت کی ان کی اشاعت میں اسلام کو بہت مصارف ادا کرنا پڑے۔ جعفر طیار، سید الشہدا حمزہ، عبیدہ بن حارث ابو سلمہ سب اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں شہید ہوئے۔ جب اسلام کی اشاعت میں ایسے گرانقدر نفوس قربان کیے جا سکتے ہیں تو اسلام کی حفاظت کے لیے اُس سے زیادہ اہم قربانیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حسین اپنے نانا رسول اللہ کے خدمات کی اہمیت جانتے تھے۔ اُن کے سامنے ان قربانیوں کی فہرست بھی تھی جو ان کے خاندان نے اس سلسلہ میں پیش کی تھیں۔ کیا یزید شراب خواری اور زناکاری کو عام طور پر روا نہیں رکھتا تھا؟ کیا وہ آئین اخلاق کی علانیہ ہنسی نہیں اُڑا رہا تھا؟ اس وقت حسین کی خاموشی کو صرف وہ شخص جائز سمجھ سکتا ہے جو اسلام کی قربانیوں سے واقف نہ ہو۔ حسین ایسے آوارہ اور بدأطوار کو خلیفۂ رسول کیسے تسلیم کر لیتے؟! اگر حسین ایسا کر لیتے تو وہ حسین نہ رہتے۔

یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ حسین ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالتے۔ حسین کے لیے محال تھا کہ حسین فضیلت اور رذیلت کو ایک درجہ میں رکھتے۔

سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی حسین کے علاوہ یزید کی خلافت کو پسند نہیں کیا۔ ان لوگوں نے معاویہ کے سامنے ہی

عــ۵ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری دکتور جامعۂ ازہر مصر

یہ کہدیا تھا کہ اُن کا یہ طریق عمل کسی طرح مناسب نہیں ہے حسین، سعد بن ابی وقاص اور ابن زبیر وغیرہ سے زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔

حسین زیادہ حق رکھتے تھے کہ وہ یزید کے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور ہر قسم کی قربانی اپنے مقاصد کی حمایت میں پیش کریں۔

حسین کو یہ بھی یقین تھا کہ بیعت کا قصہ اس وقت برائے نام ہے۔ وہ خواہ بیعت کریں یا نہ کریں یزید ان کو زیادہ دنوں تک زندگی کی سانس نہیں لینے دے گا۔ لیکن اگر وہ یزید کی بیعت کریں گے تو صرف خود قتل نہ ہوں گے بلکہ ان کے ساتھ ان کے نانا کے عظیم الشان کارنامے بھی قتل ہو جائیں گے اور بیعت نہ کرنے سے چند جانیں تو ضرور برباد ہوں گی لیکن امت زندہ ہو جائیگی، خیالات و عقائد کو دائمی حیات مل جائے گی۔

سر سلطان احمد صاحب لکھتے ہیں "۶۰ھ میں عربوں کا سیاسی اور سماجی زاویۂ نگاہ اس حد تک بدل چکا تھا کہ وہ خلافت کی جانشینی کے موروثی اصول کو بھی تسلیم کر لینے کے لیے آمادہ ہو چکے تھے یزید استعماریت کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر رسول کی مسند پر بیٹھ چکا تھا لیکن جب تک کہ امام حسین کی ذات امت محمدیہ میں موجود تھی اور جب تک ان کے دست حق پرست نے اس کی بیعت نہ کی تھی، اس وقت تک اُس کو کوئی شرعی استحقاق حاصل نہ تھا کہ وہ ملت اسلامی کی روحی قیادت کا مدعی ہوتا۔ اس نے حسین کو بیعت کی دعوت دی لیکن بیعت کا مسئلہ حسین کی شخصیت کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا بیعت حسین سے بحیثیت حسین کے مانگی نہیں جارہی تھی بلکہ اسلام کی مقدس امانت کے حامل اور امین کی حیثیت سے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے عمل اور اپنی زبان سے یزید کے خلاف شرع طرز عمل کی تصدیق کر کے اسلام کی موت کے پروانے پر اپنی مہر ثبت کر دیں۔

سر محمد سلیمان گولڈن ڈیڈس آف حسین میں فرماتے ہیں "یہ ایک انتہائی آزمائش و ابتلا کا وقت تھا جبکہ اسلام کی قسمت امام حسین کے فیصلہ پر منحصر تھی۔ یزید کا چیلنج تمام مادی طاقتوں کے ساتھ سامنے تھا۔ حسین نے اپنے مقصد کے لیے آخر تک لڑتے رہنے کا آہنی عزم کر لیا اور واقعات اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ حسین نے اپنے فرض کو اسی شدت عزم کے ساتھ

ادا کیا جوان کے شایان شان تھا" کوئی شبہ نہیں کہ عـ۱ـہ " اسلام کے لیے اس سے پہلے کوئی ایسا نازک زمانہ نہ آیا تھا۔ سچے مسلمان حیران اور خائف تھے کہ اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کریں اور کس طرح اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکیں۔ وہ اپنے ایمان کو بچائے ہوئے اپنے مامن میں بیٹھے تھے لیکن یہ ان کی طاقت سے باہر تھا کہ وہ عوام کو اس فتنہ سے بچا سکیں اور ان کی جائے پناہ بھی یزید اور اس کے ہواخواہوں کی دستبرد سے محفوظ نہ تھی بلکہ ظالم حکومت کا ہاتھ انھیں فرداً فرداً لے جاتا تھا۔ اگر یہی صورت کچھ عرصہ جاری رہتی تو یہ سچے مسلمان یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو جاتے اور پھر اسلام سوائے قرآن کے نسخوں کے دنیا میں کہیں نظر نہ آتا۔ مگر خدا کو اسلام کا بچانا منظور تھا اس لیے اس نازک وقت میں اس نے ایک ایسے شخص کو چن لیا جو ہر لحاظ سے اسلام کا یاور و مددگار بننے کا مستحق تھا۔ وہ شخص حضرت امام حسین تھے آپ اور مخلص مسلمانوں کی طرح اب تک کفر و الحاد کے فروغ کو دور سے دیکھتے رہے تھے لیکن دل میں یہ تہیہ ضرور کر چکے تھے کہ وہ اس کا مقابلہ کرینگے اور اپنے نانا کے عزیز مذہب کو تباہی سے بچانے کے لیے ہر ممکن قربانی کرینگے۔ وہ موقع کے منتظر تھے اور یہ موقع انھیں جلدی مل گیا کیونکہ یزید یہ بھی گوارا نہ کر سکا کہ وہ الگ تھلگ مدینہ میں اپنا دامن اس سیلاب سے بچا کر بیٹھے رہیں بلکہ اس پر مصر ہوا کہ آپ اس کی بیعت کریں اور اسے خلیفہ برحق تسلیم کریں۔ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا اور وقت آ گیا تھا کہ حضرت امام حسین اپنے سکوت کو توڑیں اور اپنی جائے پناہ کو چھوڑ کر میدان جہاد میں اتر آئیں۔

عـ۲ـہ " یہ کہنا کہ حسین نے ایک سلطنت کے خلاف بغاوت کی اس سے زیادہ دنی الطبعی ہے جیسے یہ صلاح کہ حسین نے جان بچانے اور انعامات کے لیے بیعت کیوں نہ کر لی۔

بغاوت کیا ہے؟ یہ کہ کسی حکومت کے خلاف جو انصاف اور قانون پر مبنی ہو، جو رفاہ عامہ اور آسودگی و امن خلق کی کوشاں ہو اس کو کسی کوشش سے منقلب کرنا اور خود صاحب اختیار بننے کی سعی کرنا۔ یزید کی حکومت ان باتوں کا ایک معکوس نظام تھا۔ ہر طرح کی سیاسی تدبیریں ایسے اموی مدبرین نے اختیار کی تھیں جنھیں ان باتوں کا نہیں بلکہ محض اس کا خیال تھا کہ کس طرح نظام حکومت بنی امیہ کے قبضہ میں رہے اور یزید

عـ۱ـہ ڈاکٹر محمود حمید مرزا صاحب عـ۲ـہ جناب ریاض بنارسی

برسر اختیار ہو جائے۔ ان نتائج کے حصول کیلئے بہترین لوگ زہر اور فولاد سے سلا دیئے گئے یا بیت المال کا ناجائز مصرف ہوا یا بچے کھچے ہکا بکا ہو کر رہ گئے اور اُن میں کچھ بولنے کی ہمت نہ رہی۔ پھر یزید نے جیسے نمونے پیش کئے تھے اس سے عام اخلاق کی پیشانی شرم سے عرق آلود ہو گئی تھی اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہے کہ یزید کا برسر حکومت ہونا اُس عہدنامہ کے ساتھ صریحی بدعہدی تھی جس کے ایک فریق خود حسین تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اہل کوفہ کی فریاد کسی کی اتھائی ہوئی تھی یا ہمارے زمانہ کی طرح فن پروپیگنڈا تھا یا انتخابی چالیں تھیں؟ نہیں بلکہ خلق اللہ کی صدا تھی صاف اور صریح جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ہم کس حالت میں ہیں۔ باوجود اس کے بھی ایسے نظام کے خلاف آواز بلند کرنے اور اُس کے منقلب کرنے کی کوشش کو اس مفہوم میں بغاوت کہنا کہ نیرو۔ چنگیز اور اٹیلا اور یزید کی حکومت بھی حق منجانب اللہ کے لحاظ سے ہر باز پرس سے بالا ہے پست طبعی ہے۔ بلند آہنگی اور عالی ہمتی یہی جواب دے گی کہ ہمیں نہیں معلوم کہ یزید کی سی حکومت کے خلاف باغی کہے جانے سے زیادہ بہتر کوئی اخلاقی سند عطا کی جا سکتی ہو۔ اگر عالی ہمتی اور خلق اللہ کی صدا پست نہ کی جاتی تو ممکن نہ تھا کہ یزید، مروان بن حکم اور ولید بن عبدالملک کے ایسے لوگ تاریخ اسلام کی پیشانی کے لیے ابدی سیاہی کا ٹیکہ بنتے اور اگر صدائے خلق میں قوت رہتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ اور حالت وہ نہ ہوتی جو ہے کیونکہ بادشاہ اور حکومتیں اپنا ایک زبردست نگران سر پر موجود سمجھتیں۔ اس گورستانی خاموشی، اس کچلی ہوئی ہمت، اس دم خفا کر دینے والی تاریکی میں ایک آواز، صدائے صور، ایک ہمت جس پر عالی ہمتی کو فخر ہو، ایک روشنی جو راہنما بن جائے آغوش پروردۂ خاتم النبیین کی تھی۔“ [1] ”اگر حسین یزید کے ساتھی بن جاتے تو اسلام کا ساتھی کون رہتا۔ حقیقی اسلام دنیا سے رخصت ہو جاتا، حق ناحق سے شرمندہ رہتا، پھر حسین کے واسطے چارہ کار کیا تھا؟ [2] ”حسین کے لیے جو اسلامی عقائد کی عظمت اور اُن کی اعلیٰ قدر و قیمت کے بڑے حامی تھے ممکن نہ تھا کہ وہ اس فاسق و فاجر کو خلیفۂ رسول تسلیم کر لیں۔“

---

[1] علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب [2] خواجہ غلام السیدین صاحب

دوسری کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی تھی نہیں۔ پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟

جنگ، اگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال آپ کے سامنے پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علی بن ابیطالب کی وفات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علی ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ حضرت علی کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکر لے سکی اور حضرت امام حسن کو اس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپ نے صلح کرنا بہتر سمجھا۔ حالانکہ اس وقت "شیعیان علی" کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس برس کی طولانی مدت گزرنے پر وہ جتھا پراگندہ ہو چکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خرید ے جا چکے تھے، بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کئے جا چکے تھے اور ہزاروں کو جیلوں میں بھرا جا چکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بددلی سے ادھر ادھر پریشان و پاشان ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں دمشق کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا؟! اس کے علاوہ آپ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہو سکتا تھا اس کی تشریح آئندہ کی جائے گی۔

بہر حال، ہمارے گزشتہ تبصرہ سے آپ کو حضرت امام حسین کے سامنے موقع کی نزاکت کا اندازہ تو ضرور ہو گیا ہو گا۔ یعنی جتنی صورتیں بظاہر کسی انسان کے سامنے آ سکتی ہیں وہ سب ہی غیر ممکن ثابت ہو رہی ہیں۔ بیعت کرنا کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں۔ صلح کا کوئی امکان نہیں۔ جنگ کی کوئی صورت نہیں۔ پھر اب جو حضرت امام حسین بیعت سے انکار کر رہے ہیں تو کیا کریں گے؟ میں سچ کہتا ہوں کہ اے اگر حسین کر کے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسین نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ کریں گے مگر جنگ کا طریقہ بدل دیا۔ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں ان میں طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہوتا ہے۔ حسین نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ وہ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے، انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقہ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس کے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

حسین کا مقصد بھی اسی طریقۂ جنگ سے حاصل ہو سکتا تھا اور اسی مقصد کا حصول اُن کی حقیقی فتح تھی عہ۱ "حسین کو یزید سے کوئی ذاتی یا خاندانی عداوت نہ تھی یہ ایک اتفاق تھا کہ آل ابوسفیان سامنے آگئی۔ اگر کوئی دوسرا قبیلہ خواہ وہ بنی ہاشم ہی کی کوئی شاخ کیوں نہ ہوتی سامنے آجاتی اور اُن مقاصد کے اجرا و شیوع میں مانع ہوتی جن کی ترویج حسین اپنا فرض اولین سمجھتے تھے تو حسین اس قبیلہ کے مقابلہ میں ویسا ہی ٹھہرتے جس طرح آپ یزید کے مقابلہ میں نظر آرہے ہیں" عہ۲ "انھیں دنیاوی کوئی لالچ بھی نہیں تھی۔ اگرچہ خلافت کے وہ ہر طرح حقدار تھے لیکن انھیں اس کا بھی ملال نہ تھا کہ وہ انھیں نہ ملی وہ نام و نمود کے خواہاں نہ تھے۔ رسول اللہ کے نواسے کو نام و نمود کی کیا خواہش ہو سکتی تھی؟ وہ عیش و عشرت کے جویانہ تھے جن کی والدۂ محترمہ نے تمام عمر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی اُنھیں آرام و عیش کی کیا خواہش ہو سکتی تھی اور اب آپ کی وہ عمر بھی نہ رہی تھی جس میں ان چیزوں کی لالچ انسان کو ہو سکتی ہے"

یاد رکھنا چاہیے کہ حسین اگر یزید سے صرف عداوت کی بنا پر مقابلہ کرنا چاہتے یا وقتی طور پر اپنی سلطنت قائم کرنا منظور ہوتی تو چاہے مکمل فتح حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا تب بھی آپ سلطنت شام کو ایک عرصہ تک پریشان کر سکتے تھے اور اگر اس کے ساتھ وہ عہ۳ "موقع بینی اور وہ جان ہے تو جہان ہے" کی وضع کے مدبر ہوتے تو اُن کے لیے یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ مدینہ اور مکہ کے تقدس میں پناہ لیتے اور لوگوں کو اپنی مدد کی دعوت دیتے رہتے۔ ممکن وسائل سے لڑتے اور جب یہ سامان ناکافی ہوتا تو پسپا ہوتے، پھر مہیا کرتے اور علیٰ ہذا القیاس یا اگر ان دونوں مقامات سے نکل ہی چکے تھے تو طرماح بن عدی کے کوہ اجا میں پناہ لیتے جہاں بیس ہزار سواران طے کی حمایت کا وعدہ تھا لیکن حسین اس سے کہیں بڑے تھے کہ وہ اپنے موافق نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے۔ انھوں نے ایسی تدبیریں اختیار نہیں کیں جو غرضمندوں کی تاریخ کا ایک ورق ہوتا اور جس سے ارضیت کی بو آتی۔ انھیں اپنے اقدامات کو آب باراں کی طرح صاف اور اپنے احوال کو صداقت کی طرح یقین خیز

عہ۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ عہ۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب عہ۳ ریاض صاحب بنارسی

رکھنا تھا — ،، کیا حسین عبداللہ بن زبیر سے کم ملکِ عرب اور مسلمانوں میں اثر رکھتے تھے
پھر جب ابن زبیر کئی برس تک سلطنت دمشق کا مقابلہ کر سکے تو حسین کیوں نہ کر سکتے تھے؟
،، جنگ دو سر دارد،، نتیجہ میں چاہے جو کچھ ہوتا مگر کہنے کو ہوتا کہ ،، مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا،،
مگر حسین اس طرح کے مقابلہ کا خیال اُس وقت کرتے جب صرف مادی طور پر انھیں
دشمن کو نقصان پہونچانا ہوتا - اگر ایسا ہوتا تو پھر تیاریاں بھی اُس کی دوسری طرح
ہوتیں — لشکر فراہم کیا جاتا۔ اسلحہ جمع کیے جاتے اور سب سے پہلا اقدام آپ کی طرف سے
یہ ہوتا کہ اُسی موقع پر جب ولید کی ملاقات کو گئے تھے اور معاویہ کی وفات کی اطلاع
ملی تھی تو فوراً ولید اور مروان پر حملہ کر دیتے اور اُن دونوں کو قتل کر کے اسی وقت
دار الحکومت مدینہ پر قبضہ کرتے - کیونکہ یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ امام اپنے ساتھ اس
وقت اتنی جمعیت لے گئے تھے جو وقتی طور پر آپ کی حمایت کے لیے کافی تھی یہ بھی ظاہر ہے
کہ مدینہ میں اس وقت سلطنت شام کی طرف سے کوئی فوجی انتظام نہ تھا۔ سیاست کے
ماہر اور ملکی انقلاب کے واقف کار جانتے ہیں کہ ایک بادشاہ کے دنیا سے جانے کے بعد حکومت
کی بنیادیں کس طرح متزلزل ہوتی ہیں اگر اس وقت حضرت امام حسین اس طرح کا اقدام
کر دیتے تو کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر مدینہ اور اُس کے اطراف میں آپ کی سلطنت
وحکومت مسلّم ہو جاتی - پھر مکہ، طائف، یمن اور عراق بلکہ ایران کا آپ کی سلطنت میں داخل
ہو جانا کوئی دشوار امر نہ تھا مگر آپ نے ایسا نہیں کیا - وہ طاقتور جماعت جسے اپنے ساتھ
لے گئے اُس سے بھی صرف اپنی جان کی حفاظت اور مدافعت کا کام لینا منظور تھا اسی
لیے باوجود سخت کلامی تک نوبت آ جانے کے تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ان
لوگوں کو اندر نہیں بلایا اور نہ کسی عملی اقدام کی اجازت دی - اس سے صاف ظاہر
ہے کہ آپ سلطنت دمشق پر براہ راست کوئی مادی ضرب لگانا نہیں چاہتے تھے اور نہ
خود اس طرح کی حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے جب آپ کا یہ مقصد نہیں تھا تو اس کا لازمی
نتیجہ یہ ہے کہ فتح وشکست کا معیار بھی آپ کی نظر میں بالکل جداگانہ تھا - فتح کے یہ معنی
نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اُس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے یہ معنی

نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی قتل ہو جائیں۔ بیشک عام طور پر فتح وہی ہی اور شکست اسی کا نام ہی۔ مگر یہ اُن کے لیے جن کا مقصد مادی اقتدار حاصل کرنا یا اُس کو ترقی دینا یا دشمن کی مادی زندگی کو ختم کرنا ہو۔ حضرت امام حسین کا جب مقصد یہ نہ تھا تو اُن کے نزدیک شکست و فتح کا معیار بھی یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ میرے نانا کے تعلیمات اور انسانیت کے اصول جنھیں بڑی قربانیاں برداشت کرکے رائج کیا گیا تھا اب بالکل فراموش ہو گئے ہیں اور شہنشاہی اقتدار اور سلطنت کے جاہ و حشم نے نگاہوں کو اس طرح ہٹا دیا ہے کہ اب اُن تعلیمات کی چمک دنیا کو نظر نہیں آتی۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیمات اسلام پر ایسا غلاف چڑھ گیا ہے جس سے آیندہ صدیوں کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقتہً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظام زندگی کیا تھا جسے پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نگاہ اُٹھا کر سامنے نظر کریں تو اونچی عمارتیں، بلند مینار اور بڑے بڑے عالیشان پھاٹک آنکھوں کے سامنے جلد آ جائیں گے لیکن زمین سے ملے ہوئے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر، وہ چھوٹے دروازے جہاں آدمی بغیر سر جھکائے ہوئے جا بھی نہیں سکتا مشکل سے دکھائی دینگے۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہی تو وہ تاریخ ہو سکتی ہی۔ یہی تاریخ کی دوربین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سلاطین اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالب تحقیق نیک نیتی کے ساتھ تاریخ کی دوربین سے نظر ڈالتا تو اُس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے، وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں، وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زر و جواہر کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے

اندر باریابی ہو جاتی تو زرو جواہر مرصع تخت نظر آتا اور زریں کمر غلام صف باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صدا اور ساز و طرب کے نغموں کی گونج۔ "پیشوائے اسلام کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہی تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہی۔ موذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقارخانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی۔ بتایئے! اگر وہ یہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن یہی ہی اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ ان کے افعال مسلمانوں کے افعال بتائے جاتے اور ان کا کردار ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی۔ کہاں نظر آتے محلہ بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جن میں کچھ بوڑھے، کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب، محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود فاقہ سے دن گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسا بھائی بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔ کہاں نظر آتے وہ چہرے جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھا گئی ہے! وہ ہونٹ جو ذکر الٰہی سے خشک ہو گئے ہیں، وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہی کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کسی کمزور کی مدد کرو اور کسی محتاج و بیکس کی دستگیری کرو۔

بس حسین بن علی کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے ہوے اسی پر کمر بستہ ہو گئے تھے کہ تو یہی انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں ان قصروں اور میناروں سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کی برق تجلی کو عمل کی اس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اٹھتے ہی سب سے پہلے اسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں ستارے کی طرح چمک اٹھے۔ سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اس نقارخانۂ ساز و نغمہ سے بہرا بنا دیں اور حقانیت اسلام کی اس سریلی اور دلکش آواز سے آشنا کر دیں جو

موجودہ حالات میں سنائی نہیں دیتی۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے حسین کمر بستہ ہوئے تھے۔ دوسری لفظوں میں اُن کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کر دیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تمدن و تہذیب اور اُس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسین جس مشن کو لے کر اُٹھ رہے تھے وہ مشن اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی مشن تھا جسے تمام انبیاء لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے مگر اس مشن کو جس صورت سے آپ نے کامیاب بنایا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیاتِ امم کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افراد انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور اُن تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ عوام سے قوت احساس کو سلب کیا جائے۔ دوسرے جرأت اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی طاقت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پر پوری طاقت صرف کر دی تھی۔ ورنہ مسلمان جن کو پیغمبر نے اُس محنت و مشقت سے اصول انسانیت کی تلقین کی ہو اور جس مسلم جماعت نے دیکھا ہو کہ پیغمبر کس طرح مادی ساز و سامان کو ہیچ و پوچ سمجھتے ہیں، جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبر کے دروازے پر پھٹا ہوا پردہ پڑا ہے جنھوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبر کے گھر سے دھواں نہیں اُٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا ہے وہ جماعت کیسے اس کو برداشت کر سکتی کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس چوس کر روپیہ جمع ہو اور اُس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ اسلام کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب و کباب کے مشغلے رہیں۔ مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوا تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب ہے۔ مسلمانوں کی طبیعت میں یہ انقلاب کس طرح پیدا ہو سکتا تھا؟ اُن ہی دو باتوں سے، قوت احساس کا ختم ہونا اور جرأت اظہار کا سلب ہونا۔

قوت احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے اُن کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے ممتاز افراد اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے تو جدھر یہ لیڈر لے جانا چاہیں، عوام نیک نیتی کے ساتھ اسی طرف چلے جائیں گے۔ خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اور اسی طرح عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے کبھی حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا۔ کس طرح؟ جس کو ذرا مخالفانہ رجحان رکھتے ہوئے پایا، اس کی جیب میں اشرفیوں کی ایک تھیلی پہونچادی گئی اگر اُس نے قبول کرلی تو سمجھ لیجئے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن ہوا اتنا ہی اُس کی مخالفت کا سر جھک گیا پھر "چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی" جہاں خیال ہوا کہ اب کی دفعہ دَس توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دَس کے چار ملیں گے وہیں قوت احساس ختم ہوگئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے جا ہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا ضمیر خرید لیا گیا اور بہت سے منچلے جن کے سر اُٹھے ہی رہے اُن کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کردی گئی اور اگر یہ حربہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام جو لب تک پہونچتے ہی موت کی میٹھی نیند سلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کردیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو اُن لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس کے پہلے کچھ سوچ کر خلاف کا اظہار کر چکے تھے کہ آج صفحہ ہستی اُن کے نقش وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جرأت اظہار ختم ہوئی۔

یہی دَو چیزیں ایسی تھیں جن کو از سرِ نو پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا کر حضرت امام حسین میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوت احساس کیسے پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو مانتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ان کے احساسات اسلامی پر غشی چھاگئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس میں نفس کی آمد وشد قائم ہوتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثار زندگی

مفقود ہوتے ہیں۔ احساس اور حرکت دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں اسی طرح اس وقت
جامعۂ اسلامیہ میں کلمۂ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی
روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساسات اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ
جب کسی کو غش آجاتا ہے تو اس کے چہرے پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جتنی گہری بے ہوشی ہو اتنا ہی تیز
چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسین نے بس یہ چاہا کہ مسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز
چھینٹا دے دیں جس کے بعد وہ پھریری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا
میں کیا ہو رہا ہے؟ حضرت امام حسین نے یہ بھی سوچا کہ اس بیہوشی کا کیا سبب ہے؟ آپ نے سمجھا
اور بالکل صحیح سمجھا کہ وہ جماعت جو تعلیمات اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مسلم
جماعت ہوتی تو مسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیمات اسلام
کو برباد کر رہی ہے۔ اپنے چہرہ پر اسمی و رسمی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے ہے۔ اور مسلمانوں کی جماعت
ہے اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے حضرت امام حسین نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت
کے چہرہ سے اسلام کی اس نقاب کو اتار کر پھینک دیں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں
اور یہ کہ ان کو اسلام سے حقیقۃً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائیں گے اور
ان کے خلاف انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے دوسرے بعد میں مسلمانوں کے لیے ان کے افعال سند نہ رہیں گے جب مسلمانوں کو ان کے
اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائے گی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ تیسرے غیر مسلم
دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی امیہ کے اوصاف و اخلاق کو
اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسین بن علی کا کردار
مسلمانوں کے سر کو بلند کرے گا کہ اگر یزید کے افعال کا اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو پیغمبر اسلام
کا نواسا اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈال دیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام و کمال مادی جنگ
سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اس سے افراد و اشخاص قتل
ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افراد جامعہ
کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا حسین بن علی اشخاص کو قتل کرنے نہیں اٹھے تھے۔ یزید
کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید ختم ہو جاتا

اور اُس کے تمام عمال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جاسکتا تھا کہ یزیدیت ختم ہو گئی اور یزیدی مسلک فنا ہو گیا۔ ذہنیت دنیا کی جب متوف تھی تو اگر آپ عسکری طاقت لے کر جنگ کرتے تو جو اُس کی واقعی حیثیت تھی اُس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت و سلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جاچکا تھا اور حسین کا پلہ سبک ہوتا اس بنا پر کہ سیاسی طور پر وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے ہوتے۔ اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بنا پر غیر ممکن تھی تو اُس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیرپا نہیں رہتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اُسی طرح برقرار رہتا جس طرح اس کے پہلے تھا اور اگر کچھ لوگ حسین کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطار اجتہادی کا سارٹیفکٹ دیدیتے جیسا کہ اس کے پہلے صفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو اُن سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک اُن سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اُس وقت تک ان امتیازات و اقدار کو مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسین طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا میں جنہیں کو نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں حسین بن علی کی فتح ویسی ہی فتح سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کرتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی۔ اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی حالانکہ تاریخی حالات بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی یعنی اُس صورت میں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو امیر المومنین کو وقت سے مجبور ہو کر گوارا کرنا پڑا تھا یعنی عراق و حجاز وغیرہ کی

حکومت امام حسین کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی دونوں طرف کی حکومتوں میں مقابلہ ہوا کرتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں مگر امام حسین جو کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے وہ ایسی تھی جو نہ باعتبار حدود مملکت محدود تھی اور نہ باعتبار حدود زمانہ محدود۔

ممکن ہے یہ سوال اُٹھایا جائے کہ حسین کے واقعہ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوئے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیے دُور ہو گیا ہے کہ انکو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ حسین نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا ہے۔

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسین بن علی کے لیے اپنے مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ وہی جسے اُنھوں نے اختیار کیا اور اسکے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا عـ۵ "حسین کا سن اس وقت چھپن برس سے کم نہ تھا اور یقیناً اس عمر میں انھوں نے ایک ایسے اقدام کو جس میں کہ پورے خاندان کے بقا و فنا کا سوال درپیش تھا بغیر پورے طور سے غور کیے شروع نہیں کیا تھا چونکہ وہ ایک عدیم المثال کارنامہ صفحۂ عالم پر مرتسم کرنا چاہتے تھے اسلیے اُنھوں نے پورا یقین کر لیا ہوگا کہ جس مقصد کے لیے وہ اپنی اور عزیزوں کی جان دینا چاہتے ہیں وہ یقیناً اُن کی موت کے بعد فنا نہیں ہوگا"

اس طریقہ کار کی پوری تشریح و تفصیل آیندہ کے ابواب میں ہوگی اور اس داستان کی آخری سطریں وہی ہوں گی جہاں قلم کی نوک سے روشنائی کے بدلے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی دینے لگیں مگر ابھی تو حسین کا طرز عمل صرف ایک منفی ہی فقرہ سے ادا ہو سکتا ہے۔ یعنی "بیعت نہ کرنا"۔ اگر ہم آگے کے حالات کا مطالعہ نہ کریں تو ہم اس سے کچھ

عـ۵ سید خورشید حسن صاحب نقوی

بھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ جب کہہ رہے تھے کہ "بیعت نہ کروں گا" تب ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کرنے والے ہیں مگر وہ جلد باز اور جذباتی انسان ہوتے اگر اپنے عمل کو اسباب کی رفتار سے آگے بڑھا دیتے۔ بے شک اسکے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہے اور بڑی قوت برداشت درکار ہے جس نے مرناطے کر لیا ہو اُس کے لیے پھر آج اور چھ مہینے بعد میں فرق ہی کیا مگر وہی بات جو چھ مہینے بعد ایک عظیم قربانی سمجھی گئی آج "خودکشی" قرار پا سکتی تھی۔ انھیں لازم تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کی بھی کوشش کریں مگر اُس حد تک کہ اُن کے اصول اور مقصد پر آنچ نہ آئے اور اگر مقصد کا تحفظ جان دینے پر موقوف ہو تو پھر جان دینے کیلیے بھی تیار ہو جائیں بس یہی ہے حسین کے رفتارِ عمل کی تشریح شروع سے لے کر آخر تک اور اس کی ابتداء ہو گئی تھی یہیں سے کہ اُنھوں نے ولید کے مطالبۂ بیعت کو پورا نہیں کیا مگر اس طرح کہ اُن کے خلاف فوراً کوئی اقدام عمل میں نہ آسکے۔

اصولاً آپ کے جواب نے ولید کو خاموش کر دیا تھا اور اُسے مستقبل کے ساتھ توقع وابستہ کرنے کا موقع تھا۔ [۵] رہے ابن زبیر تو اُنھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آتا ہوں مگر گھبرا کر چھپ رہے۔ ولید نے قاصد بھیجا تو اُس نے یہ دیکھا کہ ابن زبیر اپنے احباب کے جتھے میں ہیں اور اس کی وجہ سے بیعت سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں مجبوراً ولید کو پے در پے قاصد روانہ کرنا پڑے اور اُن سے مسلسل مطالبہ شروع کر دیا۔ ابن زبیر نے مہلت مانگی مگر وہ لوگ تمام رات اڑے رہے یہاں تک کہ ولید نے چند غلام بھیجے جنھوں نے آ کر ابن زبیر کو سخت سُست کہا اور پکارے امیر کے پاس چلو، نہیں تو ہم تمھیں قتل کر دینگے۔ اس حالت میں تمام دن اور ثلث اول شب ابن زبیر نے کاٹا اور یہی کہتے رہے کہ "ابھی آیا" جب زیادہ مجبور کیا گیا تو کہنے لگے کہ ان پیادوں کی پیہم آمد سے گھبرا گیا ہوں، اک ذرا تم جاؤ کہ ولید کے پاس ہم اپنا آدمی بھیج کر اُسکی رائے دریافت کر لیں چنانچہ اپنے بھائی جعفر کو ولید کے پاس بھیجا۔ جعفر نے جا کر کہا کہ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ ابن زبیر تم سے کل ملیں گے انھیں تو تمھارے مسلسل پیادوں نے پریشان کر رکھا ہے اپنے پیادوں کو

---

[۵] مولانا نعمت امام صاحب حنفی دھلواری ضلع پٹنہ۔

حکم دو کہ وہ لوٹ آئیں۔ خیر ولید نے بات مان لی اور اپنے پیادوں کو لوٹنے کا حکم دے دیا ابن زبیر کو موقع غنیمت مل گیا۔ اُنھوں نے اسی رات کو مکہ کا رُخ کیا۔ شارع عام سے کترا گئے۔ صبح ہوئی تو ولید نے قاصد بھیجے تو معلوم ہوا کہ وہ تو شب ہی کو مدینہ سے نکل گئے۔ وہ ہیں اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی جعفر ہیں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مروان کے مشورہ سے مکہ کی راہ پر سوار تعاقب کے لیے روانہ کیے گئے مگر وہاں تو راستہ ہی بدل دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوار تھک کر لوٹ آئے۔

واضح رہے کہ ابن زبیر اُسی دن کی رات کو مکہ کی طرف چلے گئے اور جناب امام علیہ السلام نے یہ کہدیا تھا کہ اُسی دن بلانا جب مجمع عام ہو۔ اس کے بعد عقلاً امام سے تعرض ہو ہی نہیں سکتا تھا تا آنکہ مجمع عام ہی نہ ہو۔ اسی لیے امام کو موقع ملا۔ آپ گھر تشریف لائے اور روضۂ رسول پر حاضر ہوئے۔ اور پہلی شب وہیں گزاری۔ دوسرے دن مجمع عام ہو سکتا تھا مگر عبداللہ بن زبیر کی غیبت اور اُن کے تعاقب کی وجہ سے دن بھر فرصت ہی نہیں ہوئی کہ امام سے تعرض ہو سکے۔

کوئی شک نہیں کہ ؎ "مدینہ میں ولید کی ملاقات کے بعد سے جو قدم حسین اُٹھاتے تھے وہ نہایت سنجیدہ اور واضح ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان چیزوں کی اہمیت اُس وقت نہ سمجھی گئی ہو لیکن بعد کے واقعات نے اُن ضرورتوں کو اور حسین کے کمال تدبر و سکون دماغ کو ثابت کر دیا۔"

؎ سید خورشید حسن صاحب نقوی

(تیسرا باب)

مدینہ سے کربلا تک

ع۱؎ حسین کا پوزیشن مدینہ میں بہت نازک تھا۔ وہ وہاں ایک اکیلے خاص آدمی رہ گئے تھے جنھوں نے یزید سے اختلاف کیا تھا اور فطرۃً اپنے مخالف کے شدید غضب کا مرکز بن گئے تھے۔ یزید چاہتا تھا کہ اُن کو ذلیل کرے اور نہ صرف اُن کو بلکہ چونکہ اُس کی نظر میں رسول اور اُن کے مذہب کی بہت کم عزت تھی اس لیے وہ اس کے ضمن میں تمام خاندان بنی ہاشم کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ پرانا بُت پرستی کے زمانہ کا جذبۂ رقابت تھا جو اس وقت یزید پر مسلط تھا اور اُس نے اپنے ملازموں کو جو مدینہ میں تھے سخت احکام نافذ کئے کہ وہ جس قیمت پر بھی ہو حسین سے بیعت حاصل کریں"۔

ع۲؎ "اب مدینۂ رسول جو حقانیت و صداقت کا گہوارہ تھا اُس کی زبوں حالی کا یہ نقشہ ہے کہ مجسمۂ فسق و فجور کی عہد غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کے لیے سب کے سب تن تیار ہیں الا ماشاء اللہ۔ کسی کو یہ احساس بھی نہیں کہ یہ کوئی بری شئے ہے۔ اگر کسی کے دل میں کچھ احساس ہے بھی تو اُس کی زبان خوف حکومت سے بند ہے۔ ہر طرف بنی امیہ کے سطوت و جبروت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ رسول کے نواسے سے سختی کے ساتھ یزید کی بیعت کا مطالبہ شروع ہو چکا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر بیعت سے انکار کی صورت میں امام حسین کا مدینہ میں قیام جس قدر خطرناک ہے اسی قدر بے نتیجہ۔ حکومت وقت اپنی انتہائی طاقت صرف کرنے کے لیے تیار ہے۔ کئی پشت کی جمی جمائی سلطنت سے مقابلہ کا یہی نتیجہ ہوگا کہ خاندان نبوت تو تباہ ہوگا ہی۔ حرم رسول کی بے حرمتی اور مدینہ کی بربادی کا الزام ہمیشہ کے لیے امام کے دامن پر رہ جائے گا۔

بادی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضرت امام مدینہ میں قیام فرماتے تو آپ کو اہل مدینہ

ع۱؎ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب دٹریجڈی آف کربلا) ع۲؎ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی

سے کافی امداد ملتی اور اُس بے دردی کے ساتھ، خاندان نبوت کا استیصال نہ ہو جاتا جس طرح کربلا میں ہوا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر کربلا کی سی صورت مدینہ میں پیش آتی تو حضرت کی حمایت کے لیے کوئی نہیں تیار ہوتا۔ یقیناً کچھ نہ کچھ لوگ ایسے نکل آتے جو حق جاں نثاری ادا کرتے لیکن اس سے نتیجہ میں کیا کامیابی ہوتی؟ ہوتا وہی جو ہوا۔ اہل مدینہ کی نگاہوں میں حضرت کی جتنی وقعت و منزلت تھی حضرت کو اُس کا پورا پورا اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یا ابن رسول اللہ یا بابی انت کی صدائیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈال سکیں۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ خاندان نبوت کا وہ درجہ اہل مدینہ کی نگاہوں میں نہ تھا جو دوسرے اصحاب اقتدار کا تھا۔ ظاہر ہے کہ حسین ایسے مبصر انسان کو اس کا کس قدر احساس ہوگا چنانچہ اہل بصرہ کو جو خط آپ نے لکھا اُس میں صاف طور سے اپنے حقوق کی پامالی اور اغیار کے منتخب ہونے کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ ہمارے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی گئی —— اب دیکھنا یہ ہے کہ اہلبیت کے مقابلہ میں جن حضرات کو اہل مدینہ نے فوقیت دی اور ان کی عظمت کا لوہا مانا اُن کا کہاں تک ساتھ دیا۔ حضرت عثمان غنی ایک دن دو دن نہیں بلکہ پورے چالیس دن تک محاصرہ میں رہے لیکن بجز اہلبیت کے کوئی اُن کے آب و دانہ کا لحاظ کرنے والا بھی نہ تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ محاصرین کی کوئی بڑی بھاری فوج تھی جس کا مقابلہ اہل مدینہ نہیں کر سکتے تھے۔ مصر کے تھوڑے سے بلوائی تھے اور کیا تھا؟ تمام وہ لوگ جنھوں نے بیعت کی تھی اور حمایت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ نہ معلوم کس غفلت میں بیٹھے ہوئے تھے نہ کسی نے خلیفۂ معظم کی حمایت میں تلوار اُٹھائی نہ کہیں سے اتنے دنوں کوئی کمک آئی۔ ان تجربات کے ہوتے ہوئے حسین سا صاحب الرائے انسان کس امید پر مدینہ میں قیام کر سکتا تھا۔ ہاں ایک ہی صورت قیام کی ہو سکتی تھی۔ وہ یہ کہ حسین بھی معاذ اللہ بیعت یزید کر لیتے اور ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کی آیت کریمہ کو فراموش کر دیتے مگر امام عامل بالکتاب اسے کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو سورہ نساء چودھواں رکوع:۔ ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم یکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا

ملائکہ جب ظلم علی النفس کرنے والوں کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ تم کس مذہب میں تھے؟ (الناس علیٰ دین ملوکھم) تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو زمین میں مغلوب تھے مگر اُن کا یہ عذر قابل قبول نہیں سمجھا جاتا ہے اور ملائکہ اُن پر جرح کرتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کرکے کہیں چلے جاتے؟ اس آیۂ کریمہ کا منطوق یہی ہے کہ جب کسی مقام پر دینی آزادی نہ حاصل ہو اور بیدینی کی تائید پر مجبور کیا جائے تو اس وقت ہجرت کرنا ضروری ہے" حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر حسینؑ عاقبت اندیشی کرکے مدینۂ رسول کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے وہ سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرز عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی ناگواری کے مال وجاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اُس کو معزول کرکے مروان بن الحکم یا اُس کے ایسے کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمن اہلبیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کرکے فرزند رسولؐ کے خون سے مدینۂ رسولؐ کی زمین کو گلرنگ بنایا جاتا۔

وہ خطرہ جو حسینؑ کو ولید کی گفتگو کے بعد پیدا ہو چکا تھا صرف توہم یا اندیشہ نہ تھا بلکہ وہ بالکل یقینی تھا اور اُس نے فعلی حیثیت اختیار کرلی اُس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "خلیفۃ المسلمین یزید کی طرف ولید بن عتبہ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسین بن علی آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں اب آپ کی جو رائے ہو"۔ اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام اُن ممتاز افراد کی جنھوں نے میری بیعت کی اور جنھوں نے بیعت نہیں کی مکمل فہرست جلد بھیجو لیکن اس جواب کے ساتھ حسین بن علی کا سر موجود ہو"۔ اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں تک ٹھہر سکتا تھا؟ یہ بالکل ظاہر ہے وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اُسے

معزول کرکے عمر بن سعید کو حاکم مدینہ مقرر کردیا گیا۔ ع۱۔ سوال یہ ہے کہ ولید یہاں سے کیوں ہٹایا گیا۔ بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ وہ یزید کے احکام کی تعمیل پوری طرح نہیں کرتا تھا۔ ابن خلدون اور سبط ابن جوزی دونوں نے اس معمے کو حل کیا ہے۔ سبط ابن جوزی اپنے تذکرہ خواص الامہ میں رقمطراز ہیں کہ "جب یزید کو ولید کے طرز عمل کی اطلاع ہوئی تو اس نے ولید کو مدینہ سے معزول کردیا اور عمرو بن سعید اشدق کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا (قلمی ص۲۸۹) ابن خلدون نے بھی اپنی کتاب (مطبوعہ مصر جلد سوم ص۲۱) میں صاف لکھا ہے کہ جب یزید کو خبر پہونچی ولید کے طرز عمل کی ان لوگوں کے بارے میں (جنھوں نے بیعت سے انکار کیا تھا) تو اُس نے ولید کو معزول اور عمرو بن سعید اشدق کو مقرر کیا۔ ان اقتباسات سے پورے طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حسین کا مدینہ چھوڑنا حق بجانب تھا۔ حسین کو بخوبی یزید کا عندیہ اور نصب العین معلوم تھا اور وہ موقع کی نزاکت سے کماحقہ واقف تھے۔ ولید کے دربار میں جانے سے قبل اُنھوں نے حفاظت خود اختیاری کرلی تھی۔ یقیناً اگر مروان کو آپ اپنے جواب سے مرعوب نہ کرتے تو معاملہ دگرگوں ہوگیا تھا۔ پھر بھی مروان کے اقدام سے یہ تو ظاہر ہی ہوچکا تھا کہ حسین کا مدینہ میں ٹھہرنا کتنا مخدوش ہے۔ مدنیوں میں زندگی کا کوئی شرر باقی نہ تھا۔ اور ان سے کسی قسم کی التجا کرنا محض بے سود تھا۔ نتیجہ ہوتا کہ یزید کے خفیہ مشیر کار حسین کو قتل کردیتے اور الزام کسی بے گناہ کے سر تھوپ کر معاملہ کو رفع دفع کردیتے اور اس طرح حسین بغیر اپنے حق میں یا مذہب کے حق میں اپنا کارنمایاں دکھائے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے"۔ کیا مدینہ میں حسین کو اتنے بھی خالص اور سچے جاں نثار مل جاتے جتنے کربلا میں آپ کے ساتھ نظر آتے ہیں؟ یہ بات بہت مشکوک ہے۔ ع۲ کیا نہیں دکھائی دیتا کہ وہ مدینہ جس کا گوشت اور پوست رسول اور علی مرتضیٰ کی کوششوں سے بنا تھا حسین کو مدینہ سے جلاوطن ہوتے اس طرح خاموشی سے دیکھتا ہے جیسے کوئی جنازہ جاتے دیکھتا ہے۔ کون تھا جسے اہلبیت رسول کے خوف کا موقع معلوم تھا لیکن ہر ایک کو یہ بھی معلوم تھا کہ اموی حکومت نے ہر ایک قوی شخص کو جس سے کوئی خوف تھا زہر یا رشوت سے خاموش کردیا ہے۔ اگر تھیں معلوم ہو تو دو ہی ایک ایسے

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ع۲ ریاض صاحب بنارسی

آدمیوں کا نام بتادو جنھوں نے حسین سے کہا ہو کہ مدینہ سے نہ جائیے۔ ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔"

خود اہل حجاز کی افتاد طبیعت کے متعلق دانشمندان عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں جیسا کہ علامہ ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (مطبوعہ لیدن۔ ہالینڈ) صفحہ ۱۲۵ میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے ابن الکواء سے مختلف عربی ممالک کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس میں اہل حجاز کے متعلق بھی پوچھا۔ اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ۔"

پھر اگر حسین مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا ان کا قتل اسی اعلان و اشتہار کے ساتھ ہوتا جو کربلا آکر ہوا۔ سیاست حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے یا تو حسن کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا علی کے قتل کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسین واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے گئے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہی۔

حسین اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبر کا اقتضاء یہ تھا کہ مدینہ میں قیام کرتے تو پھر بیعت ہی کر کے اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو انھیں اپنے اصول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اس افق پر لے جاکے پیش کرنا چاہیے تھا جہاں وہ کربلا کے میدان میں سے ابھر سکے ؎ وہ یہ صاف نظر اور روشن ضمیر جس کی آنکھوں نے ۵۷ برس کی عمر تک بڑی آنکھیں دیکھی تھیں یہ جس کے کانوں نے پاک ترین زبانوں سے صداقت ریز کلام سنے تھے اور قوم کے بننے اور بگڑنے کا تماشا اس قربت سے دیکھا تھا جیسا کوئی گھر والا دیکھ سکتا ہے، وہ مسخ شدہ صورتوں ہی تنہا کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامعہ باطنی کو ترانے ترنم سنائی دے رہی ہے۔ ذرہ ذرہ کائنات کا اس سے کہہ رہا ہے کہ حسین تم اسی دن کے لیے پیدا اور تیار کیے گئے تھے۔ تمھیں اس جرم پر سزا دی جائے کہ کیوں مشیت ایزدی نے رسول کی گود کا پالا اور فرزند علی و فاطمہ بنایا۔ تم اس

؎ ریاض صاحب بنارسی

اقرار جرم پر فخر کروگے۔ زمانہ تمہارے گھر کو اس طرح پہچان لے گا کہ پھر شبہہ کی گنجائش نہ رہیگی اصول آج تمہارا منھ دیکھ رہا ہے چلو قتل گاہ کی طرف چلو۔ صداقت تمہاری عزت کی ضامن اور حقیقت تمہاری ہمدردی کی کفیل ہوگی اور حسینؑ کی آنکھوں کے سامنے سوتے جاگتے رسول اللہؐ قبر مطہر سے نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور فرما رہے تھے کہ حسینؑ شہادتِ سعادت حاصل کرنی ضرور ہے۔ بس اب کوئی تردد نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے گھر بھر کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ طیبہ سے نکلنا اگر انکار بیعت کا اعلان تھا تو فوری خطرہ سے حتی الوسع بچنے کا اقدام بھی تھا۔" ع۱ "یاد آتا ہے اس وقت حضرت محمد مصطفےٰ کا طائف کی جانب سفر کرنا جو یقیناً ایک بلند منصوبہ اور شجاعانہ اسپرٹ کے ماتحت تھا۔ غور کرو کہ رسول کیونکر بے زاد و توشہ جا رہے ہیں۔ خدا کا بندہ تن تنہا جسے قوم نے ذلت و نفرت کے ساتھ نکال دیا تھا، خدا کا نام لیتا ہوا بہادری سے منزلوں کو طے کرتا چلا جا رہا تھا اور بت پرست ملک کو اپنے کئے ہوئے پر پچھتاوے کی اور دین حق کی حمایت کی ترغیب دلاتا جاتا تھا۔ رسول کی اس کیفیت سے بہت ملتی جلتی ہے حسین ابن علی کی صورت جس کو کہ امت نے رسولؐ ہی کی طرح ملک اور قبیلہ سے نفرت کے ساتھ علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور جو آخری دم تک گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا عزم کئے ہوئے ہے۔"

ع۲ "حضرت کے پیش نظر ایک ایسا مقصد تھا جو بہت بلند تھا اور جس کو آپ نے وصیت نامہ کے طور پر لکھ کر اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے حوالہ کر دیا تھا۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ یہ وصیت نامہ ہے حسین فرزند علی بن ابیطالب کا اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ اُس کے بندۂ خاص اور رسول ہیں جو حق کی جانب سے حق کو لے کر آئے ہیں اور یہ کہ بہشت و دوزخ حق ہیں اور قیامت آنیوالی ہے اُس میں کوئی شک نہیں اور یہ کہ اللہ تمام مردوں کو ایک روز زندہ کرے گا اور یہ کہ میں غرور، سربلندی، جذبۂ تفوق یا فتنہ انگیزی اور ظلم کے لیے نہیں نکل رہا ہوں بلکہ صرف امت پیغمبر کی اخلاقی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نکلتا ہوں اور اپنے جد بزرگوار

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ع۲ مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری

اور اپنے باپ علی مرتضیٰ کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں جو شخص حق جان کر میری باتوں پر عمل کریگا
وہ اپنا فرض انجام دے گا اور جو میری باتوں کو مسترد کریگا تو میں صبر و تحمل سے کام لوں گا یہاں تک
کہ اللہ میرے اور دوسرے لوگوں کے درمیان حقیقی فیصلہ کرے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"
اس وصیت نامہ کا ایک ایک لفظ جناب سید الشہداء کے حقیقی زاویۂ نظر اور واقعی نصب العین کا آئینہ
ہے اور اُس کو بہ نظر اعتبار دیکھنے والے اس میں شبہ ہرگز نہیں کر سکتے کہ حضرت کے سامنے جو مہم تھی
وہ صرف یہ تھی کہ اسلامی دنیا کو سیرت نبویہ و علویہ یعنی صحیح انسانیت اور حقیقی اسلام کی طرف دعوت دیں۔
۶۰ھ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ اتوار کی رات تھی جب حسین مدینہ سے روانہ ہوئے
(ارشاد شیخ مفید ص۲۲۱) عہ "یقیناً سرزمین مدینہ کو چھوڑتے وقت جہاں وہ اپنے جدّ بزرگوار
رسول خدا کی آغوش میں کھیل چکے تھے جہاں اُن کے قریب ترین اور عزیز ترین افراد دفن تھے
حسین کا دل بھر آیا ہوگا۔ اس کے علاوہ آیندہ کے واقعات کی صورت اُن کی آنکھوں میں
پھر رہی ہوگی اس لیے مدینے سے رخصت ہونا یقیناً ایک نہایت دردانگیز منظر تھا" آپ کی زبان پر اُس
وقت قرآن کی یہ آیت تھی فخرج منہا خائفا یترقب قال نجّنی من القوم الظالمین اس
آیت میں موسیٰ کا ذکر ہے اُس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر
نکلے ہیں اور یہ فقرہ اُن کی زبان پر تھا۔ آپ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے حالانکہ
ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہ عام کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے
تھے۔ دیا لوگوں نے یہی مشورہ حسین کو بھی۔ مگر وہ اپنے مدینہ سے نکلنے کو "فرار" کے نام دینے
پر تیار نہیں تھے اُنھوں نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا نہیں، میں تو اسی
راستے سے جاؤں گا۔ پھر جو خدا کو منظور ہو (الاخبار الطوال ص۲۳۰)
آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا سوائے محمد بن الحنفیہ کے جو مصلحتہً
مدینہ میں چھوڑ دئے گئے اور کہا جاتا ہے کہ ایک بھائی آپ کے اور عمر بن علی تھے جو خود اپنی
خوشی سے مدینہ میں رہ گئے تھے عبداللہ بن جعفر اس کے پہلے سے مکہ جا چکے تھے اور
وہاں وہ بیمار پڑ گئے تھے، اس لیے اُنھوں نے اپنے بدلے میں اپنے دونوں بیٹیوں کو حسین

عہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

کے ساتھ کیا۔ ایک روایت کے مطابق حسین اپنی ایک بیٹی کو بھی جو کہ بیمار تھی اپنے مکان پر چھوڑ گئے تھے جن کی تیمارداری حضرت ام سلمہ زوجۂ پیغمبر سے متعلق تھی اور ام ہانی بنت ابی طالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں۔ بس ان کے علاوہ اولاد ابوطالب کے مردوں اور عورتوں میں سے کوئی بھی حسین کے ساتھ سے جدا نہیں رہا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسین کے ساتھ بنی ہاشم میں سوائے اولاد ابوطالب کے کسی اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ سعادت قدرت نے ابوطالب ہی کے خاندان کے لیے مخصوص کی تھی کہ اسلام کی اس عظیم قربانی میں انہی کے مرد، عورتیں اور بچے حصہ لیں اور بس۔ حسین کے طرز عمل سے آئینہ کی طرح صاف روشن تھا کہ وہ کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں اور اس لیے صرف اپنے گھر والوں کو جن کے وہ کفیل اور سرپرست ہیں اپنے ساتھ لیا ہے اور مدینہ میں کسی شخص کو یہاں تک کہ بنی ہاشم میں سے تمام عزیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی ہے۔ اس سے ہر شخص حسین کے مقصد کو سمجھ سکتا ہے۔

ع۵ " یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ مدینہ سے کس طرف ہجرت کرنا مناسب اور مفاد دینی کے لیے مفید تھا۔ آپ کی پیش بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ بنی امیہ کو نہ حلال و حرام کی پروا ہے نہ ان کے دلوں میں شعائر اللہ کی عظمت باقی ہے۔ وہ یقیناً خانہ کعبہ پر بھی حملہ آور ہونگے چنانچہ آپ اپنے لیے حرم کعبہ ہی نہیں بلکہ "حجر ہامہ"[۵] کو بھی مامن نہیں سمجھتے تھے ہاں اتنا ضروری ہے کہ جب کوئی حکومت بڑا اقدام کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ بالخصوص خانہ کعبہ پر حملہ کرنا جو تمام عربی ذہنیت سے مستقل جنگ تھی۔ اس کا جلد وقوع پذیر ہونا آسان نہ تھا۔ بالخصوص ایام حج میں، کیونکہ تمام اطراف و جوانب سے لوگوں کا گروہ کا گروہ آتا ہے۔ ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنا سخت بلوہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ بڑے سے بڑا جرم انسان کر سکتا ہے اور دوسرے بھی دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اگر مذہبی رنگ میں رنگ دیا جائے

ع۵ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی

تو وہ دوسرے بھی اس جرم کی طرف سبقت کرتے ہیں لیکن یکایک کوئی سخت جرم اس قسم کا کرنا سخت ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کچھ دنوں کے لیے مامن ہو سکتا تھا تو فقط حرم کعبہ چنانچہ حضرت نے مکہ میں ورود فرمایا اور حرم میں پناہ لی حضرت کا مکہ میں ورود تمام عالم اسلامی کو ایک خاموش پیغام تھا جس نے نہ سننے والوں کو اتنا سنا دیا کہ حسین یزید کی خلافت سے جس کی بنیاد اثم و عدوان پر ہی سخت بیزار ہیں اور اس کی بیعت سے دستکش ہیں:۔

سکوت ماست تمنا بیان ہر غم دل — ہزار گفتن ما ہست در نگفتن خویش

مکہ میں عرب کے قدیم روایات اور اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل جائز نہیں۔ امام نے یہاں پہونچ کر اپنے تئیں ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمات مملکت سے کوئی تعلق۔ آپ نے مکہ پہونچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف و جوانب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی دعوت دی یہ بھی آپ کے مقصد کے تعین کے لیے آپ کے کردار کا ایک اہم جزو ہی۔ آپ کا مکہ میں ورود بروز جمعہ ۳ شعبان ۶۰ھ کو ہوا۔ (ارشاد شیخ مفید ص۲۲۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ دن میں آپ مدینہ سے مکہ پہونچ سکے۔ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ مدت بتلاتی ہی کہ رستا بہت تیزی سے قطع کیا گیا اور یہ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے ضروری بھی تھا۔

آپ نے مکہ میں پہونچ کر "شعب علی" میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہونچ چکے تھے۔ ان کے مکہ میں اچانک پہونچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد حلقہ آور ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل تھی۔ لیکن حضرت امام حسین کے مکہ میں پہونچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسین کے گرد و پیش رہنے لگے۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو گونہ ناگواری پیدا ہوی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حضرت حسین کی موجودگی میں کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحت وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسین کے پاس آنے جانے لگے۔ (الاخبار الطوال ص۲۳)

جب امیر معاویہ کی وفات ہوی ہی تو مدینہ میں ولید بن عقبہ بن ابی سفیان کی

حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبید اللہ بن زیاد گورنر تھا (الاخبار الطوال ص۲۳۹)

حکومت دمشق کو معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ بن حکیم پر اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسین کے مکہ میں پہونچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ پھر جب ولید کے طرزِ عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہونچی تو ولید کے بجائے اس عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں آپ کو معلوم ہوگا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسین کے معاملہ میں یزید کا طرزِ عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے اور خود اس کے گورنر اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورتِ حال سے ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت میں سے جو بھی حسین کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہلبیت کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں۔ اس کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسین کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا۔ اس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمالِ حکومت پر تھی؟!

اس وقت امام حسین کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد بن الحنفیہ نے دیا تھا جب آپ نے پسند کیا۔ مکہ میں حالات کے ناساز گار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جایئے گا ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیئے گا یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجئے (طبری ج ۶ ص۱۹۱ وارشاد ص۲۲۱)

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا سوائے ایک پُر امن زندگی کے جسے "جیو اور جینے دو" ہی کی لفظوں سے

ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنے ساتھ کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر اور تحریر کسی صورت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی پھر بھی حالات کا تقاضا یکساں نہیں رہتا۔

کوفہ [1] "فرات کے مغربی کنارے پر یعنی مقام حیرہ سے تین میل کے فاصلہ پر ۱۷ھ مطابق ۶۳۸ء میں بسایا گیا تھا اس میں یمنی عرب آباد تھے اور یہ مدائن کا قائم مقام ہو گیا جو کہ اپنی خرابی آب و ہوا کی وجہ سے ترک کر دیا گیا جب سے اس کی بنیاد رکھی گئی اسی وقت سے یہ فوجی چھاؤنی کا کام دیتا رہا ہے۔" [2] "اس کو فوجی چھاؤنی اس لیے بنایا گیا کہ سرحد ایران و حجاز و شام پر واقع تھا۔" اسی مصلحت سے حضرت علی بن ابی طالب نے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا اور جمل، صفین اور نہروان میں حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ ہو کر آپ کے مخالفوں سے جنگ کرنے والے کوفہ ہی کے لوگ تھے۔ وہ آج کل کے محاورہ کے مطابق اگرچہ شیعہ نہیں تھے مگر "شیعۂ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے کو "شیعۂ علی" کہنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ وقت وہ تھا کہ کوفہ شیعیان اہلبیت سے چھلک رہا تھا لیکن اُدھر امیر معاویہ کا ممالک اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیاد بن ابیہ کی حکومت ہوئی، اُدھر اہل کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین اُن کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محبِّ علی سمجھے جا سکتے تھے اُن کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام سناتا تھا۔ ابو الحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں اُس زمانہ کی مرقع کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دور حکومت میں سب سے زیادہ مصیبت میں اہل کوفہ تھے اس لیے کہ وہاں شیعیان علی کثیر تعداد میں موجود تھے وہاں کا حاکم زیاد بن سمیہ مقرر کیا گیا۔ اُس نے شیعوں کو پوری جستجو کے ساتھ گرفتار کیا اور جہاں پایا قتل کیا اور ہاتھ پاؤں قطع کئے اور آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں اور درختوں پر سولیاں دلوائیں اور عراق سے جلاوطن کیا، یہاں تک کہ کوئی نمایاں شخص اُن میں کا باقی نہیں رہا (نصائح کافیہ علامہ ابن عقیل حضرمی ص ۰۰)

اس صورت حال میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعۂ علی کے گروہ کے لیے کوئی نمایاں

---

[1] سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ [2] علامۂ ہندی مولانا سید احمد صاحب

حیثیت رہتی ملکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلا وطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستی اہلبیت کا نام بھی زبان پر لانا اپنے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کرتے تھے۔

یہ صورت حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس سال تک قائم رہی جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے اور بوڑھے فنا ہو گئے۔ شیعیت ایک مخصوص قلیل التعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی اور وہ جماعت کوفہ کے اتنے بڑے شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ رؤسائے عشائر اور شیوخ قبائل ذمہ دار و باعتبار اشخاص سب حکومت وقت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دارومدار ہوتا ہے وہ بلا استثنار ہر ملک میں "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رُخ پر اُڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ اُن میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی۔ اس کے نمونے حکومتوں کے تغیر و تبدل اور سلاطین کے عزل و نصب کی صورت میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی طوفان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک بیس سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر اُن کو سیلاب کی طرح کسی خاص طرف متوجہ کر سکے ۶۰ھ کے رجب کا وہ مہینہ تھا جب امیر معاویہ نے انتقال کیا اور اُن کا نامزد کردہ خلیفہ جانشین اُن کا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پُر سکون فضا میں تموج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرۃً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید والی سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اُس کے اخلاق و عادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق و عادات، اُس کی مے نوشی اور شہوت رانی، اُس کی طفلانہ جوانی اور

لہو و لعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آ گیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پونچھ گچھ میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات و عادات کا شخص ہے۔

یقیناً اس کا نتیجہ تھا کہ ایک عام بے چینی و اضطراب اور نفرت و بیزاری کا جذبہ سینوں میں پیدا ہو گیا اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اُٹھا کر ملت اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دے

اس کے ساتھ یہ خبریں بھی مشہور ہوئیں کہ حسین بن علی نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اسی لیے مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستان علی کی اس جماعت کو جو بیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آ چکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے گشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھٹا میں امید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خودکشی کا مرادف ہو گا۔

یہ سوچ کر سلیمان بن صرد صحابی رسول کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ سن رسیدہ اور تجربہ کار سلیمان نے جو پیغمبر خدا کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ لڑائیوں میں شریک رہ چکے تھے مجمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسین نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اور وہ مکہ معظمہ چلے گئے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے اور اُن کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہوں کہ اُن کی نصرت و مدد میں اور اُن کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہوگی تو بسم اللہ اُن کو خط لکھیے اور اگر سستی و کم ہمتی کا اندیشہ ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب دے کر اُس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔"

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کے فرض کو ادا کرتے ہوئے گرجتے برستے

الفاظ سے وقتی جوش کو برانگیختہ اور الفاظ کی طاقت سے رگوں میں خون دوڑا کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ خود مجمع سے اُس کے موجودہ جوش و ولولہ کی آخری تھاہ اور موقع اقدام پر اُس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُن کو موقع کی نزاکت اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ کرا دینا بھی مقصود ہے مگر یہ امر فطری ہے، کہ جذبات کے طوفانی ہونے کے موقع پر انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں غلطی کر جاتا ہے مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اُٹھے، نہیں نہیں، ہم یقیناً اُن کے دشمنوں سے جنگ کرینگے اور اپنے تئیں حضرت کے قدموں پر نثار کر دینگے۔

یہ جمعیت کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالیشان قصر کے وسیع صحن میں مجتمع نہوئی تھی بلکہ وہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آجتک عربستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صرد کے گھر میں مجتمع ہوگئی تھی۔

مذکورۂ بالا سوال و جواب اور اُس کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جوہر نظر آرہا ہے اور وہ بولنے والوں کے باطنی ضمائر کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن وہ آنے والے ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔

سلیمان بن صرد کی صحبت تمام ہو چکی تھی۔ خط امام حسینؑ کے نام بدیں عنوان لکھا گیا:۔

"یہ خط ہے حضرت حسین بن علیؑ کی طرف سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مومنین و مسلمین اہل کوفہ میں سے" اس کے بعد معاویہ کے انتقال اور یزید کی ولیعہدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے لہٰذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یکدل ہو سکیں اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہے مگر ہم اُس کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے، نہ عیدگاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائے گی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اُس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کر دینگے والسلام"

اس خط کو عبداللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے پہلا خط ہے جو امام کو مکہ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔ جمعیت منتشر ہوئی اور اب ہر ایک نے اپنے حلقۂ اثر میں اس تحریک کو پھیلانا شروع کیا اور دو ہی دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہو گئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ سب خطوط قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کیے گئے۔ اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی خلافت کے باعث عام طور پر پیدا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا، ان حضرات کی مذکورہ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ نہ رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسین کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس خیال سے کہ یزید ایسے شرابخوار و فاسق سے وہ یقیناً بہتر ہیں، اس تجویز کے گرمجوشی سے موید نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر ان افراد کو جو حقیقۃً اس تجویز کے محرک تھے یہ یقین پیدا ہو گیا کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فریب نظر تھا، عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں ویسی ہی تھی جیسے آندھی کے رخ پر اڑتے ہوئے پرند، اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط میں "شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی کرے" کے الفاظ بیم و رجا کا اظہار کر رہے تھے یا اب آخری خط میں پرزور الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ "تشریف لائیے جلد اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہذا جلدی کیجیے جلدی والسلام"۔ اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ذریعہ روانہ کیا گیا۔

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رخ کا آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنھیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی مصلحت وقت یہ سمجھی کہ اسی آواز میں آواز ملا دیں چنانچہ ان اجتماعی کارروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جا سکتا ہے، ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"کھیتیاں لہلہا رہی ہیں اور میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور تالاب لبریز ہیں۔ پس

جب آپ چاہیں تشریف لائیں ایک ایسے لشکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام"

اس پر سات آدمیوں کے دستخط ہیں شبث بن ربعی۔ حجار بن ابجر۔ یزید بن حارث یزید بن رویم۔ عزرہ بن قیس۔ عمرو بن الحجاج زبیدی۔ محمد بن عمیر تمیمی۔

یہ خط لب و لہجہ کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف ہے۔ اُن میں اپنی دوستی و اخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی۔ یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادی ذہنیت کی ترجمان اور دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاق طبیعت سے اجنبی اور ناشناس ہونے کی دلیل ہے۔

آپ کو بعد میں معلوم ہوگا کہ اس خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقعہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اُس موقع کی رائے عامہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہو کر آئندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنا دیں۔

گزشتہ تقریر سلیمان بن صرد کی اور اس کے بعد کے واقعات، ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور سے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) امام حسینؑ کا بیعت یزید سے کنارہ کشی کرنا اور مدینہ سے روانہ ہونا کسی خارجی تحریک اور اہل کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھا۔

(۲) حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

(۳) آپ نے مکہ پہونچنے کے بعد بھی خود کسی قسم کی تحریک اہل کوفہ سے نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔

مگر اب جس وقت کہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آئیے ہم آپ کی نصرت و امداد کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ کی ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو ایک آوازیں نہیں ہیں بلکہ آپ دیکھ چکے کہ کوفہ بھر یہی چلا رہا ہے چاہے وہ دوست ہو یا دشمن

چنانچہ اُن چوّن ہزار خطوں کے بعد بھی جو صرف دو دن کے عرصہ میں گئے تھے برابر خطوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ دو خرجیاں خطوں سے بھر گئیں (الاخبار الطوال ص ۲۳۲)

اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسین کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

صورت حال آپکے پیش نظر ہے یعنی یہ کہ حضرت امام حسین یزید سے بیعت جیسا کہ ابتک نہیں کی، آیندہ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر کہ یا بیعت کی جائے آپ یا قتل ہوں، ناممکن ہو چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تابکے؟ ع ۵ "اوّل تو یزید کے لیے کوئی چیز متبرک تھی ہی نہیں اور اُس کے شریر اور لامذہب مشیران کار شیطانی سازشوں کے پورا کرنے میں مطلق العنان تھے۔ ایک نے اُن میں سے صاف طور پر کہدیا تھا کہ اگر اُن کے مقاصد کی مہم کے لیے ضروری ہو تو وہ مکہ کی دیواروں کو ڈھادینگے اس کے علاوہ مکہ حسین کے لیے کوئی بہت سازگار مقام نہ تھا اس لیے کہ اگرچہ بہت سے اُس کے باشندے بہت جوش کے ساتھ آپ کے پیچھے پیچھے رہتے تھے مگر آپکے ایک مدمقابل وہاں موجود تھے ابن زبیر جنھوں نے اپنے کو آپ سے پہلے اُس مقدس شہر میں پہونچا دیا تھا۔ ابن زبیر نمائشی ہمدرد تھے لیکن وہ حسین کے طولانی قیام کے خیال کو اُس شہر میں جہاں وہ لیڈر بننا چاہتے تھے پسند نہیں کرتے تھے"

پھر جبکہ یہ خطرہ موجود ہے کہ مکّہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ پر فوج کشی ہو اور مکّہ کے اندر کوئی ایسی جماعت نہیں جو آپ کی حمایت پر یکدل سے متفق ہو تو اس صورت میں آپ مکّہ میں قیام کرکے مکّہ کے اندر خونریزی کے باعث خود ہوں کس لیے؟

رسول کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طائف ہو یا یمن۔ بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔

اس موقع پر عرب کے آباد ترین خطۂ ملک (عراق) اور اُس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ ہمارے یہاں آئیے اور ہم آپ کی حفاظت وحمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں

ع ۵ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ ایک دو اور دس بیس سے گزر کر پچپن عرضداشتیں بلکہ دو خورجین بھرکے خطوط اور پانچ قاصد یکے بعد دیگرے روانہ ہوتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص ہیں جن کی محبت پر آپ کو پورا بھروسا ہے جیسے حبیب بن مظاہر، سلیمان بن صرد رفاعہ بن شداد وغیرہ۔ اس صورت میں یہ نہ دیکھو کہ بعد میں ہوا کیا کیونکہ وہ تو بعد کے وقتی اسباب کا نتیجہ ہے تم اس امر سے بالکل خالی الذہن ہو کر، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ بعد والے واقعات ابھی نہیں ہوئے ہیں، یہ غور کرو کہ موجودہ حالات میں امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے؟

یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ عــه "جہاں کوفیوں کے بیسیوں معائب ہیں وہاں کچھ محاسن بھی ہیں جن کو نظر انداز کر دینا انصاف کے خلاف ہے ۔ عیب من جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔

کوفہ کا مردم خیز خطہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں فتح ہوا اور بہت جلد اسلامی رنگ میں رنگ گیا۔ نقد و تحقیق مسائل اس کے ضمیر میں داخل تھا چنانچہ سب سے پہلے اس کی طرف سے جو شکایت دربار فاروقی میں پیش ہوئی وہ یہ تھی کہ سعد بن ابی وقاص کو نماز پڑھانا نہیں آتی ہے۔ اس کے علاوہ جو گورنر جاتا تھا اُس کے افعال و اعمال پر ان کی برابر انتقادی نگاہ رہتی تھی۔ کسی حال میں یہ چیز نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ کیا وجہ تھی کہ اہل کوفہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ امام کو دعوت دی جائے اور آپ سے بیعت کی جائے یہی خیال اہل مکہ یا اہل مدینہ کو کیوں پیدا نہیں ہوا۔ امام کے پاس کوفیوں کے سیکڑوں خط آئے۔ کوفیوں نے اٹھارہ ہزار کی تعداد میں بیعت کی۔ یہ تمام چیزیں مکہ ہو کر پہنچتی رہیں۔ بایں ہمہ کسی مکی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ حضرت سے بیعت کرے۔ ہاں مشورہ دینے کے لیے پوری دنیا تھی۔

یہ تو کہا جا ہی نہیں سکتا کہ کوفیوں نے کسی سازش کے ماتحت یا قصداً فریب دینے کے لیے دعوت دی تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ اُنھوں نے دعوت دینے سے پیشتر اپنی قوت و ثبات قدم کا اندازہ نہیں کر لیا۔ نہ غور کیا کہ ہم کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں جان کا ہدیہ پیش کرنے کی ہم میں ہمت ہے یا نہیں۔ چونکہ اُن کی عقل غبار عناد سے پاک تھی اور وہ سمجھے ہوئے تھے کہ اسلام کی مرکزیت کس سے وابستہ ہو سکتی ہے، اس بنا پر اُنھوں نے

عــه مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی

دعوت نامے بھیجنا شروع کر دیے۔ اگرچہ اُن میں خاص خاص افراد کے سوا عام افراد میں ہمت و شجاعت نہ تھی اور وہ قول پر جان دینا نہیں جانتے تھے مگر دنیا میں ایسے جان دینے والے کتنے ہوتے ہیں؟!

بہرحال سوال یہ ہے کہ کیا امام حسین کے لیے جائز تھا کہ اُن کی دعوت مسترد کر دیتے اور محض سابق تجربات کی بنا پر غدار و کذاب سمجھ کر کسی دوسری طرف کا قصد کرتے؟ کسی کے ضمیر پر حملہ کرنا ہرگز کسی مذہب میں جائز نہیں اور قرآن کا سورۂ عبس گواہ ہے کہ طالب کو ٹھکرا دینا روا نہیں ہے۔ صحاح میں ہے کہ ایک بزرگوار صف جنگ میں مسلسل قتل کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جب ایک کافر کے سر پر پہونچ گئے جس کا اس وقت کوئی مددگار نہ تھا۔ غریب فوراً کلمہ پڑھنے لگا مگر بزرگ موصوف نے اس کا کام تمام ہی کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے سخت باز پرس کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اُس کا دل چیر کر کے دیکھا تھا؟! اُس کے بعد فرمایا "اے پروردگار میں اس شخص کے فعل سے بری ہوں"۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کوفیوں کی دعوت پر لبیک کہنا مذہبی فرض تھا۔ بلا شبہہ اُن لوگوں کے اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے جو حق کو پہچانتے ہوں۔ بخلاف اُن کے جو حق کو پہچانتے ہی نہ ہوں"۔

اگر آپ غور کیجیے تو پورا اندازہ ہو جائیگا کہ مکہ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت امام حسین کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی ضرور جیسے عبد اللہ بن زبیر پر اُسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے۔ اُسی طرح آپ پر بھی اسی مکہ میں فوج کشی ہوتی اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا لیکن کیا اس وقت جبکہ کوفہ سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جا چکی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا اور آپ اس دعوت و مطالبہ کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کرتے اور وہاں شہید کیے جاتے تو یہی لوگ جو اس وقت حضرت امام حسین پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کوفہ کیوں گئے؟ یہی یہ کہنے نہ اٹھ کھڑے ہوتے کہ کون سی عقلمندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدۂ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد کی نصرت کر چکے تھے آپ کی محبت کا دم بھرتے تھے

اور اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سیکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ کی تشریف آوری کی خواہش کر رہے تھے۔ اتنے نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ و بے اُمنگ اور جہاں کی فضا بے مہر و محبت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ قتل بھی ہوئے اور مکّہ معظمہ کی حرمت بھی برباد ہونے کے باعث ہوئے۔ کیوں! کیا یہی کہا نہ جاتا؟ بے شک یہی کہا جاتا اور یقیناً حالات کی بنا پر حق بجانب کہا جاتا اس لیے کہ موجودہ حالات میں عقل و تدبر کا اقتضار یہی ہے کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ ہوں تب بھی اُن پر اتمام حجت کی جائے۔

معلوم ہے کہ تھے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ عراق والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کئے ہوئے تھے کہ کیا مکّہ معظمہ میں آپ کا قیام قتل ہونے سے آپ کو بچا دے گا؟ بلکہ حقیقۃً اگر موازنہ کیا جائے تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکّہ میں قیام کی صورت میں قتل ہونا یقینی اور کوفہ کی طرف روانگی کی صورت میں مشکوک، اس لیے کہ اہل کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اُن کے ذاتی افتادِ طبع کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی ہے۔ اس صورت میں اگر آپ مکّہ میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے ہوئے، نوعِ انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصُول پر بحدِّ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے تئیں مکّہ سے علیحدہ کر کے مکّہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی لیے وہ لوگ جو آپ کو عراق جانے سے مانع ہوتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ، اُن کے جواب میں آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے

اور وہاں میں اگر جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کریں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ آپ نے زیادہ تر عراق کے متعلق اُن کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور سے قائم رہنے کا اظہار کیا ہے (الاخبار الطوال ص۲۴۳) اور کبھی صاف کہدیا ہے کہ میں یہاں بھی رہوں گا تو قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ مینڈھا بننا نہیں چاہتا (طبری ج ۶ ص۲۶۷ وصواعق محرقہ ص۱۱۷)

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد آپ نے اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمایئے اور باہر نہ جایئے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا "خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل ہوں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھکو وہاں سے باہر لے آئیں گے یہاں تک کہ جو چاہتے ہیں میرے ساتھ وہ سلوک کریں خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جس طرح یہود نے روز شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا (طبری ج ۶ ص۲۶۷)

ان وجوہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یقیناً آپ کے لیے کوفہ تشریف لے جانے کی ضرورت تھی اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب تھا۔ بے شک چونکہ عہ گزشتہ تلخ تجربوں کی وجہ سے کوفیوں پر اعتماد کرنا مشکل تھا اس لیے آپ نے پہلے اپنے چچا زاد بھائی مسلم کو بھیجا کہ اُن کے دل ٹٹولیں اور حقیقت حال سے اطلاع دیں۔ ان کے ساتھ آپ نے ایک تحریر بھیجی جس کا مطلب یہ تھا کہ "ہانی اور سعید تمھارے خطوط لے کر پہونچے اور یہ دونوں شخص تمھارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں آپ آیئے! شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں تمھاری جانب اپنے بھائی اور چچا

عہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

کے بیٹے اور اپنے محل اعتماد عزیز قریب کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھکو تمھارے حالات سے اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمھاری جماعت اور اہل حل و عقد اس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمھاری طرف آتا ہوں اور امام کے کوئی معنی نہیں سوائے اُس شخص کے جو کتاب الٰہی پر عامل ہو اور عدالت کا پابند اور حق کا متبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی پر وقف کئے ہوئے ہو والسلام (طبری ج ۶ ص ۱۷۹-۱۸۰)

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مسلم بن عقیل جنگ پر مامور نہ تھے اور نہ کوفہ کی تسخیر کے لیے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمایندہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ کوفہ کی رائے عام اور وہاں کے لوگوں کے حالات و خیالات کا حضرت امام حسین کے متعلق اندازہ کرکے آپ کو اس سے آگاہ کریں۔ یہی مسلم کے طرز عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ کوفہ گئے تو حاکم دارالامارہ میں موجود تھا مگر مسلم نے اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر شورش کرنا ہوتی تو پہلا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ دارالامارہ پر قبضہ کیا جائے مگر مسلم نے کیا کیا؟ صاف اس بات کا مظاہرہ کہ ہمیں تمھاری سلطنت سے مطلب نہیں، تمھاری حکومت سے کوئی غرض نہیں ہے ہمیں صرف طالبان ہدایت کی تلاش ہے اور اُن کی مذہبی و اخلاقی اصلاح مدنظر ہے۔

مسلم کے ورود کوفہ کے موقع پر طبری اور دوسری مستند تاریخوں نے جو حالات درج کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بن صرد خزاعی کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ ضرور جناب مسلم اُن ہی کے مکان پر قیام کرتے جبکہ وہ اس تحریک کے روح رواں اور قائد اعظم اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحب وجاہت اور ذی اثر تھے۔ مجبوراً آپ نے مختار بن ابی عبیدہ کے گھر میں قیام کیا۔ اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی صدی ہجری تک باقی تھے چنانچہ ابو حنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ اب یہ گھر "دار مسیب" کے نام سے مشہور ہے (الاخبار الطوال ص ۲۳۰)

کوفہ میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی اور لوگ آپ کے پاس ملاقات کے لیے آنے لگے جب کافی مجمع ہو گیا تو مسلم نے امام کا خط جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس سے حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے اور عابس بن ابی شبیب شاکری نے کھڑے

ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھ کو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہار رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم میں جس وقت بھی آپ دعوت دینگے لبیک کہتا ہوا حاضر ہوں گا اور آپ کے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کروں گا اور اُس وقت تک شمشیر زنی کروں گا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کروں اور میرا مقصد اس سے سوائے رضائے پروردگار کے کچھ نہ ہو گا۔"

یہ تقریر ختم ہونا تھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "مرحبا جزاک اللہ کتنی مختصر لفظوں میں تم نے حقیقت حال کو واضح کیا ہے۔" پھر حضرت مسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "خدا کی قسم میرا بھی ذاتی خیال وہی ہے جو عابس بن ابی شبیب نے اپنی لفظوں میں ادا کیا۔" ایسی ہی لفظوں میں سعید بن عبداللہ حنفی نے تائید کی اور مجمع متفرق ہوا۔ خط کے مضمون کی بنا پر اس کارروائی کا مقصد ظاہر ہے یعنی یہ عہد و پیمان اس غرض سے تھا کہ مسلم کوئی جارحانہ اقدام کرنا چاہتے ہیں اور اس میں یہ لوگ مسلم کی اعانت کرینگے اور نہ اس وقت یہ خیال کسی دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ چند ہی روز میں تن تنہا مسلم کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیے بلکہ یہ عہد و پیمان صرف امام حسین کی تشریف آوری کی پیش نہاد اور اُس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیات کے اندازہ کے لیے تھا۔

مسلم بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو گئی اور اُس فضا کے لحاظ سے جو اس تحریک یعنی امام حسین کو دعوت دینے کے متعلق ابتدا ہی سے کوفہ میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے اسباب وضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا بقول شخصے، خلقت بھیڑیا دھسان ہوتی ہے۔ جدھر ایک چلا اُدھر سب۔ یزید کی خلافت سے بسبب اُس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف حسین بن علی کی ہردلعزیزی نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے اُن کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور

"کل جدید لذیذ" کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت ہوتی ہے وہ چونکہ جاذب۔ ان تمام باتوں کا ماحصل کر یہ نتیجہ تھا کہ حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستانِ علی تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آلِ زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی میں مشغول رہے اور دست وپا سر و زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا کوفہ میں بیس ہزار کی تعداد میں علی کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ اور جب یہ نہیں تو کیا مذکورۂ بالا طبعی اور عارضی اسباب سے جو رائے عام ہموار ہوئی ہے اُس میں کوئی وزن یا ثبات و استقرار ہو سکتا ہے؟

بے شک جب اُس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عام کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہنے والے، پروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو مسلم بن عقیل کو جنھیں اس شہر کے حالات کا تجربہ بھی حاصل نہ تھا صورتِ حال کی تشخیص میں دھوکا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے۔ اُن کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جانبازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عام کو ہموار کر کے مسلم کی نصرت و بیعت پر آمادہ کرنے والے بے شک سب سچے خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور اُن کا کام یہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں اُن کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن آئندہ کے انقلابات کوئی دوسری صورت پیدا نہ کرا دینگے اس کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی۔ بے شک اُنھوں نے اپنے اقراروں اور عہدِ جانبازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا کے کر دکھایا جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے، اس لیے امام حسین کو خط لکھ دیا کہ کوفہ آپ کے ساتھ ہے تشریف لائیے۔ مقامی حکومت کا طرزِ عمل اُن کی نسبت روادارانہ تھا نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر کہہ دیا کہ مجھے مسلم کے آنے کا علم ہے مگر میں جب تک کوئی جنگی اقدام میرے خلاف نہ ہو اُس وقت تک کوئی جارحانہ اقدام نہیں کروں گا۔ کوفہ میں یہ خبر گرم ہے کہ اب بہت جلد ہی حسین بن علی تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی ہے اور حلقہ حلقہ جماعت جماعت لوگ بیٹھ کر اس مسئلہ پر اظہارِ خیالات کرتے ہیں

اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ ہیں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ کوفہ کے اندر ایک جماعت موجود ہے جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تلی ہوئی ہے اور وہ اموی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ ہیں جنھیں حسین بن علی کے اقتدار کے بعد اموال خلق پر بیجا تصرفات کا حق باقی نہ رہے گا ان ہی کی جانب سے خفیہ کارروائی یہ ہوئی کہ یزید سے حاکم حال کو معزول کر کے ایک مدبر اور سفاک حاکم کا مطالبہ کیا گیا۔ وہاں سرجون غلام یزید کے مشورہ سے قرعۂ فال عبید اللہ بن زیاد کے نام نکلا۔ عبید اللہ کوئی اور نہیں، زیاد کا بیٹا اور معاویہ کا ایک معنی سے بھتیجا ہے اور یہ خاندان وہ ہے جس پر حیلہ و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کی کہ اس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغہ راز میں رکھا تا کہ اس کا ورود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر راستے میں جبکہ کوفہ نزدیک رہ گیا اس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کر کے ایک سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور چہرہ پر اسی طریقہ سے جو عرب قوم کے بہادروں کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھاٹا باندھ لیا جس کی بنا پر شناخت ناممکن ہو گئی۔ ایک مرتبہ شہر کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک رئیس قوم پورے وقار و تمکنت کے ساتھ، سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و لجام، ساز و سامان سے آراستہ۔ اس حشم و خدم کو دیکھ کر ان توقعات کی بنا پر جو قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا یعنی ہر شخص یہی سمجھا کہ حضرت حسین بن علی تشریف لائے ہیں اور اس قائم شدہ اثر کی بنا پر جو لوگوں میں تھا جس جماعت کی طرف سے عبید اللہ کا گزر ہوتا تھا وہ بہ نظر تعظیم کھڑے ہو کر آمد یا سید کا نعرہ لگاتی تھی اور "خوش آمدید" کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی تھی کہ مرحبا بک یا ابن رسول اللہ قدمت خیر مقدم ابن زیاد کسی کو کچھ جواب نہ دیتا تھا بلکہ آوازوں کو سنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل و شمائل کو پہچانتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہو گیا اور لوگ اشتیاق میں گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص بخیال خود فرزند رسول کی تمنائے زیارت میں آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہونچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس وقت مسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا پکار کر کہا "رستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبید اللہ بن زیاد ہیں"

نہ معلوم ان الفاظ میں کون سا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اُٹھتے ہوئے ہاتھ اور مسرت آمیز ترانے سب موقوف ہوگئے۔ سناٹا سا چھا گیا اور مجمع تتر بتر ہوا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دارالامارہ میں پہونچا ہی تو دس آدمیوں سے زیادہ اُس کے ساتھ نہ تھے (طبری ج ۶ ص ۲۰۰-۲۰۱)

اب ذرا فطری رجحانات پر غور کرتے ہوئے اہل کوفہ کے موجودہ باطنی اضطرابات کا اندازہ کیجئے۔ ایک تو اچانک حادثہ جو غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہو وہ خود سنسنی پیدا کر دیا کرتا ہی اُس پر یہ صورت حال کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے خلاف جاسوسی کے فرض کو ادا کیا یعنی اپنے باطنی خیالات و جذبات اور حسین بن علی کے ساتھ خلوص عقیدت کو خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود پیش کر دیا۔ اور ابن زیاد نے صاف ایک ایک کے چہرہ اور آواز کو پہچان رکھا ہی اور ابن زیاد وہ ہی جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، جلاد کے ہاتھ سے سر کو قلم کرا دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزا واقارب کے لیے پیش نظر ہیں، کیا یہ وجوہ ایسے نہ تھے جن کی بنا پر دل ودماغ معطل، قوائے عمل سلب اور طاقتیں مضمحل اور ہمتیں پست ہو جائیں اور اُن پر عظیم خوف وہراس کا غلبہ ہو جاتا۔

عربستان میں اب تک یہ طریقہ موجود ہے کہ بڑے شہروں میں ہر محلہ کا ایک مختار محلہ ہوتا ہے جو اُس محلہ کی مردم شماری، وارد وصادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ و غیر شادی وغیرہ امور کے تشریحات کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہی اور اگر کوئی شخص اُس محلہ سے کسی جرم کا مرتکب ہو یا کہیں مفرور ہو تو اُس کی جوابدہی اور سراغ رسانی کی ضمانت بھی اُسی سے تعلق رکھتی ہے۔

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہدیدی تقریر کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ کہ تمام محلات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص اور جن سے عرافت یعنی مختاری محلہ کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلہ کی مردم شماری اور جو لوگ نووارد ہیں اُن کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہی، اُن کے نام اداره حکومت محلیہ میں پیش

گردیئے جائیں اور وہ کسی وجہ سے ان باتوں کے تفصیل وار لکھنے سے معذور رہوں تو ضمانت داخل کریں کہ ان کے محلہ میں کوئی متنفس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اس کے خلاف ظاہر ہوا تو اس مختار محلہ کو فوراً اس کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اس کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا (طبری ج ۶ ص ۲۰۱)

یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی مشتبہ ہو۔ کوفہ کا چپہ چپہ جواسیس و مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ اب ہر شخص خاص اپنے محلہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا بھی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرار داد طے کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہ پہلا وقت تھا کہ مسلم بن عقیل کو اپنی جان کے خطرہ کا اندازہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہوا۔ اب اُن کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ وہ حفاظت خود اختیاری کے اصول پر جہاں تک مقدور ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے انھیں مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس میں وہ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ نظر آیا اس لیے کہ اُن کا قیام وہاں مشتہر ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی وقت آئے تو وہاں اُن کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے اور پھر وہ آنے والے واقعات سے بے خبری کی حالت میں چند روز سے اپنے موضع پر گئے ہوئے تھے (طبری ج ۷ ص ۵۸)

لہٰذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ وہ غیر معلوم طریقہ پر ہانی بن عروہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ یہ قبیلۂ مراد و مذحج کے سردار تھے اور جب نکلتے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ہمراہ رکاب چلتے نظر آتے تھے۔

مسلم نے ہانی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے تئیں بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں ڈال دیا جو اُن کے حفظ جان و آبرو کی بہترین ضمانت ہو سکتی ہے۔

ہانی نے مسلم کو مخفی طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوائے مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس راز کی اطلاع نہ دی۔

دوستانِ اہلبیت کو جو اس تحریک کے بانی تھے اپنی ناکامیابی کا منظر سامنے نظر آگیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کرنے لگے۔ بے شک اب نقطۂ نظر بالکل بدل گیا تھا۔ اس کے پہلے امام کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پُر امن نمایندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسین کے لیے عہدِ وفاداری کا استوار کرنا تھا چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہی کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب خود مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلانے کی ذمہ دار ہے اُس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُس ہدایت نامہ سے آگے ہی جو مسلم کو امام حسین کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورت حال ہی جس کے لیے مسلم اور جماعت کوفہ کو بہر حال مناسب طرزِ عمل اختیار کرنا لازم ہے۔ چنانچہ مسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور ابو ثمامہ صائدی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمہ دار ہوئے۔

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے پناہ کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اُس نے مسلم کی سراغ رسانی کے لیے اپنے غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ مکر و فریب کے ساتھ مسلم کا پتہ چلائے معقل اس فکر میں مسجد جامع میں آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ مسلم بن عوسجہ جو اُس وقت اُس مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے مسلم بن عقیل کے نمایندۂ خاص ہیں اور اُن کی طرف سے حسین بن علی کی بیعت لیتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے وہ مسلم بن عوسجہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا کہ میں شام کا رہنے والا ہوں ذوالکلاع کا غلام ہوں اور خدا کے فضل سے اہلبیت رسول کا دوست ہوں مجھے معلوم ہوا کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ آج کل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسولِ خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں۔ مجھے تمنا پیدا ہوئی کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور یہ تین ہزار درہم جو میرے پاس ہیں اُنکی خدمت میں نذر کروں مگر اب تک کوئی ایسا شخص نہ ملا جو مجھے اُن کی خدمت میں پہونچائے یا اُن کا پتہ بتائے ابھی ابھی میں اس مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے کچھ مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا

کہ آپ کو اس خاندان کے لوگوں سے واقفیت حاصل ہے۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ یہ روپیہ مجھ سے لے لیجئے اور مجھے اُن بزرگ کی خدمت میں لے چلیے کہ میں اُن سے بیعت کروں اور اگر آپ چاہیں تو اُن کے پاس جانے سے پہلے یہیں مجھ سے بیعت لے لیجئے۔ یہ مکارانہ تقریر تھی جس کو صاف دل اور نیک نیت مسلم بن عوسجہ نے حقیقت پر محمول سمجھا اور جواب دیا، "مجھے تمھاری ملاقات سے بہت خوشی ہوئی اور اس بات سے اور زیادہ مسرّت حاصل ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور تمھارے ذریعہ سے اہلبیت رسول کو کچھ تقویت حاصل ہوگی۔ بے شک اس کا افسوس ہے کہ میری کارگزاریاں اس معاملہ میں نشو و نما پانے کے پہلے ہی تمھارے کانوں تک پہونچیں جس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو جائے"۔ بہر حال کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور رازداری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ نے اقرار کیا کہ میں چند روز میں تمھارے لیے مسلم بن عقیل سے اجازت حاصل کر لوں گا۔ چنانچہ معقل اس کے بعد چند روز تک برابر آتا جاتا رہا یہاں تک کہ مسلم بن عوسجہ کے ساتھ جناب مسلم کے پاس پہونچا۔ اور آخر ابن زیاد کے پاس خبر پہونچائی۔ جس کی بنا پر ابن زیاد نے ہانی بن عروہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔ ہانی کو اُن تحفظات پر جو اُنھوں نے مسلم بن عقیل کے اخفا میں کر لیے تھے پورا بھروسہ تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر اُن کے دل میں کسی طرح کا اندیشہ نہ گزرا اور نہ اُنھوں نے اس موقع پر اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی بلکہ خود تن تنہا ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ راز منکشف تھا اور واقعہ سے انکار بے سود اور اقرار کے بعد اپنے مہمان کو حوالے کر دینے سے انکار باعث اشتعال۔ آخر بوڑھے لیکن بات کے پکّے ہانی کا سر و چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہو گیا اور ابن زیاد کے حکم سے وہ قید خانہ بھیجد یئے گئے۔ بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی تھا۔ اسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذحج کے بہت سے زرہ پوش سوار لے کر دار الامارہ پر چڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے ہانی کے دل میں رہائی کے توقعات پیدا کر دیے لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمایش اور

اس کہنے سے کہ ہانی قتل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظر بند کر دیے گئے ہیں، وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے۔

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ ان کا پناہ دینے والا، وفادار اور مستقل مزاج بہادر ہانی بن عروہ ان کی وجہ سے زدوکوب کی توہین آمیز تکلیف برداشت کر کے دشمن کے قید خانہ میں ہے۔ اور مسلم کے گرد گھر میں خاندان مرادی کی عورتیں نالہ و شیون کر رہی ہیں، کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے ہوئے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں ان کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابل اعتماد شخص کے یہاں جا کر مخفی ہو جاتے؟ لاالہ اللہ! غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مسلم کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا۔ اور کوئی قرارداد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اس وقت کھڑے ہو گئے جب ان کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زدوکوب کے بعد قید کیے گئے ہیں (طبری ج ۶ ص ۲۰۸)

واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والے سب ایک دم میں مسلم کے گرد جمع ہو جاتے اور جنگ میں ان کے ساتھ شرکت کرتے اور پھر جبکہ کوفہ کے محلے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ محلہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا کافی وسعت رکھتا تھا اور اسی کے اطراف میں مسلم کے گرداگرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جو نہی یا منصور امت کا نعرہ بلند کیا گیا جو پہلے سے قرارداد کے مطابق ان کا شعار یعنی امتیازی نعرۂ جنگ تھا تو اسی وقت شرما شری وہ چار ہزار آدمی مسلم کے پاس جمع ہو گئے لیکن اس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہونگے اس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر ہے۔

ابھی مسلم قصر دارالامارہ تک پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ واپس جانا شروع ہو گئے اور پہونچتے پہونچتے صرف تین سو رہ گئے لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ

کوئی بڑی جمعیت ہے، قصر کے اندر قلعہ بند ہو گیا اور مسلم نے بنی مراد کی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آتے گئے یہاں تک کہ مسلم کے پاس کافی اجتماع ہو گیا اور ظہر سے شام تک برابر زدو خورد ہوتی رہی۔

موجودہ جمعیت کہ جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں شریک ہے مختلف قبائل کے مخلوط مجمع کا نام ہے اور قبائل کی روح شیوخ و اشراف قبائل ہیں کہ جو ہمارے سابقہ بیانات کے مطابق حکومت کے ہوا خواہ اور پابند فرمان ہیں اور ابن زیاد نے بروقت پیش بندی یہ کی ہے کہ آج صبح سے شیوخ و اشراف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا ہے کہ اُن سے حسب موقع کام نکالا جا سکے۔

اب ابن زیاد نے پہلی تدبیر تو یہ کی کہ شہر کی ناکہ بندی کرا دی یعنی چوراہوں اور عام رستوں پر پہرے بٹھلا دیے کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آ سکے اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ امر لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ نہ آتے بلکہ اکا دُکا جس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا چنانچہ عبد الاعلیٰ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لیے آ رہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محلہ بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلخب ازدی نے ہتھیار جسم پر آراستہ کر کے چاہا تھا کہ مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن اشعث نے گرفتار کر لیا یہ دونوں جانباز مسلم و ہانی کی شہادت کے بعد ابن زیاد کے حکم سے قتل کر ڈالے گئے (طبری ج ۶ ص ۲۰۶)۔

اس طرح مسلم سے مختلف اطراف و جوانب کی مدد قطع ہو گئی۔ دوسری جانب اشراف قبائل کو مجمع کے منتشر کرنے کے لیے حکم دیا عـ۵ "چنانچہ بعض لوگ قصر پر چڑھ گئے اور لوگوں کو ڈرانا شروع کیا۔ کچھ لوگ قصر کے عقبی دروازہ سے باہر نکل گئے۔ گلیوں میں جا جا کر شور و ہنگامہ برپا کر دیا۔ عورتوں کو خبر دی کہ تمام لوگ قتل کر دیے جائیں گے، ابھی شام سے فوج آنیوالی ہے۔ نادان عورتیں گھر سے باہر نکل پڑیں اور اپنے اعزا کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر لے جانے لگیں بہت سے لوگ عورتوں کو باہر دیکھ کر گھبرا گئے اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے صرف تیس ۳۰ آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جا کر نماز مغرب پڑھی

عـ۵ مولانا نعمت امام صاحب

نماز کے ختم ہونے کے بعد وہ بقیہ تیس بھی چلے گئے۔ اب حضرت مسلم تنہا بازاروں میں پھرنے لگے، ایک عورت اسید حضرمی کی منکوحہ طوعہ نامی سے پناہ مانگی۔ وہ آپ کو اپنے گھر لے گئی۔ جب ابن زیاد نے دیکھا کہ خطرہ بالکل نہ رہا تو لوگوں کو حکم دیا کہ سائبانوں میں دیکھیں، کہیں ابن عقیل کے ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ اس طور پر مزید اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشا کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر میں مسجد میں کثیر انسانوں کا ہجوم ہو گیا۔ اقامت کہی گئی اور ابن زیاد نے اپنے داہنے بائیں محافظ کھڑے کر دیے۔ اس کے بعد نماز کی امامت کی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت و دشمنی کا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے تم نے دیکھا۔ جس کے گھر ہم ابن عقیل کو پائیں گے اُس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ اور جو انھیں ہمارے پاس لائیگا اُس کو اُن کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ اس کے بعد حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے اور لوگوں کو عمرو بن حریث کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا طوعہ کا لڑکا بلال جو مسجد سے گھر آیا تو دیکھا ماں گھر کے ایک کمرے میں بار بار آتی جاتی ہے۔ اس کو شبہہ ہوا، پوچھا کہ واقعہ کیا ہے۔ ماں نے پہلے تو چھپایا لیکن جب یہ بضد ہوا تو قسمیں لینے کے بعد حقیقت ظاہر کر دی کہ ابن عقیل کو میں نے پناہ دی ہے وہ رات بھر تو خاموش رہا صبح ہوتے ہی ابن زیاد کے لڑکے عبدالرحمٰن کو خبر دی اُس نے فوراً باپ کو خبر پہونچائی۔ ابن زیاد نے محمد ابن اشعث کی سرگردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کر دی۔ تن تنہا مسلم اور اتنا انبوہ کثیر۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم اپنی خاندانی شجاعت کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد زخمی ہوئے اور ایک گڑھے میں جسے خس پوش کر دیا گیا تھا گرا کر گرفتار کر لیے گئے۔ جب مسلم گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس لائے گئے ہیں تو اس وقت جو گفتگو ہوئی ہے وہ ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ مسلم پر جو بغاوت کا الزام عائد کیا گیا اُس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔ ابن زیاد نے کہا "ابن عقیل تم یہاں آئے ہو لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور اُن میں آپس میں فساد کرانے کہ ایک

جماعت دوسری جماعت پر حملہ کرے اور خانہ جنگی ہو۔ مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک اقدام حسینی کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نہیں، میں اس لیے تو نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تیرے باپ نے ان کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے خون بہائے اور ان میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے اس لیے کہ ان کی اخلاقی اصلاح کریں اور عدالت و انصاف اور تعلیمات قرآن پر لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں"۔

واقعۃً مسلم کا کوئی طرزِ عمل ان کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ صفائی ان کے جرم بغاوت سے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کیا کام دیتا ہے۔ آخر مسلم بن عقیل عہ ۵ دوشنبہ ۹ ذی الحجہ ۶۰ھ ۱۱ دسمبر ۶۷۹ء کو قتل کر دیے گئے"۔

اب شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنا خطرناک سمجھتے تھے اور اس لیے چاروں طرف سناٹا اور ہو کا عالم تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

انتہا ہے کہ وہی ہانی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کی غلط خبر سننے پر دارالامارہ کھنچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آگیا تھا آج مشکیں کسے ہوئے بازار میں لائے جا رہے ہیں اور وہاں پکار رہے ہیں کہ کہاں ہیں میرے قبیلہ والے بہادر بنی مذحج ہائے افسوس آج میرے لیے مذحج نظر نہیں آتے لیکن کوئی ایک متنفس بھی ان کی طرف رخ کرتے نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ابن زیاد کا ترکی غلام اپنی تلوار سے ان کے سر و تن میں جدائی کر دیتا ہے۔

یہ سب یہاں ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع بروقت مکہ میں کیسے پہنچ سکتی تھی حضرت امام حسین کو مسلم کا خط پہنچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے۔ سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یقینی اس خط کے پہنچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کی روانگی ضروری ہو گئی تھی

عہ ۵ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری

پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود پھر بھی حج کو ترک فرما دیں اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متوقع صورت یقینی کچھ ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتاد طبیعت اور ذوق عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری موقع رکھتا تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ حج کی تمامیت کو دو ہی دن باقی اور آپ نے اس قریبی وقت میں ایک دم حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ معظمہ سے روانگی اختیار فرمالی۔

اس کے اسباب ظاہری آنکھوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرم الٰہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی اور انہیں یہ ہدایت کہ حسین جس حال میں ہوں ان کو گرفتار کر لو۔ یہ راز اس وقت کھلا جب آپ مکہ سے باہر آ چکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور کہا فرزند رسول! اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟ امام نے فرمایا "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا" بس یہ تھا کہ جس نے حسین کو عراق کی طرف روانگی پر مجبور کیا۔

ع۱ "امام نے سفر کے لیے قدم کیا اٹھایا، ہر گام پر تعلیمات اسلام کی اشاعت اور ہر مقام پر سنت نبویہ کا احیاء فرمایا۔ آپ نے اہل مکہ کو بتا دیا کہ حرم کی بے حرمتی ہونے والی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میری وجہ سے شعائر الٰہیہ کی عظمت کو صدمہ نہ پہونچے مجھے ایک بالشت مکہ سے دور قتل ہونا ایک بالشت قریب قتل ہونے سے زیادہ محبوب ہے ؎

لہو بیکس کا مقتل کی زمیں پر نہ دامن پر نہ ان کی آستیں پر

حضرت نے احرام حج توڑ دیا اور وہ سنت نبویہ جو صلح حدیبیہ کے موقع پر دنیا نے دیکھی تھی اُسے دوبارہ یاد دلایا جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خانۂ کعبہ کی کیا عظمت ہے اور اُس کی اباحت کا سبب بننا کس قدر گناہ ہے" ع۲ "حضرت امام حسین کو یہ ثابت کرنا تھا کہ خانۂ کعبہ مرکز روحانیت ہے نہ مرکز عسکریت۔ وہ لڑنے مرنے کی جگہ نہیں

ع۱ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی   ع۲ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

وہ مامن ہو۔ امام حسین نے چاہا کہ قرآنی ہدایات اور رسول کی تعلیم کی بناء پر اقوام عالم کی للچائی ہوئی ملک گیری کی نظروں سے حجاز کو محفوظ کر دیں اور امن کا مرکز بنا کر عالم کے فرقوں کو مطمئن کر دیں۔"

وارث کعبہ نے کعبہ کو رخصت کر دیا۔ نتیجہ آخر امام کے پیش نظر تھا یعنی موت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکہ معظمہ میں روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزند آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے اتنا ہی جتنا یعقوب کو یوسف سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درند جدا کر رہے ہیں کوئی چارہ کار نہیں اس دن سے جو خط تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسول سے ان کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔" یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے اس رات کو اپنے گردو پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی، اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ کیا ہے کسی متکلم میں دم جو اس اطمینان قلب، اس عزم، اس سچائی اور اس خلوص کی حد بتلا سکے جو اس تقریر کے الفاظ میں مضمر ہے اور جو حسین کے بلند کردار کا معرف ہے۔

پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے مکہ سے فوراً نکل جانا ان خطرات کے بعد جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے ہیں ضروری ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کہاں جائیں؟ عقلاً اسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے ہیں، ان تمام خطرات کے باوجود جو بہرحال آنکھوں کے سامنے ہیں اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو ہے ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جایا جائے۔ جہاں

جانا، ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے ہو یا ایسی جگہہ جہاں کے لوگ الحاح و زاری کے ساتھ دعوت دے رہے ہیں۔

خطرہ کے معنی کیا؟ یہی تو کہ جان جائے گی مگر جان تو جانا ناگزیر ہے پھر یہ جان ایک انسانی فرض کی ادائی کے سلسلہ میں کیوں نہ جائے جس کا نام ہے وعدہ وفائی، طالبان ہدایت کی ہدایت اور خلق خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اور اسپر کافی بحث کی جا چکی ہے۔ حضرت امام حسین نے اُن لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ نہیں کہا کہ نہیں مجھے اُن سے امید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اپنے اپنی روانگی کو اُن کی طرف ضروری بتلایا چنانچہ فرزدق بن غالب شاعر سے جب ملاقات ہوی اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل تو آپ ہی کے ساتھ ہیں مگر تلواریں اُن کی بنی امیہ کے ساتھ رہیں گی۔ حضرت نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھلاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو اُس کا شکر ہے اور اس شکر کے ادا ہونے کے لیے اُس کی مدد درکار ہے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں حائل ہو تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُس کی نیت میں سچائی اور اُس کے ضمیر میں پارسائی ہو" اس کے معنی یہ ہیں کہ مقصد نیک ہو اور نیت خیر، اس کے بعد "ہر چہ بادا باد"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسین کسی دوسرے پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوے تھے بلکہ خود اپنے ارادۂ عمل کی طاقت پر بھروسا کر کے۔

خانۂ کعبہ میں گرفتاری کے جو خطرے تھے اُن کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آ گیا اُس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے جو یحیی بن سعید افسر پولیس کی قیادت میں تھا بیرون شہر آ کر آپ سے مزاحمت کی اور کہنے لگے کہ آپ کو واپس چلنا ہوگا۔ حضرت نے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی آویزش بھی ہوی مگر امام حسین کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو روکنے پر تیار تھے اس لیے اُن لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہو گیا (طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۷)

دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس افسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیجی (الاخبار الطوال ص ۲۴۴)

جیسا کہ ارشاد شیخ مفید میں ہے یہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز وہاں کوفہ میں حضرت مسلم سے اور ابن زیاد سے جنگ چھڑی اور ۹ ذی الحجہ کو وہ شہید کیے گئے۔ اس وقت حضرت امام حسین مکہ سے نکل کر وادی غربت کی منزلوں میں راستہ طے کر رہے تھے۔

آپ کے پاس قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے اور پہنچ گئے تھے جو آپ کے ساتھ ساتھ چلے (ارشاد مطبوعہ طہران ص ۲۴۳)

مکہ سے کربلا کے سفر تک حضرت امام حسین جن منزلوں میں مقیم ہوئے اُن کے نام ترتیب کے ساتھ مختلف مورخین نے مختلف دیے ہیں۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے اُن کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے:-

(۱) صفاح اس منزل پر بقول طبری فرزدق سے ملاقات ہوئی جس کی تفصیل اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ دینوری کا بیان بھی اس کے مطابق ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۵)

(۲) ذات عرق ابن طاؤس نے فرزدق سے ملاقات اس منزل پر لکھی ہے۔ فرزدق چونکہ حج کے ارادہ سے جا رہے تھے اور حج کو صرف ایک دن باقی تھا اس لیے یقیناً یہ منزل مکہ سے بالکل نزدیک، شاید دو ہی چار گھنٹہ کی راہ پر ہو گی اور اسی لیے امام کا اس منزل پر قیام کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ راستہ چلتے کے ٹھہر کر فرزدق سے بات چیت ہوئی اور پھر آپ آگے بڑھ گئے۔

اسی منزل پر عبد اللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آکر ملاقات کی واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسین مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے ہیں اور کوفہ کا قصد فرمایا اس وقت عبد اللہ بن جعفر مدینہ ہی میں تھے ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے جانا اس خطرہ کی بنا پر تھا کہ وہاں کے حاکم کو یہ فرمان آچکا تھا کہ اگر حسین بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ سے ہے کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں

بھیجے گئے ہیں جنھیں حکم یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو حسین کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیج دیں۔ اس موقع پر عبد اللہ بن جعفر نے اپنے مقدور بھر یہ بڑی خدمت انجام دی کہ وہ حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اُس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسین کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد عون و محمد اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آ جائیے کیونکہ اُس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیت کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر آپ دنیا سے اُٹھ گئے تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبان ہدایت کے لیے نشان راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں سفر میں جلدی نہ کیجئے میں خود اس خط کے پیچھے آ رہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کی خدمت میں راستے میں جا کر ملحق ہوئے۔ عمرو بن سعید نے عبد اللہ بن جعفر کے اصرار سے امان نامہ تحریر کیا اور اُسے اپنے بھائی یحییٰ کے ساتھ عبد اللہ کے پاس بھیجا۔ عبد اللہ یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور جب امام منزل ذات عرق پر پہونچے تو عبد اللہ اور یحییٰ وہاں آ کر امام سے ملحق ہوئے اور تحریر امام کے سامنے پیش کی۔ امام خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبد اللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھ کر اُن کے سپرد کیا۔ عبد اللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ چل سکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس گئے۔

(۳) بطن الرمہ اور حاجر

"بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو خط دے کر اہل کوفہ کے نام روانہ کیا (الاخبار الطوال ص ۲۴۷)۔ اس خط کا مضمون یہ تھا "یہ خط ہے حسین بن علی کا برادران ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد الٰہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمہارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی

ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام کو پہونچائے اور تم کو اس پر بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہوگیا ہوں جب میرا خط تمھیں پہونچے تو انتظامات مکمل کرو اور تیزی سے اپنا نظام درست کرو کہ میں اس چند روز میں تمھارے یہاں پہونچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ والسلام۔

یہ خط حضرت نے قیس بن مسہر صیداوی کو جو اہل کوفہ کے فرستادہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے دیکر روانہ کیا اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جا سکتی تھی۔ ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے ہیں تو عبد اللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے انھوں نے آپ سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہل کوفہ کی دعوت کا حال سن کر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح کوفہ جانے سے اختلاف کیا اور امام نے فرمایا کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ (الاخبار الطوال ص ۲۴۵)

(۴) زرود اس منزل پر زہیر بن قین سے ملاقات ہوئی۔ یہ حج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کوفہ جا رہے تھے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اسکے پہلے ان کو خاندان رسول سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ عام طور پر اہل شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کو اُس زمانہ میں "عثمانی مسلک" کہا جاتا تھا۔ مگر حسین کی نباض فطرت فراست اُن کی باطنی استعداد سے واقف تھی۔ آپ نے اُن کے پاس پیغام کہلا بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، خاندان رسول سے جو وحشت عام طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اُس کی بنا پر انھوں نے ملنے سے انکار کیا مگر ان کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھی کہا کہ "واہ کیا غضب کی بات ہے کہ رسول خدا کا فرزند تمھارے پاس پیغام ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو" اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسین کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسین نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ یہ ہمہ تن حسین کے موافق بن گئے۔ بڑے خوش خوش منزل پر واپس آئے اور حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے اکھاڑ کر اصحاب امام کے

خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور اُس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائے۔ ساتھیوں سے کہا کہ میں نے امام حسین کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے۔ جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ قیام کرے اور جو نہ چاہے وہ یہیں سے واپس جائے چنانچہ ساتھ والے سب واپس گئے (الاخبار الطوال ص ۲۵۶)

صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو ان سے کچھ خوش آیند توقعات یا امید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اُس آخری انجام کا انکشاف تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسین کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزل عمل میں گامزن تھے۔

بے شک عوام بالکل ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ اُن کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آیند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزند رسول اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت، عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کوفہ میں اپنے شیعوں کے اصرار و طلب پر جا رہے ہیں وہاں پہنچ کر تاج و تخت، فوج و لشکر، حشم و خدم سب کچھ مہیا ہو گا۔ حضرت بادشاہ عراق ہوں گے اور امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہو گی ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب ایک مختصر لشکر بن گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ بے شک کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکز سلطنت کی طرف جا رہا ہے لیکن زرود سب سے پہلا وہ مقام ہے جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبداللہ بن سلیم اور منذر بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغت حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرود میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے۔ ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا جس نے حسینی قافلہ کو آتے دیکھ کر رستہ بدل دیا اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ امام اُس کو دیکھتے ہی ٹھہرے تھے کہ کچھ حالات کوفہ کے معلوم کریں لیکن جب اُس نے رُخ دوسری جانب کر دیا تو حضرت آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کوفہ کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری سے

اُس جانے والے تک پہونچ گئے اور صاحب سلامت کے بعد اُس کا قوم و قبیلہ دریافت کیا۔
معلوم ہوا اسدی ہے تو انھوں نے بتایا کہ ہم بھی قبیلۂ بنی اسد میں سے ہیں۔ ذرا تم سے
اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ "ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں
آیا تھا کہ مُسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کئے گئے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
کہ اُن کی لاش کے پاؤں میں رسّی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جارہا ہے"۔ بڑی وحشت ناک خبر تھی
دونوں آدمیوں نے سُن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اُس وقت اُسے دل میں رکھ لیا
یہاں تک کہ وقت اُس کے اظہار کی اجازت دے۔

(۵) زبالہ اس منزل پر پہونچ کر جب حضرت امام حسین نے قیام کیا تو دونوں اسدی
آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجالائے۔ حضرت نے جواب سلام
دیا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض
کریں اور اگر ارشاد ہو تو علٰحدہ تخلیہ میں کہیں؟ حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص
پر ڈالی اور فرمایا "ان لوگوں سے کوئی بات راز نہیں۔ اُنھوں نے کہا آپ نے اُس سوار کو دیکھا
تھا جو کل شام کے وقت آرہا تھا؟" فرمایا "ہاں اور میں نے اُس سے کچھ حالات بھی دریافت
کرنا چاہے تھے"۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے حضور کے منشا کے مطابق اُس سے حالات دریافت
کئے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھدار، سچا اور دانشمند شخص ہے۔ اُس نے
ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید
ہو گئے اور اُن کی لاشیں بازاروں میں پھرائی گئیں"۔

بے شک یہ خبر بہت اندوہناک تھی۔ ایک طرف مسلم کا صدمہ جو آپ کے چچازاد بھائی
اور وفادار ساتھی تھے۔ دوسری طرف اپنے مستقبل کے متعلق ظاہری تمام امیدوں کا
ختم ہو جانا لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت ہر موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی
ہے۔ سخت موقعوں پر تمام لوگوں کی نظر سردار پر ہوتی ہے۔ اگر کہیں اُس کو اضطراب
ہوا تو پھر تمام رفقاء و ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا لازمی
امر ہے۔ اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسین کو پہونچی۔ کیا ہوا صرف اتنا کہ حضرت نے

چند بار کہا انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہما اور بس خاموش ہو گئے،
دینوری نے کلمہ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ نحتسب انفسنا
"ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا یعنی اُسی کی راہ میں ہم ان جانوں کو نثار کرتے
ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔ (الاخبار الطوال ۲۴۶ص) اس فقرہ سے یہ پتہ چلتا تھا
کہ آپ بھی اُسی راہ پر قائم ہیں اور جان دینے پر تیار ہیں جس راستے پر مسلم کی جان گئی۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اُس سے پورا پورا
اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائیں قائم کر چکے تھے اُن
سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور ایک بے قرار جذبہ کے ساتھ جو الفاظ سے جھلک
رہا ہے کہنے لگے "خدا کا واسطہ اپنے اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے، یہیں سے
واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا
کوفہ آپ کے خلاف ہی ہوگا۔" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے
جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اُس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا وقتی
جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل بہت کم کامیاب ہوا کرتے ہیں لیکن اُن کے اس مشورہ کو
خاموشی کے ساتھ سن لینا تمام اہل قافلہ کو اُن کی اس رائے سے متاثر ہو جانے کا موقع دینا
تھا اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری
جذبہ کے احساس سے دینا چاہا اور اُس کے لیے ایک نظر اولادِ عقیل پر ڈالی اور فرمایا "تمھاری
کیا رائے ہے مسلم تو شہید ہو گئے"۔ امام کے اس سوال نے گھٹے ہوئے جذبات پر برادران
مسلم کے وہی کام کیا جو کسی مشتعل مادہ سے آگ کا چھو جانا، تمام عقیلی جوان کھڑے ہو گئے
اور کہا خدا کی قسم ہم تو واپس نہ ہوں گے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں یا وہی
موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں جو مسلم نے چکھا۔" یہ سننا تھا کہ حضرت متوجہ ہوئے
دونوں اسدیوں کی طرف، فرمایا "جب یہ لوگ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے!"
حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مسلم کی برابری نہیں۔ آپ کوفہ
میں پہنچ جائیں تو کوفہ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے" حضرت نے اس

خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی۔

ابو حنیفہ دینوری کا بیان ہے کہ اس منزل پر محمد بن اشعث اور عمر بن سعد کا قاصد بھی امام کے پاس پہونچا۔ واقعہ یہ تھا کہ جناب مسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین حاصل ہونے کے بعد ان دونوں آدمیوں سے یہ وصیت کی تھی کہ تم ایک خط حضرت امام حسین کے پاس بھیجدینا کہ کوفہ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوفہ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں تشریف لانے کا ارادہ نہ کیجئے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور وہ منزل زبالہ پر امام کے پاس پہونچا۔ اس خط سے قتل مسلم کی خبر کا پورا یقین ہو گیا۔ اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسہر قتل کیے گئے (الاخبار الطوال، ص ۲۴۷)

قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی موجودگی میں حضرت مسلم کی خبر شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص اور رازدار لوگ تھے اسی لیے اتنے مجمع میں حضرت مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونیکے بعد پھر بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی یہانتک کہ آپ کو اپنے دودھ شریک بھائی عبد اللہ بن یقطر کی خبر شہادت پہونچی جنھیں آپ نے خط دیکر قیس بن مسہر کے بعد روانہ کیا تھا اور وہ بھی کوفہ پہونچنے سے قبل ہی گرفتار کر کے شہید کئے گئے حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا آپ جانتے تھے کہ راستے کے بہت سے عرب آپکے ساتھ اس خیال سے ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں۔ جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے ہیں آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورت حال کا اظہار کر دینگے تو بس وہی لوگ آپکے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقۃً آپ کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کے ساتھ مرنا پسند کرتے ہیں (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

چنانچہ آپنے ایک عام اعلان کی صورت میں حسب ذیل سرکاری بیان تمام اہل قافلہ کی اطلاع کے لیے شائع کیا۔ "ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہمارے ماننے والوں نے ہماری مدد سے ہاتھ اٹھا لیا اس لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر

کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام!

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور داہنے بائیں روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ بس وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔

(۶) **بطن عقیق** اس منزل پر قبیلہ عکرمہ کا ایک شخص ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی جانب سے قادسیہ اور عذیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اُس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سوائے تلواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسا نہ کیجئے۔ وہی لوگ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسین نے اُس کی خیر خواہی پر اُسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۷)

حقیقت حال یہ تھی کہ مسلم کو شہید کرنے کے بعد ایک تو خود عبیداللہ ابن زیاد کو خیال تھا کہ عنقریب حسین بن علی تشریف لانے والے ہیں اور اُس کو اندیشہ تھا کہ اگرچہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں لیکن اُن کے آنے سے کہیں پھر انقلاب پیدا نہ ہو جائے۔ دوسری طرف مکہ سے یزید کے جاسوسوں نے یزید کو اطلاع دی کہ امام حسین یہاں سے روانہ ہو گئے اس لیے اُس نے مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر معلوم ہونے کے بعد ابن زیاد کو لکھا کہ مجھکو خبر معلوم ہوئی ہے کہ حسین بن علی عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ اب تم ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو اور سنگر بناؤ اور وہم و گمان بھی خطرہ کا ہو تو اُس سے تحفظ کرو اور بدگمانی جس پر ہو اُسے فوراً گرفتار کر لو (طبری ج ۶ ص ۲۱۵)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اشخاص گرفتار کر لیے گئے جن سے اہلبیت رسول کی حمایت کا اندیشہ تھا اور اس طرح شہر کے داخلی حالات کے متعلق اطمینان حاصل کیا گیا اور دوسری طرف کوفہ کے باہر جتنے راستے مختلف سمت کے تھے اُن سب کی ناکہ بندی ہوئی تاکہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ جہاں دوستان علی کافی تعداد میں بسے ہوئے ہیں کوئی مداخلت نہ کریں، نیز امام حسین جن کا آنا قریبی زمانہ میں یقینی تھا انکے

ساتھ دینے کے لیے کوئی جماعت باہر نہ جانے پائے۔ اس کے لیے قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا کئی ہزار سواروں کے ساتھ حصین بن تمیم کو مقرر کیا گیا جو اب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ اقصہ سے لے کر قطقطانہ لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام اور بصرہ کے راستے تھے ان سب میں لشکر پھیلا دیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آ سکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی اور عبد اللہ بن یقطر جو امام حسین کے فرستادہ اہل کوفہ کے نام خط لے جا رہے تھے وہ اسی قادسیہ میں پہونچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور حضرت امام حسین جب ان حدود میں پہونچے اور صحرائی عربوں سے حالات کو دریافت کیا تو انھوں نے کہا بخدا ہمیں کچھ نہیں معلوم سوائے اس کے کہ نہ ہم اندر جا سکتے ہیں اور نہ باہر نکل سکتے ہیں۔ جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے بطن عقیق تک امام حسین بالکل اُس راستے پر جا رہے تھے جو سیدھا کوفہ تک پہونچتا ہے لیکن یہ سُنکر کہ قادسیہ کے ناکہ پر فوجوں کا پہرا ہے اور وہاں پہونچنا اپنے کو یقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کرا دینا ہے آپ اس شاہراہ عام سے ذرا ہٹ کر روانہ ہوئے اور اسی لیے قادسیہ کہ جو ہر کوفہ جانے والے کے محل گزر میں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر اور عبد اللہ بن یقطر گرفتار ہوئے تھے آپ کے منازل سفر میں واقع نہیں ہوا اور آپ کا اُس فوج سے تصادم نہیں ہوا جو حصین بن تمیم کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

(۷) **سراة** بطن عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی (الاخبار الطوال ص ۲۴۲) صبح ہوئی تو امام نے حکم دیا کہ پانی کثرت سے بھر لو اور مشکیں، چھاگلیں پانی سے پُر کر لو۔ حکم ہوا اور جاں نثار رفقا نے اطاعت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام چشمہ کے کنارے یا اُس کے نزدیک تھا اور شاید اُس مقام پر پانی کا کثرت کے ساتھ لے لینا اسی لیے ہو کہ اب یہ راستہ جو اختیار کیا گیا تھا شاہراہ عام سے الگ تھا اور عام شاہراہوں پر تو عموماً تھوڑی تھوڑی، دُور پر چشمے یا کنویں وغیرہ موجود ہوتے ہیں

لیکن بے راہ راستے میں عرب کے ریگستان اور بیابان ہوتے ہیں جہاں پانی کا ملنا بڑی بڑی دور تک غیر ممکن ہوتا ہے اس لیے پانی کا انتظام ہو جانا پہلے سے ضروری ہے

(۸) شراف

ہجرت کا سنہ ساٹھ اپنے دور کو ختم کر کے رخصت ہوا ہے اور محرم سنہ اکسٹھ ہجری کا چاند فلک پر نمودار ہوا۔ پہلی تاریخ بھی ہو گئی اور دوپہر دن کے قریب گزرا ہوگا امام حسین کا قافلہ منزل شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا کہ ایک شخص نے اصحاب میں سے کہا "اللہ اکبر" امام نے فرمایا بے شک اللہ سب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اُس نے کہا مجھے خرمے کے درخت دکھلائی دے رہے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ دونوں اسدیوں نے جن کا تذکرہ خبر شہادت مُسلم کے بیان میں ہو چکا ہے کہا کہ اس جگہ تو درخت خرما کبھی ہم نے دیکھے نہیں۔ حضرت نے فرمایا پھر تم ہی دیکھو، کیا دکھلائی دیتا ہے؟ اُنھوں نے کہا ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

(۹) ذو حسم

فوج کے آنے کا یقین کر کے امام حسین نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان نہ باقی رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذو حسم پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جیے۔ اگر ہم دشمن کے پہلے اس تک پہونچ گئے تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ حضرت نے اس رائے کو پسند فرمایا اور آپ بائیں طرف متوجہ ہوئے آنے والی سپاہ نے جو دیکھا تو اُس نے بھی اُسی طرف کا رُخ کیا۔ مگر امام وہاں پہلے پہونچ گئے۔ اصحاب کو حکم دیا کہ خیمے نصب کر دیے جائیں۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ اتنی دیر میں وہ فوج بھی قریب پہونچی اور معلوم ہوا کہ حر بن یزید ریاحی ہے ایک ہزار کی فوج کے ساتھ جو سدِّ راہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ چونکہ امام سامنے کے راستے پر نہیں گئے جو قادسیہ پہونچتا تھا اور اس لیے حصین کی فوج کے چنگل میں نہ آسکے جو قادسیہ میں پڑی ہوئی تھی مگر جاسوسوں نے حصین کو آپ کے اس طرح بچ کر آگے بڑھ جانے کی اطلاع

دے دی اس لیے حصین نے حُر کو اس ایک ہزار کی فوج کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے آگے روانہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ناکہ بندی کرنے والی فوجوں کی زد سے بہت دور نکل آئے تھے اس لیے حُر کو آپ تک پہونچنے میں بڑی غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا اس لیے یہاں پہونچتے پہونچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔

امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے۔ تلواریں حمائل کئے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال حسین ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت برداشت کے قابل نہیں تھی آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کر دو۔ حکم کی دیر تھی اطاعت امام پر کمر بستہ جوان کھڑے ہو گئے اور سب کو سیراب کیا۔ حالت یہ تھی کہ پیالے لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے، جب ہر گھوڑا تین چار یا پانچ دفعہ پی کر منھ ہٹا لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے، یہانتک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہو گئے۔ علی بن طعان محاربی حُر کا ایک ساتھی تھا، وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہونچا۔ جب امام حسین نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا، فرمایا "راویہ (یعنی شتر آبکش) کو بٹھا دو" میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے۔ اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا حضرت نے فرمایا "جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھا لو"۔ میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا اب پانی پیو، مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا تھا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہونچتا تھا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا تب حضرت خود اُٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو بھی سیراب کیا (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

اس واقعہ نے حسینی خلق و مروت کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُر کے دل پر قائم کیا

اُس کے ظاہر ہونے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ کم از کم اس وقت وہ ششدر رہ گیا تھا کہ اس احسان کے بعد اب اسی وقت اس بلند مرتبہ انسان سے کس طرح کی گفتگو کروں امام نے بھی اپنے فطری استقلال و طمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے ؟ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسین نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور اُنھوں نے اذان کہی جب نماز جماعت کی صفیں تیار ہو گئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد حُر اور اُس کی فوج کو مخاطب کر کے ارشاد کیا " اے کوفہ کے لوگو! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمھارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمھاری طرف اُس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمھارے خطوط میری طرف نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آئیے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے، شاید خدا آپکے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کر دے۔ اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آہی گیا ہوں۔ اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں " اس تقریر کے بعد بھی خاموشی چھائی رہی اور کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر حضرت نے اقامت کا حکم دیا اور اقامت ہوئی۔ اب آپ نے حُر سے فرمایا کہ چاہو تو تم اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھاؤ۔ حُر نے کہا نہیں آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپکے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دونوں طرف کے لوگوں نے امام کے پیچھے نماز ادا کی۔ ظہر کے وقت امام اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپکے اصحاب آپکے خیمہ میں جمع ہوئے۔ حُر اُس خیمہ میں جو اُس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اُس کے کچھ ساتھی اُس کے پاس آکر بیٹھے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اُسی میدان میں بیٹھ گئے، اس طرح کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں اور اُن ہی کے سایہ میں دوپہر کا وقت گزرنے تک بیٹھے رہے۔ عصر کا وقت ہوا تو امام حسین نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آکر عصر کی نماز کا اعلان کیا۔ نماز کے بعد آپ نے رُخ کیا تمام مجمع کی طرف اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا:۔ تم لوگ اگر تقویٰ اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل ہوگی حقیقۃً ہم اہلبیت امت اسلامیہ

کی فرمانروائی کے اُن لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اُس رائے کے خلاف ہو جو تمھارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" اب حُر کی مہر خاموشی ٹوٹی اور اُس نے کہا ہمیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں جن کا آپ حوالہ دے رہے ہیں۔

امام نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لاکر سامنے رکھدیے اور نکال کر پھیلا دیے۔ حُر نے کہا ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور ہیں اس بات پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر آپ کو چھوڑیں نہیں، جب تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس نہ پہونچا دیں۔ امام نے زور سے کہا "موت تمھیں اس سے زیادہ نزدیک معلوم ہوگی" یعنی میں تمھارے ہاتھوں میں گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس تو نہیں جاؤں گا۔ بس اب کوفہ جانے کا ارادہ بالکل بدل گیا ہے یعنی پہلے تو راستہ بدلنے کے ساتھ سہی مگر رُخ کوفہ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اس کے بعد اب کوفہ جانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ امام نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:۔ "صورت حال جو پیش آئی ہے وہ تم لوگ دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اُس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اُس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے سوائے تھوڑے حصہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھانس کے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علٰحدگی نہیں اختیار کی جاتی اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبال جان ہے۔" اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام سے مطلع کرنا اور اُن کے عزائم میں پختگی پیدا کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سُنکر اصحاب

کی جانب سے بھی اپنے اخلاص نیت اور پختگی عزائم کا کوئی اظہار ہو۔ زہیر بن قین کا ذکر اس کے پہلے ہو چکا ہے کہ وہ پہلے عثمانی جماعت میں سے تھے اور اب راستے سے امام کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ انھیں اس وقت اس کا احساس تھا کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا پورا حق حاصل نہیں ہے مگر اُن کا قلبی جوش و ولولہ اُن کو سکوت کی اجازت بھی نہ دیتا تھا آخر امام کی تقریر ختم ہوتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور اصحاب امام سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت مانگی کہ آپ لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں یا میں کہوں؟ یہ اخلاق و مروت سے بالکل بعید تھا کہ انھیں روکا جاتا سب نے کہا نہیں تم تقریر کرو۔ زہیر نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا:۔

"خدا آپ کو مقصد تک پہونچائے اے فرزند رسول! ہم نے آپ کے ارشاد کو سنا بخدا دنیا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اُس سے آپ کی نصرت اور ہمدردی میں ہوتا تو ہم آپ کے ساتھ چلنے کو دنیا کے ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے"

امام نے دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی۔ اس کے بعد نافع بن ہلال جملی کھڑے ہوئے اور حسب ذیل پُرزور تقریر کی:۔

"فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جد بزرگوار سے یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر پلا دیں اور لوگ اُن کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جس طرح کہ وہ چاہتے تھے اور اُن کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو اُن سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے اور دماغ میں غداری کا خیال مضمر رکھتے تھے وہ باتیں ایسی کرتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہیں اور کردار میں مخالفت کرتے تھے ایسی جو انتہائی تلخ تھی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ کا انتقال ہو گیا آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ اُن کی نصرت پر متفق ہوئے اور اُن کے ساتھ مل کر ناکثین و قاسطین و مارقین (جمل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی یہاں تک

کہ اُن کی وفات ہوئی اور آج ہمارے نزدیک آپ کو وہی صورت درپیش ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیت خراب کرے گا وہ خود اپنا بُرا کرے گا۔ اور خدا آپ کو اُس سے لاپرواہ کردے گا۔ اللہم چلیے ہم کو لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب۔ ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اُس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اس کے جو آپ سے دشمنی کرے۔"

پھر بریر بن خضیر ہمدانی نے تقریر کی جو حسب ذیل ہے:۔

"خدا کی قسم اے فرزند رسول! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ ہم کو موقع دیا۔ اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت میں ہمارے اعضا قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جد بزرگوار روز قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پاسکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو برباد کیا ہو اور روائے ہو اُن کے لیے۔ یہ خدا کو کیا مُنھ دکھائیں گے اور کیا حال ہوگا اُس دن جب وہ آتش جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے۔"

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو اور سب لوگ یہاں تک کہ خواتین اپنی عماریوں میں سوار ہوئیں آپ نے حکم دیا کہ جس راستے پر آئے ہیں اُسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سد راہ ہوئی۔ امام نے فرمایا کہ تمھارا مطلب کیا ہے؟ حُر نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں۔ حضرت نے فرمایا خدا کی قسم یہ تو نہیں ہوگا حُر نے کہا پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں۔ یونہی تین مرتبہ ردو بدل ہوئی۔ آخر میں حُر نے کہا کہ میں آپ سے جنگ پر تو مامور نہیں ہوں، مجھے تو یہ حکم تھا کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کوفہ پہونچیں۔ اب جب آپ کوفہ جانے سے انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا رستہ اختیار کیجیے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو

اور نہ مدینہ کی طرف واپسی کا راستہ ہو۔ یہ میرے اور آپ کے معاملہ میں انصاف کا طریقہ ہے آپ اس راستے پر رواں ہوں یہاں تک کہ میں ابن زیاد کو لکھوں اور چاہیں تو آپ بھی یزید یا ابن زیاد کو خط لکھیں۔ بہرحال شاید خدا اس طرح کوئی ایسی صورت پیدا کردے کہ مجھے آپ سے کوئی عملی تصادم نہ کرنا پڑے"۔ حضرت کو حُر کی یہ بات اچھی معلوم ہوئی اور آپ قادسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے اور حُر حضرت کے ساتھ ساتھ۔ دینوری کا بیان ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا (الاخبار الطوال ص ۲۴۸)

راستے میں جو گفتگو ہوتی جاتی تھی، وہ بھی بڑی معنی خیز تھی۔ حُر نے کہا دیکھیے میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی پر رحم کیجیے، اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل ہوں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ حضرت نے جواب دیا "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو۔ اس کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا شعر بطور مثال پڑھا جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت میں ایک جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت سچی ہو اور وہ حق کے راستے پر جہاد کر رہا ہو"۔

حُر نے جو یہ انتہائی عزم کا اظہار سنا تو وہ حضرت سے کچھ فاصلہ پر علیحدہ ہو گیا اور دور دور مگر آپ کے ساتھ روانہ ہوا۔

(۱۰) بیضہ | اس مقام پر امام حسین نے اصحاب حُر اور اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کے تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے فرائض کو دکھلایا ہے فرماتے ہیں "ایہا الناس پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے جو ظلم و جور کرتا ہے، محرمات الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے۔ خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے اور سنت رسول کی مخالفت کرتا ہے اور بندگان خدا میں معصیت کا طرز اختیار کئے ہوئے ہے لیکن یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور

اصلاح کی کوشش نہ کرے نہ قولی اور نہ عملی تو خدا کو حق ہوگا کہ وہ اس شخص کو بھی اسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے یعنی اُس گناہ میں اسے بھی شامل قرار دے۔"
اس کے بعد موجودہ حالت پر تبصرہ فرماتے ہیں "تمھیں معلوم ہوگا کہ ان بنی امیہ نے اطاعت شیطان کو اپنا پیراستہ بنالیا اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کی ہے مسلمانوں کے اموال کو اپنا بنالیا ہے۔ اور حرام خدا کو حلال، حلال خدا کو حرام بنادیا ہے۔ اس صورت میں مجھ سے زیادہ کس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے"
ان الفاظ میں پورے طور پر حسین کے اُن تعلقات وخصوصیات کی طرف اشارہ ہے جو انھیں اسلام کے ساتھ حاصل ہیں جن کو پہلے بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ اس طرح کہ رسول کے رشتہ سے حسین اور اسلام میں وہی تعلق تھا جو ایک گود میں پرورش پانے والے دو بچوں میں ہوتا ہے تو اب اگر اسلام کے گلے پر چھری پھر رہی ہو تو حسین سے زیادہ اُس کی مدد کا فرض کس پر عائد ہوسکتا ہے

(۱۱) عذیب الہجانات اس منزل پر امام حسین اور نیز حُر کے لشکر نے ایک تیر کے فاصلہ سے الگ الگ قیام کیا (الاخبار الطوال ص ۲۴۹)

(۱۲) قصر بنی مقاتل عذیب الہجانات سے امام حسین روانہ ہوئے تو کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ پر یہاں تک کہ قصر بنی مقاتل پر پہونچے۔ یہاں پہونچکر آپ نے اور ساتھ ہی ساتھ حُر نے قیام کیا (الاخبار الطوال ص ۲۴۹)
قصر بنی مقاتل سے آگے بڑھے اور تھوڑا راستہ طے ہوا تو اس وقت امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی آنکھ کھلی تو آپ فرمارہے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین دو تین مرتبہ آپنے یہی غمگین الفاظ ارشاد فرمائے اس وقت آپکے فرزند علی اکبر گھوڑا دوڑاتے ہوئے آپ کے پاس آئے اور یہی الفاظ اپنی زبان پر جاری کرکے دریافت کیا کہ اس وقت ان کلمات کے زبان پر جاری کرنے کا کیا سبب تھا؟ فرمایا ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ تو راستہ طے کررہے ہیں اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح

ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے " شاہزادہ نے عرض کی "بابا خدا آپ کو رنج کی
صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام نے فرمایا کیوں نہیں؟ یقیناً قسم
اس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے " شاہزادہ نے کہا "جب ہم حق پر ہیں
تو پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے " امام نے فرمایا "بیٹا تمہیں خدا جزائے خیر دے۔ بہترین
جزا جو کسی بیٹے کو اس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو" یہ عزت نفس، اطمینان قلب اور
ثبات ضمیر کا عجیب مرقع تھا۔

(۱۳) نینوا قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور حر
کی طرف سے بھی اب کوئی مزاحمت نہیں کی جاتی یہاں تک کہ یہ قافلہ
"نینوا" کی زمین پر پہونچا۔ یہاں ایک سوار مسلح کوفہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا اور سب
کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہونچا تو اس نے حر اور اس کے اصحاب کو
تو سلام کیا لیکن حسین اور اصحاب حسین کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ قاصد ابن زیاد
کا تھا جو حر کے نام خط لایا تھا، اس میں لکھا تھا کہ تم کو لازم ہے جہاں پر تم کو یہ خط
پہونچے وہیں پر حسین کو آگے بڑھنے سے روک دو اور انھیں ایسی جگہ قیام کرنے پر
مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ و جائے پناہ ہو اور میں نے
اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہے اور تم سے جدا نہ ہو
جب تک میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے والسلام " معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد کو حر کے
روادارانہ برتاؤ کی امام کے ساتھ اطلاع ہو گئی۔ امام کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز
پڑھنا، اور پھر کوفہ لے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت پیدا کرنا کہ
مدینہ اور کوفہ کے علاوہ دوسرے راستے پر جائیے یہ باتیں تھیں جن سے حر کی وفاداری
ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن گئی اور اسے ضرورت ہوی کہ وہ اپنے تعمیل حکم
کے لیے حر کی نگرانی کے لیے اپنے قاصد کو ساتھ رہنے کی ہدایت کر دے۔ حر جو کچھ بھی
ہو ابھی تک دنیا کا بندہ تھا۔ اس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخواستگی
طبع کے ساتھ سہی مگر وہ امام اور آپ کے اصحاب کے سامنے آیا اور اعلان کیا کہ یہ

امیر ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جہاں یہ خط پہونچے وہیں پر آپ لوگوں کو اُترنے پر مجبور کر دوں اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو حُر نے اپنا معاملہ صفائی کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ امام نے نہ چاہا کہ اب اس کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے بس اتنا کہا کہ اچھا ہم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام "غاضریہ" ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیہ ہے (الاخبار الطوال میں سقبہ ہے) مگر حُر نے کہا مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے چٹیل میدان میں اُتاروں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرزِ عمل کی جا کر اطلاع دے۔ اس موقع پر اصحاب امام کو جوش پیدا ہو گیا اور زہیر بن قین نے کہا کہ فرزند رسول ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اُن لوگوں سے جنگ کے جو ان کے بعد آئیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی جن کے مقابلہ کی ہم کو طاقت نہ ہوگی۔ مگر امام نے فرمایا کہ نہیں میں جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا۔ زہیر نے کہا اچھا یہاں ایک قریہ ہے فرات کے کنارے اور وہ ایک محفوظ جگہ ہے اور تین طرف سے فرات اُس کو گھیرے ہوئے ہے، وہاں چلیے۔ امام نے نام پوچھا۔ اُنھوں نے کہا "عقر" اس لفظ کے معنی ہوئے بانجھ یعنی بے نتیجہ۔ امام نے فرمایا مجھے تو اس لفظ سے نفرت ہوتی ہے آخر امام حسین نے حُر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو۔ حُر خاموش ہو رہا۔

کربلا امام ذرا بائیں طرف مڑے اور تھوڑا سا چلے تھے کہ سپاہ حُر سامنے آ کر سدِ راہ ہو گئی اور کہا کہ بس یہیں اُتر پڑیے۔ فرات یہاں سے دُور نہیں ہے امام نے نام پوچھا۔ معلوم ہوا کربلا۔ فرمایا اچھا کرب و بلا کی یہی منزل ہے۔ یہ کہہ کر گھوڑے سے اُتر پڑے (الاخبار الطوال ص ۲۴۹)

اب جبکہ قلم اس منزل تک آ گیا اور امام کا سفر منزل آخر تک پہونچ گیا تو ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے جس سے آپ کو اُس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا اور یہ معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی یہ سفر امام کے مقصد کے حصُول کے لیے کتنا ضروری تھا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ امام کا مقصد یزید سے اُس طرح کی جنگ نہ تھی جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ انھیں نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا، نہ براہ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کریں اور چاہے اپنی اور تمام عزیزوں کی جان دے کر کیوں نہ ہو مسلمانوں میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزید اور اُس کے کردار کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اُن کے ظاہری دعوائے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپنے مدینہ سے روانگی اختیار کی جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اُس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کرتے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اُسے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مدنظر تھی۔ یا زہر کام کرتا اور یا تلوار مگر تلوار کیسی جس کی ذمہ داری کسی صورت سے سلطنت شام پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ملجم کا سا جس نے علیؑ کو شہید کیا تھا یا کوئی تیر آتا آدمی نہیں بلکہ جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا یہی ہوتی ہیں حکومت کی شعبدہ کاریاں جن کا نام دنیا نے "سیاست" رکھا ہے حسینؑ اس طرح کی سیاست کے گرُوں کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ اس لیے چھوڑا کہ اُن کا واقعۂ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے ——— جا کر قیام کیا، کہاں؟ مکۂ معظمہ میں جو قلب جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہر حال ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع

ہونا ضروری تھا وہ شہرِ کا نفرنسین جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھی جن کو "اسواق العرب" کہا جاتا ہے، ذیقعدہ سے لے کر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسین کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسین کو اُن کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسول کا نواسا، سلطان حجاز و عراق کا فرزند۔ ملک عرب کا سب زیادہ سخی جس کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا بنی ہاشم کا بزرگ خاندان یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ حسین نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبایل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ امام حسین کا یہاں خاموش قیام بھی تمام اطراف ملک میں آپ کے بیعت یزید سے اختلاف کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وجہ تھی جس سے آپ کی زندگی سیاست وقت کے لیے یہاں بھی ناقابل برداشت ثابت ہو سکتی تھی اور اسی لیے حکومت یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تھے کہ آپ کو گرفتار کر لیں یا قتل کریں۔

امام حسین کو یہاں قتل ہونا منظور نہ تھا۔ اول تو اُسی وجہ سے جو خود آپ نے ظاہر کی کہ آپ اپنے سبب سے حرمت خانہ کعبہ کا ضائع ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری بات جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد و پیش حج کے زمانہ میں ایک بڑا بھبھڑ ہوا کرتا ہے۔ ہر قسم کے لوگ اور ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں امام حسین کے لیے یہ بات تو بہر حال غیر ممکن تھی کہ آپ عرفات، منیٰ، مشعر، مقام ہر جگہ میں اپنے ساتھ پہرا رکھیں اور پہرا بھی اتنا مضبوط جو اُس ہنگامہ و اژدہام میں پوری نگرانی کر سکے بہت ممکن تھا کہ حجر اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے ہنگام میں، منیٰ کی قربانی کے موقع پر، مقام ابراہیم میں نماز پڑھتے کے کسی وقت اچانک آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جاتا اس طرح کہ قاتل کا پتہ نہ لگتا۔ پھر کس کے مُنھ میں دانت تھے جو یہ کہہ سکتا کہ حسین کا قاتل یزید یا اُس کا کوئی فرستادہ ہے۔

ع۵۱۔ اس طرح پر مکہ میں قتل ہو جانے سے حرمت کعبہ بھی جاتی، خون حسین بھی برباد ہوتا۔ حاجیوں کے قافلہ میں ہلچل اور اہل مکہ میں فساد عظیم برپا ہو جاتا اور رسول کے نواسہ کا خون ہدر ہو جاتا قاتلوں کا کہیں پتہ ہی نہ چلتا اور یزید پر کوئی الزام نہ آتا کوئی کہتا کہ یزید نے قتل کرایا ہے اور کوئی کہتا کہ نہیں عبد اللہ بن زبیر کے آدمیوں نے حسین کو قتل کر دیا ہے یزید اور یزیدیوں کو اپنی براءت کا موقع مل جاتا اور خون حسین کا الزام بیچارے عبد اللہ بن زبیر پر ڈال دیا جاتا اور حسین کے قصاص میں عبد اللہ بن زبیر کو پکڑ کر ایک ہی تلوار سے دونوں کی خلش مٹا دی جاتی اور یزید کا دل ٹھنڈا ہو جاتا کیونکہ تاریخیں اس کا بھی پتہ دے رہی ہیں کہ عبد اللہ بن زبیر سلطنت کے خواہاں تھے اور اسی لئے حسین کی موجودگی مکہ میں ان کو بھی سخت گراں تھی، چنانچہ عبد اللہ بن زبیر کو ناگواری امام کے قیام کی اتنی نمایاں تھی کہ جب امام نے قطعی ارادہ مکہ سے نکلنے کا کر لیا تو عبد اللہ بن عباس نے گویا مبارکباد دی عبد اللہ بن زبیر کو اور کہا کہ اب میدان خالی ہو گیا اب تم خوب کھل کھیل سکتے ہو (الاخبار الطوال ص ۲۴۳) یقیناً اس ناگواری کا علم اموی سلطنت کو بھی ہوگا اور اس لیے یہ بالکل آسان بات تھی کہ امام حسین کے قتل کی ذمہ داری عبد اللہ بن زبیر پر ڈال دی جاتی۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسین نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی مکمل نہ کیا ع۵۲ وہ چلے لیکن عامل مکہ نے انھیں روکا۔ مگر حسین کے آہنی عزم کے سامنے گورنر کو اپنی فوجیں ہٹانا پڑیں۔ یزیدی عامل کا حسین کو مکہ سے روانہ ہوتے وقت روکنا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ حسین وہاں آزاد نہیں تھے حسین کے زیر نظر دو چیزیں تھیں ایک تو اپنی اور اپنے اعزا کی جان بچانا اور دوسرے اسلام کے کسی قانون کو برباد نہ ہونے دینا اصلی نصب العین تو شاید یہی دو ہوں مگر نتیجہ کے طور پر اس سے آپ کے مقصد میں دوسری حیثیتوں سے بھی وہ جان پڑی جو بغیر اس کے غیر ممکن تھی۔ ع۵۳ "ایسی ایک خلاف توقع حسین کا حج کو ترک کرنا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑے ہونا

ع۵۱ ناموس اسلام ع۵۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ع۵۳ نہضۃ الحسین۔ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی (بغداد۔ عراق عرب)

ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا، اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک کھلبلی سی لہر دوڑا دی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی مکمل اسی وقت قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا حسین بن علی کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟! آخر تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانا کے قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

"یزید کے خوف سے"

کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟
"حسین سے بیعت کا طالب ہے"

لاحول ولاقوۃ۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسول اور یزید ایسے شرابخوار اور زناکار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی ترک کر دیا؟!

"جان کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسین کے قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے" توبہ توبہ! اس سے بڑھکر سفاکی اور ظلم کیا ہوگا۔ ارے فرزند رسول کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا گیا۔ یہ وہ تذکرے ہونگے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ جاری تھے۔ وہ زمانہ کہ جب مراسلت و مخابرت کے راستے کم تھے اور تار ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب اس سے بڑھکر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسین کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس کا مطلب اگرچہ یہ نہیں تھا کہ امام کیلئے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے کیونکہ اسکی آپ نے دعوت ہی نہیں دی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہیں پائی اور اہل شام کو اپنے دل سے اس کیلئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع نہیں ملا اس لیے حسین کی مظلومیت و حقانیت مخفی نہ ہو سکی یقیناً اگر امام کی طرف سے نشر و اشاعت کے ان طریقوں کو عمل میں لایا جاتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسین کا خون رائگاں چلا جاتا یعنی نہ آپ جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور آپ کا مقصود بھی حاصل نہ ہوتا مگر صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوئی یعنی امام شہید ہوئے اور فوراً ہی تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ناحق قتل کیے گئے شام کا حاکم اور اس کے وزرا اور ہوا خواہ کسی تہمت تراشنے کا موقع ذرا بھی نہ پا سکے یہ اسباب و علل شہادت کے نشر ہی کا نتیجہ تھا حسین نے اپنی نقل و حرکت

کہ اسپر لکو اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شایع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومیت کے سامنے دنیا کا سر خم کرا دیا۔ اسی میں آپکے مقصد کی تکمیل پوشیدہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حسین کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا وہ خود ایک خاموش مبلغ تھا۔ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے۔ ادھر امام حسین اپنے اہل و اقربا۔ انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسین کا شاندار قافلہ اور اصحاب و انصار کا مختصر لشکر۔ اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیے متوجہ ہو۔ یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور حسین کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کیے ہیں چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق سے ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوی اور عبد اللہ بن مطیع اور عمر بن عبد الرحمن مخزومی سے بھی اسی طرح جبکہ وہ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آ رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسین بن علی اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو مجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اس کے ساتھ مدینہ میں محمد بن الحنفیہ اور عبد اللہ بن جعفر کا چھوڑ دینا بھی بڑا اچھی خبر ہے۔ بہت ممکن ہے۔ جیسا بتلایا جاتا ہے یہ دونوں بزرگوار بیمار بھی ہوں مگر ہمیں یقین ہے کہ فرض کا احساس حضرت امام حسین کو ان کے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرتا تو بیماری کی صورت میں بھی نہ آپ اس میں کوتاہی کرتے اور نہ یہ افراد ہی ایسے تھے کہ امام کی آواز پر لبیک نہ کہتے لیکن ع۵ امام یہ جانتے تھے کہ مسلمان حج کے بعد مدینہ ضرور جاتے ہیں اور وہاں خانوادہ رسول کے افراد سے

ع۵ نواز حسین صاحب فاروقی بی اے

بھی شرف ملاقات حاصل کرتے ہیں۔ آپ کی مدینہ میں عدم موجودگی ہی ان لوگوں پر بڑا گہرا اثر ڈالے گی مگر یہ "منفی" Passive پروپیگنڈا ہی ہوتا۔ اس لیے پروپیگنڈا کا Active اثر ڈالنے کیلئے آپ عبداللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ کو مدینہ میں چھوڑ گئے تاکہ یہ لوگ جو اسلامی دنیا میں کافی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں آپکے مقاصد کی اشاعت کرتے رہیں اور جس اسلامی تحریک کی کامیابی کیلئے آپ قربانیاں دینے جارہے ہیں اُس کا صدر میں مورچہ مضبوط رہے۔ عبداللہ بن جعفر تاجر تھے اور اُن کے تجارتی تعلقات نہ صرف اہل مدینہ اور اہل مکہ سے تھے بلکہ باہر سے انہوں نے تجار بھی آپ کی رسم وراہ بھی مدینہ میں برابر تجارتی قافلے آیا کرتے تھے اور پھر یہ قافلہ مدینہ سے شہروں شہروں گھوم کر واپس ہوتے تھے۔ عبداللہ بن جعفر ان قافلوں کے سرکردہ افراد میں اسلامی تحریک کے اثرات کو اچھی طرح پھیلا سکتے تھے؛

اب یہ دیکھیے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد آپنے رُخ کدھر کا کیا؟ کوفہ کی طرف کا۔ اس کے اخلاقی و مذہبی پہلو بیان کیے جا چکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ اہل کوفہ کے انتہائی اصرار کو اس بنا پر مسترد کرنا کسی صورت پر جائز نہیں تھا کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں ہے جبکہ آپکے نمایندہ نے جا کر وہاں کے حالات کو بھی قول و قرار کے موافق پایا تھا لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کوفہ کی جانب روانگی کو آپکے مقصد یعنی بعد والے انقلاب میں کتنا بڑا دخل ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "کسی کے ہو رہو یا کسی کو اپنا بنا لو" حسین اپنے وطن سے بے بسی اور بیکسی کے ساتھ نکل چکے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی بھروسے کے قابل حالت نہ تھی مگر مکہ سے آپ کا نکلنا اہل کوفہ کے مہمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی عزت وحمیت کے تقاضے مہمان کے بارے میں سب کو معلوم ہیں۔ یہ بالکل صحیح کہ عین موقع پر اُن مجبوریوں سے جن کا ذکر شاید بعد کو آئیگا اہل کوفہ کثرت کے ساتھ امام حسین کی امداد کو نہیں پہونچ سکے یا نہیں پہونچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ یقینی تھا کہ بعد کو اہل کوفہ کے دل میں ایک عجیب بیقرار احساس پیدا ہوگا اس کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کے اور پرورش پا کے ایک عظیم سیلاب کی صورت میں اُمنڈیگا جو اس سلطنت کے بیڑے کو ہمیشہ کیلئے ڈبو کر چھوڑے گا۔ جس کا نتیجہ ہوگا امام کی فتح اور دشمن کی شکست دیکھیے گا کہ بعد کو ایسا ہی ہوا یا نہیں کہ ادھر امام حسین شہید ہوئے اور اُدھر اہل کوفہ کے

جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا اور یہ احساس دل کے اندر کروٹیں لینے لگا کہ ہمارا بلایا ہوا مہمان تھا جو ہمارے تغافل یا تساہل کی بدولت مار ڈالا گیا۔

امام حسین تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن یہ بات نہ ہوتی جو کوفہ کی طرف آنے میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی شہادت ممکن ہے کہ شکست ہی ہوتی لیکن اب فتح اور دائمی فتح ہو گئی یہی سبب تھی کہ آپ نے حضرت مسلم کی شہادت سننے کے بعد بھی اپنے ارادہ کو مضبوطی سے قائم رکھا اور اپنے آخری انجام کی ذمہ داری اہل کوفہ پر باقی رکھی وہ لوگ جو مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقینی نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال میں حق بجانب تھے مگر انھیں حسینی مقصد کا اندازہ نہ تھا آپ کی روانگی عراق کا ارادہ اگر حقیقتاً کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بیشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ حضرتؑ کے سامنے کوئی امیدوں کا سبز باغ نہیں تھا بلکہ وہ اُس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو حضرت مسلم کی خبر شہادت معلوم ہوئی متزلزل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگی ارادہ، وعدہ کی سچائی اور بات کی پابندی کا تقاضا یہ تھا کہ آپ انھیں دکھلا دیں کہ دیکھو ہم اپنے وعدہ پر قائم ہیں اور تمھارے بلائے ہوئے آتے ہیں اور اس وقت تک اپنے ارادہ پر قائم رہیں گے جب تک روکے نہ جائیں اور اور جب تک آگے بڑھنے میں خود اپنی طرف سے خونریزی اور امن عامہ کی بربادی کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ابھی مسلم کی شہادت کے اطلاعات ہی تو نہیں آئے ہیں عام اسباب کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ وہ بڑی خونریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہل کوفہ نے پورے طور پر داد شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سربر نہ ہوئے ہوں اور ممکن ہے اُن کے دلوں میں یہ ارمان ہوں یا بعد میں کہنے کا موقع ملے کہ اگر امام حسین آجاتے تو ہمیں تازہ قوت حاصل ہو جاتی اور حالات کا ورق بالکل پلٹ جاتا اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے ہیں بڑی کمزوری اور کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اب آپ روانہ ہوتے تو کس طرف؟ آپ نے اپنے اقدامات سے اُس وقت کی اسلامی حالت کا آنے والی

دنیا کو اندازہ کرا دیا ع۵۔ "مکہ اور مدینہ کو خیرباد کہکر انھوں نے وہاں کی حالت کو ظاہر کر دیا اور کوفیوں کے ادعائے غلط آمیز کو انھوں نے اپنے بھائی مُسلم بن عقیل کو بھیجکر بالکل نمایاں کر دیا اس وقت مکہ اور مدینہ اور کوفہ اسلامی تہذیب کے خاص مراکز تھے جہاں کہ رسول اور علی نے لوگوں کی حالت سُدھارنے کے لیے اپنی زندگیاں ختم کر دی تھیں جب ان مقامات کی یہ حالت تھی تو شام، فلسطین، بصرہ، مصر، یمن وغیرہ سے کیا امید کی جا سکتی تھی"، معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی کچھ امید ہونا چاہیئے تو کوفہ ہی سے اور کسی دوسری جگہ سے نہیں۔ آپ نے ارادہ میں تبدیلی کی بس اُس وقت جب حُر کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور اُس نے کہا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لیجائینگے۔ اب امام کا ارادہ بدل گیا، اسلیئے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت سے فوجوں کو درہم و برہم کرتے راستے کو صاف کرتے کوفہ پر حملہ آور ہوں اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ صبر خاموشی کے ساتھ جس طرح ابتک آ رہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھیں۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی کیونکہ ابتک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ حیثیت سے، اپنے ارادہ سے تھا اور اب حُر کی فوج آجانے کے بعد اس کا قصد ہے کہ آپ کو کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جائے۔ آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا ابن زیاد کی فوج کے ہاتھ میں اسیر اور ابن زیاد کا قیدی بن جانا ہے۔ کیونکہ ابھی یہ حُر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر افواج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جانا ہے جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے ع۵[2] "خود اپنے اختیار سے کوفہ کی طرف جانا یہ اور بات ہے اور ابن زیاد کا قیدی ہو کر اُس طرف جانا ایک ایسی بات تھی جو کہ حسین کا سا بلند ہمت انسان کسی طرح منظور نہ کر سکتا تھا"

اسی لیئے آپ نے حُر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے چلنے کیلئے آئے ہیں انتہائی ترش اور دلیرانہ جواب دیا کہ موت تمھیں اس سے زیادہ نزدیک نظر آئے گی۔

بیشک پہلی صورت باقی ہے کہ آپ کوفہ جائیں حملہ آور کی صورت سے اور غنیم کی فوج کو پسپا کرکے وہاں اپنا قبضہ جمائیں۔ یہ صورت بیشک پہلی صورت سے مختلف ہے، مگر ایک تو آپ کے ساتھ موجودہ فوجی طاقت ایسی نہیں ہے کہ

ع۵ سید خورشید حسن صاحب نقوی ع۵[2] ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

ایک سرکاری منظم عسکر کا مقابلہ کر سکے اور بغیر ایسی طاقت کے موجود ہوئے ایک جگہ گھیر لیے جانے کے بعد حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بہتر کے ساتھ تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا تو عین شجاعت و ہمت اور صحیح طریقہ کا ہے مگر اس قلیل تعداد کے ساتھ غنیم پر جارحانہ حملہ کرنا سوائے تہور اور ناعاقبت اندیشی کے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے یہ آپ کے اس مسلک کے خلاف ہے جو آپ نے شروع سے قائم کر رکھا ہے کہ آپ کی طرف سے بغاوت اور شورش انگیزی کی سی کوئی صورت نہ پیدا ہونے پائے۔ یہ آپ کی طرف سے ایک عملی جنگ کا اقدام تھا جس کی ذمہ داری آپ اپنے اوپر لینا پسند نہ کرتے تھے اور تشدد کا راستہ خود اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے پہلی ہی گفتگو میں جو حر کے ساتھ ہوئی ہے اس رواداری کا اظہار کر دیا تھا کہ میں بلایا ہوا آیا ہوں اگر میرا آنا منظور نہ ہو تو میں واپس جاتا ہوں یہ بات اس صورت میں ہوتی جب آپ خود کوفہ پر حملہ کر دیتے یا حر اور اس کی فوج سے جنگ شروع کر دیتے جس پر آپ کے بعض اصحاب مصر بھی تھے مگر حضرت نے یہی فرمایا کہ ہم جنگ کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے۔

یہی سبب تھا کہ فوج حر کی اس مزاحمت کے بعد آپ نے کوفہ کا خیال ترک کر دیا اور واپس جانے کا ارادہ کیا کہاں؟ مدینہ یا مکہ یا طائف و یمن وغیرہ کسی اور جانب؟ یہ معلوم نہیں۔

اور یہی جنگ سے حتی الامکان بچنے کا منشا ہی اس کا باعث تھا کہ جب کربلا کی سرزمین پر پہونچکر فوج حر نے قطعی آگے بڑھنے سے مزاحمت کی تو آپ نے وہیں پر خیمے نصب کرا دیے کیونکہ اب بغیر جنگ کیے ہوئے آگے نہ بڑھ سکتے تھے پھر آگے بڑھنے کی صورت میں اگر کوئی اہم مرکز آپ کے پیش نظر ہوتا جہاں جا کر آپ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں تو اچھا یوں بھی سہی۔ ان لوگوں سے اپنے مقصد میں سد راہ ہونے کی وجہ سے جنگ بھی کر لی جائے لیکن جب آپ کے آگے کوئی خاص مرکز نہیں ہے جس طرف جائیں اور نتیجہ میں پھر ابن زیاد کی فوج میں گھرنا ہی ہے تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہرینگے آگے بڑھیں گے ایک لاحاصل سی بات ہے۔ جنگ ہو تو پھر وہی آخری جنگ ہو جس میں بیعت اور عدم بیعت کا سوال تھا اور جو آپ نے مدافعتی صورت پر بہترین طریقہ سے انجام دی اس لیے آپ نے اپنی طرف سے اس موقع پر بھی امن پسندی اور رواداری کا ثبوت دیا کہ اچھا تم کہتے ہو تو ہم یہیں قیام کر لیں گے دیکھیں آئندہ حالات کی رفتار کیا ہوتی ہے چنانچہ آپ نے کربلا کی سرزمین پر فرات کے کنارے سے ہٹ کر خیمے نصب کر لیے

مکہ سے کوفہ تک کے منازل کی جغرافیائی صورت جو واقعات سے ظاہر ہوتی ہے حسب ذیل تھی،

جس زمین کو اب کربلا کہا جاتا ہے یہ حقیقتہً مجموعہ ہے چند زمینوں اور قریوں کا جو اُس زمانہ میں بالکل پاس پاس واقع تھے۔ اس کی مثالیں زمینداریوں اور جاگیروں اور موضعات کی حیثیت سے ہر ملک میں موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں ایسا پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعات ارض کے مستقل نام ہوتے تھے جنھیں اگر ہر ایک کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ کئی مقام ہیں اور اگر اُن کے باہمی قرب پر نظر کی جائے تو وہ سب ایک ہی ہیں اور ایک جگہ کا واقعہ دوسری طرف منسوب ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضتہ الحسین" میں لکھا ہے واقعہ کربلا کے محل وقوع میں جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں۔ کربلا، نینوا، غاضریہ، شط فرات انھیں ایک ہی جگہ کے متعدد نام نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ وہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے ایک ہی سمجھی جا سکتی تھیں اور اس لیے محلِ وقوعِ واقعہ کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا۔

"نینوا" یہ ایک قریہ تھا جسے موجودہ زمانہ کے سدۂ ہندیہ کے قریب سمجھنا چاہئے، اس کے پہلو میں "غاضریہ" تھا یہ قبیلہ بنی اسد کی ایک شاخ بنی غاضرہ کی طرف نسبت رکھتا تھا اور ان ہی کا محل سکونت تھا یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب حُسینیہ کے نام سے مشہور ہے اسی جگہ ایک قریہ شفیہ تھا اور یہیں پر ایک قطعہ زمین کربلّہ تشدید لام کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی جانب جنوب کی طرف واقع ہے اس کے مقبل "عقر بابل" کے نام کا قریہ تھا جو غاضریات کے شمال غربی میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں جن میں بہت اہم آثار قدیمہ کے انکشاف کی امید ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا۔ اور اپنے قدرتی محل وقوع یعنی ٹیلوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب "نواویس" کا مقام تھا جو اسلامی فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سب کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسین کی قبر مبارک ہے۔ حیر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور

پہلو بہ پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرق کی طرف سے جدھر، حرم حسینی کا "باب السدر" اور "منارہ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب باب زینبیہ کے حدود تک پہونچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف در قبلہ کے مقام تک آکر ختم ہوتا تھا ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو "ن" کی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا راستہ مشرقی جہت میں اُس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت عباس میں جانے کا راستہ ہے تحقیقاتی انکشاف سے اب تک یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن مکانات کے آثار میں جو قبر امام حسین کے گرد ہیں شمالی اور مغربی جانب زمین کی قدیمی بلندی کے نشان موجود ہیں اور مشرقی جانب سوائے نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے کچھ نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال و غرب کی جانب سے ہلالی شکل کے اوپر بلند تھی۔ یہی ہلالی دائرہ وہ تھا جس میں فرزند رسول کو گھیر کر شہید کیا گیا فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا ہے اُسے براہ راست کوئی تعلق اس کربلا کی زمین سے نہ تھا۔ اُس کا خط سیر حلہ، مسیب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصوں کی جانب تھا کربلا میں اور اس میں بڑا فاصلہ ہے لیکن اس نہر یا دریا کے فرات سے ایک چھوٹی شاخ مقام "رضوانیہ" کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے شمالی مشرقی جانب کے ریگستانوں اور نشیبوں سے بہتی ہوئی اُس مقام سے ہو کر گزرتی تھی جہاں حضرت عباس علمدار کی قبر ہے اور اس کے بعد موجودہ مقام ہندیہ کی طرف سے بہتی ہوئی اُس مقام کے مغربی شمالی جانب جس کا نام قریہ ذی الکفل ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر "علقمہ" کے نام سے موسوم تھی اور اُسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات کہا جاتا تھا طف کے معنی ہیں "نہر کا کنارہ"، خصوصیت سے دریائے فرات کے اُس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے ہیت تک تھا طف کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے "فرات صغیر" یعنی نہر علقمی کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا طف کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو واقعۂ طف کہا جاتا ہے اور کربلا کو شط فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

(چوتھا باب)

دوسری سے دسویں محرم تک

حسین کربلا میں ٹھہر گئے۔ حُر نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دے دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور "دستبی" کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کے فرزند عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے حکومت "رے" کا پروانہ لکھا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانیکے لیے باہر نکل بھی چکی تھی اور عمر بن سعد اس فوج کو لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا۔ اب امام حسین کی مہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو مامور کیا کہ پہلے اس مہم کو سر کر لو۔ پھر ایران کی طرف روانہ ہونا۔ عمر سعد صحابی تو نہیں مگر تابعی ضرور تھا۔ عین حضرت عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اس کی پیدائش ہوئی تھی (تقریب التہذیب حافظ ابن حجر مطبوعہ دہلی ص ۱۹۰) اس کے سن تمیز تک پہونچنے تک بہت سے صحابۂ کرام موجود تھے یقینی اُن کی زبانی اُس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبر اکرم نے حسن و حسین کے بارے میں ارشاد کیے تھے۔ نیز حسین کے ساتھ رسول کی انتہائی محبت کے واقعات بھی گوش زد ہوئے ہوں گے۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب کے زمانۂ خلافت میں جبکہ امام حسین بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کمسنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسین کے محاسن ذات اور بلند اوصاف و اخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہو گا پھر جبکہ آپ مدینہ تشریف لے گئے تو اُس وقت سے اب تک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اُسے امام کے تقویٰ و عبادت، خوش اخلاقی اور سخاوت کے کتنے ہی واقعات سننے میں آئے ہوں گے

ان تمام امور کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حضرت امام حسین سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اسے ایک گناہ خیال کرتا تھا۔ اُسے یہ تصور بےچین کرتا تھا کہ مجھے کس سے لڑنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے چنانچہ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجئے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے کہا اچھا تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کرو۔ یہ معاملہ سخت تھا، عمر سعد کو رے کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی یہاں تک کہ اُسے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی۔ مہلت مل گئی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب واعزّاء سے مشورہ لینا شروع کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔ حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی۔ آپ حسین سے جنگ کو نہ جائیے اور اور گناہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتۂ قرابت قطع کرنے کے مرتکب ہو جیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسین کے خون کا بار اپنی گردن پر لیجئے۔ (طبری ج ۶ ص ۲۳۳)

یہ وہ پہلو تھا جسے سچے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر رے کی حکومت کا خیال دلا رہا تھا۔ وہ دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اس کے اشعار ظاہر کر رہے تھے:

ااترک ملک الری والری رغبتہ	ام ارجع مذموما بقتل حسین
وفی قتلہ النار التی لیس دونہا	حجاب وملک الری قرۃ عینی

(یعنی) کیا میں رے کی حکومت چھوڑ دوں درانحالیکہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسین کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار رہوں؟! اُن کو قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے اور رے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے (کتاب البلدان علامہ ابن الفقیہ ص ۲۷۱)

دوسرے لوگ اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسین کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اُس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہوگا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں پھر رے کی نقد حکومت کو چھوڑ کے آخرت کے راحت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟!

غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے اس لیے کہ نتیجۂ عمر بن سعد کے عمل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی وقتی دلفریبی غالب آئی اور اس نے رسول کے فرزند سے جنگ پر کمر باندھ لی مگر ایک آخری مرتبہ ضمیر کی چٹکیوں نے اُسے آمادہ کیا کہ وہ پھر ابن زیاد سے کمزور الفاظ میں سہی معذرت کرلے چنانچہ اُس نے آکر کہا کہ آپ مجھکو دستبیٰ اور دیلم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہو گیا ہے اور میری فوج والوں نے بھی وہیں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھکو ادھر روانہ کیجیے اور حسین بن علی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اشراف اہل کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت اور فن سپہگری و مہارت جنگ میں مجھ سے کم نہیں ہیں روانہ کر دیجیے عمر سعد نے چند آدمیوں کے سرداران اہل کوفہ میں سے نام بھی لیے۔

ابن زیاد برہم ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ تمھیں سرداران کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہوگا تو تم سے مشورہ لے کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنی کہو تمھیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کرو۔ عمر سعد نے دیکھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ قربانی پر اُس کا نفس تیار نہیں تھا۔ مجبوراً اقرار کیا کہ میں ہی جاؤں گا چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمربستہ تھی کربلا کی طرف روانہ ہوگئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسین کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن یعنی تیسری محرم کو کربلا پہونچ گیا (طبری ج ۶ ص ۲۳۲ الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

حُر کے ساتھ ایک ہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچ ہزار ہوئی حضرت امام حسین اور اُن کے مختصر ساتھیوں کے لیے اتنا لشکر بہت تھا مگر نہ معلوم امام حسین کی خاندانی شجاعت اور اُن کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر کتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا۔

عمر بن سعد نے کربلا آکر ایک کوشش معاملات کے رو باصلاح کرنے کی شروع کی عزرہ بن قیس احمسی سے کہا کہ وہ امام حسین کے پاس جا کر آپ کے مقصد نصب العین و نقطۂ نظر

کو دریافت کرے۔ یہ اُن سات آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے سب سے آخر میں امام حسین کو دعوتی خط لکھا تھا۔ اس لیے اُس کو آپ کے پاس جانے سے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے شرم دامنگیر ہوئی اور اُس نے صاف انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوسرے ایسے ہی اشخاص کہ جو خطوط لکھ چکے تھے اُنھیں بھی جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبد اللہ شعبی ایک درشت خو سخت مزاج انسان یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے پر تیار ہوں بلکہ اگر مجھے حسین کے قتل کرنے کا بھی حکم ہو تو میں اس مہم کو انجام دیدوں عمر سعد نے کہا نہیں، یہ منظور نہیں ہے، تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں آئے کس لیے ہیں؟ کثیر لشکر امام کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ صائدی جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسین پر پہرہ دے رہے تھے۔ اُنھوں نے دُور سے دیکھ لیا اور امام سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بڑا پُر جگر لیکن بدترین خلق انسان اور انتہائی سفاک و خونریز شخص آ رہا ہے۔ اس کے بعد آئے اور کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کے رکھدینے کا مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں اگر تم اس پیغام کو سنو تو میں کہدوں۔ نہیں تو واپس جاؤں ـــــــ وفادار ابو ثمامہ کو کسی طرح یہ گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی اس سلح شوری کے ساتھ اسلحہ لے کر امام کے پاس جائے۔ انھوں نے کہا اچھا کم از کم میں تمھاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو لے جاؤں گا۔ شیطنت مزاج انسان نے کسی طرح نہ مانا اور کہا ہرگز نہیں تم میری تلوار کو ہاتھ بھی لگانے نہ پاؤ گے۔ ابو ثمامہ نے کہا پھر تم اپنا پیغام مجھ ہی سے کہدو۔ میں اس کا جواب لے آؤں گا۔ تمھیں اس طرح سے قریب نہیں جانے دوں گا آخر آپس میں سخت کلامی ہوگئی۔ کثیر واپس گیا اور عمر سعد کو تمام واقعہ سے مطلع کیا۔

اُس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا، اس سے کہا کہ تم جا کر دریافت کرو کہ آپ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں۔ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا امام نے جو اُسے آتے دیکھا دریافت فرمایا تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہر نے کہا جی ہاں یہ ایک شخص ہے قبیلہ حنظلہ کا بنی تمیم میں سے اور اپنے ننھیالی رشتہ سے ہمارا عزیز ہوتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے

اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا
کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام
کی خدمت میں تسلیم بجالایا اور عمر سعد کا پیغام پہونچایا، وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا
مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا "مجھکو تمھارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن
اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا" جواب بالکل صاف تھا،
قاصد واپس جانے لگا۔ حبیب بن مظاہر کو موقع تبلیغ کا مل گیا کہنے لگے "اے قرہ بن قیس
ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی
بدولت تمھاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے"۔ قرہ نے کہا میں جو پیغام لایا تھا اُس کا جواب
پہونچادوں، پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، وہ گیا اور عمر سعد سے پورا جواب
امام حسین کا بیان کیا۔ عمر سعد کا دل تو پہلے ہی امام حسین کے مقابلہ سے لرز رہا تھا، اس
جواب میں اُسے امید کی بجلی چمکتی دکھائی دی اور توقع ہوئی کہ اب صلح ہوجائے گی۔ اُس
نے عبید اللہ بن زیاد کے نام خط لکھا کہ میں نے یہاں پہونچ کر حسین کے پاس اپنا نمائندہ
بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں، کیا مطالبہ کرتے ہیں اُنھوں
نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھکو لکھا تھا اور میرے پاس اُن کے قاصد گئے تھے اور مجھے
ادھر آنے کی دعوت دی تھی لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور اُن کے خیالات
میں تبدیلی ہوگئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں اُدھر ہی واپس چلا جاؤں گا"۔

خط پہونچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غرور، دنیا کے گھمنڈ اور تجبر، فرعونیت اور ظلم و
سفاکی کے جذبہ کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا۔

الآن اذ علقت مخالبنا بہ — یرجو النجاۃ ولات حین مناص

(یعنی، اب جبکہ ہمارے چنگل اُن تک پہونچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب ہیں،
ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے"۔

اُس نے عمر سعد کو خط لکھا:۔ "خط پہونچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسین کے سامنے
یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور اُن کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کرلیں جب

وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے ۔"

اس خط سے عمر سعد کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ اور تاریکی چھاگئی اس خط کی اسپرٹ بالکل مفسدانہ اور فتنہ پردازانہ تھی۔ پہلے تو بیعت کا سوال ہی حضرت امام حسین سے ایک ناممکن بات کا مطالبہ تھا پھر اس پر یہ کہ بیعت کے بعد بھی حکومت کی طرف سے کسی خوشگوار نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ پھر ہم رائے قائم کرینگے" اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ اس کے بعد بھی حکومت حضرت امام حسین کے گزشتہ انکار یا بزعم خود باغیانہ رویہ کے بارے میں کچھ سزا تجویز کرنے کا حق رکھے گی۔

خط کے انداز سے صاف ظاہر ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسین کے روادارانہ جواب سے مغالطہ میں مبتلا ہو گیا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فوج کی کثرت کو دیکھکر حسین ڈر گئے ہیں اور اس لیے وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں جہاں سے آیا ہوں واپس چلا جاؤنگا مگر عمر سعد حسین اور ان کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ حسین کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے کسی مرعوبیت یا خوف پر مبنی نہیں ہے اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے فوراً کہدیا کہ اچھا معلوم ہو گیا کہ امیر ابن زیاد امن و سکون کے خواہاں نہیں ہیں (طبری ج ۶ ص ۲۳۴)

پھر بھی اس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسین کے پاس بھیجدیا۔ امام حسین نے وہی کہا جسے عمر سعد بالکل سمجھ چکا تھا "یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں (الاخبار الطوال ص ۲۵۲) عمر سعد نے یہ جواب امام حسین کا ابن زیاد کے پاس بھیجدیا۔

حقیقت میں عمر سعد ایک بے جان لاشے کی طرح اپنے عمل کو حکومت کی مرضی کی تعمیل میں اپنے ضمیر کے بالکل برخلاف چلا رہا تھا اس کی قوت ارادی میں خود کوئی جان نہ تھی وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے مگر اس طرح کہ میری خیر خواہی حکومت پر کوئی حرف نہ آئے۔ ابن زیاد کو اس خط کا مضمون دیکھکر بڑا غصہ آیا وہ سمجھا کہ اتنی فوج حسین کو مرعوب کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئی۔ اس لیے اس نے کوشش کی کہ

تعداد فوج زیادہ سے زیادہ ہو جائے میں سمجھتا ہوں کہ یہ پوری کاوش و کوشش حسین کے نفس اور ارادہ کی طاقت کا اندازہ نہ کرنے کی وجہ سے عمل میں لائی گئی ابن زیاد پہلے ہی دن اگر حسین سے جنگ کرنے اور آپ کو قتل کرنے ہی کا ارادہ کر لیتا اور شروع ہی سے یہی نصب العین قرار دیتا تو وہ شاید اتنی فوج روانہ ہی نہ کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ پھر وہ اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا اور جس طرح جناب مسلمؑ کے مقابلہ میں مزید کمک بھیجنے کی ضرورت پڑی تھی ویسے ہی یہاں بھی ہوتا مگر شروع ہی سے فوج کی تعداد بڑھانے کی اتنی کوشش جنگ کے سر کرنے کے بجائے حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو مرعوب کرنے پر زیادہ مبنی معلوم ہوتی ہے وہ گویا دکھلا رہا تھا کہ حکومت کے پاس اتنی طاقت موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کا اندازہ اس بارے میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ اتنی بڑی فوج حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو اتنا بھی تو متاثر نہیں بنا سکی کہ اُن کے انکار کا آہنگ کچھ مدھم ہی ہو جاتا۔

ابن زیاد نے فوج کی تعداد بڑھانے کے جو انتظامات کیے وہ تاریخ میں درج ہیں پانچہزار فوج تو گنی چنی ہوئی آپ سُن ہی چکے ہیں۔ چار ہزار کی فوج حصین بن تمیم کوتوال شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے ناکہ پر تھی جو عذیب، واقصہ، لعلع، اور خفان تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی۔ ابن زیاد نے اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا۔ اور خود کوفہ سے باہر نکل کر نخیلہ میں جو کربلا کے راستے میں تھا آکر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے در پے کربلا کی جانب روانہ کرے۔ بڑے بڑے سرداران کوفہ۔ حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، عمرو بن الحجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ ہوں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اکیلا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی مسموع نہیں ہوتا تھا چنانچہ شبث نے بیماری کا عذر کیا ابن زیاد نے کہا تم بیمار بن رہے ہو۔ اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد

کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ ابن زیاد کو اس کا علم ہوگیا تو اُس نے سوید بن عبد الرحمن منقری کو تھوڑے سے سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے کہ حسین سے جنگ کو نہیں روانہ ہوا ہے اُسے گرفتار کر کے لے آیا جائے سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی ترکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا ہوا تھا سوید نے اُسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیجدیا، اُس کی گردن ماری گئی۔ اس سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہوگئی اور سب حسین سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے (الاخبار الطوال ص۲۵۳) اب میں سمجھتا ہوں تاریخ میں مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت ہے کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسے علامہ مجلسی نے اختیار کیا ہے۔ یا پینتیس ہزار تھے جسے ابن شہر آشوب نے لکھا ہے یا ایک لاکھ تک جیسا بعض اہل مقاتل نے لکھا ہے۔ بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے یہ ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں اُنڈل آئی تھی اور کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مار رہی تھی۔

فوجوں کی طاقت بڑھانے کے بعد بھی جب حسین اور اُن کے ساتھی خوفزدہ اور متاثر نہیں ہوسکے تو ایک بڑا بے پناہ اقدام یہ کیا گیا کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں پر پانی بند کردیا گیا۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے اور وہ پیش کرتی ہے یہ موقع کہ جب خلیفہ سوم حضرت عثمان مدینہ کے دارالامارہ میں محصور تھے اور مصر کے بلوائی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور پانی کا پہونچنا شہر کے اندر بند ہوگیا تھا تو ان ہی حسین کے پدر بزرگوار حضرت علی نے مشکیں پانی کی دارالامارہ میں بھجوائی تھیں اور خود حسین اور ان کے بڑے بھائی حسن کو بھیجا تھا کہ دیکھو پانی پہونچنے میں رکاوٹ نہ ہو۔

اس کے بعد یہ بھی موقع یاد ہے کہ جنگ صفین میں اتفاق سے امیر معاویہ کا لشکر فرات کے گھاٹ پر حضرت علی کی فوج سے پہلے پہونچ گیا تو معاویہ کے حکم سے ابوالاعور سلمی نے دس ہزار شامیوں کی فوج کے ساتھ گھاٹ کا رستہ روک لیا اور حضرت علی کے لشکر پر پانی بند کردیا گیا۔ ایک رات دن یہ لوگ پیاسے رہے آخر حضرت علی نے حکم دیا کہ

جنگ کرکے انہیں گھاٹ پر سے ہٹا دو مالک اشتر اور دوسرے افسروں نے حملہ کرکے بہادری کے ساتھ فوج شام کو گھاٹ سے ہٹا دیا اور خود فرات پر قبضہ کیا۔ اس وقت ہوا ہوگا اہل شام کو اندیشہ کہ اب علی ہم پر پانی بند کر دینگے مگر حضرت علی کا جب گھاٹ پر قبضہ ہوا تو آپ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ خبردار اہل شام کو پانی لینے سے منع نہ کیا جائے نتیجہ یہ تھا کہ گھاٹ پر علی کی فوج کا قبضہ تھا مگر شام والے بڑے اطمینان سے آ آ کر پانی پیتے تھے اور پانی بھر کرلے جاتے تھے اور کوئی تعرض ان سے نہ کیا جاتا تھا (الاخبار الطوال ص۱۶۸)

مگر افسوس دنیا کی نابینائی اور بے انصافی آج معاملہ کو برعکس کرتی ہے۔ ناکردہ گناہ بلکہ محسن ہستی کو گناہگار بنا کر اپنی ستم کیشی کو انتقام کے پردہ میں چھپاتی ہے ابن زیاد کا خط آتا ہے عمر بن سعد کے پاس کہ حسین اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو اور انھیں ایک قطرہ بھی پانی کا نہ ملے جیسا کہ مظلوم خلیفہ عثمان بن عفان کے ساتھ کیا گیا تھا (ذرا سے لفظوں کے اختلاف کے ساتھ طبری ج ۶ ص۲۳۴ اور الاخبار الطوال ص۲۷۳ دونوں قدیم مورخین کے یہاں یہ خط درج ہے) عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمر بن حجاج زبیدی کو پانچسو سواروں کی فوج کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کر دیا کہ ایک قطرہ پانی کا حسین اور اصحاب حسین تک پہنچنے نہ پائے۔ دینوری نے تصریح کی ہے کہ یہ امام حسین کی شہادت سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے (الاخبار الطوال ص۲۵۳)

ع۱ "وہ سرچشمہ ہمدردی جس نے ابھی چند روز ہوئے اپنے دشمنوں کی پوری فوج کو سیراب کیا تھا اب اس کے ننھے ننھے بچے ایک ایک قطرہ پانی کو ترس رہے ہیں کیا حسین کے موقع کی دشواری کا اندازہ اس وقت کچھ دشوار ہے؟ عالم یہ تھا کہ

ع۲ "محاصرہ کن فوجوں کی گھنی اور تاریک صفیں، پے در پے چمکتی ہوئی انیوں اور تلواروں کی باڑہ کا انبوہ بڑھتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نہ صرف اپنی بلکہ عزیزوں اور معصوم بچّوں کی پیاس جنگل کی آگ کی طرح بڑھ رہی تھی۔ موقع فہمی کی راہ میں اب کوئی چیز حائل نہ تھی یعنی یہ امر بالکل صاف تھا کہ اب ہم اہل کوفہ کی مدد نہیں کر سکتے

ع۱ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ع۲ ریاض صاحب بنارسی

نہ اہل کوفہ اپنی جگہ قائم ہیں۔ قائد لشکر یزید سے یہ گفتگو ہو چکی کہ ہم کو واپس جانے دو لیکن گروہ یزید اس پر راضی نہیں ہوتا۔ کیا معنی تھے اس کے یعنی دو بڑی باتوں میں اہل کوفہ کی مدد کا موقع ناممکن تھا لیکن اب تک یہ ممکن تھا کہ حکومت یزید سے یہ عہد ہو جائے کہ ہم کوفہ نہ جائیں اور وہ ہم پر بیعت کا جبر نہ کرے اور اس طرح ایک بڑا اصول اپنی جگہ قائم رہے لیکن یزید کی حکومت جواب دیتی ہے کہ ہمارے چنگل میں آکر نکلنا چاہتے ہو۔ اس نے ہر شخص کے گزشتہ خوف اور خیال کو بالکل صاف کر دیا کہ یزیدیت جس وقت حسین پر قبضہ پاتی بیعت یا قتل کے علاوہ کسی اور بات پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ اب وقت تھا کہ جس جس طرح حسین پر دشمن کی سختی بڑھتی جاتی۔ اُن کے انکار کے معنی اور اُس کا درجہ واضح ہوتا جاتا اور دشمن اپنے تمام ممکن ذرائع ختم کرنے کے بعد بھی اس تسکین کا موقع نہ پاتا کہ ہمارے اتنے سامانوں نے چند بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو مرعوب کر لیا یا ہم اپنی بات منوا سکے"

پھر بھی وہ امن و سلامتی (ایمان و اسلام) کے پیغمبر کا نواسا تھا جس نے ایک مرتبہ اور امکانی درجہ تک دشمن کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش اور صلح و آشتی کی فضا قائم رکھنے کی خواہش کی اُن کو اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کا محفوظ رکھنا حتی الامکان مدنظر تھا جو اُن کے نانا کی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے بشرطیکہ اُس سے اہم مذہبی مفاد قربان نہ ہوتا ہو [1] آپ شہادت کا آئیڈیل (مثالیہ) دنیا کے سامنے پیش کیا چاہتے تھے اور اس کے لیے آپ کا تمام حجتیں ختم کر دینا نہایت ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ہر موقع پر نہایت ملائمت برتی ہر اپنی طرف سے حفظ نفس کا کوئی احتیاطی پہلو جو اصول خودداری اور منزلت مذہب سے متصادم نہ تھا فروگذاشت نہیں فرمایا" چنانچہ [2] اپنے دشمنوں کو دائمی عذاب سے بچنے کا ایک آخری موقع دینے کے لیے انھوں نے عمر بن سعد کو ایک نجی گفتگو کی دعوت دی۔ دونوں خیام کے مابین خیموں کی آگ کے دھوئیں کی وجہ سے ہلال زرد ہو گیا تھا اور اُس کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی، اُس ریگستان نے آسمان پر

---

[1] مولانا اختر علی صاحب تلہری [2] ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

یہاں تک کہ حسین اور عمر بن سعد دونوں اپنے اپنے خیموں سے نکل کر بیس بیس ہمراہیوں کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب ایک دوسرے کے پاس پہونچا تو ہمراہی ٹھہر گئے۔ دونوں سپہ سالار گھوڑوں سے اُترے اور بہت دیر تک گفتگو میں مشغول رہے چاند آہستہ آہستہ آسمان پر رینگتا رہا اور ستارے اپنا خاموش رابطہ کرتے رہے صحرا میں رات کی تازہ ہوا سے خیمہ کے پردے متحرک تھے جبکہ یہ دونوں رات کو دیر تک گفتگو میں مشغول رہے ان کے ہمراہی کچھ سُن تو نہ سکتے تھے لیکن وہ نگراں رہے کہ دیکھیں اس گفتگو کا کیا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی صحیح طریقہ پر نہ معلوم ہو سکا کہ ان میں کیا گفتگو ہوئی "اس بڑے شہید کی یہ آخری اپیل جبر و تشدد کی قوتوں کے سامنے تاریخ کے طالب علم کے سامنے کم و بیش ایک راز ہی رہ گی"۔ مگر مختصر طور پر اتنا معلوم ہو سکا کہ بات اتنے پر ختم ہوئی جاتی تھی کہ حضرت امام حسین عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دینگے اور اگر ضرورت ہو تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دینگے اور کسی دور و دراز جگہہ پر چلے جائیں گے۔

غور کیا جائے تو اس صورت سے بھی حسین کی جیت تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اُس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی۔ پھر بھی آپ کا رویہ اتنا نرم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ صلح کے راستے پر گامزن ہیں اور اُس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت امام حسین کی اس شرط مصالحت سے اطلاع دی ان الفاظ کے ساتھ کہ الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور امت اسلامی کا معاملہ رو باصلاح ہو گیا۔ آخر میں اُس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے طبری میں ہے کہ ابن زیاد نے بھی بہت خوشی کے ساتھ اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیر خواہانہ ہے۔ ہمیں اس صورت کو منظور کر لینا چاہیئے مگر شمر بگڑ گیا اور کہنے لگا "بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اُسے چھوڑ دے! حسین آپ کے پاس پہلو میں آ گئے ہیں اگر آج وہ چلے گئے اور اُنھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیئے

کہ قوت و عزت اُن ہی کا حق ہوگا اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصّہ۔ میری رائے میں کبھی اُن کی یہ خواہش منظور نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ بڑی ذلّت کی بات اور کمزوری کی نشانی ہے بے شک اُنھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا چاہئیں اور آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ پھر اگر آپ انھیں اُن کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اُس کا کیا ذکر! میں نے تو سُنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسین کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے"۔

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدانہ اور فتنہ پردازانہ تقریر تھی۔ جس سے ایک طرف تفوق طلبی اور ظفر انجامی کے جذبہ کو حرکت پیدا ہوئی، دوسری طرف انانیت، غرور اور خودی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی جانب سے بدگمانی ہوگئی اور وہ خلوص اور سچائی کا اثر جو اُس کی تحریر سے پیدا ہوا تھا رخصت ہو گیا۔ شمر بڑا خیر خواہ دوست اور سچا مشیر کار معلوم ہوا اور عمر سعد پر غصّہ آیا کہ وہ لڑنے گیا ہے اور رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے حسین سے مل گیا ہے۔ ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے پھر ایسے مشتبہ شخص کا سردار لشکر رکھنا کیسا ہے؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرز عمل کا تدارک ہو اور حسین کے ساتھ ہر قسم کی مصالحانہ گفتگو کا سدباب ہو۔ اُس نے اسی غصّہ کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا:۔ "میں نے تم کو حسین کی جانب اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تم اُن کے ساتھ مراعات کرو یا اُن کے ساتھ معاملات کو طول دو یا اُن کو زندگی کی امیدیں دلاؤ یا میرے پاس اُن کی سفارش کرنے بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور اُن کے اصحاب میرے حکم پر سرِ تسلیم خم کریں اور اپنے تئیں میرے رحم و کرم کے سپرد کر دیں تو ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو اُن پر حملہ کر کے اُنھیں قتل کر ڈالو اور اُن کے اعضاء کو قطع کر دو کیونکہ وہ لوگ اسی کے مستحق ہیں"۔ اتنا ہی نہیں اسلام کے نام کو بدنام کرنے والے، انسانیت کی پیشانی کو عرق انفعال سے تر کرنے والے اور تاریخ کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنیوالے یہ الفاظ ہیں جو کسی اور کی نسبت نہیں، رسول کے سب سے پیارے نواسے حسین کی نسبت لکھے جا رہے ہیں کہ "اگر حسین قتل ہو جائیں تو

اُن کے سینہ اور پشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا۔ کیونکہ وہ سلطنت کے باغی، مخالف اور حریف ہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد اُن کو کوئی نقصان پہونچے گا لیکن میں یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسین کو قتل کروں تو اُن کے ساتھ یہ سلوک کروں گا اگر تم نے ان احکام کا اجرا کیا تو خیر تمہیں معاوضہ ملے گا جو ایک وفادار و فرمانبردار شخص کو ملنا چاہیے اور اگر تمہیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علحدہ ہو جاؤ اور اس منصب کو شمر کے سپرد کر دو جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کر دی ہیں"۔

یہ خط شمر کے سپرد کیا اور زبانی بھی اُس سے کہدیا کہ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو وہ معزول ہے اور تم اُس کی جگہ سردار لشکر ہو تم جنگ کرنا اور عمر سعد کو قتل کر کے اُس کا سر میرے پاس بھیجدینا۔

یہ تعجیلی اور تنبیہی حکم نامہ شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجدیا گیا۔ اب جنگ کا التوار غیر ممکن سا ہو گیا عہ "اس کتاب میں حسین کے نظریات کی توضیح کی جا چکی ہے۔ ایک دفعہ یہاں پھر سمجھ لو کہ وہ کسی ایک فرد کے حق کو ظاہر کرنے یا کسی ایک فرد کی غلطی کی تلافی کرنے نہیں آئے تھے بلکہ وہ عام انسانی حقوق کی پیشوائی و نمایندگی کے لیے آئے تھے۔ اُن کی جنگ انسانی حریت مساوات اور اخوت کے لیے تھی، وہ ایک سماجی غلطی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ حضرت محمد مصطفےٰ نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ایک زبردست تمدن قائم کیا تھا۔ اپنی رسالت کے تھوڑے ہی زمانہ میں اُنھوں نے عربی سماج کو یک لخت بدل دیا اُنھوں نے عربوں میں زندگی کی ایک لہر، ایک جذبہ کا وہ خزانہ بھر دیا تھا کہ عرب اب گویا تہذیب و تمدن کی مشعل ہو گئے تھے ساری دنیا کے لیے —— بگڑی ہوئی انسانی سوسائٹی کو متوازن کرنے کے لیے اسلام نے ذاتی اغراض و مقاصد اور لوگوں کی خود کامیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ امویوں کو اسی سے عناد تھا۔ شام کو اپنی مستقل حکومت بنا کر انھیں اپنے مقصد کی تکمیل میں نئی راہیں دکھائی دیں۔ قتل حضرت عثمان کے انتقام کا بہانہ لے کر شاہ دمشق کو اس اسلامی قیادت کے خلاف محاذ قائم کرنے کا اچھا موقع مل رہا سیاسی

عہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

چالیں چلی جانے لگیں اور اسلامی تاریخ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان کی خونریزیوں سے خونیں دکھائی دینے لگی۔ مکہ و مدینہ کو بھی ان کے مہلک اثرات کا شکار ہونا پڑا۔ بصرہ و کوفہ میں زندگی کی لہر باقی نہ رہی۔ یزید کی ولیعہدی اور جانشینی گویا اس تمدن اسلامی کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ حسین سے حکومت دمشق کی اطاعت قبول کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس شاہی حکم کے سامنے جھکنے کی کس کو مجال تھی؟ حسین بن علی نے اس شاہی مبارز طلبی کو قبول کیا۔ یقیناً ان کا یہ فعل بڑی شجاعت اور بہادری کی مثال ہے۔ امویوں کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حسین ان کی باتوں کو جلد مان لیں گے۔ حسین کے لیے اس دیر کا ظہور تعجب خیز نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جنگ جمل اور صفین یقیناً معرکہ کربلا کا مقدمہ تھیں۔ انھوں نے واقعات پر غور کر کے ان کا ایک خاکہ اپنے دماغ میں پہلے ہی سے بنا لیا تھا۔ مکہ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حسین کا مکہ کو اپنے لیے جائے پناہ قرار دینا فی الاصل امویوں کی سیاست کے تار و پود بکھیر دینا تھا اور یہ ظاہر کر دینا مقصود تھا کہ بنی امیہ کو دنیاوی فتح کا اتنا شوق ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو اپنی بات پوری کرنے کے لیے وہ احترام خانۂ کعبہ کو بالائے طاق رکھ کر اسے قتل گاہ بنا دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ حسین عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفیوں میں کوئی جان باقی نہیں تھی لہٰذا حسین کربلا گئے اور انھوں نے صلح کے شرائط پیش کیے جو انتہائی معقول تھے۔ یہ شرط کہ ان کو اجازت دی جائے کہ وہ اموی سلطنت سے کہیں باہر چلے جائیں یزیدی حکومت نے ٹھکرا دی اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ اس حکومت کی بنیادیں کتنی ناقص ہیں وہ حسین کی شخصیت اور قدر و قیمت کو بھی بخوبی جانتی تھی اور گویا وہ احساس کمتری میں گرفتار تھی۔ حسین جہاں رہتے اس کو یہ اندیشہ تھا کہ کبھی نہ کبھی حسین کہیں قلوب خلق کو اپنی طرف کھینچ نہ لیں۔ اس لیے اس نے اپنی شرط کو یہیں تک محدود رکھا کہ غیر مشروط اطاعت یا پھر تلوار۔ حسین کو ان دونوں میں سے ایک کو منتخب کرنا تھا۔ تلوار اس میں شک نہیں کہ حسین کو ختم کر سکتی تھی لیکن بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت اس پیغام کو فنا کر دیتی جس کو حسین قائم رکھنا چاہتے تھے۔ بیعت سے ممکن ہے کہ وہ کچھ دنوں اور زندہ جاتے

اور پھر کسی خفیہ حربہ سے شہید کر دیے جاتے لیکن اگر وہ زندہ بھی رہتے تو یہ زندگی خود اُن کی آنکھوں میں کتنی ذلیل ہوتی؟! تلوار فوری موت کا سبب تھی لیکن وہ اُن کو زندۂ جاوید بنا دیتی تھی۔ حسین کے نفس کو پہچانے بغیر صورت حال نازک ضرور ہے ذرا دوسری تاریخی عظیم شخصیتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا جن کے اوپر بھی کوئی ایسا ہی موقع گزرا ہو اور دونوں کا موازنہ کیجیے تب حسین کے نظر انتخاب کی داد دیجیے۔ جو ذاتی مفاد کو مدنظر رکھیں گے وہ حسین کے اس انتخاب کو عزت کی نظر سے نہ دیکھیں گے لیکن جو انسانی بہبودی و فلاح کے علمبردار ہیں وہ حسین کے انتخاب کی داد دیں گے۔ حسین کی ذات نہایت اہم و ذمہ دار تھی۔ وہ ایک خاص مقصد کو لے کر آئے تھے۔ وہ صلح کر سکتے تھے لیکن اطاعت قبول نہیں کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے صلح کو بھی محدود کر دیا تھا کہ اس میں بیعت کر لینے کا کوئی پہلو نہ نکلے۔ وہ ملک چھوڑ کر کسی سرحدی مقام پر جا سکتے تھے۔ اپنی تمام املاک کو چھوڑ سکتے تھے لیکن کسی صورت میں اپنے مقصدِ حیات سے دستکش نہیں ہو سکتے تھے اور اپنے اصول سے سرمو منحرف نہیں ہو سکتے تھے۔ اصول غیر قابل تبدیل ہوا کرتا ہی۔ حسین جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق ہے ہر بات برداشت کر سکتے تھے اور اُنھوں نے ایسا کرنے سے گریز نہیں کیا۔ وہ اپنی ذات کے مالک تھے، اپنے نفس پر پورا اختیار رکھتے تھے لیکن جہاں سے اصول کے تحفظ کی منزل شروع ہوتی تھی وہ اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو اصول کے تلف کرنے کا اختیار نہیں تھا وہ اصول کے محافظ تھے، اُس کے امین تھے، مگر اُس پر کوئی تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے اور نہ اس کا انھیں جواز تھا حضرت محمد مصطفٰے نے اس اصول کو امتحان کے اوقات میں قائم رکھا۔ حضرت علی نے اُس کو زندگی بھر نباہا۔ حسن بھی ناامیدی کی حالت میں بھی اس پر قائم رہے۔ اب حسین کے ہاتھ میں سارا اختیار تھا کہ وہ تاریخ کو چاہے بدل دیتے یا سنوارتے لیکن اللہ رے امانت کی فرض شناسی' اُنھوں نے تمام ذاتی خیالات کو نظر انداز کر دیا۔ تمام مادی خواہشوں کو محو کر دیا۔ اور بغیر مہلک نتائج کا خیال کیے ہوئے آخر وقت تک اپنے اصول کی بقا پر قائم رہے —"

حقیقت میں بیعت کرنا ہوتی تو امام حسین پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے۔ اب خطرہ کو بالکل سامنے دیکھ کر وہ اس بیعت یا اطاعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسین نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسین بیعت یا غیر مشروط اطاعت ہرگز نہ کریں گے اس لیے جونہی اسے ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ پہونچا اور اس نے کھول کر پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا "کمبخت یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو ہی نے ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسین کبھی اپنے تئیں ابن زیاد کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں گے۔ یقیناً حسین ایک غیور دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔ شمر نے کہا ان باتوں کو جانے دو! یہ بتاؤ کہ اب کرو گے کیا؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل کرو گے یا سرداری کو میرے سپرد کرو گے؟

کمزور دل والا، دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے نفعی اعزاز اور جاہ و ثروت کے ہاتھ سے چلے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا۔ وہ دنیا کے عشق میں اس وقت اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر تیار ہو جاتا تھا جس میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔ خطرہ بالکل نقد تھا اور اپنا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب تھا جس پر تمام فیصلہ کی بنیاد تھی جس کے ساتھ بس فقط سرداری رہنے اور نہ رہنے کا سوال نہ تھا بلکہ جیسا ابن زیاد کی گزشتہ تقریر سے معلوم ہوا جان کا مرحلہ بھی درپیش تھا یعنی مخالفت کی صورت میں قتل کیا جانا بھی یقینی تھا۔ اس کے لیے تو ویسے ہی جذبۂ حق پسندی کی ضرورت تھی جو راہ حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے۔ مگر عمر سعد اس جذبہ سے عاری اور ثبات و استقلال سے خالی تھا۔ شمر کے اس سوال پر اسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں

میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا۔ اب شمر کا وجود اُس کے لیے سوہان روح تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اپنی نسبت ظاہر ہو چکی تھی اور اُسے اپنی وفاداری اور اخلاص مندی کا ثبوت دینا تھا اس لیے اب جنگ میں تھوڑی بھی تاخیر اُس کے نزدیک مناسب نہ تھی۔ اور اس لیے اُسی وقت حملہ کی تیاری کر دی اور نویں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسین پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسین عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور کچھ نیند غالب ہو گئی تھی ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینب کے کان میں گئی آپ گھبرا کر امام حسین کے قریب آئیں اور ہوشیار کیا کہ دیکھیے دشمن کے لشکر کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ چونکے اور فرمایا میں نے ابھی رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت فرماتے ہیں تو عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتا ہے۔ اچانک حملہ کی دہشت سے زینب کا دل دہلا ہوا تھا ہی۔ اب جو بھائی نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینب مضطرب ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے منھ پیٹ لیا اور کہا "ارے یہ غضب!" امام نے بہن کو تسکین دی فرمایا اے بہن غضب تمھارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو، خدا مالک ہے" ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ جناب عباس بھی پہونچ گئے اور کہا بھیا! لشکر آ گیا۔ حضرت یہ سُن کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا اے عباس سوار ہو اور ان کے پاس جاؤ۔ ان سے پوچھو کہ اس وقت نئی بات کیا پیدا ہوئی۔ ان کے طرز عمل میں تبدیلی کیوں ہوئی اور اس بے وقت کے حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ آپ نے جا کر دریافت کیا تمھاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ ہو۔" آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمھارا مطالبہ پیش کرتا ہوں، اس کے بعد جو کچھ فرمائیں گے تم سے آ کر بتلا دوں گا۔ جناب عباس گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسین کی خدمت میں گئے کہ آپ کو واقعہ سے اطلاع دیں، اتنی دیر میں

حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوج مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسین کی بے گناہی پر اُن کو قائل معقول کرتے رہے، یہاں تک کہ جناب عباس واپس آئے اور فرمایا کہ امام نے ایک رات کی مہلت مانگی ہے۔ صبح کو دیکھا جائے گا۔ عمر سعد شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا اس لیے اب وہ امام حسین کے معاملہ میں خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ اُس کو شمر کی ذات سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا جو آپ کی رائے۔ افسر آپ ہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے" وہ سمجھا کہ شمر کا یہ فقرہ اُس کا دل لینے کیلئے ہے اس لیے اُس نے کہا "میں تو چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے" مگر اصل میں اُس کا ضمیر اس کے خلاف تھا۔ اس لیے اب وہ متوجہ ہوا دوسرے سرداروں کی طرف اور کہا کیوں تمہاری کیا رائے ہے عمرو بن حجاج زبیدی (وہی ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی جو اُن کے قتل کی غلط خبر سُن کر فوج لے کے دارالامارہ پر چڑھ دوڑا تھا) نے کہا "سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلۂ ترک و دیلم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمھیں اُن کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی" قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینی چاہیے۔ آخر ایک شب کی مہلت مل گئی اور بڑھی ہوئی حملہ آور فوج پیچھے واپس گئی۔

غور کرنے کے قابل بات ہے کہ ع۵ حسین نے یہ کیوں کیا؟ کیا وہ تیار نہ تھے؟ کیا انھیں کہیں اور سے مدد کی امید تھی؟ کیا وہ میدان جنگ سے کہیں اور چلے جانا چاہتے تھے؟ کیا وہ اس وقفہ سے کچھ اور سوچنا چاہتے تھے؟ اور کیا وہ تمام باتوں کو غور کر کے صبح کو بیعت قبول کر لینا چاہتے تھے؟ کیا چاہے رات ہی کو وہ قتل ہو جاتے یا دن کو قتل کئے جاتے اس میں کوئی فرق ہو سکتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں! اُن کے دماغ میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔

ایک تو آپ نے اپنی مہلت مانگنے کا سبب اُسی وقت جب جناب عباس کو مہلت مانگنے کے لیے بھیجا ہے ظاہر کر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا "ہم آج کی رات اپنے پروردگار

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کی خوب عبادت کریں اور دعاؤ استغفار میں مصروف رہیں کیونکہ خدا خوب واقف ہے کہ میں ہمیشہ سے اُس کی عبادت اور تلاوت قرآن اور کثرت دعاؤ استغفار کو محبوب سمجھتا رہا ہوں (طبری ج ۶ ص ۲۳۹ مطبوعہ مصر)

دوسری بڑی مصلحت اس شب کی مہلت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرے کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دے دیں اور ایک بار اور یہ کہدیں کہ جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہے وہ چلا جائے تاکہ عین موقع پر کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادل ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے اس شب کو اپنے مجمع کے چھانٹنے کی کوشش کی اور لوگوں کو غور و خوض کر لینے کا پورا موقع دیا۔ عہ "نویں" کا دن گزر کر جو رات آتی ہے اسی کو ہی "شب عاشورا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ رات اتنی ہی اہم اور قابل یاد ہے جیسا خود روز عاشورا حسین نے اس رات کو اپنے ساتھیوں کو بلا کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ ہم ابن خلدون سے نیچے پیش کرتے ہیں:-

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اتنا جانباز اور وفا شعار نہیں سمجھتا جتنا کہ میرے ساتھی ہیں اور نہ دنیا میں اتنے نیک اعزا کسی کو ملے جیسے نیک و وفادار میرے اعزا ہیں۔ خدا تمھیں اجر عظیم دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کریگا میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تمھارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ میں ہرگز مزاحم نہیں ہوں گا۔ شامی محض میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر وہ مجھے پالیں گے تو دوسروں کی تلاش نہیں کریں گے" حسین اس وقت اس سیاسی ڈرامے کا جو ابوسفیان کے خاندان والے کھیل رہے تھے مضحکہ اُڑا رہے تھے اور گویا یہ امویوں کی سیاست کا پول کھولنے کا آخری موقع تھا۔ وہ اس بات کو واضح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ کسی مادی چیز کو اپنا وسیلہ نہیں بنانا چاہتے اور نہ وہ کثرت افواج سے مرعوب ہیں اُنھوں نے یہ بھی صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی قسمت کے فیصلہ کو جانتے ہیں اور موت کا

عہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

مقابلہ کرنے کے لیے بخوشی تیار ہیں۔ اُن کا یہ خطبہ دشمن کی ریاکاریوں اور عذر تراشیوں کے خلاف ایک اعلان جنگ تھا وہ گویا دشمن پر یہ ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ چونکہ وہ اپنی مقدس ذمہ داری کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ اس کے بچانے میں آخر وقت تک ثابت قدم رہیں گے چاہے ان کے ساتھی بھی اُنھیں چھوڑ کر چلے جائیں۔"

کیپٹن ال ایچ بنٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ کہتے ہیں:-

"بعد ختم تقریر آپ نے وہ کام کیا جس کی مثال صفحۂ عالم میں ملنا ناممکن ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو انسانی کمزوریوں کا کس قدر احساس تھا اور کس قدر آپ فیاض اور رقیق القلب تھے اور جذبۂ ایثار کس حد تک آپ میں موجود تھا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ خیموں کے تمام چراغ گل کر دیے جائیں اور جس کا جہاں جی چاہے اس اندھیرے میں چلا جائے۔ میں نے اپنی بیعت تم سب سے ہٹالی ہے۔"

منشی پریم چند صاحب ورما لکھتے ہیں:- "مگر ایک فرد بھی اس دوستانہ فہمائش سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ آج سپاہیوں کو جبراً فوج میں برقرار رکھا جاتا ہے۔ انھیں مصنوعی ذرائع سے شراب پلا کر، یا عقب میں توپیں لگا کر میدان جنگ میں مقید رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسی تحریک سپہ سالار کی جانب سے ہو تو کسی سپاہی کی گرد بھی نظر نہ آئے بڑے بڑے کپتان اور کرنیل گھر کی راہ لیں مگر یہاں ہر طرح سے موقع دینے پر بھی کوئی حضرت حسین کی رفاقت ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ بوڑھا زہیر بن قین سا صحابی کہتا ہے۔ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے کہ میں آپ کی حمایت میں زندہ جلایا جاؤں گا اور پھر زندہ ہو کر جلایا جاؤں گا اور یہ عمل بہتر مرتبہ ہوتا رہے تو بھی میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتا۔"

یہ سب سے آخری جواب تھا ان کے پہلے سعید بن عبداللہ حنفی اور مسلم بن عوسجہ اور سب سے پہلے حضرت ابوالفضل العباس اور تمام اعزا اظہار خیالات کر چکے تھے۔ عزیزوں نے کہا تھا کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں خدا ہم کو یہ روز بد نصیب کرے امام نے خاص طور سے اولاد عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ میں تمھیں اجازت

دیتا ہوں" انھوں نے کہا ہم ایسا نہیں کرینگے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں"
مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ "ہم آپ کو چھوڑ دیں اور خدا کے یہاں آپ کے حق کو ادا کرکے
جو ابدہی کی فکر نہ کریں؟! یہ نہیں ہوسکتا۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے
ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار
لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح
جدا نہ ہونگا۔ اگر ہتھیار نہ ہونگے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا
اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کردوں"
سعید بن عبد اللہ حنفی نے کہا "بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا
کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ ہوجائے کہ ہم نے رسالتمآب کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے
میں ادا کردیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا۔ پھر جیتے جی
جلا دیا جاؤں گا پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ
ستر مرتبہ ہو گا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آخری موت آپ
کے قدموں پر نہ آئے۔ چہ جائیکہ یہ تو ایک دفعہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی
عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے" دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی
قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہجہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ
ہم آپ سے جدا ہوجائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کردینگے۔ ہاں جب ہم مرجائیں تو
پھر جاہے جو ہو۔ ہم تو اپنا فرض ادا کرچکے ہوں گے (طبری ج ۶ ص ۲۳۸-۲۳۹)
یہ تھا مجاہد کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ وہ دل لبھانے والی
تقریروں سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات سے۔ خوش آیند امیدوں
کے سبز باغ سے اور دلفریب توقعات کے سراب خیال سے اپنے ساتھ والوں کو
گرویدہ بنانے کی کوشش نہیں کررہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقت حال کو واضح کرکے
غلط فہمیوں کے پردہ کو چاک کردینا چاہتے تھے ——— یہ کوشش شب عاشور تک
ختم نہیں ہوی بلکہ اس کا ایک مظاہرہ روز عاشور بھی ہوا جب بشر بن عمر و حضرمی کو

جو انصار امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہونچی کہ ان کا فرزند عمر ورے کی سرحد پر قید ہوگیا۔ اُنھوں نے کہا خدا پر چھوڑتا ہوں اُس کو بھی اور اپنے تئیں بھی۔ بیشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید رہے امام کو خبر ہوی تو فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہوجاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو، وفادار مجاہد نے کہا "مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں یہ بھلا کہاں ممکن ہے!" حضرت نے فرمایا! اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیج دو اور یہ قیمتی کپڑے لو کہ ان کی قیمت سے اُس کی رہائی کا سامان کیا جائے حضرت نے پانچ کپڑے مرحمت کئے، جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی کیا اتنی بے نیازی اور اتنی بچی کوشش اصحاب کو اپنے سے جدا کرنے کی اتنے سخت موقع پر حسین کے سوا کوئی دوسرا شخص کر سکتا تھا؟

مسٹر ی ایس رنگا آئر (سابق ایم ایل اے سنٹرل) لکھتے ہیں "حسین کا عمل ڈیوک آف ولنگٹن کی طرف منسوب شدہ اصول سے بہت بلند تھا۔ یہ وہی ڈیوک ہے جس نے واٹرلو (Waterloo) میں نپولین کو جرمن جنرل بلوشر کی اعانت سے شکست دی تھی۔ سواروں کے ایک دستہ کو دفعتہً مقام "راس امید" (Cape of Good Hope) بھیجے جانے کے موقع پر ایک افسر نے گھر پر رہنے کی رخصت طلب کی تو ڈیوک مذکور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے جواب دیا "چلو یا بک جاؤ" (Sail or sell) حسین یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص اُن کے ساتھ اُس جگہہ کا سفر اختیار کرے جہاں سے پھر کوئی واپس نہیں آتا۔ اُنھوں نے سب سے چلے جانے کے لیے کہا مگر برخلاف اُس افسر کے جس نے رخصت طلب کی تھی، بہادر اصحاب حسین کے ساتھ چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوے حالانکہ اُن سے بار بار یہی کہا جا رہا تھا حسین اب جانتے تھے کہ اُن کی جنگ کا خاتمہ اُن کی شہادت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے ایک بڑی فوج جمع کرنے کے وہ اپنے موجودہ ساتھیوں کو بھی واپس کر رہے تھے وہ مال غنیمت کے لیے جنگ نہیں کر رہے تھے جس کی کشش ہمیشہ سپاہیوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اُنھوں نے نہ حسین عورتوں کی طمع دلائی نہ شرابوں کے قرابوں کے ذریعہ سے اُنھیں مرد میدان بنایا۔ نیدپلیس کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ اُس نے کیلے (Calai) میں اپنی فوج سے کہا تھا کہ اگر انگلستان پر فتح حاصل ہو جائے تو دنیا کی بہترین عورتیں تمھارے ہاتھ آئیں گی۔ حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارا ساتھ چھوڑ دو اس لیے کہ دنیاوی نقطۂ نظر سے جنگ میں ہم کو فتح نصیب نہ ہو گی۔"

اب جو لوگ حسین کے ساتھ رہ گئے تھے وہ موت کو اپنے سامنے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے اُس پر آمادہ تھے اس لیے کمزوری کا اُن میں شائبہ نہ تھا۔

دوسری بات اس ایک رات کی مہلت میں یہ تھی کہ ع۵[1] "وہ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ کا دینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے رات بھر میں یزیدیوں کی جنگی اسپرٹ میں کچھ تبدیلی ہو جائے اور وہ ٹھنڈے دل سے حسین کی بات پر غور کر سکیں وہ ان جانوں کو یوں تباہ ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ رسول کے نواسے سے بڑھ کر مسلمانوں کی جانیں کسے عزیز ہو سکتی ہیں۔ وہ ان جانوں کو بہتر سے بہتر قربانیوں کے لیے صرف کرانا چاہتے تھے۔"
چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسین کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت سے فوج عمر سعد سے الگ ہو کر حسین کی جانب آ گیا اور آپ کی نصرت میں جان نثار کی۔

حقیقت میں ایک داعی حق کی بڑی کامیابی ہے اگر وہ کسی ایک انسان کو بھی گمراہی سے نکال کر ہدایت تک پہنچا دے اور یاد رکھیے کہ حسین کے اصول کی یہ ایک بڑی فتح صرف اس رات کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

ع۵[2] "حسین نے مع اپنے ساتھیوں کے تمام رات عبادت میں بسر کی وہ محض قادر مطلق سے مدد کے طالب تھے وہ محض اس امید میں زندہ تھے کہ کل شہید ہوں گے۔"

آپ نے کل کی جنگ کے موقع کے لیے امکانی حد تک حفاظت کا سامان بھی کیا۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ حسین اُس باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر نوجوانی سے لے کر بڑھاپے تک میدان جنگ میں گزری اور حسین نے بھی آنکھیں کھول کر بڑے بڑے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

معرکے دیکھے مگر جیسی سپہ سالاری کا موقع حسین کو درپیش تھا ویسا اس کے پہلے اسلام کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

اب جنگ کے ٹلنے کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امام کے ساتھ فقط جنگ کے سپاہی نہ تھے بلکہ عورتیں اور بچے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد انتہائی کم اور دشمن کی سپاہ حد سے زیادہ تھی۔ کوفہ میں اس عمومی اعلان کے بعد کہ جو قتل حسین کے لیے نہ جائے گا اُس کا گھر گرا دیا جائے گا اور وہ خود قتل ہو گا، کوفہ کے ہر طرح ہی کے لوگ کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔

شمر جو ایک پست فطرت اوباش انسان تھا اپنے ساتھ بہت کمینے بدمعاش کوفہ کے آدمی معرکۂ کربلا میں لے آیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ قتل و غارت کے موقع پر اس قسم کی باتوں سے نہیں چوکتے جنھیں شریف لوگ اور بڑے سپاہی اپنی شرافت اور سپاہیانہ آن بان کے خلاف سمجھ کر ہرگز اختیار نہیں کرتے۔

دیکھیے ص ۹۳

حضرت نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کا قیام کھلے ہوئے میدان میں دشمن کو چاروں طرف سے ہجوم کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں سراپردۂ حرم کی حفاظت آپ کی زندگی ہی میں غیر ممکن ہو جائے گی۔ یہ خیال کر کے آپ نے کربلا کی سرزمین پر تمام اطراف میں گردش کی۔ ایک خاص موقع لشکرگاہ اور حرم سرا کے لیے مناسب نظر آیا جہاں تین طرف سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا مدور شکل میں اس طرح آ کر ملتا تھا جس سے ہلال کی شکل پیدا ہو۔ اسی کا نام "حائر" ہے جو شخص اس دائرہ میں آ جاتا وہ تین طرف سے محفوظ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہو جاتا۔ مگر یہ پناہ وہی لے سکتا ہے جس کے پاس کافی مقدار میں آب و طعام موجود ہو۔ امام اگر شروع سے یہاں خیمہ زن ہوتے تو ساتویں سے پہلے ہی دشمن راستہ روک کر بھوک اور پیاس کے شکنجہ میں کس لیتا۔ لیکن امام کو اس کے پہلو میں جنوب کی طرف ایک طولانی سلسلہ ٹیلوں کا ملا جو اُس پہلے موقع سے زیادہ مناسب صورت رکھتا تھا اس لیے کہ جو شخص اس کے دامن میں قیام کرے

وہ شمال اور مغرب کی جانب سے چھوٹی پہاڑیوں میں محصور ہو گا اور مشرق و جنوب کی جانب وسیع میدان جنگ حرب و ضرب کے لیے موجود ملے گا۔ حضرت نے اپنے حرم سرا اور خیمہ گاہ کے لیے اس جگہ کو منتخب فرمایا تھا اور شب عاشور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملالیں اور ہر خیمہ کی طناب کو دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرا دیں کہ اُن میں آگ دے دی جائے جس کے بعد اُس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شب عاشور مکمل ہوئیں اور صبح کو اُس خندق میں آگ روشن کر دی گئی۔ اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیرنے اور چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

(پانچواں باب)

دسویں محرم ۶۱ ھ

(صبح سے عصر تک)

آغازِ حرب۔ تفصیلات۔ لشکروں کی نوعیت اصحابِ حسین کی شخصیت۔ انصار و اقربائے امام کی بے نظیر شجاعت اور حیرت انگیز قربانیاں حضرت امام کا جہاد اور مظلومانہ شہادت

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ یقین کرنا چاہیئے کہ آج کربلا کے میدان میں کوئی آنکھ سوئی نہیں ہوگی اس طرف عبادتِ خدا اشتیاق شہادت، بی بیوں میں اضطراب، بچوں میں گھبراہٹ اور سب سے بڑھ کر پیاس کی بے چینی۔ دوسری طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی، تدابیرِ جنگ میں مشورے اور صبح کا انتظار۔

اب [۱] رات ختم ہوئی اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا حسین نے اپنے بیٹے علی اکبر سے کہا کہ بیٹا اذان دو۔ اذان کے لیے علی اکبر سے بہتر کون ہو سکتا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ وہ آواز اور شکل میں بالکل رسول کی شبیہ تھے۔ اذان کا کیا مقصد ہے؟ اگر ہم اس کی تحلیل کریں تو اس کا مقصد محض خدا کی عظمت ثابت کرنا اور اچھے کردار کے لیے دعوت دینا ہے۔ اس وقت اذان کا مقصد یہ بھی تھا کہ یزیدیوں کو یہ احساس ہو جائے کہ حسین اور اُن کے ساتھی مسلمان ہیں اور اسلام مسلمانوں

---

[۱] سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کے ساتھ جنگ کی ممانعت کرتا ہے حسین اس طرح پھر یزیدیوں کو متنبہ کر دینا چاہتے تھے
نماز صبح نہایت خضوع و خشوع سے ادا کی گئی جس کی نظیر تاریخ میں ملنا ناممکن ہو"۔

عام انسانی دل و جگر کے معیار پر خیال ہوتا ہے کہ اس وقت اصحاب حسین پر عجب ہراس کا عالم ہو گا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو دشمن کی فوج کا عظیم سمندر موجیں لیتا ہوا نظر آتا ہو گا اور اپنی ہستی اس میں حباب کی سی نظر آ رہی ہوگی مگر نہیں، ایسا نہیں تھا۔ اُن کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ اُن کے سینوں میں خوشی اور مسرت کی لہریں تھیں اور اُن کے چہروں پر فرحت و انبساط کی سُرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے ویسے آج خوش نظر آ رہے تھے جیسی پرمذاق باتیں کبھی نہ کرتے تھے ویسی آج کر رہے تھے۔

امام کربلا میں واجبات نہیں بلکہ مندوبات شرع کو بھی ادا کر رہے تھے، طرز عمل صاف اطمینان و سکون نفس کا ترجمان تھا چنانچہ نماز و تعقیبات سے فراغت کے بعد فوج دشمن میں تو جنگ کی آخری تیاریاں ہو رہی تھیں اور امام ایک خیمہ میں غسل و آداب طہارت ادا کرنے تشریف لے گئے۔ عبدالرحمٰن بن عبد ربہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی دونوں بزرگ اصحاب میں سے دروازہ پر بیٹھے۔ اس انتظار میں کہ حضرت باہر تشریف لائیں تو ہم خیمہ میں جائیں۔ حالت یہ تھی کہ دونوں آدمی دو بے تکلف دوستوں کی طرح ملے بیٹھے تھے کہ شانہ سے شانہ لڑ رہا تھا اور آپس میں لطف آمیز جھگڑا ہو رہا تھا کہ حضرت کے باہر تشریف لانے کے بعد کون پہلے خیمہ میں داخل ہو۔ اسی میں بریر نے عبدالرحمٰن سے کچھ دل لگی کی۔ عبدالرحمٰن نے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے" بریر نے کہا خدا کی قسم میرے قوم و قبیلہ والے اس بات کو جانتے ہیں کہ میں نے جوانی اور بڑھاپے میں کبھی اس طرح کی مذاق کی باتوں کو پسند نہیں کیا مگر مجھے تو اس وقت اپنے مستقبل کی وجہ سے خوشی ہے۔ خدا کی قسم ہمارے اور حوران جنت کے درمیان بس اتنا فاصلہ ہے کہ یہ لوگ تلواریں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے

کہ کسی طرح یہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں۔"

بے شک یہ اپنی حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین کا نتیجہ ہے یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے۔

اتنی دیر میں مخالف فوج میدان جنگ میں آگئی اور اُس نے اپنے پرے جمائے اور لشکر کی ترتیب ہوئی۔ میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی۔ میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی اور پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔ امام حسین بھی جہاد کے میدان میں آ گئے یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کو پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بیس تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو۔ اکثر مورخین کے بیان کے مطابق یہ بتیس سوار اور چالیس پیادے سے زیادہ نہیں تھے اور دینوری اور طبری ایسے قدیم مورخین نے بھی اس کی تصریح کی ہے (تاریخ طبری ص۲۴۱ - الاخبار الطوال ص۲۵۳) مگر واقعہ کربلا کی جنگ اور مجاہدین کے ناموں کے تفصیلات اور دوسرے واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی ——— ممکن ہے کہ تاریخ میں جو تعداد درج ہو وہ اُن بہادروں کی ہو جو صبح عاشور باقاعدہ سپاہی کی حیثیت رکھتے تھے اور فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلۂ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان جہاد میں آگئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جا سکتے تھے۔ ع۵ یہ سب کے سب پیدائشی بہادر تھے۔ اُنھوں نے بہادروں کی زندگی گزاری تھی اور بہادری کی موت مرنا چاہتے تھے۔ وہ سب کے سب بھوکے پیاسے متردد اور متفکر تھے لیکن ہر ایک اپنی جگہ کوہ ثبات تھا۔ اُن کے چہروں پر کسی پریشانی کا نشان نہ تھا۔ لبوں میں مایوسی نہ تھی اور زبان پر حرف شکایت نہ تھا۔ اُن کے سوکھے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دکھائی دیتی۔ عزم اُن کی پیشانی سے نمایاں تھا

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

اور سچائی اُن کی جبینوں سے عیاں تھی۔ اُن کی ہمت کہہ رہی تھی کہ دشمن کی فوج کا کیا ذکر، اگر ضرورت ہو تو وہ تاریخ عالم کو درہم و برہم کر دیں ۔"

امام نے اپنے ہاتھ درگاہ خدا میں اٹھائے اور یہ دعا پڑھی ——— موازنہ کیا جا سکتا ہے نبی خدا عیسیٰ کی آواز میں جو بائبل کی نقل کی مطابق صلیب پر بلند ہوی تھی ایلی ایلی لما سبقتنی "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" اور نبی زادہ کی دعا میں جو اس سیلاب مصیبت کے اندر اُس کے لبوں پر جاری تھی :-

"خداوندا تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبلۂ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پر مجھے ہر مہم میں جو در پیش ہو بھروسا ہے۔ کتنے صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست اُن میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن اُن میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ میں اُن کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا ہی نہیں جانتا۔ تو اُس تکلیف کو دُور کرتا اور اُس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطلب کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین۔ میسرہ پر حبیب بن مظاہر اور علمدار عباس بن علی قرار دیے گئے (الاخبار الطوال ص ۲۵۲)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لشکروں کی نوعیت پر ایک مختصر لیکن ضرورت کے لحاظ سے کافی تبصرہ کر دیا جائے۔

عام طور سے حضرت امام حسین کے مقابل والی فوج کو "شامی فوج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اس اعتبار سے درست ہے کہ وہ سلطنت شام کی محکوم فوج تھی مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرزمین کربلا پر روز عاشور اہل شام میں سے کسی ایک شخص کی بھی موجودگی ثابت نہیں ہے اور اس فوج میں کسی ایک شخص کے

متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ باعتبار اصل ونسل "شامی" تھا۔ جتنی فوج واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسین کے سامنے موجود تھی وہ تمام تر "کوفی" لوگوں کی تھی اور یہ ایک سیاست تھی جو یزید نہیں بلکہ اُس کے باپ امیر معاویہ کے دور رس دماغ کا نتیجہ تھی کہ حضرت امام حسین کے قتل کے لیے اہل کوفہ ہی سے کام نکالا جائے اور اسی لیے معاویہ نے سرجون اپنے غلام کو یہ وصیت سپرد کی تھی کہ اُن کے بعد کوفہ کا گورنر عبید اللہ بن زیاد کو قرار دیا جائے اور یہ وصیت سرجون نے یزید سے اُس وقت بیان کی جب حضرت مسلم بن عقیل کے بارے میں نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نے رواداری سے کام لیا اور اس کی شکایت ہوا خواہان بنی امیہ نے کوفہ سے دمشق لکھی اور اس بنا پر یزید کو فکر ہوئی کہ وہ نعمان کو معزول کر کے کسی دوسرے "وفادار" اور "موزوں" شخص کو کوفہ کی گورنری پر مقرر کرے۔ یزید نے اپنی ناتجربہ کاری سے اس سیاست کو سمجھا ہو یا نہیں مگر امیر معاویہ نے یہ وصیت صرف اس لیے کی تھی کہ انھیں اپنی دوراندیشی سے یہ خوب اندازہ تھا کہ حضرت امام حسین کا معاملہ یزید کے لیے درپیش ہوگا اور اس موقع پر اگر کوفہ والوں کو حسین کے خلاف کوئی صف بستہ کر سکتا ہے تو وہ صرف ابن زیاد۔ اس سیاست پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ یزید کو حسین کے مقابلہ کے لیے براہ راست دمشق سے کوئی فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ ابن زیاد نے صرف اہل کوفہ ہی کے ذریعہ سے اس مہم کو سر کر دیا۔

اس سیاست کا مقصد یہ تھا کہ قتل حسین کی ذمہ داری براہ راست بنی امیہ پر عائد نہ ہو اس لیے کہ کوفہ حضرت علی کا رہ چکا تھا اور وہاں کے لوگ عام طور سے شیعہ سمجھے جاتے تھے خود عبید اللہ کا باپ زیاد ایک وقت میں شیعیان علی میں محسوب رہ چکا تھا۔ اس سے یزید نے خود بھی بعد میں یہ فائدہ اُٹھایا کہ اُس نے اپنی برأت قتل حسین سے ثابت کی اور صفائی پیش کرنا چاہی یہ کہکر کہ "خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر جو کچھ کیا وہ اُس نے کیا" اور آج تک اس سے ہوا خواہان بنی امیہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں یہ کہکر کہ یزید نے قتل حسین کا حکم نہ دیا تھا اور یہ کہ "قاتلان حسین شیعہ ہی تھے"

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ یزید یا تو اس سیاست کو دیر میں سمجھا تھا اور یا حضرت امام حسین کی شہادت کی خبر سُن کر وہ اپنی مادی قوت پر اتنا نازاں ہو گیا تھا کہ کچھ عرصہ تک اُس نے یہ خیال کر لیا کہ اب اُسے اس احتیاطی سیاست کی ضرورت باقی نہیں ہے یعنی اُس نے خیال کر لیا کہ جب حسین قتل ہو ہی گئے تو اب دنیا کو معلوم بھی ہو جائے کہ ہم نے قتل کیا تو ہمارا بنایا کیا جا سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس نے اہلبیت حسین کو براہ راست کوفہ سے مدینہ بھیج دیے جانے کی ہدایت نہیں کی بلکہ دمشق میں طلب کیا اور بھرے ہوئے دربار میں مختلف طریقوں سے اہلبیت کے ساتھ عداوت اور اُن کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان ضروری سمجھا۔ یہ ایک دلدوز تاریخی باب ہے جس کا تذکرہ بعد کو آئیگا۔ مگر بعد میں اُس کو محسوس ہوا کہ "قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے" اور اس احساس مرگ سے بچنے کی "حرکت مذبوحی" تھی جو بعد میں اُس اظہار انفعال، یا اظہار برأت کی شکل میں نمایاں ہوئی جسے آج بعض بھولے بھالے مورخین یا سلطنت بنی امیہ کے خیر سگال یزید کی واقعی براءت کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اگر کہیں یزید نے برابر اُس سیاست کو پیش نظر رکھا ہوتا جو اُس کے باپ کے "بے پناہ تدبر" نے سامنے رکھی تھی تو یقین رکھیے کہ واقعۂ کربلا میں حسینی مفاد بہت مشکل سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہ تو یزید کی ناتجربہ کاری تھی جس نے معاویہ کی سیاسی مصلحت کو پامال کر دیا اور حسین کو اُس آخری فتح کے حاصل کرنے کا موقع دے دیا جو بنی امیہ کے خلاف دائمی اور لازوال حیثیت رکھتی ہے۔

بہرحال یزید نے اپنے لیے صفائی پیش کرنے کا موقع باقی رکھا ہو یا نہیں مگر شیعیان کوفہ کے دامن پر اس سیاست سے یہ ایک بڑا دھبّا ہو گیا کہ اُنھوں نے خود ہی حضرت امام حسین کو بلایا اور خود ہی آپ کے قتل پر تیار ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوفہ بے وفائی میں ضرب المثل ہو گیا مگر یاد رکھیے کہ یہ صرف اہل کوفہ کی بدقسمتی اور سیاست بنی امیہ کی ایک شعبدہ کاری تھی۔ یہ تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کوفہ میں حضرت علی بن ابی طالب کی شہادت سے واقعۂ کربلا تک بیس برس کی

مدت میں شیعیانِ علی کے استیصال کی مسلسل کوشش کے بعد اس جماعت کی کوئی اکثریت اور قابلِ لحاظ طاقت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ نہ جناب مسلم کی بیعت کرنے والے ۱۸ ہزار آدمی سب ہی "شیعیانِ علی" کہے جا سکتے تھے "شیعہ" بہت محدود تعداد میں تھے اور خاص خاص لوگ تھے جنھوں نے حضرت امام حسین کو خطوط لکھے تھے اور جنھوں نے کوفہ کی رائے عام کو آپ کے موافق بنانے کی کوشش کی تھی اور جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے اگر ابن زیاد کی اچانک حکومت صورتِ حال میں یکایک انقلاب پیدا نہ کرتی ــــ پھر بھی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان خطوط لکھنے والوں میں سے جو جماعت شیعہ کے نام سے گئے ہیں ایک شخص کی بھی موجودگی واقعۂ کربلا میں امام حسین کے مقابلہ میں پائی نہیں جاتی بلکہ اُن میں سے حبیب بن مظاہر نے کربلا میں امام حسین کے قدموں پر جانبازی کے ساتھ دم توڑ کر ہمیشہ کے لیے سرخروئی حاصل کی اور اُن اشخاص میں سے جو خطوط لے جانے والے تھے سعید بن عبد اللہ حنفی نے بے نظیر طریقہ پر جاں نثاری جس کی تفصیل بعد کو آئے گی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن کدن ارحبی بھی شہید ہوے اور قیس بن مسہر صیداوی نے اپنی زندگی کے آخری نفس تک جس سچائی اور استقلال کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کیا اُس کا تذکرہ صفحۂ تاریخ پر زریں حرفوں میں ہمیشہ ثبت رہے گا۔ بے شک ایک خط جو سب سے آخر میں کسی سازش کے ماتحت یا رائے عامہ سے مرعوب ہو کر کوفہ کے روسائے قبائل میں سے سات آدمیوں کے دستخط سے گیا تھا اُن کے متعلق پہلے سے یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ مخالفین اہلبیت میں سے ہیں اور اسی لیے شیعیان کوفہ کی اجتماعی کارروائیوں میں انھیں نہیں شریک کیا گیا تھا۔ یہ لوگ ایسے تھے جو واقعۂ کربلا میں شریک بھی ہوے۔

ابن زیاد کی ہنگامی حکومت اور جناب مسلم و ہانی کی دردناک شہادت کے بعد ظاہر ہے کہ ہر اُس شخص کے لیے جس نے حضرت امام حسین کو خط لکھا ہو کوفہ کی زمین تنگ ہو گئی تھی اس لیے کچھ لوگ چھپ گئے۔ کچھ کوفہ سے مختلف اطراف میں نکل گئے اور جو بچ گئے انھیں ابن زیاد نے تلاش کر کر کے قید کر لیا چنانچہ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی

جو جناب مسلم کے خروج کے موقع پر کوفہ میں موجود نہ تھے اور اُسی دن اطلاع پاکر آئے لیکن ایسے وقت پہونچے کہ مسلم کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور عمرو بن حریث نے رایت امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے اُس کا جان و مال محفوظ رہیگا مختار اس رایت کے نیچے آ گئے مگر اُن کو امان نہ مل سکی اور وہ پابزنجیر کر دئے گئے۔ اسی طرح عبد اللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔ اس سیاست کی نوعیت کا اندازہ ابن زیاد کی اُس تقریر میں جو یزید کی ہلاکت کے موقع پر اُس نے کی ہے اس فقرہ سے ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان بھی ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے (طبری ج ۷، ص ۱۰) نیز اُس موقع پر جبکہ ہلاکت یزید کے بعد ابن زیاد بصرہ سے فرار ہو کر دمشق جا رہا تھا تو راستے میں لیساف بن شریح یشکری سے اُس نے ایک گفتگو کے دوران میں کہا کہ میں ابھی اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش میں نے ان لوگوں کو جو قید خانہ میں بند تھے نکال کر گردن مارنے کا حکم دے دیا ہوتا (طبری ج ۷، ص ۲۰)

یہ بھی آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ناکہ بندی ہوئی تھی ایسی سخت کہ نہ کوئی باہر سے کوفہ کے حدود میں آ سکتا تھا نہ کوئی کوفہ کے حدود سے باہر نکل سکتا تھا اس طرح ایک تو حضرت امام حسین کے نقل و حرکت کی اطلاع ہی کوفہ کے عام لوگوں تک پہونچنا دشوار بلکہ غیر ممکن تھی۔ آپ کے قاصد قیس بن مسہر صیداوی اور عبد اللہ بن یقطر جو آپ کی روانگی کی اطلاع لے کر جا رہے تھے وہ تو خود ہی ابن زیاد کے سپاہیوں کے ہاتھ میں قید ہو گئے تھے اور قتل کر دیے گئے تھے پھر عوام تک اطلاع پہونچتی تو کیسے اور اگر کوئی کسی اتفاقی طریقہ سے اطلاع پاکر جانا بھی چاہتا تو وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ غیر معروف راستے سے امام حسین کے پاس پہونچنے کی کوشش کرے۔ اُس میں بھی گرفتار ہونے کا اندیشہ برابر تھا۔ یہاں تک کہ طرماح بن عدی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ غیر معروف راستے سے آکر امام حسین سے ملحق ہوئے تو حُر نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ لوگ جو اہل کوفہ

میں سے ہیں آپ کے ساتھ مکہ سے نہیں آئے ہیں لہذا میں ان کو گرفتار کرتا ہوں یا کوفہ واپس جانے پر مجبور لیکن حضرت کے اس فرمانے پر کہ اب جبکہ میرے پاس پہونچ گئے تو میرے ہی اصحاب و انصار میں داخل ہیں اور اب ان کی حفاظت مجھ پر فرض ہے لہذا ناممکن ہے کہ میں ان کو تمھارے سپرد کردوں۔ اُس کو ساکت ہونا پڑا (طبری ج ۶ ص ۲۳)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ، بریر ہمدانی ابوثمامہ صیداوی وغیرہ تمام ممتاز انصار حسین جو اہل کوفہ میں سے تھے امام سے آکر ملحق نہیں ہوئے تھے حالانکہ یہ کربلا پہونچنے سے دو ہی ایک دن قبل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اُس موقع پر جب امام حسین کربلا پہونچ چکے تھے تو آپ سُن چکے ہیں کہ خود ابن زیاد نے کوفہ سے نکل کر نخیلہ میں اپنا مرکز قرار دے لیا تھا اور وہیں افواج کا معائنہ ہوتا تھا اور انھیں ترتیب دے کر کربلا روانہ کیا جاتا تھا۔

اس صورت میں بالکل ظاہر ہے کہ کوفہ کی جماعت شیعہ میں جو حسین کے ہمدرد ہو سکتے تھے اور جن کو نصرت کا خیال ہو سکتا تھا اُن میں سے ایک کثیر تعداد پابزنجیر کر لی گئی تھی۔ اس کے علاوہ حدود کی ناکہ بندی نے کوفہ کے رہے سہے اشخاص کے لیے جن میں جذبۂ نصرت حسین ہو سکتا تھا آپ تک پہونچنا غیر ممکن بنادیا تھا اور اگر وہ آنے کا قصد کرتے تو یقیناً نخیلہ میں کہ جو بالکل کوفہ کے نکڑ پر کربلا کے راستے میں تھا گرفتار کر لیے جاتے یا آگے بڑھ کر قادسیہ اور خفان اور قطقطانہ و لعلع کے منازل میں سے کسی میں دستگیر ہو جاتے۔

اس کے بعد کیا شیعیان کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ نہیں ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ افراد جو حسینی دعوت کے بانی و مبلغ اور اس تحریک کے داعی و مروج تھے، جنھوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے اُن کے ورود کے موقع پر پہلے ہی جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسین بن علی تک پہونچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کردیں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسین بن علی کی نصرت

کے لیے نہ پہونچے یا نہ پہونچ سکے ان میں سے کسی متنفس کا حسین کے مقابلہ میں کربلا کے میدان میں موجود ہونا پایا نہیں جاتا۔

یہ دنیا کی ناانصافی اور عیب جوئی کی عادت ہے کہ اس نے امام حسین کے مقابل والی فوج کو تو دیکھا کہ وہ اہل کوفہ ہیں اس لیے کوفہ کو ہمیشہ کے لیے روسیاہی کا تمغہ دے دیا لیکن حسین کا ساتھ دینے والوں کو نہ دیکھا کہ ان میں کتنے اہل کوفہ ہیں اور وہ کتنے مشکلات کے ہفتخوانوں کو طے کر کے پہونچے ہیں اور کیسے سخت موقع پر انھوں نے حسین کا ساتھ دیا ہے۔ اگر دنیا اس پر نظر ڈالتی تو اسے ماننا پڑتا کہ اہل کوفہ نے جن سخت مشکل رستوں سے گزر کر اور سخت ماحول میں رہ کر ثبات قدم دکھلایا ہے اس کی نظیر صفحۂ تاریخ پر نہیں مل سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ کوفہ کو خراج تحسین پیش کرتی نہ یہ کہ طوق ملامت میں گرفتار کرتی۔

اس معاملہ میں اہل کوفہ کی مثال بالکل "مسلمان جماعت" کی سی ہے۔ ایک مخالف اسلام شخص کو یہ موقع حاصل ہے کہ واقعۂ کربلا کو ملت اسلامیہ کے بدترین معائب میں شمار کرے اس لیے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اپنے نبی کی اولاد کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو جیسا مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی وفات کے صرف پچاس برس بعد اس کے نواسے کے ساتھ سلوک کیا۔ مگر ایک منصف مزاج انسان کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ واقعۂ کربلا کو ملت اسلامیہ کے بہترین کارناموں میں شمار کرے اس لیے کہ کسی مذہب کے ماننے والوں نے اس مذہب کی حفاظت کے لیے ایسی منظم اور بے مثال قربانی نہیں پیش کی جیسی حسین اور ان کے ساتھ والوں نے اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے پیش کی۔ جس طرح ایک شخص کا اسلام کے مقابلہ میں صرف تاریک پہلو کو پیش کرنا ایک بڑا ظلم سمجھا جائے گا اسی طرح کوفہ کے بارے میں صرف تصویر کے سیاہ رخ کو سامنے رکھنا ایک بدترین ناانصافی ہے بلکہ اس کا روشن پہلو بھی سامنے رکھنا تاریخ کی منصفانہ نگاہ کا فرض ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جسے کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا اس وقت جب ابوالعباس سفاح

کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عیاش میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا ہے اور ابن عیاش نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتے ہوئے یہ کہا کہ کوفہ کی بہادری کا کیا کہنا کہ اُن میں جتنے بھی تھے وہ یا حسین اور اُن کے اہلبیت کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا اُن کا مال و اسباب لوٹنے والے یا اُن کی لاشوں کو پامال کرنے والے۔ یہ سُنکر ابن عیاش نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنے دینے پر اُتر آئے۔ تم نے امام حسین کے والد بزرگوار حضرت علی بن ابیطالب کو قتل کیا (ابن ملجم بصرہ کا رہنے والا تھا) رہ گئے اہل کوفہ۔ اُن میں سے حضرت امام حسین کے ساتھ روز شہادت چالیس آدمی تھے اور مجموعاً آپ کے سپاہیوں کی تعداد ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام حسین پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو بھی قتل کیا۔ (کتاب البلدان ابن فقیہ مطبوعہ لیدن ص ۱۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف وجوانب کے قبائل جن کا مذہب صرف اطاعت شیوخ ہے اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتل حسین میں صرف حکم حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ڈیوٹی کا انجام دینا اور جائزہ و انعام کی ہوس تھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسین سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضامند نہ تھے مگر اُن میں اتنی قوت ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ بہت سے ایسے بھی جوان اور نو عمر تھے جو حسین کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ تھے اور وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسین کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ دہان کی خلقت کے دل و دماغ مقصود وہ تھے جو دنیا کے تمام محرکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں

سے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور اُن کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور اُن کے لیے یہ عجیب معمہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد وزاہد اور پرہیزگار لوگ آج کس طرح میدان جنگ میں آگئے ہیں۔ ان شخصیتوں کا فوج مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ اُن کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ آپ کو واقعۂ کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کی زبان سے یہ سننے کا موقع ملتا ہے کہ فوج مخالف نے حسینی سپاہیوں کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقتہً یہ فرار صرف مادی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل ہے۔

حقیقت میں یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کے لیے آخر آخر وقت تک فوج کی اکثریت سر اندختہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ وانعام وغیرہ کے ترغیبات اور عتاب حکومت کے تازیانے ہی تھے جو رُکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط و نظام ایک بے مثال نمونہ ہے یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا، نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے کا سوال۔ اُن کا کوئی اقدام جوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جس وقت تک امام اتمام حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں اُس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خود رائی یا خودسری سے کام لے۔ چنانچہ اُس وقت جب طرفین میں فوجی ترتیب ہو چکی اور صفیں بندھ گئیں، دشمن کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات کیے گئے مگر حسینی سپاہیوں میں سے ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جو بے قابو ہو کر ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی کہ آغاز جنگ کی ذمّہ داری امام حسین پر عائد ہو سکے۔

آپ سُن چکے ہیں کہ امام نے پشت خیام پر خندق کھدوادی تھی اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی۔ فوج کی ترتیب کے بعد اپنی اُس غیر معمولی اکثریت کے باوجود دشمن کو کمینگاہوں اور حملہ کے بہترین موقعوں کی فکر تھی اسی خیال کے ماتحت سہی

کہ اپنے لشکر کا کچھ نقصان ہوئے بغیر ہی ان مٹھی بھر لوگوں کا خاتمہ کر دیا جائے، اس لیے فوج کے لوگ پشت خیام پر بھی جاتے تھے کہ اُس طرف سے حملہ کا موقع ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق جو اُس طرف سے گزرا اور خیموں کے اوپر نظر ڈالی اور چاروں طرف آگ شعلہ ور نظر آئی تو اُس نے پکار کر امام کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم نے قیامت کے دن کے پہلے ہی اپنے لیے دنیا میں آگ کا سامان کر لیا"۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا۔ حضرت نے اصحاب سے فرمایا یہ کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے شمر بن ذی الجوشن ہے۔ اصحاب نے عرض کیا ہاں فرزند رسول یہ وہی ہے۔ حضرت نے فرمایا "جہنم کی آگ میں جلنے کا تو زیادہ مستحق ہے"۔ مسلم بن عوسجہ نے کہا "میری جان آپ پر فدا اجازت ہوتی ہے کہ ایک تیر اس کو مار دوں کیونکہ یہ اس وقت بالکل زد پر ہے تیر خطا نہیں کر سکتا اور آدمی بڑا فاسق و فاجر ہے"۔ حضرت نے فرمایا "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا"۔

ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ سپاہیوں میں سے ہر ہر فرد کا ایسے جوش کے موقعوں پر اتنا ذمہ داری کا احساس کرنا بہت دشوار ہے مگر یہ واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تیر جو مسلم بن عوسجہ یا کوئی اور اس وقت چلا دیتا وہی بنائے جنگ بن کر واقعۂ کربلا کی نوعیت کو بالکل تبدیل کر سکتا تھا۔ جیسا کہ جنگ جمل کے بارے میں بعض مورخین یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ جناب امیر کی فوج کے بعض غیر ذمہ دار لوگوں نے خود سے یورش کر کے اس جنگ کو ایسے غیر شعوری طور پر چھیڑ دیا کہ کوئی ایک فریق بھی اُس کا ذمہ دار باقی نہ رہا۔ حضرت امام حسین کی پوری کوشش یہی تھی کہ ایسے کسی پہلو کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہو کہ فوج مخالف اپنے تشدد میں حق بجانب ثابت ہو یا اُس کا تشدد وقت کی مجبوری کا نتیجہ سمجھا جا سکے۔ اس بارے میں حسین کو جتنی کامیابی حاصل ہوی اس میں آپ کے سپاہیوں کے بے مثال ضبط و نظام کو بڑا دخل حاصل ہے۔

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حسین کا مقصد کربلا کی جنگ سے کیا تھا؟ یہ کہ اپنے دشمن کے نمائشی مذہب کی حقیقت کو ظاہر کر کے اُس کے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرا دیں کہ اُس کو اسلام سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے۔ اس کے لیے آپ نے مصالحت کی گفتگوئیں کیں۔ ملک عرب کو چھوڑنے اور دربدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اسباب اشتعال پیدا ہونے کے بعد بھی اپنے ساتھیوں کو اقدام جنگ سے روکا اور تمام لڑائی کی تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی۔ دوسرے آپ کے خلاف دشمنوں کے طرزِ عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی کے عمل کی اُس کی بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدود مملکت میں یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ پیغمبر نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم اُن کے وارث جائز ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ آپ اپنے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو تمام مجمع کے سامنے اس طرح واضح کر دیں کہ کسی ایک فرد کی بھی ناواقفیت کا شبہہ نہ رہ جائے، نیز آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اُس کے جرم کی اہمیت کو ہر ایک پر بالکل روشن کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ دشمن کے پاس اپنے گناہ کا کوئی عذر باقی نہ رہے اور دوسروں کو بھی اُن کی نسبت کسی "حسنِ ظن" یا "حمل بر صحت" کا راستہ نہ ملے۔ امام حسین دیکھ چکے تھے کہ اُن کے پہلے اُن کے والد بزرگوار کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو "خطائے اجتہادی" کا پردہ ڈال کر قابل معافی سمجھ لیا گیا۔ حسین کے خلاف تلوار اُٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح طبقہ یا ہوا خواہان بنی امیہ اُس سے فائدہ اُٹھانے سے چوکتے تھوڑے ہی اور اس سے حسین کا مقصد پامال ہو جاتا۔ اس کے لیے حسین نے وہ سب کچھ کیا جسے "اتمام حجت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے "اصرار گناہ" یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

فوجوں کی ترتیب ہو جانے کے بعد معلوم نہیں حملہ میں انتظار کس بات کا تھا؟ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی صف بندی کے بعد دونوں طرف کے لشکر کافی وقت گزرنے تک بالکل خاموش کھڑے رہے۔ معلوم ہوتا ہے دشمن اس کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینی فوج کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے مگر ایسا نہیں ہوا اس کے برخلاف امام نے یہ چاہا کہ اتمام حجت کردیں۔ سب سے پہلے آپ نے ایک ناقہ طلب فرمایا۔ معلوم ہے کہ میدان جنگ کی سواری ہے گھوڑا۔ امام ناقہ پر بیٹھ کر گویا عملاً اظہار کر رہے تھے اس بات کا کہ ہم از خود لڑنا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ اس طرح آپ بلند بھی ہو گئے جس سے آپ کی تقریر مخالف مجمع میں دور تک سُنی جاسکتی اور آپ کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ قرآن منگوایا اور اُسے اپنے سامنے رکھا پھر صفوف دشمن کے سامنے آئے۔ بلند آواز سے جو فوج کے اکثر حصہ تک پہونچ سکتی تھی ارشاد فرمایا، "صاحبو! میری بات سنو! جلدی سے کام نہ لو یہاں تک کہ میں جیسا کہ میرے ذمہ تمہارا حق ہے تم کو نصیحت کا فرض ادا کردوں اور تمہارے سامنے اپنا عذر پیش کردوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کرلیا اور میری بات کو سچا سمجھا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہیں میری مخالفت کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر تم نے میرے عذر کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو پھر تم سب جمع کرلو اپنے مجمع کو اور اکٹھا کرو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں کو اور کوئی کشمکش اُٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے میرا خاتمہ کردو اور مجھے ایک دم کی بھی مہلت نہ دو۔ میرا مددگار بس خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اچھے اعمال والوں کا بس مددگار رہے" آواز حضرت کی خیمہ میں پہونچی تو اہل حرم سے گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے جناب عباس و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا جب آواز گریہ کی موقوف ہوگئی تو حضرت نے حمد الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف اُس کی ذات اقدس کے لحاظ سے ذکر فرمائے پھر حضرت رسالتمآبؐ پر درود بھیجا اور حضرت کے اوصاف و فضائل

کو تھوڑی دیر تک بیان فرماتے رہے - راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت کے پہلے اور آپ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا "ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو - دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں مُنھ ڈالو - غور تو کرو کہ تمھارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں نہیں ہوں تمھارے نبی کا نواسا اور اُن کے وصی، اُن کے چچازاد بھائی اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہ سید الشہدا میرے ہی باپ کے چچا نہیں تھے اور کیا جعفر طیار میرے ہی چچا نہیں تھے - کیا یہ حدیث تمھارے گوش زد نہیں ہوی جو زبان زد خلائق ہے کہ حضرت رسولخدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ میں جب سے سن تمیز کو پہونچا کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دینگے - پوچھو تو جابر بن عبد اللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے، وہ تمھیں بتلائینگے کہ انھوں نے رسالتمآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہو پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ شمر نے کلام قطع کیا اور بول اٹھا کہ میں خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو (قرآن میں منافقین کی نسبت ہے "و من الناس من یعبد اللہ علی حرف - اُس کا مقصود تھا کہ میں مسلمانوں نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں)

اصحاب امام خاموش کھڑے ہوئے امام کی تقریر سُن رہے تھے - انھیں شمر کی یہ بدتمیزی اور امام کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوی حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا "سچ ہے میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستّر حرفوں پر کرتا ہے (یعنی

انتہائی مکار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے۔ ایک بات پر قائم نہیں رہتا) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگادی ہے"۔ امام نے پھر سلسلۂ تقریر جاری کیا فرمایا "اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسول کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں، کوئی نبی کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے نبی کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر کیوں آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا بدلا لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کیا ہے۔ یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہے؟ یا کسی زخم کا قصاص چاہتے ہو؟ ایک خاموشی سی چھائی رہی اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف اور ہزاروں انسان دوسری طرف۔ بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حسن عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو جیسے حسینؑ اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے۔ ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس ۳۰ ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا۔ ؏ "یزیدیوں کو موقع تھا کہ وہ حسینؑ سے کہتے کہ تم نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے اور اس وجہ سے اسلام میں تمھارا وجود مثل ناسور کے ہے وہ اُن الزامات کو جو حسینؑ کے خلاف تھے ایک ایک کر کے اس وقت پیش کرتے لیکن یزیدیوں میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ وہ حسینؑ ایسے معصوم و بے خطا کو کسی الزام سے متہم کرتے اور اُن کے قول میں سچائی کہاں ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے حسینؑ کے سوال کرنے پر وہ سب کے سب بُت بنے رہے اور کوئی الزام پیش نہ کر سکے"۔ کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو ذہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک

؏ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو چیلنج دے رہا تھا اور کسی کو اُس کے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔ اس کے بعد حضرت خصوصی حیثیت سے مخاطب ہوئے اُن افسرانِ فوج کی طرف جنھوں نے کوفہ سے آپ کو آخر میں ایک دعوت نامہ بھیجا تھا۔ حُر سے گفتگو میں یہ صورت پیش آچکی تھی کہ جب اجتماعی طور سے اہلِ کوفہ کی طرف نسبت دے کر کہا گیا کہ تم نے خطوط لکھے تو حُر نے کہدیا کہ میں تو خطوط لکھنے والوں میں نہیں تھا۔ اس لیے اس موقع پر حضرت نے نام بنام اُن لوگوں کو پکارا جنھوں نے خط بھیجا تھا اور یہ لوگ کوئی معمولی درجہ کے سپاہی نہ تھے کہ اُن کے پکارنے کا کوئی حاصل نہ ہو بلکہ اُن میں سے ہر ایک کم از کم ہزار پانچ سو آدمیوں کا سردار تھا۔ آپ نے فرمایا "اے شبث بن ربعی۔ اے حجار بن ابجر۔ اے قیس بن اشعث۔ اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں، لشکر آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ آئیے اور جلد آئیے!" اب معاملہ ان اشخاص کے لیے نازک تھا۔ چار آدمیوں کا نام لے کر یہ انکشاف کیا جا رہا تھا کہ اُنھوں نے خط لکھا۔ گویا اس بڑے مجمع کے سامنے اور یزیدی فوج کے افسر کے سامنے ان لوگوں کی سازش اور منافقت اور اپنی حکومت سے ایک طرح کی بغاوت کا ثبوت مل رہا تھا کیونکہ وہ کوفہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے۔ اُنھوں نے تو وہ خط جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے ہوا کے رُخ کو دیکھ کر لکھا تھا اس خیال سے کہ حسین کے نام اتنے کثرت سے خطوط جا رہے ہیں اور بلایا جا رہا ہے۔ اگر کہیں حسین آگئے اور فضا اُن کے موافق رہی تو ہمارے لیے بھی جگہ باقی رہنا چاہیئے اس لیے اُنھوں نے یہ خط بھیجا تھا مگر اس وقت اتنے گواہوں کے سامنے اُن کی سازش منکشف ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور سلطنت بنی امیہ کی جانب سے راندۂ بارگاہ قرار پا جائیں اس لیے بربنائے ضرورت اُن کو یہاں پر بولنا ناگزیر تھا۔ مگر بولنا کیسا؟ بے غیرتی کے ساتھ۔ وہ بولنا جس میں خود چہرہ کی ہوائیاں، آواز کی تھرتھراہٹ

اور زبان کی لکنت بولنے والے کے جھوٹ کی ترجمانی کر دیں۔ اُنھوں نے کہا اور وہی کہا جو اب بھی عدالتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے یعنی تحریروں سے انکار کیا اور کہا کہ ہم نے اس طرح کے خطوط نہیں لکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا تھا۔ امام نے فرمایا "اللہ اکبر! اتنا کھلا ہوا حقیقت کا انکار! تم نے لکھا اور ضرور لکھا اچھا اگر نہیں لکھا اور تم لوگ میرا آنا ناپسند کرتے ہو تو مجھے واپس چلا جانے دو کسی ایسی جگہ جہاں میں امن و امان کی زندگی گزار سکوں۔"

قیس بن اشعث (جو محمد بن اشعث کا بھائی ہے۔ اس کی بہن جعدہ بنت اشعث امام حسن کی زہر خورانی کی ذمہ دار اور محمد بن اشعث حضرت مسلم کے قتل کا ذمہ دار تھا) نے پکار کر کہا "آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟" حضرت نے فرمایا "تم ایسا کیوں نہ کہو گے؟ تم محمد بن اشعث ہی کے تو بھائی ہو۔ کیا تم اتنے کو کافی نہیں سمجھے کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیدوں اور غلامانہ زندگی کا اپنے لیے اقرار کر لوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔"

عہ "کوفیوں میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں تھی کہ جان و مال کے خوف پر غالب آسکتی۔ پھر بھی شرم سے سر جھک گئے۔"

فوج مخالف کے متاثر ہونے کی پہلی ہی سے امید نہ تھی۔ اپنا فرض پورا کرنا تھا وہ پورا ہو چکا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا، اُتر پڑے اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دو۔

اصحاب حسین آپ کا مقصد بالکل سمجھے ہوئے تھے اس لیے وہ بھی اُسی راستے پر گامزن تھے جس پر امام سالک نظر آتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ یہ تمام مجمع کوفہ کی عام خلقت کا تھا اس لیے کوفہ کے کسی ممتاز مقرر کی تقریر کا اُن پر اثر ہو سکتا تھا۔ اس اعتبار سے

عہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

کہ یہ ہم ہی میں کا ایک ممتاز انسان ہے اور پھر حبیب بن مظاہر تو ہمیشہ سے دوستی حسین کے ساتھ مشہور تھے اور آپ کو کوفہ کی جانب دعوت دینے والوں میں سے تھے اس لیے ہوا خواہان بنی امیہ کے لیے اُن کی تقریر ایسی موثر نہ ہو سکتی تھی جیسی زہیر بن قین کی جو کہ پہلے "عثمانی" گروہ میں داخل تھے اور اب مکہ اور کربلا کے راستے ہی میں وہ امام کے پاس آکر شریک ہوئے ہیں۔ اس لیے فوج مخالف کے سامنے سب سے زیادہ تقریریں اُنھوں نے کی ہیں جن کا اثر ہوا ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہی اثر کیا کم ہے کہ فوج دشمن کے لیے حجت پیش کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا اور ہر طرح اُن کے خلاف اتمام حجت ہو گیا۔ امام کے بے نظیر مگر بظاہر "غیر سودمند" خطبہ کے بعد زہیر بن قین گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرقاب صف سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا:۔ "کوفہ والو! خدا کے عذاب سے ڈرو۔ ایک مسلمان کی گردن پر اُس کے اسلامی بھائی کا یہ حق ہے کہ وہ اُسے خیر خواہانہ نصیحت کرے۔ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی ملت کے تابع ہیں جب تک کہ ہمارے تمھارے درمیان تلوار نہیں کھنچ گئی ہے یعنی جب تک باقاعدہ جنگ نہیں شروع ہو گئی ہے ہم میں تم میں رشتہ قائم ہے اور تم ابھی ہماری طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی تو یہ رشتہ خود بخود ٹوٹ جائے گا اور ہم ایک امت اور تم دوسری امت ہو جاؤ گے۔ یقیناً خدا نے ہماری اور تمھاری آزمائش کی ہے اپنے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم اُن کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور تم کیا سلوک کرتے ہو۔ ہم تم سب کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم کو اُن کی سلطنت کی عمر بھر سوائے بُرائی کرنے کے کوئی اچھا سلوک نظر نہ آئیگا۔ وہ تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے، تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے اور تم کو مثلہ کراتے، تم کو سولیوں پر چڑھاتے اور تمھارے اچھے اچھے حفاظ قرآن مثلاً حجر بن عدی اور اُن کے ہمراہیان اور ہانی بن عروہ وغیرہ ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔"

اسپرٹ کے لحاظ سے امام کے خطبہ اور اس تقریر میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُس کا انداز ایک خاص طور پر انفرادی اور اپنی صفائی، بے جرمی اور تعارف پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس تقریر میں خاص طور پر حکومت کے خلاف ایک سیاسی حیثیت پیدا ہوگئی ہے جس میں دمشق کی شہنشاہی سے زیادہ مقامی حکومت کے اعمال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس خیال سے کہ مخاطب کوفہ کے باشندے ہیں جن کو براہ راست ان مظالم سے سابقہ پڑ رہا ہے مگر یہی اس کا باعث ہوا کہ زہیر بن قین کو اپنی تقریر میں سخت مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ کوفہ والے سلطنت ابن زیاد کے ہوا خواہوں اور خوشامدیوں نے زہیر کو بُرا کہنا شروع کیا اور ابن زیاد کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور کہا "ہم اُس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمھارے سردار اور اُن کے ساتھیوں کو قتل نہ کر لیں یا گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس لے جائیں"۔ زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ہدایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شمر نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش۔ خدا تیری زبان کو خاموش کرے"۔ زہیر نے تیر کی کوئی پرواہ نہیں کی اور شمر سے مصروف کلام ہوگئے۔ شمر کے اس کہنے پر کہ "دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمھارے سردار سب قتل ہوا چاہتے ہیں"۔ زہیر نے بڑی جگرداری اور قوت ایمانی کے ساتھ کہا "تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے؟! خدا کی قسم اُن کے ساتھ مرنا مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگی جاوید حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے"۔ اس کے بعد پھر لشکر کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "اے اللہ کے بندو! ایسے بندگانِ زر کے کہنے میں نہ آؤ۔ خدا کی قسم پیغمبر خدا کی شفاعت اُن لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہوسکتی جنھوں نے پیغمبر خدا کی اولاد کا خون بہایا اور اُن کے مددگاروں کو قتل کیا ہو"۔ امام حسین نے یہ دیکھ کر کہ باتوں کا جواب تیر سے مل رہا ہے اور اتمام حجت کا فرض ادا ہو چکا ہے کسی سے پکار کر کہلوایا کہ "زہیر! واپس چلے آؤ اگر مومن آل فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر دی تھی اور اپنے فرض کو ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے اور تم نے نصیحت کا حق ادا کر دیا ہے مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی فائدہ بھی تو ہو!" اس آواز کو سُن کر زہیر واپس چلے آئے۔

اُن مصالحانہ رجحانات، ان حقیقت ریز بیانات اور بصیرت افروز اظہارات کا کوئی اثر ہو رہا تھا یا نہیں۔ یہ امر بالکل تاریکی میں تھا۔ جب تک کہ حُر کے باطن نے پردہ اُلٹ کر اپنے کو ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کتاب کے ناظرین کے لیے یہ نام کوئی اجنبی حیثیت نہیں رکھتا۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ امام حسین کو کوفہ کے راستے میں ایک ہزار فوج کی جس جمعیت نے آ کر روکا ہے اُس کا افسر حر بن یزید ریاحی تھا وہی امام کو گھیر کر کربلا لایا اور اُسی نے ابن زیاد کے خط آنے کے بعد اتنی سختی برتی کہ امام کے خیموں کو دریا کے کنارے برپا نہ ہونے دیا۔ دوسری تاریخ محرم سے دسویں تک آٹھ دن میں حُر کی کیا حالت تھی؟ اسے تاریخ کے اندھیرے پردے میں رہنے دیجیے اور یہ راز منکشف ہو تو کیونکر جبکہ اُس کا کوئی بتلانے والا رہا نہیں۔ لیکن بعد کی صورت حال اور حُر کی گفتگوؤں نے صاف بتلا دیا ہے کہ حُر جس وقت سے امام حسین کو کربلا میں پہونچا کر ابن زیاد کو اطلاع دے چکا اُس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں بڑی گہری نگاہ سے مگر بے چینی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔

اُس نے راستے ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنبانی کی تھی کہ کسی طرح امام حسین اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خط و کتابت ہو اور معاملات رو باصلاح ہو جائیں اُسے کربلا میں پہونچنے کے بعد بھی یہ توقع تھی کہ بیچ میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائے گا جہاں امام اور اُن کے مخالف مجتمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اُسے کوفہ سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوا ہوگا مگر عمر بن سعد کا طرز عمل اُس کے لیے اُمید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگو میں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آیا جب سلسلۂ گفتگو ایک ایسے نقطہ پر پہونچا جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ یکسو ہو گیا اور مقابلہ کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ پھر ایسی صورت میں حر کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہو گی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرز عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ توقعات تھے جو اُس کے

دل میں ۹ محرم کی سہ پہر تک قائم تھے اور اُس پر کیا، کسی شخص کو اُس وقت تک صلح سے مایوسی کے اسباب پیدا نہ ہوئے تھے۔ مگر ۹ محرم کی شام کو یہ سب امیدیں منقطع ہوگئیں ابن زیاد کے اُس خط سے جو شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہونچا جس کے بعد عمر سعد مجبور ہوا کہ وہ اسی وقت امام کے لشکر پر حملہ آور ہو جائے اور بہت مشکل سے صرف ایک شب کی مہلت عبادت خدا کے لیے منظور کرے۔ یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ اب حقیقۃً حُر کے سامنے امام حسین سے جنگ اور اُن کے قتل میں شرکت کا سوال درپیش تھا اور اب وہ سمجھا کہ میں نے اس کے پہلے جتنے بھی اقدامات کیے وہ ایک مظلوم مقدس ہستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہیے؟ کیا میں حسین کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگین کر سکتا ہوں؟ اُس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہرگز نہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے اب سب کچھ یاد آتا تھا کہ حسین وہ انسان تھے جس نے اُس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا۔ اب اُن پر پانی بند ہے اور میری بدولت جس نے کہ اُنھیں اس بے آب وگیاہ جنگل میں اُترنے پر مجبور کیا۔ اُسے یہ احساس کر کے خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا وہ سوچتا تھا کہ اس کا تدارک کیا ہے؟ میں حسین کے پاس جا کر اپنی اس خطا کو معاف کراؤں مگر کیا اتنا بڑا جرم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟ پھر اگر حسین نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا؟ نہ دنیا ملی نہ آخرت۔ پھر بھی اُس کا ضمیر کہتا تھا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہیے۔ انھوں نے نہ بھی معاف کیا پھر بھی اپنی امکانی کوشش تو ہو جائے گی۔ میں جب اپنی جان اُن کے قدموں پر ڈال دوں گا۔ تو پھر وہ بھی کریم النفس ہیں کہاں تک خیال نہ کریں گے۔ یہ خیالات تھے جو اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کیے ہوئے تھے اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی سیاہی کے بے پناہ سمندر میں اُس کے خیالات کی کشتی تھپیڑے کھا رہی تھی۔

ہُو مارتا ہوا جنگل اور رات کا سناٹا، صفحہ تاریخ بھی سنسان ہے، کون مؤرخ ہے

جو اُس معرکہ کی داستان قلم بند کرے جو حُر کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ بے شک سچا شاعر اکثر حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ میر انیس علیہ الرحمہ اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال مرثیہ گویوں نے جس طرح اس رات کو حر کی حالت کی تصویر کشی کی ہے وہ یقیناً ایک صحیح واقعہ ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطہ سے شاعر کے دل تک پہونچی ہے اور واقعات کے قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی حُر کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ کیا واقعی جنگ ہی ہو گی یا کوئی اور صورت رونما ہو گی۔ اُس نے انتہائی ضبط و صبر کے ساتھ دیکھا کہ فوج کی ترتیب ہوئی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصۂ فوج کا افسر قرار دیا گیا ہے۔ اُس نے امام کا بے نظیر، مؤثر خطبہ سُنا جس نے اُس کے دل میں گھر کر لیا۔ مگر پھر اُس نے انتظار کیا کہ اس کا اثر فوج مخالف پر کیا پڑتا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ زہیر بن قین نے بڑھ کر تقریر کی اور ناصحانہ انداز میں اہل کوفہ کو مخاطب کیا ان تمام باتوں کے بعد بھی اُسے محسوس ہوا کہ فوج ابن زیاد کے دلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور وہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ بس اب حُر کے ضبط و صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ خیال جو اُس کے دل میں پرورش پا رہا تھا اب رازداری کے حدود سے آگے بڑھ گیا۔ وہ آیا عمر سعد کے پاس کہا "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟" یہ سوال اپنے اندر اُن سب قلبی کیفیتوں کو مضمر رکھتا ہے جن کی تشریح کے لیے میں نے گزشتہ سطور میں بہت سے الفاظ اور جملے صرف کیے ہیں۔ اُسے یہ یقین آنے کے قابل بات ہی نہیں معلوم ہوتی کہ فرزند رسول سے جنگ عملی شکل بھی اختیار کرے گی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے آثار و قرائن کو جنگ کے قطعی پا رہا ہے مگر پھر بھی اس کی آرزو رکھتا ہے کہ یہ سب نمائشی ہو اور اس میں حقیقت بالکل نہ ہو۔ عمر بن سعد اُس کے ضمیر کے اندرونی کیفیات سے بالکل بیگانہ نہ تھا۔ اس سوال کا کہ "کیا واقعی تم ان سے جنگ کرو گے؟" اُس نے افسرانہ انداز سے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "ہاں، قسم بخدا، ایسی جنگ جس کا بہت ادنیٰ نتیجہ یہ سمجھنا چاہیے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ قلم ہو کر

زمین پر گریں“ حُر نے کہا ”کیا اتنی صورتیں مصالحت کی جو حسین نے پیش کیں ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟“ اس سوال سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صلح کی گفتگو کو پورے غور سے نتیجہ کی جستجو کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور اُسے یقین تھا کہ ان صورتوں میں سے کوئی ضرور مان لی جائے گی عمر بن سعد نے کہا ”خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا مگر کیا کروں؟ تمھارا حاکم نہیں مانتا“ عمر سعد کے جواب میں خود کمزوری تھی۔ اُس کا مضمون حُر کی رائے اور خیال کو مزید تقویت دینے والا تھا۔ وہ تسلیم کر رہا تھا کہ حسین کا مسلک صلح پرورانہ ہے مگر ابن زیاد کی ہٹ دھرمی قتل حسین سے کم پر رضامند نہیں۔ اس کے بعد حُر کچھ گفتگو کرنا بے کار سمجھا اور اب یہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اُس اپنے فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اُس کے دل و دماغ کی جنگ سے طے پایا تھا عملی لباس پہنائے۔

حُر کو یہ اندیشہ قطعی تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ اطلاع ہو جائے کہ میری نیت میں کچھ تبدیلی ہو رہی ہے تو مجھے یہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ اس لیے وہ اس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اُس کے قبیلہ کا ایک شخص قرہ بن قیس اس وقت اُس کے نزدیک تھا۔ غالباً یہ وہی شخص ہے جو عمر بن سعد کا پیغام لے کر امام کی خدمت میں گیا تھا اور حبیب بن مظاہر کی نصیحت کرنے پر اُس نے کہا تھا کہ میں جو پیغام لایا ہوں جا کر اُس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا کہ خود مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے حُر کو اُس کا اپنے پاس رہنا ناگوار ہو رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ٹل جائے مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر اس نے کہا ”قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟“ اُس نے کہا ”نہیں ابھی نہیں“ کہا ”پھر پلاؤ گے نہیں؟!“ انسان کا چہرہ، اُس کی بات چیت، اُس کے چہرہ کا رنگ سب ہی اُس کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ حُر لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرہ کچھ نہ سمجھا ہو اتنا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں۔ بعد میں اُس کا بیان تھا کہ اگر حُر مجھ سے بتلا دیتے

کہ میں امام حسین کی طرف جارہا ہوں تو میں بھی یقیناً اُن کے ساتھ ہو لیتا اور نکل جاتا"
مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور خواہ مخواہ کے عذر ہیں جو احساس گناہ پر وقت نکلنے کے
بعد پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسی اخلاقی جرأت اُس میں موجود ہوتی تو حُر کے بے کے
چلے جانے پر بھی قرہ کے لیے رستہ نہیں بند ہو گیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا بہرحال
وہ ایک سنجیدہ شخص تھا اس لیے یہ محسوس کر کے کہ حُر کو میرا اپنے پاس رہنا ناگوار ہے،
اُس نے موقع سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ حُر نے اپنے خیال میں اُس کو ہٹا کر ایک
بڑی فتح حاصل کی اور آہستہ آہستہ گھوڑا اپنا فوج امام کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ ہر
شخص تصور کر سکتا ہے کہ اس وقت اُس کا دل دھڑک رہا تھا اُس کے سینہ میں طوفان
برپا تھا۔ وہ سمجھتا تھا اب میں کہیں اور ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ میں سب سے
علیحدہ ہوں۔ اس وقت کسی کا ٹوک دینا! معاذ اللہ۔

مہاجر بن اوس اُس کے قبیلہ کا ایک شخص کہنے لگا "کیوں حُر! کیا ارادہ ہے؟ کیا
حملہ کرنا چاہتے ہو؟" وہ چونک پڑا۔ "حملہ کرنا چاہتے ہو؟" حُر اس کا کیا جواب دیتا؟
اس نے پھر بھی سکوت کر کے پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر جسم
میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ راز فاش تھا۔ مہاجر نے کہا "حُر تمھاری یہ کیا حالت ہے؟
میں نے تمھاری یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ
بہادر کون ہے تو میں تمھارے سوا کسی کا نام نہ لیتا مگر اس وقت میں تمھاری عجیب
حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہ آخر ہے کیا؟" یہ شجاعت پر حملہ تھا۔ حُر اس غلط فہمی کو
برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے چھپانے کی مہم میں اپنی شکست کا احساس بھی کر لیا
اس لیے اب صاف کر دینا چاہا اور کہا "میرے سامنے اس وقت بہشت و دوزخ کا سوال
ہے" ——— وہ کہہ رہا تھا اور الفاظ کی رفتار کے ساتھ دل کی بے چینی میں اضافہ
ہو رہا تھا ——— "میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا، چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے
کر دیے جائیں اور آگ میں جلا دیا جائے" اب دیر کا موقع نہ تھا۔ یہ کہتے ہی اُس نے
گھوڑے کو چابک لگایا اور لشکر امام حسین کی طرف پہونچ گیا (طبری ج ۶ ص ۲۴۴)

حُر کو اندیشہ تھا کہ اُس کے اس بے تحاشا گھوڑا اُڑائے ہوئے آنے سے انصار امام میں وحشت نہ پیدا ہو اور کہیں اُس کی مزاحمت نہ کی جائے اس لیے اُس نے لشکر امام کے قریب پہونچتے ہی اپنی سپر پلٹ کر ہاتھ میں لے لی (ابصار العین ص ۱۱۹) یہ عرب کے دستور کے مطابق تھا۔ جب کوئی حملہ آور ہو تو اُس کے ہاتھ میں تلوار کھنچی ہوگی سپر حفاظت کے لیے سامنے ہوگی لیکن اگر وہ تلوار نیام میں رکھ لے۔ سپر کو اُلٹا کرلے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیام لا رہا ہے۔ حُر نے اپنی سپر اس طرح ہاتھ میں لے کر گویا پہلے سے بتا دیا کہ میں طالب امان ہو کر آرہا ہوں۔ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں

(ابصار العین ص۱۲۰)

حُر کے اس اچانک آجانے پر سب لوگ متعجب ضرور ہوں گے اور چشم براہ ہونگے کہ یہ آکر کیا کہتا ہے۔ وہ سیدھا امام کے سامنے آیا۔ کہنے لگا "میری جان آپ پر فدا۔ اے رسول کے فرزند۔ میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ راستے میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ فرد قرارداد جرم ہے جو اس کے ضمیر نے خود اپنے خلاف مرتب کرلی تھی۔ "قسم ہے اُس خدائے برحق کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کرینگے مسترد کردینگے اور نوبت یہاں تک پہونچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے۔ میں کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم نہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ اُن شرائط کو تو قبول ہی کرلیں گے جو امام ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہیں کرینگے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمسار، توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اور آپ کا شریک مصیبت ہو کر اپنی جان کے ساتھ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر مرجاؤں۔ کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو جائے گی؟"

حُر نے اپنے جرائم خود ہی پیش کر دیے تھے۔ اُس نے اپنی صفائی میں اسباب بھی وہ پیش کیے تھے جو حقیقت کے بالکل موافق تھے اور وجہ اُس کے طرز عمل سے مطابقت رکھتے تھے

اُس کے الفاظ میں سچائی تھی۔ دل کی دھڑکن کا اثر آواز کے ارتعاش سے ظاہر تھا۔ اب موقع اس کا نہ تھا کہ امام کسی طول طویل تقریر کے ساتھ اُس کی بات کا جواب دیتے۔ آپ کو اُسے مطمئن کرنا چاہیے تھا فوراً۔ آپ نے بلا توقف فرمایا "ہاں ہاں۔ خدا تمھاری توبہ قبول کرے گا اور تمھیں بخشدے گا۔ مبارک ہو۔ واقعی تم حُر (آزاد منش) ہو ویسے ہی جیسے تمھاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ گھوڑے سے تو اترو" حُر نے کہا "میں آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار ہوں بہتر ہے اس سے کہ نیچے اتروں۔ بس ایک تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں، پھر تو (مر کر) گھوڑے سے نیچے اُترنا ہی ہے" امام نے دیکھا کہ حُر کو جہاد کا ولولہ ہے فرمایا "اچھا جو تمھاری خوشی ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمھارے شامل حال کرے"

وہ ضبط بہت کر چکا تھا۔ اب وقت تھا کہ اُس کے خیالات کا کوہ آتش فشاں شگافتہ ہو۔ اُس کی چنگاریاں اُڑیں اور شعلے بلند ہوں۔ حُر آیا میدان میں اور اہل کوفہ کی فوج کے سامنے اگر تقریر شروع کی ——— موقع تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ——— پہلے امام کا خطبہ تھا جو خود ایک فریق کی حیثیت رکھتے تھے ——— پھر زہیر بن قین نے تقریر کی تھی جو خود اہل کوفہ کی ایک ممتاز فرد تھے اور ایک وقت میں اہلبیت کے مخالف گروہ میں خیال کئے جاتے تھے۔ پھر بھی اس وقت مہینہ بیس دن سے وہ حسینی لشکر کی ایک فرد بن چکے تھے۔ مگر اب حسین کی طرف سے احتجاج کرنے والا فوج دشمن کے سامنے وہ ہے جو اسی فوج کا ابھی ایک افسر تھا اور جب تک باقاعدہ معزول نہ کیا جائے سمجھئے کہ اب بھی افسر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کو اور اپنی فوج کے دوسرے ساتھیوں کو اُتنے تلخ الفاظ میں مخاطب کرتا ہے جس کا اُسے بخوبی حق حاصل ہے۔ وہ کہتا ہے "اے کوفہ والو۔ خدا تمھیں غارت کرے تم نے اس بزرگوار کو بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اُسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم اُن پر جان نثار کرو گے۔ پھر تم نے خود اُن پر چڑھائی کر دی اور اُن کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے اُن کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو

اور چاروں طرف سے انھیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے اُن کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جدھر وہ امن کا رہستا پائیں اُدھر جانے سے روک دیا ہے اور وہ تمھارے ہاتھ میں قیدی کی طرح سے بے ہوئے ہیں اور بے بس ہیں اور تم نے اُن کو، اُن کے اہلحرم اور بچّوں کو اور اُن کے اصحاب کو فرات کے بہتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے۔ وہ پانی جس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سور، کُتّے تک اُس میں آکر لوٹتے ہیں اور یہ لوگ ہیں کہ ان کو پیاس نے جاں بلب کر رکھا ہے۔ کیا بُرا وہ سلوک ہے جو تم نے محمد مصطفےٰ کے بعد اُن کی اولاد کے ساتھ کیا ہے۔ خدا تم کو اُس شدّت والی پیاس کے دن سیراب نہ کرے اگر تم ابھی۔ آج۔ اسی دم توبہ نہ کرلو اور اپنے طرزِ عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آجاؤ"

حُر کی تقریر دشمن کے مفاد کو بہت خطرناک تھی۔ کچھ سپاہیوں نے تیر چلائے جس نے تقریر موقوف کردی جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی، اس لیے وہ آکر امام کے سامنے کھڑے ہوگئے (طبری ج ۶ ص ۲۴۵)

کوئی شبہ نہیں کہ ع۵ "کسی فوج کا سپاہی اگر دشمن کی فوج میں جا ملے تو اُس کو غدار و بے وفا کہتے ہیں لیکن یزیدی افسر حُر کا لشکر پسر سعد کو چھوڑ کر حسینی فوج کا سپاہی بننا ایسا ہے کہ عالم کے جرنیل و کرنیل جب اس سپاہی کا نام لیں گے تو تعظیم و احترام سے سر جھکالیں گے اس لیے کہ یہ سپاہی مرنے اور جان دینے کے لیے فوجِ حسینی کا سپاہی بنا جو اُس کی شجاعت و بہادری اور حق پسندی کا کارنامہ تھا۔ وہ کثرت کو چھوڑ کر قلت کے حامی بنے۔ عیش و راحت کو چھوڑ کر تکلیف و مصیبت کے ساتھ ہوئے اور مال و ثروت چھوڑ کر فقر و فاقہ کا ساتھ دیا۔"

جیسا کہ شبِ عاشور کی مہلت پر بحث کے سلسلہ میں کہا جا چکا ہے یہ امام حسین کی سب سے بڑی فتح تھی جو عین موقع جنگ پر خود آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوگئی۔ کیونکہ ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ جس قدر ہمت بڑھانے اور دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے مادی اسباب ہوسکتے ہیں، سب فوج یزید کی طرف تھے

ع۵ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

کثرت تعداد، طاقت و قوت، یقین کامیابی، آسائش و راحت اور آب و غذا کا اطمینان جائزہ و انعام کے توقعات اور حکومت کی رضا مندی کی خواہش اور خوف عتاب۔ اس کے برخلاف جتنے ہمت شکن اور جی چھڑانے والے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب اصحاب حسینی میں مجتمع تھے۔ قلت تعداد۔ بے کسی و بے بسی۔ یقین بربادی اور تین دن کی بھوک پیاس اور حکومت کا عتاب جس کا نتیجہ اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بعد اپنے پس ماندگان اور اولاد کے لیے بھی پشت شکن اور طاقت ربا ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سب کے باوجود تاریخ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معمولی سپاہی بلکہ بچہ بھی الگ ہو کر فوج مخالف سے جا کر ملا ہو۔ نہ حسین کی زندگی میں اور نہ حسین کے بعد۔ اس کے برخلاف فوج مخالف کا ایک معمولی شخص نہیں بلکہ فوجی افسر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی اُدھر سے ٹوٹ کر ادھر آگیا۔ یہ وہ غیر معمولی فتح تھی جس نے فوج مخالف کو دنگ کر دیا اور شاید فوج کا رنگ بے رنگ پاکر ہی سالار فوج نے مزید تاخیر کو خطرناک پایا۔

اب دھوپ کافی چڑھ چکی ہے اور دن کا اچھا خاصہ حصہ گزر گیا تھا کہ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا۔ اپنے غلام درید کو جو علمبردار لشکر تھا آواز دی کہ جھنڈا اپنا میرے قریب لا۔ درید رایت جنگ لیے پاس آکر کھڑا ہوا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلّہ کمان میں جوڑا اور فوج حسینی کی طرف رہا کیا اور پکار کر اپنی فوج والوں سے کہنے لگا کہ گواہ رہنا سب سے پہلا تیر میں نے ہی لگایا ہے۔

یہ الفاظ سپہ سالار لشکر کی زبان پر جاری ہوتے ہوئے تیر رہا کیا جائے اور پھر تمام فوج میں سکون رہے، ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے کھنچے اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ اسے فوج مخالف کی پہلی کمزوری سمجھنا چاہیے کیونکہ تیروں کا حملہ بہادری کی نشانی نہیں ہے۔ یہ شرم کی بات سمجھنا چاہیے کہ ایک ایسی قلیل تعداد پر جو دو سو سے بھی کم ہو حملہ کیا جائے اُس بڑی فوج کی طرف سے جو تین ہزار سے کسی طرح کم نہ ہو اور پھر تیروں کے بے پناہ باران سے ابتدا کی جائے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ حسین بن علی کی قلیل فوج اس اچانک حملہ کے مقابلہ کے لیے
کس طریقہ پر آمادہ تھی۔ مگر نہیں، اُنھیں آمادگی کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کے تنے ہوئے
سینے تیروں کے استقبال کے لیے موجود اور اُن کے دل و جگر شوقِ شہادت میں
ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر تیار تھے۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور خوب اندازہ کہ اگر حسینی لشکر سے وہ کتنا ہی
مختصر کیوں نہ ہو دست بدست مقابلہ کیا جائے تو کربلا کی جنگ صرف عاشور کے دن
پر ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دیر ہونا اُن کے مقصد کے لیے انتہائی اندیشہ
کا باعث ہے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ امام کی روانگی کی اطلاع بصرہ میں ہے اور وہاں سے مدد
پہونچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بھی بہت سے لوگ وہ جو ابھی تک نہیں پہونچ سکے ہیں
ایسے ضرور ہیں جو موقع کے منتظر اور نصرتِ حسین کے لیے بیچین ہیں۔ یہ بھی خطرہ کچھ دور
نہیں تھا کہ ایران نزدیک ہے اور وہاں کے لوگوں کو حضرت امام حسین کے ساتھ
عقیدت کا ہونا ممکن ہے خصوصاً جبکہ آپ کے ساتھ زین العابدین بھی موجود ہیں
جو ننھیالی رشتہ سے ایرانی ملک کے شہزادے ہیں اور اس لیے بہت امکان ہے کہ
قومی تعصب بھی ایرانیوں کو ان کی حمایت پر آمادہ کر دے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ
اجاؔ و سلمی پہاڑ بہت فاصلہ پر نہیں ہیں جہاں کا طے ایک پُرطاقت قبیلہ ہے اور
طرماح بن عدی امام حسین سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر آپ وہاں پہونچ جائیں
تو آپ کی مدد کے لیے ہزاروں جوان قبیلۂ طے کے ابھی زرہ پوش ہو سکتے ہیں۔ خود
طرماح کربلا کی سرزمین کے قریب امام کو چھوڑ کر یہ کہہ کے گئے ہیں کہ میرا کچھ غلہ ہے
اُسے گھر پر رکھ آؤں تو آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ آئیں تو اپنے ساتھ کچھ فوج مدد
کے لیے لیتے ہوئے آئیں۔ انہی اسباب سے فوج مخالف کو بہت جلدی تھی اور وہ
یہ تصور کر رہے تھے کہ ہمارے مقابل میں کوئی بڑی فوج ہے اور ہمیں اس مہم کو
جلدی سر کرنا ہے۔

یقیناً یہ ہزاروں تیروں کی بارش اگر قریب سے ہوتی تو یہی فوجِ حسینی کی تعداد

کو کم کرنے کے لیے کافی ہوتی مگر ابھی صفیں طرفین کی اپنے اپنے مورچہ ہی پر تھیں اور یہ تیر صرف ایک اعلانِ جنگ کی حیثیت سے اپنے مورچہ ہی پر سے روانہ کیے گئے تھے جو بلا ترتیب اصحاب حسینی کے آس پاس آ کر گرے تھے۔ اس لیے اس ابتدائی بارش سے کوئی نقصان فوج حسینی کو نہیں پہونچا سوائے اس کے کہ وہ ان کے لیے پیغام جنگ ثابت ہوا۔ امام حجت پورے طور سے تمام کر چکے تھے اور اب یہی ایک حجت باقی تھی کہ ابتدا جنگ کی دشمن کی طرف سے ہو جائے اور وہ بھی ہو گئی۔ اب رواداری کا دور ختم ہوا اور صلح کے مواقع باقی نہیں رہے۔ بس اب حسین تھے اور استقلال، ثابت قدمی اور پر جگری۔ حق پر مرمٹنا اور باطل سے علیحدگی کا آخر دم تک اعلان کرتے رہنا۔ اب قول سے نہیں، عمل سے یہ ثابت کر دینا تھا کہ ہم جان دینگے مگر فاسق و فاجر کی بیعت نہ کرینگے۔ دنیا سے اپنی ہستی کے فنا پر راضی ہو جائیں گے مگر اسلام کی فنا پر راضی نہ ہوں گے۔

بغیر کسی ہراس اور پریشانی کے، بغیر کسی اضطراب اور سراسیمگی کے امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا "کھڑے ہو جاؤ موت کے استقبال کے لیے جو بہرحال ضروری ہے، خدا اپنی رحمت تمھارے شامل حال کرے۔ یہ تیر نہیں ہیں بلکہ دشمن کے قاصد ہیں جو تمھاری طرف روانہ کیے گئے ہیں"

اصحاب حسین کے ضبط و تنظیم کا یہ کارنامہ ہے۔ تاریخ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ تیروں کی اس بارش کے بعد بھی اصحاب حسینی خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہہ برقرار تھے اور کسی قسم کا انتشار بھی اُن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب امام نے اپنے ان الفاظ کے ساتھ اُنھیں اذنِ جہاد دیا تو وہ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے اور اُنھوں نے تیروں کا جواب تیروں کے ساتھ دیا جس کے معنی بھی صرف مقابلہ کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہزاروں تیروں کے مقابلہ میں سَو دو سَو تیر ادھر سے بھی چلے گئے تو اُس سے فوج مخالف کو نقصان کیا پہونچ سکتا مگر اُس کی اخلاقی حالت کے لیے یہ ایک بڑا نقصان تھا کہ اُسے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہماری یہ تیروں کی بارش بھی ان مٹھی بھر انسانوں کو مرعوب نہیں کر سکی اور ہمیں بہرحال ان سے جان توڑ مقابلہ کرنا پڑے گا ـــــــ جس میں ہتھیار

سے زیادہ دل کی طاقت کی ضرورت ہے اور ضمیر کے تزلزل سے یہی پہلو فوج یزیدی کا انتہائی کمزور ثابت ہو رہا تھا ——— مگر اب تو جنگ چھڑ ہی گئی ہے۔ جو کچھ ہونا ہے وہ بہر حال کرنا پڑے گا۔

اب آغاز جنگ ہو چکا ہے اور انصار حسینی کے وفادارانہ خدمات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جس میں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب انصار کے مختصر حالات زندگی اور خصوصیات شخصی کا بھی جہاں تک کہ علم ہو سکا ہے تعارف ہوتا چلے اس لیے واقعات کی تاریخی ترتیب کو مدّنظر رکھتے ہوئے جن انصار کے کارنامے آنکھوں کے سامنے آئے ہیں ان کے مختصر حالات سلسلہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ انہی حالات کے ذیل میں آپ کو جنگ کے تفصیلات اور واقعات کی ترتیب بھی معلوم ہوتی جائے گی۔ اگرچہ شہدائے کربلا کے حالات میں عربی میں "ابصار العین فی انصار الحسین" اور اردو میں "شہدائے کربلا" کے تین حصے مطبوعہ امامیہ مشن لکھنؤ جامع اور مستند کتابیں موجود ہیں مگر اس غرض سے کہ زیر نظر کتاب اس حیثیت سے تشنہ نہ رہ جائے یہاں ان حالات کا لب لباب واقعاتی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے جو لوگ مزید تحقیق و تفصیل یا مختلف روایات پر بحث و تبصرہ کے طلبگار ہوں وہ مذکورہ کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی

آغاز جنگ کے بعد فوج حسینی میں سب سے پہلے میدان کارزار میں یہی آئے ہیں اس لیے یہاں ان کے حالات پہلے لکھے جاتے ہیں۔

ان کا پورا نام و نسب :- ابو وہب عبداللہ بن عمیر بن عباس بن عبد قیس بن علیم بن خباب الکلبی العلیمی تھا۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور قبیلۂ ہمدان کے "بئر جعد" نام کنویں کے پاس اپنے ذاتی مکان میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ مقام کوفہ کی گنجان آبادی سے بالکل باہر ان باغات خرما کے قریب تھا جو "نخیلہ" کے حدود میں تھے۔ ان کے ساتھ

ان کی رفیقہ حیات رہتی تھیں جو قبیلۂ نمر بن قاسط سے تھیں اور ام وہب عبد کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ اہل سیر کا قول ہے کہ وہ بڑے سورما، بہادر اور شریف انسان تھے۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں اُن کا اصحاب حضرت علی میں تذکرہ کیا ہے۔ اُس موقع پر کہ جب کوفہ میں جناب مسلم کی شہادت ہوی ہے اور ابن زیاد نے قتل امام حسین کی تیاری شروع کی ہے عبد اللہ بن عمیر اپنے اُسی مکان میں مقیم تھے اور موجودہ حالات سے بالکل بے خبر تھے جب امام حسین کربلا میں پہونچ گئے اور ابن زیاد نے اپنا لشکرگاہ نخیلہ میں قرار دیا کہ وہاں سے فوجوں کا معائنہ کر کے کربلا کی جانب روانہ کیا جائے تو اس غیر معمولی صورتِ حال کی طرف عبد اللہ بن عمیر کو بھی توجہ ہوی اور لوگوں سے واقعہ دریافت کیا۔ اُنھیں بتایا گیا کہ یہ فوج رسول کے نواسے، فاطمہ کے فرزند حسین سے جنگ کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ بہادر عبد اللہ کے ایمانی جذبہ میں تلاطم پیدا ہوا۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے مشرکین سے جہاد کرنے کی حسرت رہی ہے۔ یقیناً ان لوگوں سے جہاد کرنا جو اپنے رسول کے نواسے کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں خدا کے نزدیک مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے سے کم درجہ نہیں رکھتا ہوگا۔ یہ بات دل میں ٹھان کر وہ اپنی زوجہ کے پاس آئے اور اُسے اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ پاک عقیدہ اور پُرحوصلہ عورت نے آتشِ شوق کو اور ہوا دے دی۔ اُس نے کہا تم بھی جاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو چنانچہ رات کے وقت دونوں روانہ ہوے اور انصارِ حسین کے ساتھ کربلا میں آکر ملحق ہو گئے۔

اُس وقت جب فوج عمر سعد کی جانب سے تیروں کی بارش ہو چکی جو پیغام جنگ کی حیثیت رکھتی تھی تو یسار اور سالم دونوں زیاد اور ابن زیاد کے غلام میدان جنگ میں آئے اور مُبارز طلب کیا۔ فوج حسینی میں سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن خضیر جوش میں بھرے ہوے آگے بڑھے مگر امام نے ان کو روک دیا۔ بس عبد اللہ بن عمیر کو تو ولولۂ جہاد تھا ہی یہ کھڑے ہو گئے اور اجازت جنگ مانگی۔ حضرت نے سر سے پیر تک اُن پر نظر ڈالی۔ گندمی رنگ، لانبا قد، مضبوط کلائیاں اور بازو، چوڑے پشت اور سینہ۔ حضرت نے فرمایا، بہادر اور جنگ آزما جوان معلوم ہوتے ہو۔

جاؤ اگر تمہارا دل چاہتا ہے"۔ عبد اللہ میدان جنگ میں آئے۔ فریق مخالف نے نام ونسب
پوچھا۔ انھوں نے بتلایا۔ اُس نے کہا ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں زہیر بن
قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ یہ سُنکر عبد اللہ کو غصہ
آگیا اور حملہ کر دیا۔ پہلے ہی وار میں یسار کا کام تمام کر دیا۔ عبد اللہ اُس کی طرف
متوجہ ہی تھے۔ کہ سالم نے تلوار کا وار کیا جو سر پر آ چکا تھا جب خبر ہوی۔ بہادر نے
بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا جس سے اس ہاتھ کی انگلیاں قطع ہو گئیں مگر عبد اللہ نے اتنی
دیر میں پلٹ کر ایک ضرب شمشیر میں اُس کا بھی خاتمہ کیا۔ زخم خوردگی کا غصہ اور اپنے
مقابل کے دونوں سپاہیوں پر فتح پانے سے جوش شجاعت میں اضافہ، ان دونوں سے
متاثر ہو کر عبد اللہ بن عمیر رجز پڑھ رہے تھے جس کا مضمون یہ تھا "اگر مجھے نہ پہچانتے
ہو تو پہچان لو کہ میں قبیلہ کلب کا سپوت ہوں۔ میرے حسب ونسب کے لیے اتنا کافی
ہے کہ خاندان علیم میں میرا گھرانا ہے۔ میں ایک سخت مزاج، درشت خو انسان ہوں
اور مصیبت کے وقت پست ہمت نہیں ہوں۔ اے ام وہب میں ذمہ داری کرتا ہوں
تجھ سے کہ میں ان میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں گا اور تلواریں ماروں گا۔ اس طرح کی
شمشیر زنی جو خدا پر ایماں رکھنے والے جواں ہمت انسان کے شایاں ہے"

ممکن ہے کہ یہ عرب بہادروں کی عام رسم کی بنا پر ہو کہ وہ اپنے کارناموں
کا گواہ اپنی شریک زندگی خواتین کو بنایا کرتے تھے۔ مگر وہب کی زوجہ عام عورتوں کے
مثل نہ تھی۔ وہ اپنے سینہ میں شیرانہ دل رکھتی تھی اور دل میں ایمان کی غیر معمولی
تڑپ، اس کے ساتھ اپنے شوہر سے بے انتہا محبت۔ ممکن ہے جب اُس نے اپنے
شوہر سے کہا تھا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ اُسی وقت یہ نیت رکھتی ہو کہ میں بھی
شوہر کے ساتھ میدان جنگ میں داد شجاعت دوں گی۔ اس وقت تک شاید وہ اپنے
قلبی جذبات کو انتہائی بے چینی کے باوجود روکتی رہی ہو بالجزم اور اُن کی ہمراہی خواتین
کو دیکھ کر جو احکام اسلام کے تحت میں میدان جنگ سے کنارہ کش ہو کر خیموں میں بیٹھی
ہوی تھیں اور ہو سکتا ہے کہ اُسے ابھی تک یہ اطلاع بھی نہ ہو کہ اُس کا شوہر میدان جنگ

میں پہونچ گیا ہے کیونکہ وہ امام سے رخصت ہو کر سیدھا میدان میں چلا گیا تھا۔ خیمہ میں آ کر کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

محبت کا سمندر طوفانی ہو جاتا ہے اور ضبط و تحمل کے ساتھ رکا ہوا الفت کا چشمہ بے پناہ سیلابی طاقت کے ساتھ بہہ پڑتا ہے جب اُس خاموش جذبہ کو فریق دوم کی جانب سے ذرا چھیڑ دیا جائے۔

عبداللہ بن عمیر کا میدان جنگ میں یہ شعر پڑھنا کہ "اے ام وہب میں تجھ سے ذمہ کرتا ہوں کہ میں ان میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں اور تلواریں ماروں گا جو ایک ایمان دار جواں مرد کے شایانِ شان ہے" جو ایک طرف ولولۂ جنگ کا مظہر، دوسری طرف جوش ایمان کا مرقع اور تیسری طرف قلبی واردات اور تعلق روحانی کا ترجمان ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بہادر جوان میدان جنگ کی سخت کٹھن میں بھی اپنی شریکۂ حیات کی یاد اپنے دل میں اور اُس کی تصویر اپنی آنکھوں میں لیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ گویا اپنی شجاعت اور سرفروشی کی داد اُس سے لینا چاہتا ہے۔
بس یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان اشعار نے "ام وہب" کے ضبط و صبر کے لیے "برق خرمن" کا کام کیا اور وہ بے تحاشا ایک گرز ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں آگئی اور پکار کر کہنے لگی "میرے ماں باپ دونوں تم پر نثار۔ اللہ اور رسول کی نصرت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔"

دلیر و غیور عبداللہ کے لیے یہ منظر انتہائی صبر شکن ثابت ہوا۔ وہ فوراً زوجہ کے پاس آیا اور چاہا کہ اُسے خیمہ کی طرف پہونچا دے مگر وہ باتوں میں آنے والی نہیں تھی۔ عبداللہ بن عمیر کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی جس سے دشمن کا خون ٹپک رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کٹ چکی تھیں جن سے خود لہو جاری تھا۔ پھر بھی اُس نے کوشش کی کہ زبردستی خیمہ کی طرف واپس کرے مگر جوش میں بھری بہادر خاتون نے اپنا دامن عبداللہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور کہنے لگی "میں تمھیں چھوڑوں گی نہیں جب تک تمھارے ساتھ میں بھی قتل نہ ہوں۔" امام حسین نے جو یہ دیکھا آواز دی۔

"خدا تم دونوں کو جزائے خیر دے۔ اے مومنہ عورتوں کے پاس واپس جا اور ان کے ساتھ بیٹھی رہ کیونکہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے" ایمان اور اطاعت امام کا احساس تھا جو بے پناہ جذبۂ الفت اور جوش قربانی پر غالب آیا اور عورت خواتین کے پاس خیمہ میں واپس چلی گئی اور اس کے بعد عبداللہ بن عمیر بھی صف مجاہدین میں واپس آگئے۔ عبداللہ بن عمیر کی شہادت مسلم بن عوسجہ کے بعد ہوی ہے۔ جب فوج مخالف کے میسرہ نے شمر بن ذی الجوشن کی قیادت میں حملہ کیا ہے اور اصحاب امام حسین نے اس کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس موقع پر عبداللہ بن عمیر نے کافی جانفشانی کی اور دو سپاہی دشمن کے پھر قتل کئے مگر اس کے بعد وہ ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے طبری نے تصریح کی ہے کہ وہ اصحاب حسین میں دوسرے مقتول تھے (طبری ج ۶ ص ۲۴۹)

شیدائے شوہر خاتون جس نے اپنی زندگی کی تمام دنیا اپنے عزیز جذبۂ ایمانی کی خاطر قربان کردی تھی اب یہ معلوم کر کے کہ اس کا شوہر ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ گیا اور کربلا کی گرم زمین پر اپنے بہتے ہوئے خون کی سرخ چادر اوڑھے موت کی نیند سو رہا ہے پھر بے چین ہوگئی اور اس ارادہ سے نہیں کہ وہ جنگ کرے گی یا اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لے گی کیونکہ یہ سب باتیں اس کے ایمان کے نزدیک امام کی ممانعت کے بعد حکم خدا کے خلاف تھیں جس کے لیے وہ کسی طرح تیار نہ تھی لیکن صرف اس لیے کہ وہ اپنے شوہر کی لاش سے ایک وداعی ملاقات کرلے میدان میں آئی اور شوہر کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرہ سے گرد و غبار صاف کرتی جاتی اور کہتی جاتی تھی کہ "تمہیں جنت مبارک ہو، بہشت کی سیر کرنا مبارک ہو" مگر دشمن کے ظلم و تشدد کی حد تھی کہ شمر نے اپنے غلام کو جس کا نام رستم تھا آواز دی کہ اس کا کام تمام کردے وہ بڑھا اور اس نے اس ستم رسیدہ اور دل خستہ خاتون کے سر پر ایک ایسا گرز مارا کہ وہ اسی جگہ ختم ہوگئی (طبری ج ۶ ص ۲۵۱)

اور اس طرح کربلا کے رنگین مرقع میں ایک قابل احترام خاتون کا مقدس خون بھی شامل ہوگیا

(۲) حُر بن یزید ریاحی

نام و نسب:- حُر بن یزید بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن ہرمی بن ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم التمیمی الیربوعی الریاحی یہ خاندان عرب میں قدیمی عزت کا مالک تھا۔ عتاب جو حُر کی چوتھی پشت میں ہے نعمان بن منذر ملک حیرہ کے مخصوصین میں وہ درجہ رکھتا تھا کہ گھوڑے پر اُس کے "ردیف" کی صورت سے سوار ہوتا تھا۔ عتاب کے دو فرزند تھے قیس اور قعنب باپ کے انتقال کے بعد یہ منصب قیس کو حاصل ہوا۔ بنی شیبان نے اُس سے منازعت کی جس کے نتیجہ میں "یوم الطحفہ" کی خونریز جنگ واقع ہوئی قیس کے سلسلہ میں اخوص شاعر ایک صحابی تھے۔ جن کا نسب ہے "زید بن عمر بن قیس بن عتاب" طبقہ کے لحاظ سے وہ حُر کے باپ یزید کے چچا زاد بھائی اور حُر کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں۔

حُر کوفہ کے روسا میں سے تھا اور ابن زیاد کی فوج میں افسر کی حیثیت رکھتا تھا اور قادسیہ کی فوج میں جو ناکہ بندی کے لیے مقرر تھی یہ بھی داخل تھا۔ اس کا امام حسینؑ کو روکنے کے لیے آنا، امام کا اُسے اور اُس کی فوج کو پیاسا دیکھ کر پانی پلانا، پھر امام سے اُس کی گفتگو اور ارادہ روانگی کے موقع پر سدِ راہ ہونا، پھر امام کو گھیر کر کربلا لانا اور ابن زیاد کا خط پاکر امام کو یہاں قیام کرنے پر مجبور کرنا۔ اس کے بعد صبح عاشور اُس کا فوج شام سے علیحدہ ہو کر سپاہ امام میں آکر شامل ہونا یہ تمام واقعات اس کتاب میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

آغاز جنگ کے بعد جب عبداللہ بن عمیر کلبی ایک کارنمایاں انجام دے چکے یعنی دست بدست لڑائی میں اُنھوں نے یسار اور سالم کو قتل کیا۔ اس شکست کا غصہ تھا کہ عمر بن الحجاج نے جو میمنہ فوج پر تھا حسینی فوج کے میسرہ پر حملہ کر دیا۔ جب وہ لوگ قریب پہونچے تو ان بہادروں نے گھٹنے اپنے زمین پر ٹیک دیے اور نیزے سیدھے تان لیے۔ دشمن کے گھوڑے نیزوں کی باڑھیں دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہر گئے اور

آگے نہ بڑھ سکے جب وہ لوگ واپس ہونے لگے اور رُخ اپنا دوسری طرف پھیرا تو انھوں نے تیروں کی بارش کردی۔ اس سے چند آدمی اُن میں کے قتل ہوئے اور چند زخمی ہوئے۔ ۵ "نیزوں سے اس طرح دشمن کا منھ موڑ دینے کی مثال ایک تو ہم کو سکندر اور پورس کی جنگ میں ملتی ہے جس میں یونانی سپاہیوں نے اپنے برچھوں سے پورس کے ہاتھیوں کا منھ موڑ دیا تھا اور دوسری مثال کربلا کے میدان میں ملتی ہے جہاں حسینؑ کے چالیس جانبازوں نے اس طرح ہزاروں کے لشکر کے دانت کھٹے کر دیے۔"

حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں سید الشہداء اور اُن کے اصحاب نے فن سپہ گری کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں نایاب ہے۔

جبکہ جنگ اس شدت کی منزل کو بھی طے کر چکی تو حُر کو خیال ہوا کہ میں تاخیر کر رہا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناصر امام مجھ سے پہلے قتل ہو جائے۔ یہ سوچکر وہ خدمت امام میں حاضر ہوا اور عرض کیا، "فرزند رسول میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہذا اب مجھے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے میں ہی آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کے جد بزرگوار سے جاکر دست بوسی کروں" امام نے اجازت دی۔ حُر میدان جنگ میں آئے اور کچھ اشعار رجز میں پڑھنے لگے جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں حُر ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں۔ میں تمھاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا اُس امام کی جانب سے جو سرزمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے۔ میں تم کو تلواریں لگاؤں گا اور ذرا بھی اس کو ظلم نہیں سمجھوں گا" اس رجز کے بعد حملہ کر دیا اور شمشیر زنی شروع کی۔ اس کے پہلے اُس وقت جب حُر لشکر عمر سعد سے جدا ہو کر امام سے جاکر ملے ہیں تو یزیدی فوج کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ بخدا اگر میں حُر کو دیکھ لیتا اُس وقت جب وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اُس کا کام تمام کرتا۔ اب جو حُر تن تنہا اتنی بڑی فوج میں جنگ کر رہا تھا۔ آگے بڑھ بڑھ کے تلواریں لگا رہا تھا اور عنترہ کا یہ شعر اُس کی زبان پر تھا کہ

---

۵ ذاکر حسین صاحب فاروقی بی اے

مازلت ارمیھم بثغرۃ نحرہ   ولبانہ حتی تسربل بالدّم

(یعنی) "میں برابر اُن پر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اُس کے سینہ کو یہاں تک کہ اُس گھوڑے نے سر سے پاؤں تک خون کی چادریں اوڑھ لیں" یہ شعر بالکل اُس کے حسب حال تھا کیونکہ اُس کا گھوڑا زخمی ہو چکا تھا۔ اُس کے سر و چہرہ پر تلواریں پڑی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت حصین بن تمیم اُس قادسیہ والی فوج کے افسر نے جس کا حُر پہلے ماتحت تھا یزید بن سفیان سے کہا کہ دیکھو حُر یہی تو ہے جس کے قتل کرنے کی تم آرزو رکھتے تھے اُس نے کہا "اچھا" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور آواز دی حُر بن یزید کیا مقابلہ منظور ہے؟ "حُر نے کہا "ہاں ضرور" یہ کہکر سامنے آ گئے۔ خود حصین کا قول بیان کیا گیا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حُر کے قبضہ میں تھی۔ دم کے دم میں قتل ہو گیا یہ ایسا پر ہیبت منظر تھا کہ دشمن کا پرا بند ہو گیا اور حُر کے مقابلہ کو پھر کوئی نہیں نکلا۔ آخر اپنے گھوڑے کو جو زخمی ہو چکا تھا موڑ کر وہ اپنے مرکز کی طرف واپس آ گئے۔

اس کے بعد پھر وہ جنگ مغلوبہ میں شریک ہوئے اور ظہر کی نماز کا وقت آنے کے بعد شہید ہوئے۔ تفصیل اس کی بعد میں آئے گی۔

(۳) مُسلم بن عوسجہ اسدی

اصحاب حسین میں ایک ممتاز شہرت رکھتے ہیں۔ نام و نسب:۔ ابو حجل مُسلم بن عوسجہ بن سعد بن ثعلبہ بن دوواں بن اسد بن خزیمہ اسدی سعدی۔ ممتاز و معزز اشراف عرب میں سے، سردار قوم، عابد و تہجد گزار تھے۔ رسول کی زیارت کی تھی اور شعبی ایسے محدث نے ان سے روایت احادیث کی ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ فارس تھے اور میدان شجاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ ۲۰ھ میں حذیفہ بن الیمان کی سرکردگی میں فوج اسلام نے ایران کے ترکستانی علاقہ آذربایجان کو فتح کیا۔ اس جنگ میں مُسلم بن عوسجہ بھی موجود تھے اور اُنھوں نے اُس روز بہت سے مشرکین کو قتل بھی کیا تھا۔ میدان کربلا میں وہ کافی سن رسیدہ اور ضعیف العمر ہو چکے تھے۔

مجاہدۂ حسینی میں اُن کے خدمات کا سلسلہ عاشور محرم کے بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا آپ سُن چکے ہیں کہ اُس موقع پر جب جناب مُسلم بن عقیل ابن زیاد کے ورود کوفہ کے بعد ہانی کے گھر میں فروکش ہوئے ہیں اور اُنھوں نے "جماعت شیعہ" کی از سرِ نو تنظیم شروع کی ہے تو مُسلم بن عوسجہ اُن کے نمایندۂ خاص تھے جو لوگوں سے آپ کی بیعت لیتے تھے اور اُن سے اہلبیت کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد و پیمان لیتے تھے۔ اس کے بعد جب ہانی گرفتار ہوگئے اور مسلم بن عقیل جنگ پر آمادہ ہوئے اور آپ نے اپنے انصار و اعوان کے لشکر کو فراہم کیا تو اس وقت بھی مُسلم بن عوسجہ جناب مُسلم کے ساتھ تھے اور جب فوج کی ترتیب ہونے لگی تو قبیلۂ مذحج اور اسد کی سپہ سالاری مُسلم بن عوسجہ کے متعلق ہوئی اور پیادوں کے سردار قرار دیے گئے (طبری ج ۶ ص ۲۰۷)

جب جناب مُسلم کی قلیل فوج نے ابن زیاد کی منظم فوجی طاقت کے مقابلہ میں شکست کھائی اور جناب مُسلم گرفتار کر لیے گئے اور آپ کی شہادت ہوگئی تو مُسلم بن عوسجہ روپوش ہوگئے اور جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت امام حسینؑ حدودِ کوفہ میں آگئے تو یہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کربلا میں آ کر امام سے ملحق ہوئے (ابصار العین ص ۶۲)

شبِ عاشور امام نے جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ تم سب مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو اس کے جواب میں آپ کو یاد ہوگا کہ عزیزوں کے بعد سب سے پہلے مُسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے تھے اور تاریخ کے یادگار رہنے والے پُرجوش پُرخلوص دل سے نکلے ہوئے الفاظ کہے تھے کہ "بھلا ہم اور آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور خدا کے سامنے جوابدہی کا سامان نہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بخدا میں اتنا لڑوں گا کہ ان کے سینوں میں اپنے نیزہ کو توڑ دوں اور تلواریں لگاؤں گا جب تک اُس کا قبضہ میرے ہاتھ سے سنبھل سکے گا اور میں آپ سے کبھی جدا نہ ہونگا اور اگر میرے پاس ہتھیار نہ ہونگے جن سے جنگ کروں تو میں اُنھیں پتھر ماروں گا آپ کی نصرت میں یہاں تک کہ آپ ہی کے ساتھ رہ کر مر جاؤں"۔

صبح عاشور شمر نے خندق میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر جو گستاخی کا تخاطب کیا تھا

اُس کے جواب میں بھی انھی مُسلم کو غصّہ آیا تھا اور انھوں نے کہا تھا کہ میں ابھی ایک تیر رہا کر دوں جو اس کا کام تمام کر دے اور امام نے روکا تھا کہ نہیں ہماری طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں ہونا چاہیے۔

اب جنگ چھڑنے کے بعد بھلا کیا ممکن تھا کہ معرکۂ کارزار میں آپ پیچھے رہتے۔ وہ بڈھے ضرور تھے مگر نصرتِ حسینؑ میں اُن کا جوش و ولولہ جوانوں سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اصحابِ امامؑ میں سب سے پہلے درجۂ شہادت پر وہ فائز ہوئے۔

جب عبداللہ بن عمیر دست بدست جنگ کر چکے اور حُر میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دکھا چکے جس کی تفصیل آپ کے سامنے آ چکی ہے، اس کے بعد نافع بن ہلال جملی نے آگے بڑھ کے لڑائی کا آغاز کیا اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ "میں قبیلۂ بنی جمل سے ہوں۔ میں علیؑ کے دین پر ہوں" اُن کے مقابلہ میں ایک شخص آیا جس کا نام مزاحم بن حریث اُس نے کہا میں عثمان کے دین پر ہوں۔ نافع نے غصّہ میں بھرے ہوئے جواب کے ساتھ اُس پر حملہ کیا اور اُن کو قتل کر دیا۔

ان پیہم نقصانات سے جو فوجِ مخالف کو برابر ہو رہے تھے، سردارانِ فوج پریشان ہو گئے۔ عمر بن الحجاج جو اس کے پہلے بھی ایک حملہ کر چکا تھا اور ناکام واپس گیا تھا۔ اُس نے زرا زور سے فوج کو للکارا اور بلند آواز سے کہا "بے وقوفو! تم جانتے ہو کس سے جنگ کر رہے ہو یہ ملک کے خاص شہسوار اور جانوں پر کھیلنے والے لوگ ہیں۔ تم میں سے کوئی شخص انفرادی طور پر ان سے جنگ کے لیے نہ نکلے۔ ہاں چونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے یہ بہت تھوڑی دیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر تم سب مل کر فقط پتھر ہی ان پر برساؤ تو بھی ان کو قتل کر سکتے ہو۔"

یہ مشورہ کہ دست بدست جنگ نہ کی جائے عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام فوج میں فرمان جاری کر دیا گیا کہ کوئی شخص مبارز طلبی کے لیے میدان میں نہ نکلے۔ بے شک عمر بن الحجاج نے آگے بڑھ کر فوج میں جوش پیدا کرنے کے واسطے تقریر کی اور کہا "اے اہلِ کوفہ اطاعت اور وفاداری کے پابند رہو اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک و شبہہ نہ کرو

ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امام وقت (یزید) کے مخالف ہیں"
امام حسین نے یہ گمراہ کن الفاظ سن کر جوابی تقریر ضروری سمجھی اور ارشاد کیا " اے عمر بن الحجاج تو لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کرتا ہے! کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو؟ قسم بخدا عنقریب اُس وقت جبکہ تمھاری جانیں ان جسموں سے جدا ہوں گی اور تم اپنے ان اعمال پر دنیا سے جاؤ گے، معلوم ہوگا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں جلنے کا مستحق تھا"

عمر بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کرلیا تھا اور اب کی پورے جوش وخروش سے عمر سعد کی فوج کے میمنہ کے ساتھ فرات کی جانب سے فوج حسینی پر حملہ کیا۔ چھوٹی فوج کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو واپس جانا پڑا مگر غبار کا دامن جو چاک ہوا تو مُسلم بن عوسجہ خاک وخون میں غلطاں نظر آئے۔ امام حسین مسلم کے سرہانے گئے دیکھا کہ ابھی رمق حیات باقی ہے۔ حضرت نے مُسلم کے لیے دعائے خیر کی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ فمنھم من قضٰے نحبه ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا (یعنی) "کچھ جانے والے گزر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں اور کسی نے اپنی بات میں تبدیلی نہیں کی"

حبیب بن مظاہر جو امام کے ساتھ ساتھ تھے مُسلم کے قریب گئے۔ کہا تمھارے ساتھ چھوٹنے کا بڑا صدمہ ہے مگر تمھیں جنت کی مبارکباد دیتا ہوں مُسلم نے کمزور آواز سے کہا تمھیں بھی ہر طرح کی خیر وبرکت کی مبارکباد قبول ہو" حبیب نے کہا اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب تمھارے پیچھے پیچھے آتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو اور میں اس وصیت کو پورا کروں" مُسلم نے کہا "وصیت کچھ بھی نہیں۔ وصیت جو کچھ ہے وہ اس ذات کے متعلق (اشارہ کیا حسین کی طرف) کہ تم بھی ان ہی کے ساتھ اپنی جان نثار کرنا۔ حبیب نے کہا "ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا"

عمر سعد کی بدحواس فوج اس مختصر جماعت کے مقابلہ سے بے تحاشا بھاگی تھی۔ اُسے خبر بھی نہیں تھی کہ کون قتل ہوا مگر مُسلم بن عوسجہ کے ساتھ ان کے اہل وعیال تو موجود ہی تھے۔ جب اُن کی شہادت کی خبر خیمہ میں پہونچی تو ایک کنیز نے چیخ مار کر کہا

"ہائے ابن عوسجہ - ہائے میرا آقا" اس آواز کو سُن کر فوج دشمن میں خوشیاں ہونے لگیں کہ ہم نے مُسلم بن عوسجہ کو قتل کیا - اس پر شبث بن ربعی کو غصہ آگیا اور اُس نے کہا "غضب کی بات ہی کہ مُسلم بن عوسجہ کا ایسا آدمی قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ - بخدا میں نے خدمت اسلام میں اس شخص کے کارنامے دیکھے ہیں - آذربایجان کی جنگ میں میرا چشم دید واقعہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کے لشکر کی پوری صف بندی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس بہادر نے چھ آدمی فوج مشرکین کے قتل کر دیے - ایسا آدمی تمھارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوش ہو؟

ظاہر میں یہ باتیں بالکل معمولی ہیں مگر حقیقتہً یہ سب حسینی فتح کے وہ علامات تھے جو جنگ کے اثنا ہی میں وقتاً فوقتاً آنکھوں کے سامنے آرہے تھے اور جن کی تکمیل اُس وقت ہوئی جب حسین اس معرکہ کو آخری نقطہ تک سر کر چکے تھے۔

میمنہ والے حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مُسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی فوج کا دل بڑھا دیا تھا - اس لیے اب کی شمر بن ذی الجوشن نے میسرۂ فوج کو لے کر حملہ کیا اس طرف بھی اصحاب حسین نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور اسی حملہ میں عبد اللہ بن عمیر نے شہادت پائی - یہ دوسرے شخص تھے جو فوج حُسینی میں سے شہید ہوئے - ان کے حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں اور ان کے بعد ان کی محبہ/ وفا زوجہ کی شہادت کا عبرت خیز واقعہ بھی درج کیا جا چکا ہے۔

(۴) بریر بن خضیر ہمدانی

سن رسیدہ تابعی تھے عبادت گزار اور حافظ قرآن حضرت علی کے اصحاب میں سے، کوفہ کے باشندہ اور ہمدانی قبیلہ کے اشراف میں سے ابو اسحٰق ہمدانی سبیعی مشہور محدث وحافظ کے ماموں، مسجد کوفہ میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے - لوگ اُن کو سید القرّار (حفاظ قرآن کا سردار) کہتے تھے - راستے میں کہیں پر امام کے ساتھ آکر ملحق ہوئے اور حُر کی ملاقات کے بعد جو خطبہ حضرت نے ارشاد فرمایا اُس کے جواب میں زہیر بن قین اور

نافع بن ہلال کی تقریروں کے بعد ایک مختصر تقریر یہ بھی کی جس کا ذکر اس موقع کے حالات میں ہو چکا ہے۔

عاشور کی صبح کو ترتیب لشکر کے بعد امام نے جو ایک خیمہ نصب کرایا ہے اور اُس میں غسل و آداب طہارت ادا کرنے تشریف لے گئے ہیں تو دروازہ پر عبدالرحمٰن بن عبد ربہ اور بریر کھڑے ہوئے آپس میں بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے۔ بریر نے کچھ مذاق کیا عبدالرحمٰن نے کہا چھوڑو ان باتوں کو یہ مذاق کا وقت نہیں ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ بریر نے کیا جواب دیا؟ اُنھوں نے کہا کہ میں نے تو جوانی اور ادھیڑ عمر میں کبھی مذاق نہیں کیا مگر اس وقت میری خوشی کی انتہا نہیں اس لیے کہ بس یہ حملہ کریں اور تلواریں ہم پر پڑنے لگیں تو پھر آخرت کی دائمی زندگی ہے۔ اور عیش و عشرت"

اس واقعہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس سے بریر کے جذبۂ شہادت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی جذبۂ بے قرار کا نتیجہ تھا کہ وہ جنگ میں سبقت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو دو پہلوان فوج عمر سعد سے نکلے جن کا نام یسار اور سالم تھا اور اُنھوں نے مبارز طلبی کی تو حبیب اور بریر ہی دو جواں ہمت بڈھے تھے جو کھڑے ہو گئے مگر امام نے ان کو منع کر دیا۔ ان کا فوج حسینی میں ایک نمایاں شہرت رکھنا اس سے بھی ظاہر ہے کہ جب عبداللہ بن عمیر میدان میں گئے تو اُن دونوں نے کہا کہ ہم تم کو نہیں جانتے، ہمارے مقابلہ پر زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔

جب دست بدست مقابلے ہو رہے تھے تو یزید بن معقل فوج عمر بن سعد میں سے میدان جنگ میں آیا۔ اس سے اور بریر سے پرانی ملاقات تھی اور مذہبی نوک جھونک بھی ہوا کرتی تھی۔ اس نے میدان میں آکر بریر کو آواز دی کہ "دیکھا تم نے خدا نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟" بریر نے کہا "خدا نے میرے ساتھ تو بڑا اچھا سلوک کیا۔ ہاں تو ہی اپنی کہہ کہ بڑا بدنصیب ہے" یزید نے کہا "تم جھوٹ کہتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تمھیں جھوٹ بولنے کی کبھی عادت نہیں تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ تمھیں یاد ہے! ایک دن ہم اور تم بنی لوذان کے کوچہ میں جا رہے تھے اور تم کہہ رہے تھے کہ عثمان گنہگار تھے

اور معاویہ خود گمراہ اور دوسروں کا گمراہ کرنے والا ہے اور سچے امام علی بن ابیطالب ہیں؟ بریر نے کہا "میں اب بھی اسی خیال پر قائم ہوں" یزید نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم گمراہ ہو" بریر نے کہا اچھا اس پر تیار ہو کہ میں تم سے مباہلہ کروں اور ہم تم دونوں مل کر خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہو اس کے ہاتھ سے باطل پرست کو قتل کرا دے پھر میں نکل کر تم سے جنگ کروں۔ یزید نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں فوجوں کی انکھیں لڑی تھیں۔ دونوں نے صف سے نکل کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے دعا کی پھر جنگ کے لیے مقابلہ پر آ گئے۔ بس دو ضربتوں کی آمد و رفت ہونے پائی، پہلے یزید نے تلوار لگائی جو بریر پر اچٹتی ہوئی پڑی اور کوئی صدمہ انھیں نہیں پہونچا۔ پھر بریر نے تلوار ماری جو خود کو کاٹتی ہوئی دماغ تک پہونچی۔ وہ گھوڑے پر سے زمین پر گر پڑا اس حالت میں کہ بریر کی تلوار اس کے سر میں قائم تھی اور وہ اسے سر کے اندر سے کھینچ رہے تھے۔ اسی حالت میں رضی بن منقذ عبدی نے ان پر حملہ کر دیا اور بریر کے لپٹ گیا، کشتی لڑنے لگا۔ بریر اس کو گرا کر سینہ پر سوار ہو گئے۔ کمینہ اور بزدل دشمن اب چیخنے لگا اور پکارنے لگا "کہاں ہیں جنگجو پہلوان، کہاں ہیں مدافعت کرنے والے جوان" کعب بن جابر بن عمرو ازدی حملہ کے لیے آگے بڑھا۔ فوج کے دوسرے سپاہیوں نے منع بھی کیا کہ یہ بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظ قرآن کرایا کرتے تھے مگر اس نے نہ مانا اور پشت کی جانب سے بریر پر نیزہ کا وار کر دیا جو سینہ سے پار ہو گیا اور بریر زمین پر گر گئے۔ پھر اس نے تلوار لگا کر بریر کا کام تمام کر دیا۔

(۵) منجح بن سہم

واقعہ کربلا میں آزاد افراد کے ساتھ غلاموں کی نمائندگی بھی کافی تھی۔ ان میں سب سے پہلے سلسلۂ شہداء میں جن کا نام آتا ہے وہ منجح ہیں۔ یہ خاندان رسالت کے غلام تھے۔ شیخ الطائفہ نے کتاب الرجال میں ان کا اصحاب امام حسین میں شمار کیا، زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ حسینیہ حضرت امام حسین کی کنیز تھی جسے آپ نے

نوفل بن حارث بن عبد المطلب سے خرید فرمایا تھا۔ آپ نے اس کی شادی سہم سے کر دی تھی جس سے منجح کی ولادت ہوئی۔ یہ کنیز سید سجاد کے گھر میں خدمات انجام دیتی تھی جب حضرت امام حسین عراق کی طرف روانہ ہوئے تو وہ اپنے فرزند منجح سمیت حضرت کے ہمراہ آئی۔

ابصار العین میں لکھا ہے کہ منجح امام حسن کا غلام تھا اور وہ کربلا میں حضرت امام حسن کی اولاد کے ساتھ آیا تھا۔ کربلا میں ان کی شہادت اوائل جنگ میں ہوئی اور حسان بن بکر حنظلی کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

(۶) عمرو بن خالد

پورا نام عمرو بن خالد بن حکیم بن حزام الاسدی الصیداوی ہے۔ کوفہ کے اشراف میں سے اور اہلبیت کے بڑے سچے محب تھے۔ شروع میں جناب مسلم کے ساتھ نصرت کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب اہل کوفہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو یہ بھی روپوش ہو گئے یہاں تک کہ امام حسین عراق کے حدود میں پہونچے اور آپ نے قیس بن مسہر صیداوی کو اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ کوفہ روانہ کیا قیس راستے میں گرفتار ہو گئے اور ان کے قتل کا حکم ہوا مگر انھوں نے مرتے مرتے حسین کی سفارت ادا کر دی کہ امام حسین مقام حاجر میں پہونچ گئے ہیں، جس کو جانا ہو ان کے پاس جائے۔ یہ خبر عمرو بن خالد کو پہونچی تو یہ اپنے غلام سعد اور تین دوسرے ہمراہیوں کے ہمراہ جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا امام کی خدمت میں روانہ ہوئے یہ لوگ غیر معروف راستے سے بہت تیز رفتاری کے ساتھ عذیب الہجانات میں امام کی خدمت میں پہونچے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب حر بن یزید ریاحی امام کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے پہونچ گیا تھا چنانچہ حر نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ نہیں آئے تھے، اس لیے یا تو میں انھیں گرفتار کر کے قید کر لوں گا یا کوفہ واپس کر دوں گا۔ حضرت نے فرمایا "اب جبکہ یہ میرے پاس پہونچ گئے اور میری امان میں آ گئے تو میں انھیں تمھارے سپرد نہیں کر سکتا۔"

روز عاشور جنگ چھڑنے کے بعد یہ اور ان کے ساتھی وہ پانچ آدمی تھے جنہوں نے بیک وقت فوج دشمن پر حملہ کیا اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ فوج کوفہ نے ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لشکر امام سے بالکل جدا کر دیا۔ یہ دیکھ کر امام نے اپنے بھائی جناب عباس کو ان کی امداد کے لیے بھیجا۔ آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی یہاں تک کہ فوج کو منتشر کیا اور ان زخمی بہادروں کو دشمن کے حلقہ سے نکال کر اپنی فوج کی طرف واپس لے چلے۔ ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن کی فوج پیچھے تعاقب کے لیے آتی نظر آئی اور وہ قریب پہونچ گئی۔ حضرت عباس ان لوگوں کو اپنے آگے آگے لیے خود بطور حفاظت پیچھے پیچھے چلے تاکہ اُن کو کوئی گزند نہ پہونچنے پائے مگر دشمن کی فوج کے قریب آتے ہی زخمی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ حضرت عباس کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور باوجودیکہ زخموں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان توڑ کر شمشیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گرے اور شہید ہو گئے۔ جناب عباس مجبوراً امام کی خدمت میں واپس آئے اور واقعہ کی اطلاع دی۔ امام نے چند بار اُن بہادروں کے لیے دعائے رحمت کی۔

(۷) سعد مولی عمرو بن خالدؒ

شریف النفس بلند ہمت غلام تھے جنھوں نے اپنے مالک عمرو بن خالد صیداوی کا آخر وقت تک ساتھ دیا۔ وہ اپنے مالک کے ساتھ اُسی مختصر قافلہ میں آ کر امام سے ملحق ہوئے تھے جو عذیب الہجانات میں وارد ہوا تھا جس کا تذکرہ اس کے قبل ہو چکا ہے اور میدان جنگ میں بھی وہ ان ہی ہمراہیوں کے جتھے میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے

(۸) مجمع بن عبد اللہ

نام ونسب :۔ مجمع بن عبد اللہ بن مجمع بن مالک بن ایاس بن عبد مناۃ بن سعد العشیرۃ المذحجی العائذی۔ وہ تابعین میں سے تھے جو بزمانۂ حضرت رسولؐ

متولد ہوئے اور ان کے باپ نے حضرت رسول کی صحبت کے شرف کو حاصل کیا تھا خود مجمع امیر المومنین کے اصحاب میں سے تھے اور جنگ صفین کے واقعات میں اُن کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہ بھی اُن پانچ اشخاص میں سے تھے جو مقام عذیب الہجانات میں امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام نے ان لوگوں سے کوفہ کی حالت پوچھی تو مجمع نے حسب ذیل الفاظ میں اہل کوفہ کی تصویر کشی کی تھی جو نفسیاتی پہلو سے نہایت کامیاب ہی۔ "بڑے بڑے آدمیوں کو تو بڑی رشوتیں دی گئی ہیں اور گٹھریاں بھر بھر کر مال و دولت عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ موافق رہیں اور خیر خواہی کرتے رہیں اس لیے یہ لوگ تو متفق ہیں آپ کے خلاف اور عوام، اُن کے دل تو آپ کی طرف جھکتے ہیں مگر تلواریں اُن کی کل آپ کے خلاف کھنچی ہوی ہونگی"!

روز عاشور یہ بھی اپنے اُسی جتھے کے ساتھ رہے جس میں آئے تھے اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جنھوں نے بیک وقت فوج دشمن پر حملہ کیا جنگ کی اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے

(۹) عائذ بن مجمع

یہ مجمع بن عبد اللہ عائذی کے فرزند تھے۔ اپنے باپ کے ساتھ آئے اور اُنہی کے ساتھ اُس جماعت کی جنگ میں شرکت کی اور شہید ہوے۔

(۱۰) جنادہ بن حارث سلمانی

سلمان قبیلۂ مراد کی ایک شاخ اور مراد قبیلۂ مذحج کا ایک شعبہ ہے۔ جنادہ بن حارث کوفہ کے باشندہ اور "مشاہیر شیعہ" میں سے تھے۔ جنادہ نے عہد رسول کا ادراک کیا، پھر جناب امیر کے ساتھ رہے اور جنگ صفین میں جہاد کیا۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں اُن کا نام اصحاب حسین میں درج کیا ہے۔

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں امام حسین کی بیعت لے رہے تھے تو جنادہ نے وفاداری کے ساتھ بیعت کی اور مسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوے مگر جب مسلم کے خلاف حالات

نے پلٹا کھایا تو یہ بھی شبل دیگر اشخاص کے مخفی ہو گئے اور آخر اسی جماعت میں جو عذیب الہجانات پر پہونچی یہ بھی خدمت امام میں حاضر ہوئے اور اپنی اسی جماعت کے ساتھ رہ کر جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۱) جندب بن حجیر کندی خولانی

کوفہ کے باشندہ اور ممتاز شیعی افراد میں سے۔ امیرالمومنین کی صحبت سے شرفیاب ہوئے تھے اور جنگ صفین میں کندہ اور ازد کے رسالوں کے افسر تھے۔ جب امام حسین کوفہ کی طرف راہ پیما تھے تو حُر کی ملاقات سے پہلے ہی یہ خدمت امام میں جاکر ہمراہی کے شرف سے بہرہ یاب ہوئے اور روز عاشور جنگ کے ابتدائی ہنگام میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(حملۂ اولیٰ)

واقعی تاریخ کا ایک یادگار اور حیرت انگیز سانحہ ہے کہ تیس ہزار فوج کے سامنے ۷۲ بہتر بھوکے پیاسے ہوں اور وہ فوج کثیر اس عدو قلیل سے نقصان پر نقصان اٹھائے اور شکست پر شکست برداشت کرے اور اس کے بنائے کچھ نہ بنے صبح سے دوپہر کے قریب کا وقت آجائے اور حسینی فوج کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنین دیوار کے سامنے موجود رہے۔ اس کے برخلاف فوج مخالف میں اضطراب ہو۔ اس کے نظم و نسق اور بند و بست میں برہمی ہو اور وہ طریقۂ جنگ میں کسی ایک صورت پر برقرار نہ رہے طبری کا بیان ہے کہ اصحاب حسین نے سخت جنگ کی اور ان کی سوار فوج جو صرف بائیس سپاہیوں پر مشتمل تھی اس نے تابڑ توڑ حملے کئے اور وہ اہل کوفہ پر جس طرف سے حملہ کرتے تھے اس طرف کی فوج کو منتشر کر دیتے تھے۔ جب عزرہ بن قیس نے جو اہل کوفہ کی تمام سواروں کی فوج کا افسر تھا یہ دیکھا کہ اس کی فوج ہر جانب سے منتشر ہوتی جاتی ہے تو اس نے عمر بن سعد کے پاس عبدالرحمٰن بن حصن کو یہ پیغام دے کر بھیجا

کہ "آپ دیکھتے ہیں آج صبح سے اس چھوٹی جماعت کے ہاتھ سے میری فوج کی کیا حالت ہے؟ اب آپ پیادوں کی فوج اور تیر اندازوں کو بھیجئے کہ وہ مقابلہ کریں"
شرم ہے اور سخت شرم۔ شکست کا اعلان اور کھلا ہوا اعلان! سواروں کا افسر ہمت ہار چکا اب پیادوں کی باری آئی شبث بن ربعی پیادہ فوج کا افسر تھا۔
سپہ سالار اعظم عمر سعد کا یہ پیغام پہونچا کہ "تم آگے کیوں نہیں بڑھتے؟" اُس نے حقارت آمیز جواب دیا کہ "افسوس ہے ایسی مہم کے سر کرنے کو اتنی فوج ناکافی سمجھی جائے اور مجھے جو ایک بڑا سردار ہوں۔ زحمت دی جائے اور پھر تیر اندازوں کی بھی ضرورت ہو کیا میرے سوا کوئی اور اس مہم کے لیے نہیں ملتا۔ عمر سعد نے مجبور ہو کر حصین بن تمیم کو اُسی فوج کے ساتھ جو قادسیہ کی سرحد میں تھی اور اُس کے ساتھ پانچ سو تیر اندازوں کو مامور کیا کہ وہ آگے بڑھیں اور فوج حسینی کے قریب جا کر پاس سے تیروں کا مینھ برسائیں
فن جنگ کے واقفکار اندازہ کر سکتے ہیں کہ تیروں کی زد کے لیے ایک خاص درجہ کی مسافت ضروری ہے۔ دور کی تیر اندازی جو مقررہ فاصلہ سے زیادہ ہو ایک طرح سے ہوائی فیروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہونچنا آسان ہے مگر قریب کی مسافت سے تیروں کا ہنگامہ خیز طوفان ایک بے پناہ حملہ ہے جس سے محفوظ رہنے کے لیے نہ فنون جنگ کام دے سکتے ہیں، نہ شجاعت و جرأت کے حوصلے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ بزدلانہ طریقہ جنگ ہے اور شجاعت کے نام کے لیے ننگ۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکرگاہ دونوں جماعتوں کے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر ہوتے ہیں اور اُسی صورت سے کربلا میں بھی تھے، دونوں فوجوں کی صف آرائی ایسی جگہوں پر ہوتی ہے جن کے درمیان بڑا میدان مصاف جنگ اور معرکۂ کارزار کی حیثیت سے موجود ہو اور وہ کچھ کم مسافت نہیں ہوتی۔ پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا عنوان یہ تھا کہ عمر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی مکمل ہوئی تھی تیر چلایا اور اس کے ساتھ فوج کے دوسرے لوگوں نے بھی تیر رہا کئے مگر ان تیروں کا اثر فوج حسینی پر کچھ نہیں پڑا اور نہ پڑنا چاہیے تھا سوائے اس کے کہ اعلان جنگ ہو جائے

اور عملی طور سے کارزار شروع ہو جائے مگر اب جو تیر اندازی ہو رہی ہے اُس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ تیروں کا حملہ ہے جو پورے طور سے زد پر لا کر کیا جا رہا ہے۔ تیر کا بچاؤ ڈھال نہیں ہے۔ تیر کا جواب نیزہ و شمشیر کوئی بھی نہیں ہے۔ تیر کا بچاؤ خالی دیا ہو سکتا ہے مگر یہ بچاؤ اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب اُتنی دوری میں کہ جس میں ایک انسان کھڑا ہو سکتا ہے یا اِدھر اُدھر حرکت کر سکتا ہے کوئی بھی جگہ تیروں کی زد سے خالی ہو لیکن عالم تصور میں اس منظر کو سامنے لاؤ کہ صرف ۷۲ آدمیوں کی صف ایستادہ ہے اور اس کے سامنے پانچ سو یا ایک ہزار کی جماعت آتی ہے تو وہ اُس پہلی جماعت سے کتنی زیادہ دور تک ایستادہ ہوگی۔ پھر اس بڑے لشکر کی طرف سے ایک مرتبہ مجموعی طور پر یک جہت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ پر، ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کر بہت دور سے نہیں بلکہ اتنی دور سے جو اُن کی زد میں لانے کے لیے ضروری ہو بوقت واحد تیر چلیں تو کیا یہ ایک عظیم سیلاب کا بہاؤ، ایک بڑے طوفان کا تھپیڑا، ایک تیز آندھی کا جھکڑ اور لوہے کی ایک بڑی چادر نہ ہوگی جو تیروں کی صورت میں چپ و راست ہر طرف سے اس مختصر جماعت کو ڈھانپ لے گی اور اُن کے جسم کے کسی حصہ اور داہنے بائیں کے کسی گوشہ میں بھی ایسا نقطہ نہیں ہو سکتا جو ان تیروں کی زد سے خالی ہو اور اس مختصر جماعت کے لیے امن و پناہ کا ذریعہ ہو۔ مگر واہ رے انصار سید الشہداء! اس عظیم الشان تیروں کے سیلاب کا جواب اُن کی طرف سے یہ تھا کہ اُنھوں نے تلواریں سونت لیں، تیروں کے آتے ہوئے طوفان کا اپنے سینوں سے مقابلہ کرتے اور لوہے کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ریلتے ہوئے جا پڑے اور دشمن کی فوج کے اندر گھس گئے اور شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی ہے وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ جو تاریخوں میں "حملۂ اولیٰ" کے نام سے مذکور ہے اور یہ ظہر سے ایک گھنٹہ قبل ہوا۔

کیا کہنا اُس قیامت خیز بہادری کا جس نے آخر میں پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو لپا کیا مگر نتیجہ اس حملہ کا فوج حسینی کے لیے بہت درد انگیز تھا جس وقت

میدان صاف ہوا اور گرد و غبار دور ہوا تو معلوم ہوا کہ مختصر تعداد بہت مختصر ہو گئی ہے۔ پچاس آدمی انصار سید الشہداء میں سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے جن میں سے بعض تیروں کا نشانہ تھے اور بعض جنگ مغلوبہ میں لڑ بھڑ کر شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحاب سید الشہداء کی سواری میں تھے سب کے سب پے ہو گئے اور اصحاب جو سوار تھے وہ اب پیادہ ہو گئے۔

حر بن یزید ریاحی بھی جن کا گھوڑا زخمی اس کے پہلے ہو چکا تھا اب بالکل پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ایوب بن مشرح حیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ میں وہ تھا جس نے حُر کے گھوڑے کو پے کیا۔ بس ایک تیر ایسا لگا کہ فرس تھرا کر زمین پر آیا اور حُر چھلانگ مار کر اس کی پشت سے زمین پر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر ہے اور تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے شعر پڑھ رہے تھے جس کا مضمون یہ ہے کہ وہ اگر تم نے میرا گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں، میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں (راوی کا بیان ہے کہ) میں نے کوئی اس طرح کا شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔

اس حملہ میں جو پچاس انصار امام حسین کے شہید ہو گئے ان میں نہیں کہا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد اس لیے ان کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیے جاتے ہیں:۔

(۱۲) ادہم بن امیہ عبدی بصری

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندے تھے۔ بصرہ میں ایک عورت ماریہ بنت سعد شیعہ اور دوست اہلبیت تھی اور اس کے مکان پر اکثر شیعیان اہلبیت کا اجتماع ہوتا رہتا تھا۔ جب امام حسین نے مکہ معظمہ سے کوفہ کی روانگی کا قصد کیا اور ابن زیاد کا تبادلہ بصرہ سے کوفہ کی گورنری پر ہوا اور بصرہ کے گورنر کی جانب سے ناکہ بندی کا انتظام ہوا کہ کوئی شخص نصرت حسین کے لیے بصرہ سے نہ جانے پائے تو ماریہ عبتد

کے مکان میں یزید بن شبیط قیسی نے نصرت حسین کو جانے کا عزم ظاہر کیا۔ یہ قصد خطرہ سے خالی نہ تھا اور مشکل تھا کہ اُس نازک حالت میں جبکہ راستے بند تھے کچھ زیادہ لوگ اس عزم کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے مگر یزید کے دو فرزند اور چار دوسرے اشخاص تھے جنھوں نے یزید بن شبیط کے ساتھ اتحاد عمل کیا۔ انھوں نے اپنی جان پر ٹھان لی اور مقام ابطح میں جو مکۂ معظمہ ہی کے حدود میں تھا پہونچ کر امام کی ہمراہی اختیار کی۔ ان چار اشخاص میں ایک ادہم بن امیہ تھے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۳) امیہ بن سعد بن زید طائی

قبیلۂ طے میں سے، بہادر، جنگ آزما، شہسوار اور حضرت علی کے اصحاب میں محبوب تھے آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شرکت بھی کی تھی اور کارنمایاں انجام دیا تھا۔ اس کے بعد کوفہ میں قیام رہا۔ جب امام حسین کے کربلا پہونچنے کی خبر سُنی تھی تو گفتگوئے صلح کے دنوں میں کوفہ سے کربلا پہونچے اور امام کی ہمراہی اختیار کی۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۱۴) جابر بن حجاج تیمی

قبیلۂ تیم اللہ بن ثعلبہ میں سے، عامر بن نہشل تیمی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کوفہ کے باشندہ اور شہسوار تھے۔ پہلے جناب مُسلم بن عقیل کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوئے مگر حالت کے دگرگوں ہونے کے ساتھ مثل دوسرے بہت سے افراد کے وہ بھی اپنے قبیلہ میں چھپ رہے۔ جب امام کے کربلا میں وارد ہونے کی اطلاع ہوئی تو یہ عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا پہونچے اور خفیہ طریقہ سے آکر حضرت امام حسین کے انصار میں شامل ہوگئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۱۵) جبلۃ بن علی شیبانی

کوفہ کے باشندہ۔ بہادر اور شجاع تھے۔ جنگ صفین میں امیرالمومنین کے ساتھ جہاد میں

شریک ہوئے۔ حضرت مسلم کی نصرت کیلئے بھی کمربستہ ہوئے تھے مگر حالات کی ناسازگاری کے بعد یہ بھی اپنے قبیلہ میں روپوش ہو گئے اور جب امام حسین کربلا میں پہونچے تو یہ آ کر انصار امام میں شامل ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۶) جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی

امام کی ہمراہی میں مکہ معظمہ سے متعلقین سمیت آئے تھے اور حملۂ اولیٰ میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(۱۷) جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تیمی

قبیلۂ بنی تیم میں سکونت رکھتے تھے۔ اس لیے اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوئے اور جب کوفہ کے تمام قبائل امام حسین سے جنگ کے لیے بھیجے جا رہے تھے تو یہ قبیلۂ بنی تیم کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں کربلا پہونچے اور جب امام حسین کے پیش کردہ شرائط صلح نامنظور ہوئے اور جنگ کے آثار نظر آنے لگے تو یہ اسی قبیلہ کے چند دوسرے اشخاص کے ساتھ شب کے وقت عمر سعد کی فوج سے جدا ہو کر رفقائے امام کی جانب آ گئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

(۱۸) حارث بن امراء القیس بن عابس کندی

شجاعان روزگار میں سے عابد و زاہد تھے اور لڑائیوں میں کارنمایاں انجام دے چکے تھے۔ اُن کے مذہبی احساس اور ثبات و استقلال کے لیے یہ واقعہ یادگار ہے کہ قلعۂ مجبر کے حصار میں موجود تھے۔ جب مرتدین اُس قلعہ سے باہر نکال کے قتل کئے جانے لگے تو حارث نے اپنے حقیقی چچا پر حملہ کیا۔ اُس نے کہا "میں تو تمہارا چچا ہوں"۔ حارث نے کہا "اور اللہ میرا پروردگار ہے، اُس کا حکم مقدم ہے"۔ یہ کہکر اُسے قتل کر ڈالا۔

کربلا میں یہ بھی عمر سعد کی فوج میں آئے تھے لیکن شرائط صلح نامنظور ہونے کے بعد

وہاں سے علیحدہ ہوئے اور امام کے ساتھ ہو گئے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۱۹) حارث بن نبہان

ان کے والد نبہان حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے غلام، بہادر اور شہسوار تھے جنگ احد میں حمزہ کی شہادت ہوئی اس کے ڈو برس بعد نبہان نے دنیا سے مفارقت کی حارث نے جناب امیر کی خدمت میں رہنا اختیار کیا اور پھر امام حسن اور امام حسین کی خدمت میں رہے۔ جب حضرت امام حسین نے مدینہ سے ہجرت فرمائی تو حارث بھی ہمراہ ہوئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۰) حباب بن حارث

ابن شہر آشوب نے حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ان کا بھی نام درج کیا ہے۔ حالات بالکل معلوم نہیں ہو سکے۔

(۲۱) حباب بن عامر بن کعب تیمی

قبیلۂ تیم اللات بن ثعلبہ میں سے کوفہ کے باشندہ، شیعہ اہلبیت تھے اور جناب مسلم بن عقیل کی بیعت کی تھی۔ جناب مسلم کی شہادت کے بعد اپنے قبیلہ میں پوشیدہ ہو گئے جب امام حسین کی کوفہ کی جانب روانگی کی اطلاع ہوئی تو خفیہ طور پر کوفہ سے باہر نکلے اور راہ میں امام حسین کی خدمت میں پہنچ کر ہمراہ رکاب ہوئے۔ عاشور کے دن قبل ظہر حملۂ اولیٰ میں شہادت پائی۔

(۲۲) جلبشتہ بن قیس نہمی

پورا نام ونسب:۔ جلبشتہ بن قیس بن سلمتہ بن طریف بن ابان بن سلمتہ بن حارثہ ہمدانی نہمی ہے۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کے دادا سلمہ بن طریف صحابی

پیغمبر میں سے تھے اور خود حبشہ بن قیس راوی حدیث ہیں۔ روز عاشور حسین بن علی کے ساتھ قتل ہوئے۔

(۲۳) حجاج بن زید سعدی تمیمی

قبیلۂ بنی سعد بن تمیم میں سے بصرہ کے باشندہ تھے۔ امام حسین نے مکہ معظمہ سے روانگی کے موقع پر چند خط رؤسائے بصرہ کے نام روانہ فرمائے تھے جن میں سے ایک مسعود بن عمرو ازدی کے نام تھا۔ مسعود نے اپنے قبیلہ کے تمام اقوام بنی تمیم۔ بنی حنظلہ بنی سعد اور بنی عامر کو مجتمع کر کے تقریر کی اور نصرت امام حسین کے لیے آمادہ کیا جن میں سے بعض نے ساتھ دینے میں تامل کیا اور بعض نے اعانت کا پختہ وعدہ کیا۔ مسعود نے اس صورت حال سے مطمئن ہو کر ایک خط امام کے نام تحریر کیا جس میں امام کی تشریف آوری عراق پر اظہار مسرت کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ میں نے بنی تمیم اور بنی سعد کو تمام تر آپ کی نصرت کے لیے آمادہ کر لیا ہے اور وہ سب آپ پر اپنی جان نثار کریں گے۔ یہ خط حجاج بن زید سعدی کے ہاتھ روانہ کیا گیا تھا۔ وہ امام کی خدمت میں کربلا میں آ کر شرفیاب ہوئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۴) حلاس بن عمرو ازدی راسبی

اصحاب امیرالمومنین میں سے تھے اور حضرت کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں افسر پولیس کی حیثیت رکھتے تھے۔ کربلا میں ابن سعد کی فوج کے ساتھ آئے اور گفتگوئے مصالحت کے ناکام ہونے پر مخفی طریقہ سے شب کے وقت امام حسین کی طرف منتقل ہو گئے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۵) حنظلہ بن عمر شیبانی

ابن شہر آشوب نے ان کا نام حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ذکر کیا ہے۔ حالات کچھ معلوم نہیں

(۲۶) زاہر بن عمرو اسلمی کندی

اصحاب رسول میں سے راوی حدیث اور بیعت رضوان کے شرف سے بہرہ اندوز تھے صلح حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر میں شریک جہاد بھی ہوئے۔ شجاعت اُن کی ممتاز صفت اور نمایاں جوہر تھا اور اہلبیت کی محبت اُن کے لیے سرنامہ اعزاز۔ جب زیاد بن ابیہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا اور عمرو بن الحمق الخزاعی نے اُس کی مخالفت کا علم بلند کیا تو زاہر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ جب معاویہ نے عمرو بن الحمق کی گرفتاری کا حکم بھیجا تو زاہر کے نام بھی وارنٹ جاری ہوا۔ مگر وہ روپوش ہو گئے اور قبضہ میں نہ آسکے۔

سنہ ۶۰ھ میں حج بیت اللہ الحرام سے شرفیاب ہوئے اور اسی سلسلہ میں امام حسین سے ملاقات ہوئی اور حضرت کی ہمراہی میں کربلا آئے اور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے اصحاب ائمہ میں سے محمد بن سنان زاہری متوفی سنہ ۲۲۰ھ جو امام رضا اور امام محمد تقی کے رواۃ میں سے ہیں انہی زاہر کی اولاد میں سے تھے۔

(۲۷) زہیر بن بشر خثعمی

حملہ اولیٰ کے مقتولین میں سے ہیں۔ حالات کا علم نہیں۔

(۲۸) زہیر بن سلیم بن عمرو ازدی

شب عاشور جبکہ امام حسین کے قتل کا ارادہ یقینی صورت پر فوج ابن سعد کی طرف سے ظاہر ہو گیا۔ تو اُس وقت یہ امام حسین سے آکر ملحق ہوئے اور حملہ اولیٰ میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(۲۹) سالم مولیٰ عامر بن مسلم العبدی

اپنے مالک کے ساتھ اُسی قافلہ میں جو یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ بصرہ سے

کربلا آیا تھا۔ امام کی خدمت میں آئے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۰) سلیم

امام حسن کا باوفا غلام۔ کربلا میں نصرتِ امام حسین میں شہید ہوا۔

(۳۱) سوار بن ابی عمیر نہمی

پورا نام و نسب :- سوار بن منعم بن حابس بن ابی عمیر بن نہم الہمدانی النہمی راویانِ احادیث میں سے تھے۔ امام حسین کے کربلا پہونچنے کے بعد گفتگوئے صلح کے زمانہ میں کربلا میں وارد ہوئے اور امام کے ہمراہ رہے یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں نصرتِ امام میں جنگ کا شرف حاصل کیا اور زخمی ہوکر گر گئے۔ دشمن فوج نے گرفتار کرکے ان کو عمر سعد کے پاس پیش کیا اُس نے چاہا کہ قتل کرائے مگر ان کی قوم کے لوگ مانع ہوئے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر بھی زخمی اتنے ہو چکے تھے کہ جانبر نہ ہو سکے اور چھ مہینے کے بعد اُنہی زخموں کے تکالیف سے انتقال کیا۔

(۳۲) سیف بن مالک عبدی

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ اور اُن شیعیان اہلبیت میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ عبدیہ کے مکان میں مجتمع ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ نصرتِ امام حسین کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح میں امام کی ملاقات سے شرف اندوز ہوئے حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۳۳) شبیب بن عبداللہ

حارث بن سریع ہمدانی جابری کے غلام، صحابی رسول اور حضرت امیر کے ساتھ جمل، صفین، نہروان تینوں لڑائیوں میں شرکت کا شرف حاصل کئے ہوئے۔ کوفہ کے

باشندہ تھے۔ کربلا میں سیف بن حارث بن سریع اور مالک بن حارث بن سریع دونوں اپنے آقازادوں کی معیت میں امام کی خدمت میں پہونچے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے

(۳۴) شبیب بن عبداللہ نہشلی

طبقۂ تابعین میں سے حضرت علی کے اصحاب میں محسوب تھے اور آپ کے ساتھ تینوں لڑائیوں میں شریک رہے۔ پھر امام حسن اور اُن کے بعد امام حسین کے اصحاب میں رہے اور حضرت کے مخصوصین میں سمجھے جاتے تھے۔ جب امام حسین نے مدینہ کو چھوڑ کر سفر غربت اختیار کیا تو شبیب بن عبداللہ وہیں سے آپ کے ہمراہ رکاب ہوئے اور مکہ میں آپ کے ساتھ رہے۔ پھر جب آپ مکہ سے روانۂ عراق ہوئے تو شبیب نے اُس وقت بھی آپ کا ساتھ دیا اور کربلا پہونچے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۵) ضرغامہ بن مالک تغلبی

کوفہ میں جناب مُسلم بن عقیل کی بیعت کی اور اُن کے شہید ہونیکے بعد روپوش ہو گئے پھر عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا آئے اور امام حسین کے پاس آکر آپ سے ملحق ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہادت پائی۔

(۳۶) عامر بن مُسلم عبدی بصری

بصرہ کے باشندہ، اُنھی شیعہ اشخاص میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ کے مکان میں جمع ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ نصرت امام کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح میں حضرت کے پاس پہونچے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۷) عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر جہنی

آپ پہلے سُن چکے ہیں کہ مکہ معظمہ سے امام حسین کی روانگی کے موقع پر عوام کو توقعات

تھے کہ آپ ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں۔ جہاں بحیثیت امام کے آپ کی اطاعت کی جائیگی اور آپ کو اقتدارِ کلی حاصل ہوگا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ راستے میں عرب کے صحرائی قبائل جن کی طرف سے گزر ہوتا تھا بہت سے اُن میں سے قافلہ میں شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ "میاہ جہینہ" نام والے چشموں کے پاس سے قبیلۂ جہینہ کے بہت سے لوگ آپ کے ساتھ ہوئے۔ ان ہی میں سے عباد بن مہاجر بھی تھے۔ جب مسلم و ہانی کے مقتول ہونے کی خبر سننے کے بعد امام حسین نے منزل زبالہ پر لوگوں کو اپنا پیغام سنایا کہ حالات اس صورت پر ہیں اور ہمارے ساتھ کوئی امید نہ رکھنا چاہیئے لہٰذا جو شخص واپس جانا چاہتا ہو وہ واپس چلا جائے تو اُس وقت بہت سے لوگ چپ و راست منتشر ہو گئے اور بس وہ لوگ رہ گئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے لیکن عباد بن مہاجر اُن باوفا لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس وقت امام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور وہ آخر تک حضرت کے ساتھ ساتھ رہے یہاں تک کہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۳۸) عبدالرحمٰن بن عبد ربّ انصاری خزرجی

صحابۂ رسول میں سے حدیث غدیر کے راوی اور شاہد تھے (تجرید اسماء الصحابہ للذہبی مطبوعۂ حیدرآباد ص ۳۶۷)

حضرت علی بن ابیطالب کے بڑے مخصوص تربیت یافتہ شاگرد تھے۔ حضرت نے خود اُن کو قرآن کی تعلیم دی اور اُن کی تربیت فرمائی امام حسین کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے اور کربلا تک ہمراہ رکاب آئے۔ صبح عاشور اُن کی اور بریر کی مزاحیہ گفتگو کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے۔ حملۂ اولیٰ میں درجہ شہادت حاصل کیا۔

(۳۹) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی

طبقۂ تابعین میں سے معزز شخص بہادر اور معرکہ آزما تھے۔ کوفہ سے جو دوسرا وفد امام حسین کے پاس بھیجا گیا ہے اور جس کے ہاتھوں تقریباً ۵۳ عرضداشتیں جن میں سے

ہر ایک دو تین اور چار دستخطوں سے تھی، امام کے نام روانہ کی گئی تھیں، اس وفد میں قیس بن مسہر صیداوی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ساتھ یہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی تھے امام نے جناب مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا تو ان تینوں نمائندوں کو اُن کے ساتھ کر دیا پھر عبدالرحمٰن بن عبداللہ کسی صورت سے دوبارہ امام حسین کے پاس آ گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۰) عبدالرحمٰن بن مسعود

یہ مسعود بن حجاج تیمی کے بیٹے تھے جن کا تذکرہ سلسلۂ شہداء میں بعد کو آئے گا۔ یہ دونوں باپ بیٹے عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے اور ساتویں محرم کو امام کے پاس سلام کرنے کے قصد سے آئے، پھر واپس نہیں گئے اور عبدالرحمٰن حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے

(۴۱) عبداللہ بن بشر خثعمی

پورا نام و نسب حسب ذیل ہے:- عبداللہ بن بشر بن ربیعہ بن عمرو بن منارۃ بن قمیر بن عامر بن رائشہ بن مالک بن واہب بن جلیحہ بن کلب بن ربیعہ بن عفرس بن خلف بن اقبل بن انمار الخثعمی۔

ان کے باپ بشر بن ربیعہ اپنے زمانہ کے مشہور روزگار شخص اور میدان جنگ کے معرکہ آزما شہسواروں میں سے تھے۔ کوفہ کا مشہور احاطہ جو "جبانہ بن بشر" کہلاتا تھا ان ہی کے نام سے منسوب تھا۔ جنگ قادسیہ میں ان کا نام صفحات تاریخ پر نمایاں ہے، ان کے فرزند عبداللہ صفات شجاعت و جرأت و نام آوری میں اپنے باپ کے قدم بقدم تھے۔ میدان کربلا میں فوج عمر سعد کے ساتھ پہونچ کر انصار امام حسین میں آ کر شامل ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

(۴۲) عبداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی

یزید بن ثبیط کا تذکرہ بعد کو آئے گا۔ ان کے دس بیٹے تھے جن کے سامنے

انھوں نے نصرت حسین کے لیے چلنے کا سوال پیش کیا۔ لیکن اُن میں سے صرف دو وہ تھے جنھوں نے اس اہم ارادہ میں باپ کا ساتھ دیا۔ ان میں سے ایک یہی عبداللہ تھے چنانچہ وہ اپنے باپ کی ہمراہی میں بصرہ سے روانہ ہوئے اور ابطح میں آکر خدمت امام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۳) عبیداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی

اپنے باپ کے دوسرے فرزند تھے جنھوں نے نصرت حسین کے لیے باپ کا ساتھ دیا اور یہ بھی حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۴) عقبہ بن صلت جہنی

"میاہ جہینہ" کے اعراب میں سے جو اثنائے راہ سے امام کے ساتھ ہو گئے تھے ایک یہ بھی ہیں منزل زبالہ میں امام کے خطبہ کو سُن کر جب دوسرے لوگ چلے گئے تو یہ امام کے ساتھ رہے یہاں تک کہ روز عاشور شہید ہوئے۔

(۴۵) عمار بن ابی سلامہ دالانی

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔ عمار بن ابی سلامہ بن عبداللہ بن عمران بن راس بن دالان ہمدانی۔ اُنھوں نے رسالتمآب کے زمانہ کا ادراک کیا اور علی بن ابیطالب کے ساتھ جمل، صفین، نہروان تینوں لڑائیوں میں شرکت کی اور کربلا میں حسین بن علی کے ساتھ قتل ہوئے۔

(۴۶) عمّار بن حسّان طائی

نام و نسب:۔ عمار بن حسان بن شریح بن سعد بن حارثہ بن لام بن عمرو بن طریف بن عمرو بن ثمامہ بن ذہل بن جذعان بن سعد بن طے۔ مخصوص

ممتاز شیعۂ اہلبیت میں سے مشہور بہادر و جنگ آزما تھے۔ ان کے باپ حسان بن شریح امیر المومنین کے اصحاب میں سے تھے اور جنگ صفین میں حضرت کی نصرت میں شہید ہوئے عمار امام حسین کے ساتھ مکۂ معظمہ سے آئے تھے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے ان کی اولاد میں سے عبد اللہ بن احمد بن عامر بن سلیمان بن صالح بن وہب بن عمار بن حسان بن شریح طائی جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے جو اپنے والد کے ذریعہ سے امام رضا سے روایت رکھتے تھے اور کتاب القضایا و الاحکام کے مصنف تھے

(۴۷) عمرو بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تیمی

یہ بہادر اور شہسوار، جنگ کے میدان میں کارنمایاں انجام دیے ہوے تھے عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدان کربلا میں آئے اور پھر انصار امام حسین میں شامل ہو گئے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوے۔

(۴۸) عمران بن کعب بن حارث اشجعی

یہ بھی حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ہیں۔ حالات کچھ معلوم نہیں ہوے

(۴۹) قارب مولی الحسینؑ

قارب بن عبد اللہ بن اریقط لیثی دُئلی۔ ان کی ماں فکیہہ امام حسین کی حرم سرا میں جناب رباب مادر سکینہ کی کنیز تھیں۔ اُن کی شادی عبد اللہ بن اریقط کے ساتھ ہوئی جن سے قارب کی ولادت ہوی۔ قارب اپنی ماں کی ہمراہی میں امام حسین کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور پھر کربلا آئے۔ اور حملۂ اولیٰ میں قتل ہوے۔

(۵۰) قاسط بن زہیر بن حارث تغلبی

یہ اور ان کے دو بھائی جن کا تذکرہ بعد کو ہوگا۔ امیر المومنین حضرت علی

کے اصحاب میں سے تھے اور حضرت کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ پھر امام حسن کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ حضرت نے حجاز کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس کے بعد یہ لوگ کوفہ میں قیام پذیر رہے جب امام حسین کربلا میں وارد ہوئے تو یہ لوگ کسی طرح امام کی خدمت میں پہونچے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۱) قاسم بن حبیب بن ابی بشر ازدی

کوفہ کے شیعوں میں سے بہادر، دلیر اور شہسوار تھے۔ عمر سعد کے ساتھ کربلا آئے اور یہاں پہونچ کر امام کے انصار میں ملحق ہو گئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۲) کردوس بن زہیر بن حارث تغلبی

ان کے ایک بھائی قاسط بن زہیر کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے اور دوسرے بھائی مقسط کا حال بعد کو لکھا جائے گا۔ یہ تینوں بھائی اصحاب امیرالمومنین میں سے تھے اور حضرت کے ساتھ لڑائیوں میں شرکت کی۔ کربلا میں خفیہ طریقہ پر نصرت حسین کے لیے آئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے

(۵۳) کنانہ بن عتیق تغلبی

کنانہ بن عتیق بن معاویہ بن جماعتہ بن قیس تغلبی کوفی شجاعان روزگار میں سے عابد و زاہد اللسان اور حافظ قرآن تھے لڑائی ٹھننے سے پہلے کربلا میں امام کے پاس پہونچے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۴) مجمع بن زیاد بن عمرو جہنی

یہ میاہ جہینہ کے اعراب میں سے تھے جو اثنائے راہ میں امام کے ساتھ ہو گئے اور منزل زبالہ میں امام کے خطبہ کو سنکر اُن کا کثیر مجمع متفرق ہو گیا مگر

مجمع بن زیاد امام کے ہمراہ رہے اور روز عاشور پہلے اُن کا گھوڑا زخمی ہو کر قتل ہوا۔ پھر چند آدمیوں کو قتل کر کے وہ دشمنوں میں گھر گئے اور قتل ہوئے۔

(۵۵) مسعود بن حجاج تیمی

کوفہ کے بڑے مشہور شیعہ اور لڑائیوں میں کام کیے ہوئے تھے۔ اپنے فرزند عبدالرحمٰن بن مسعود کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں آئے اور ساتویں محرم کو امام کے پاس سلام کرنے کے لیے آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۶) مُسلم بن کثیر صدفی ازدی

قبیلۂ ازد شنوءہ میں سے "اعرج" یعنی لنگ تھے۔ انھوں نے رسالتمآب کا دور اک کیا تھا۔ جنگ جمل میں امیرالمومنین کی نصرت میں شریک جنگ رہے اور پنڈلی پر تیر پڑا جس کا اثر ہمیشہ رہا۔ کوفہ سے نصرت امام حسین کے لیے روانہ ہوئے اور کربلا میں آکر قدمبوس ہوئے۔ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۷) مقسط بن زہیر بن حارث تغلبی

یہ اور ان کے دو بھائی قاسط اور کردوس جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اصحاب حضرت علی میں سے تھے اور حضرت کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے کربلا میں خفیہ طریقہ پر نصرت امام حسین کے لیے آئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۸) منیع بن زیاد

حملۂ اولیٰ کے شہدا میں سے ہیں۔ حالات معلوم نہیں۔

(۵۹) نصر بن ابی نیزر

ابو نیزر نجاشی بادشاہ حبشہ یا کسی اور ملک عجم کے بادشاہ کی نسل سے تھے

بچپنے میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ رسول اللہ کی خدمت میں لائے گئے اور اسلام لائے۔ حضرت نے اُن کی تربیت کی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ حضرت علی کی خدمت میں رہے اور آپ کے ایک مملوکہ نخلستان میں اصلاح و تربیت کے کام پر مامور ہوئے۔

ان کے فرزند نصر نے کمسنی اور نوجوانی حضرت علی اور امام حسن کے ساتھ گزاری اور آخر میں امام حسین کی غلامی میں رہے۔ یہاں تک کہ سفرِ عراق میں آپ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا آئے۔ حملۂ اولیٰ میں پہلے اُن کا گھوڑا کام آیا پھر وہ خود درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۰) نعمان بن عمرو ازدی

کوفہ کے باشندہ، اصحاب امیر المومنین میں سے تھے اور حضرت کے ساتھ جنگ صفین میں شریک بھی ہوئے تھے۔ یہ اور اُن کے بھائی حلاس بن عمرو ازدی جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے اور شرائط صلح مسترد ہونے پر آ کے امام سے ملحق ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۱) نعیم بن عجلان انصاری

نام و نسب:۔ نعیم بن عجلان بن نعمان بن عامر بن زریق الانصاری الخزرجی وہ اور اُن کے دو بھائی نضر اور نعمان اصحاب حضرت علی میں سے تھے اور جنگ صفین میں کارنمایاں انجام دیے تھے اور تینوں شجاعان روزگار اور شعراء میں سے تھے۔

نعمان بن عجلان کو امیر المومنین نے عمرو بن ابی سلمہ مخزومی کی معزولی کے ساتھ بحرین کا حاکم مقرر کیا۔

نضر اور نعمان دونوں نے امام حسن کی خلافت کے زمانہ میں انتقال کیا اور

نعیم کوفہ میں مقیم رہے۔ جب امام حسین سرزمین عراق پر پہونچے تو وہ کوفہ سے نکل کر خدمت امام میں آئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

یہاں پر حملۂ اولیٰ کے پچاس شہداء کی تعداد پوری ہوگئی۔ اب وہ لوگ ہیں جو حملۂ اولیٰ کے بعد سے نماز ظہر تک شہید ہوئے۔

(خیمہ گاہِ حسینی پر ہجوم)

جب تک حسین کی فوج اپنی مختصر تعداد میں سہی پوری موجود تھی، اُس وقت تک دشمنوں کو آگے بڑھنا ممکن نہ ہو سکا تھا لیکن اب جس وقت کہ پچاس آدمی فوج حسینی کے ایک مرتبہ ختم ہوگئے اور جتنے انصار حسین باقی رہے اُن کے پاس گھوڑے نہ باقی رہے، سب پیادہ ہوگئے تو اب فوج دشمن کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ خیام حسینی کے قریب آگئے۔ حسین کے اصحاب کی تعداد بہت کم تھی مگر اُن کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ طبری نے لکھا ہے "اُنھوں نے جنگ کی یہاں تک کہ دوپہر کا وقت آگیا، سخت ترین دنیا کی جنگ جو خلق خدا میں کبھی نظر سے گزری ہو"

یزیدی فوج کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پس پشت سے حملہ کر سکے اور ان بہادروں کو گھیرلے مگر پشت کی جانب ان کے خیمے تھے جنھیں امام کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندر طناب کر دیا گیا تھا کہ اُنھوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی اس لیے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا۔ عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ خیموں کو اُن کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو۔ اصحاب سید الشہداء نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں کے اندر داخل ہو کر منتظر بیٹھ گئے۔ جب خیمہ میں کوئی داخل ہوتا تا کہ طنابیں کاٹ کر اُس کو گرائے فوراً وہ قتل کیا جاتا اور اُس کی لاش باہر پھینک دی جاتی تھی

عمر سعد کو اس تدبیر میں بھی شکست اُٹھانا پڑی تو اُس نے کہا کہ اچھا! کسی خیمے کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان سب خیموں میں آگ لگا دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین کا خیمہ اور حرم سرائے عصمت اس مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ قائم تھا۔ فوج کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ دینے لگے تو امام نے فرمایا آگ لگا دینے دو اس لیے کہ اگر انھوں نے آگ لگا دی اور شعلے بھڑکنے لگے تو پھر بھی یہ اُس طرف سے تم پر حملہ نہ کر سکیں گے اور جو ان کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہوگا۔ اصحاب حسین نے مدافعت چھوڑ دی اور عمر سعد کی فوج آگ لگانے میں کامیاب ہوئی مگر نتیجہ نے بتایا کہ عمر سعد ایسے ایک بڑی فوج کے افسر نے سیاست جنگ میں غلطی کی اور اُس چھوٹی فوج کے سپہ سالار یعنی امام حسین کی رائے حرف بحرف درست ہوئی یعنی آگ لگانے سے دشمن کے لیے خود اُس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور مقابلہ کا موقع صرف سامنے ہی کی جانب باقی رہ گیا۔

اپنی تدبیر کے شکست کھانے کا غصہ ہی تھا جس نے کمینہ طبیعت شمر کو برافروختہ کر دیا اور اُس نے مخصوص امام حسین کے خیمہ پر حملہ کر کے اپنا نیزہ زور سے مارا اور کہا کہ آگ لاؤ تاکہ میں اس گھر کو اُس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں۔ اس آواز کا اثر تھا کہ خیموں میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہو گیا جس سے غیرت وار سپکر شرافت امام حسین کو تاب نہ رہی اور پکار کر فرمایا "اے شمر تو آگ اس لیے منگا رہا ہے کہ میرے گھر کو میرے اہل و عیال سمیت جلا دے۔ خدا تجھے آگ سے جلنا نصیب کرے۔" فوج کے دوسرے سپاہیوں نے شمر کو منع کیا اور شبث بن ربعی نے شمر کے پاس آ کر کہا "میں نے آج تک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تو کر رہا ہے اور نہ اس سے بدتر اقدام دیکھا جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ تو عورتوں کو خوفزدہ کرتا ہے؟" ان سب لوگوں کے کہنے سے شمر بھی کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

اتنی دیر میں زہیر بن قین نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور اتنا سخت حملہ کہ شمر اور اُس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹا دیا اور ابو عزہ ضبابی کو جو شمر کا خاص آدمی تھا قتل کر دیا۔ دشمن کی فوج نے جو اپنے ایک

ممتاز سپاہی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا تو پورے جوش و خروش سے ان دسوں آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خونریز لڑائی ہوئی مگر ان بہادروں نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں دشمن کو شکست ہوئی۔

کثرت اور قلت کا مقابلہ کیا؟ طبری کے بیان کے موافق صورت یہ بھی کہ ان میں سے ایک یا دو بھی قتل ہوتے تو اس سے نمایاں کمی پیدا ہوتی تھی اور وہ کثیر تعداد میں تھے اس لئے جتنے بھی قتل ہوتے تھے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

وہ اشخاص جو پہلے حملہ کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے واقعے پہلے شہید ہوئے، اُن میں سے بعض کے نام تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں:-

(۶۲) بکر بن حی تیمی

عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا آئے تھے مگر جنگ چھڑنے کے بعد توفیق الٰہی دستگیر ہوئی اور امام حسین کے ساتھ آکر شریک جہاد ہو گئے۔ حملۂ اولیٰ کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۳) عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی

ان کے باپ جنادہ بن کعب کا تذکرہ حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ہو چکا۔ عمرو بن جنادہ کا میدان کربلا میں نو دس برس کا سن تھا۔ ان کی ماں بحریہ بنت مسعود تھیں جو اپنے شوہر کے ساتھ واقعۂ کربلا میں موجود تھیں۔ جب جنادہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو اُن کی بیوہ نے یتیم بچہ کو ہدایت کی کہ وہ بھی باہر نکلے اور امام حسین کی نصرت میں جنگ کرے۔ بچہ خدمت امام میں آیا اور طالب اجازت ہوا۔ حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ بچے نے پھر رخصت طلب کی حضرت نے اصحاب کی طرف رُخ کر کے فرمایا، ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب بھلا اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی جو

یہ بھی جاکر قتل ہو۔ بچہ نے کہا آقا میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور انھوں نے ہی مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔ امام مجبور ہوے اور اجازت دی۔ بچہ میدان میں آیا اور لڑکر قتل ہوا۔ سخت دل اور بے رحم فوج نے بچے کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینک دیا۔ پر طاقت دل والی ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا اور کہا "شاباش! بیٹا شاباش! تونے میرا دل خوش کر دیا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈک ڈال دی" پھر اُس نے سر کو اٹھا کر فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود بھی ایک گرز آہنین لیکر دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے جو یہ دیکھا اسے گوارا نہ کیا اور اس عورت کو خیمہ کی جانب واپس فرمادیا۔

طبقۂ خواتین کے اس ایثار و قربانی کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے اور ہمیشہ بے مثال رہے گی۔

ظہر کا ہنگام اور نماز ظہر کا ہنگامہ

میدان میں ایک طرف گرمی سے آگ برس رہی تھی، دوسری طرف جنگ کی وجہ سے خون کی بارش تھی۔ دشمن کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح جنگ جلدی ختم ہو اور یہ مہم سر کر لی جائے، اس عالم میں ظہر کا وقت آیا۔ ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے امام کی خدمت میں عرض کی "مولا میں دیکھتا ہوں یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آگئے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آپ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے میں قتل ہو جاؤنگا میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو جس کا وقت آگیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔ اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔ امام نے سر اٹھایا اور فرمایا "تم نے نماز کو یاد کیا۔ خدا تم کو نماز گزاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اول وقت ہے۔" پھر حضرت نے فرمایا "ان لوگوں سے کہو کہ اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم لوگ نماز پڑھ لیں۔

اللہ! رسول کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوی وہ نماز کی مہلت

مانگے اور نہ ملے بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تمیم صف سے باہر نکلا اور اُس نے کہا کہ "تمھاری نماز قبول نہیں ہے"۔

(۶۴) حبیب بن مظاہر اسدی

نام و نسب:۔ حبیب بن مظاہر بن رئاب بن اشتر بن حجوان بن فقعس بن طریف بن عمرو بن قیس بن حارث بن ثعلبہ بن دودان بن اسد۔ کنیت ابو القاسم عرب کے مشہور شہسوار ربیعۃ بن خوط بن رئاب کے چچازاد بھائی تھے۔ ابن کلبی کی روایت کے مطابق وہ صحابی تھے اور رسول کی زیارت کی تھی۔ شیخ طوسی نے انھیں اصحاب امیر المومنین اور پھر اصحاب امام حسن اور اصحاب امام حسین تینوں بابوں میں درج کیا ہے۔

حبیب بن مظاہر میثم تمار اور رشید ہجری کی طرح حضرت علی بن ابیطالب کے اُن صحابۂ با اختصاص میں سے تھے جنھیں حضرت نے خاص طور سے عُلوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی۔

اس کتاب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے جب معاویہ کے انتقال کی خبر کوفہ میں پہنچی اور امام حسین کو کوفہ کی طرف بلانے کا خیال بعض دماغوں میں پیدا ہوا تو سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر شیعیان کوفہ کا اجتماع ہوا۔ اس جلسہ کی روئداد سے ظاہر ہے کہ اس موقع پر حبیب بن مظاہر موجود تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اُس جماعت میں نمایاں ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے چنانچہ جو خط امام حسین کے نام شیعیان کوفہ کی طرف سے گیا تھا اُس میں سلیمان بن صرد وغیرہ کے ساتھ اُن کا نام خصوصیت کے ساتھ تحریر تھا۔ جب حضرت مُسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہوئے تو سب سے پہلا اجتماع شیعوں کا جو ہوا اُس میں جناب مُسلم نے امام حسین کا خط پڑھ کر سُنایا اس موقع پر سب سے پہلی تقریر عابس بن ابی شبیب شاکری نے کی تھی اور

اُس کی تائید حبیب بن مظاہر نے کی اور اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق ذمہ داری نہیں لیتے مگر جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ہم ہر طرح امداد کے لئے آمادہ ہیں۔

کربلا میں حضرت امام حسین کے پاس پہونچنے کے بعد یہ برابر ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے کہ وہ دشمن کے ساتھ گفت و شنید کر سکیں اور نصیحت کے فرض کو انجام دیں چنانچہ جب عمر بن سعد نے قرہ بن قیس حنظلی کو امام حسین کے پاس بصیغۂ مراسلت بھیجا ہے اور قرہ بن قیس نے امام کے پاس آکر پیغام پہونچایا ہے اور واپس جانا چاہا تو آپ کو یاد ہوگا کہ حبیب نے کہا "اے قرہ بن قیس کہاں جا رہے ہو ظالم جماعت کی طرف۔ اس بزرگ کی امداد کرو جس کی بدولت خدا نے تم کو اور ہم کو اسلام کی عزت عطا کی،، قرہ نے کہا میں جواب پیغام کا جاکر کہدوں تو پھر اس مسئلہ پر غور کروں گا۔"

اس تقریر کا اثر قرہ کے دل پر ہوا ضرور چنانچہ بعد میں وہ کہا کرتا تھا کہ اگر حُر جاتے وقت اپنا ارادہ مجھ پر ظاہر کر دیتے تو میں بھی اُن کے ساتھ نصرت حسین کے لئے چلا جاتا۔ اس تاسف اور اظہار رنج سے ظاہر ہے کہ دل اُس کا احساس سے معمور ہو چکا تھا اور ضمیر آمادہ کر رہا تھا مگر اُس میں قوت ارادی اتنی نہ تھی کہ وہ حُر کی طرح اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکے وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج تھا اور یہ اُس کی عملی کمزوری تھی کہ سہارا نہ ملنے سے اُس کے قدم رُک گئے۔

نویں تاریخ کی شام کو جب فوج اہل کوفہ نے دفعتہً امام کی طرف رُخ کیا اور حملہ کر دیا اور امام نے جناب عباس کو مکالمہ کے لئے بھیجا اور جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ جن میں زہیر بن قین اور حبیب بن مظاہر بھی تھے اُن کے سامنے گئے اور پوچھا کہ اس بے وقت اقدام کا کیا منشا ہے اور جواب ملا کہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا تم سے بیعت لی جائے اور یا جنگ کی جائے۔

جناب عباس یہ کہہ کر کہ میں امام سے جاکر دریافت کر لوں تو آکر تم سے جواب

دوں امام کی خدمت میں گئے۔ اور دوسرے اصحاب وہیں کھڑے رہے۔ اتنے وقت کو حبیب نے بیکار نہ جانے دیا۔ زہیر بن قین سے کہا کہ "ان لوگوں سے تم کچھ گفتگو کرو اور نہیں تو کہو میں کچھ بات چیت کروں"۔ زہیر نے کہا "نہیں آپ ہی گفتگو کیجیے"۔ تو حبیب نے اس وقت مخالف مجمع کو مخاطب کر کے حسب ذیل تقریر کی "سونچو تو! کتنا برا انجام ہوگا پیش خدا اُس جماعت کا جو اُس کے سامنے جائے گی اس حالت میں کہ اُس نے اولاد رسول کا خون بہایا ہو اور ملک کے اُن عبادت گزاروں کو قتل کیا ہو جو پچھلے پہر سے اُٹھنے والے اور کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والے ہیں"۔

عزرہ بن قیس نے جو ایک خفیف الحرکات سبک انسان تھا بات کاٹنے کے لئے پکار کر کہا "حبیب! تم اپنی طرف ہر موقع پر اشارہ کرتے رہتے ہو کہ میں بڑا عبادت گزار ہوں" یہ بے موقع مداخلت سن کر زہیر کو غصہ آگیا اور کہا "عزرہ! اس میں شک کا ہے کا ہے۔ بے شک حبیب کا نفس ایسا ہے جس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے اور اُس کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کی ہے"۔

شب عاشور حبیب بن مظاہر نے امام سے اجازت چاہی کہ وہ جا کر قبیلۂ بنی اسد سے جو اطراف میں مقیم ہیں آپ کی امداد کی خواہش کریں۔ امام نے اجازت دی اور حبیب گئے۔ بنی اسد کے مجمع میں جا کر اُن کو عظیم نصیحت کی اور انھیں نصرت امام پر ترغیب دلائی جس پر سب سے پہلے عبداللہ بن بشیر اسدی نے لبیک کہی اور پھر دوسرے لوگ بھی آمادہ ہوئے اور سب حبیب کے ساتھ روانہ ہوئے مگر اس کی خبر عمر سعد کو ہوگئی اور اس نے پانچ سو سوار سد راہ ہونے کے لیے بھیجے جس کے مقابلہ کی اس جماعت کو تاب نہ ہوئی اور سب لوگ واپس چلے گئے حبیب تنہا خدمت امام میں واپس پہونچ گئے۔

صبح عاشور جب امام حسینؑ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا ہے اور شمر نے انتہائی بے شرمی، بے حیائی اور کمینہ فطرتی سے امام کی تقریر میں مداخلت کی اور کہا کہ میں منافق ہوں اور خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں (یعنی صرف زبانی) اگر

کچھ میری سمجھ میں آرہا ہو کہ آپ کیا کہتے ہیں؟" تو حبیب بن مظاہر ہی تھے جنھوں نے اس گستاخی کا جواب دیا یہ کہہ کر کہ بے شک بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو خدا کی سنتر حرفوں پر عبادت کرتا ہے یعنی تیری عبادت مخلصانہ حیثیت سے یکرنگ نہیں بلکہ ہفتاد رنگ ہے اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے۔ تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ امام کیا فرماتے ہیں کیونکہ تیرے دل پر مُہر لگ چکی ہے۔

یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ جب امام نے اپنی مختصر فوج کو ترتیب دیا تو میسرہ کا سردار حبیب بن مظاہر کو قرار دیا تھا۔

مُسلم بن عوسجہ کی شہادت کے وقت آپ کو حبیب کا یہ جذبۂ قربانی بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب مُسلم مجروح ہو کر گرے اور امام اُن کے سرہانے تشریف لے گئے تو حبیب بھی حضرت کے ساتھ ساتھ تھے اور حبیب نے مُسلم کو مبارکباد دی تھی اور پھر کہا تھا کہ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی تمھارے بعد ہی تم سے آکر ملتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو تاکہ میں اُس وصیت کو پورا کروں اور اس طرح جو تمھاری قرابت اور مذہبی خصوصیت کا حق ہے اُس کو ادا کردوں۔ اس کا جواب جو مُسلم نے دیا وہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ اُنھوں نے کہا اور کچھ نہیں وصیت بس یہی ہے کہ ان کی نصرت سے ہاتھ نہ اُٹھانا" اور اشارہ کیا امام حسین کی طرف۔ ظاہر ہے کہ اس وصیت سے حبیب کے جذبۂ قربانی میں کچھ کمی نہیں بلکہ اضافہ ہی ہوگیا۔

پھر کیا ممکن تھا کہ حصین بن تمیم کی اس جسارت کو جو اُس نے نماز ظہر کی اجازت طلب کرنے پر کی ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیتے؟ وہ بیتاب ہو گئے اور چیخ کر کہا "قبول نہیں ہے؟ رسول کے فرزند کی نماز تیرے خیال میں قبول نہیں ہے اور تیری نماز قبول ہے اے شرابخوار!؟" حصین نے یہ سُنکر حملہ کردیا اور حبیب بھی مقابلہ پر آگئے اُس کے گھوڑے کے مُنھ پر تلوار ماری جس سے وہ الف ہوگیا اور حصین زمین پر گر گیا۔ دوسرے ساتھیوں نے بڑھ کر اُسے حلقہ میں لے لیا اور حبیب کے ہاتھ سے چھڑا کر لے گئے۔

اب حبیب میدان جنگ میں آ ہی چکے تھے۔ ایمان کا جوش اور شجاعت کی امنگ۔ دشمن کی جرأت و جسارت کا غصہ اور اس کے زندہ نکل جانے کا رنج۔ وہ اس مضمون کا شعر پڑھنے لگے :۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اگر تعداد میں تمہارے برابر ہوتے یا تمہارے آدھے بھی ہوتے تو تم ہمارے سامنے سے یقینی بھاگ جاتے۔ اے بدترین خلق خدا حسب و نسب اور اخلاق کے لحاظ سے"

پھر انھوں نے دوسرے شعر پڑھے جن کا مضمون یہ تھا:

"میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر ہے۔ میدان جنگ اور بھڑکتی ہوئی لڑائی کے ہنگام کا شہسوار ہوں تمھاری تعداد ہم سے زیادہ ہے اور لڑائی کا سامان تمھارے پاس فراواں ہے مگر ہم اپنی بات کے زیادہ دھنی اور مشکلات کے زیادہ برداشت کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ حجت ہماری بالا، حقیقت نمایاں، فرائض کی پابندی زیادہ اور دامن صاف ہے"

ان اشعار میں حبیب نے اصحاب حسین کے کردار اور ان نفسیاتی خواص کو جو ان کے ثبات و استقلال کے ذمہ دار تھے صاف طور پر بیان کیا ہے۔

حبیب نے سخت جنگ کی یہاں تک کہ ایک تمیمی پہلوان نے جس کا نام بدیل بن صریم تھا حبیب پر حملہ کیا حبیب نے ایک ضرب شمشیر میں اس کا کام تمام کیا لیکن اسی کے ساتھ بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے ان پر نیزہ کا وار کر دیا جس سے وہ زمین پر آ رہے۔ ابھی وہ اٹھنا چاہتے تھے کہ ان کے پہلے کے شکست خوردہ حریف حصین بن تمیم نے ان کے سر پر تلوار لگائی جس سے وہ بے جان ہو کر گر گئے تمیمی شخص جس کے نیزہ نے حبیب کو گرایا سر کاٹنے کے لیے قریب آیا۔ حصین نے کہا میں ان کے قتل میں شریک ہوں۔ تمیمی نے کہا نہیں، کام میں نے کیا ہے۔ آخر حصین نے کہا مجھے اتنا کر لینے دو کہ میں ان کا سر اپنے گھوڑے کی گردن میں باندھ کر ایک دفعہ لشکر میں گردش کر لوں تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ میں نے ان کے قتل میں شرکت کی۔ پھر تم

اس سر کو لے لینا اور ابن زیاد کے پاس لے جانا، وہاں سے جو انعام ملے اُس میں میں حصّہ نہیں لوں گا۔ تمیمی نے انکار کیا مگر لوگوں کے کہنے سے رضی ہو گیا اور حصین نے ایک مرتبہ سر کو اپنے ساتھ لے کر فوج کے اندر گردش کر لی۔ اس طرح اُس نے گویا اُس شکست کی خفت کو مٹایا جو اُسے حبیب کے مقابلہ میں حاصل ہوی تھی۔

حُر کی شہادت

حُر بن یزید ریاحی جن کے حالات پہلے درج ہو چکے ہیں اور آپ کو یاد ہوگا کہ وہ حملۂ اولیٰ میں اپنے گھوڑے کے پے ہونے کے بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے، اب حبیب کی شہادت کے بعد حُر نے مضبوط ارادہ کر لیا کہ وہ منزلِ شہادت کو حاصل کر کے رہیں گے۔ انھوں نے رجز پڑھی:-

"میں قسم کھاتا ہوں کہ قتل نہ ہوں گا جب تک دشمنوں کو قتل نہ کر لوں۔ اور مارا نہ جاؤنگا مگر پیش قدمی کی حالت میں۔ میں آج تلواریں لگاؤں گا فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار ہوگا" کبھی کہتے تھے:-

"میں شمشیر زنی کروں گا اُس بہترین انسان کی طرف سے جس نے سرزمین حرم میں کبھی قیام کیا" معلوم نہیں امام کا اشارہ تھا یا خود اپنی جانب سے، زہیر بن قین نے حُر کے ساتھ مل کر جہاد شروع کیا۔ حالت یہ تھی کہ جب ایک گھر جاتا تھا تو دوسرا بڑھ کر اُس کے چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے حُر کو سختی سے گھیر لیا اور زہیر کی مدافعت ناکام ہوی۔ آخر حُر شہید ہو گئے۔ امام نے اپنے اس ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اُس کی لاش میدان سے اُٹھا کر لائی گئی اور حضرت کے سامنے رکھی گئی تو آپ خاک و خون حُر کے چہرہ سے صاف کرتے تھے اور فرماتے تھے "تم بے شک حُر ہو۔ تمھارے والدین نے تمھارا نام حُر بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حُر ہو اور آخرت میں بھی حُر" مطلب یہ تھا کہ انسان کی حریت و شرافت کا جوہر اُس کے افعال ہی سے

نمایاں ہوتا ہے۔ دنیاوی خواہشوں کی قید و بند میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو ہٹا دینے والا انسان ہرگز حریت ضمیر اور شرافت نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہے۔ یقیناً حُر نے تمام دنیاوی توقعات کو ٹھکرا کر حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ حُر ثابت ہوا اور حُریت کے اصل جوہر کو اپنے عمل سے نمایاں کر دیا۔

(۶۵) ابو ثمامہ صائدی

نام و نسب:۔ عمرو بن عبداللہ بن کعب الصائد بن شرحبیل بن شراحیل بن عمرو بن جشم بن حاشد بن جشم بن حیزون بن عوف بن ہمدان الہمدانی الصائدی ابو ثمامہ اُن کی کنیت تھی۔ وہ عرب کے شہسواروں میں سے اور فرقہ شیعہ کے ممتاز افراد میں سے تھے۔ حضرت علی کی صحبت سے شرفیاب ہوئے اور آپ کے ساتھ تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ آپ کے بعد امام حسن کی صحبت اختیار کی اور حضرت کی مدینہ کی طرف روانگی کے بعد یہ کوفہ ہی میں قیام پذیر رہے۔

جب جناب مُسلم بن عقیل نمائندہ ہو کر کوفہ آئے تو ابو ثمامہ نے گرمجوشی کے ساتھ اُن کی تائید کی اور جب ابن زیاد کا تسلط ہوا اور جناب مُسلم کو خونریزی کے آثار نظر آئے تو اُنھوں نے ابو ثمامہ کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ زر اعانت اپنے پاس جمع کریں اور اسلحۂ جنگ کی خریداری کریں اس لیے کہ وہ اس امر میں بڑی واقفیت رکھتے تھے جب ہانی بن عروہ گرفتار ہوئے اور جناب مُسلم حالات کے تقاضا سے مجبور ہو کر جنگ پر آمادہ ہوئے تو اُنھوں نے ابو ثمامہ کو تمیم و ہمدان کی افسری عطا کی۔

جناب مُسلم کی شہادت کے بعد ابو ثمامہ مخفی طور سے کوفہ سے نکل کر نافع بن ہلال کے ساتھ روانہ ہوئے اور عراق کے راستے میں امام کے پاس آکر ملحق ہوئے۔

اُن کی وفاداری اور فداکاری کا یہ یادگار واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ جب عمر بن سعد نے کثیر بن عبداللہ کو پیغام دے کر امام کے پاس بھیجا تو ابو ثمامہ نے کہا کہ اپنی تلوار باہر رکھ دو۔ وہ اس پر تیار نہیں ہوا تو یہ کہا کہ میں تمھاری تلوار

کے قبضہ پر ہاتھ رکھدوں وہ اس پر بھی نہ تیار ہوا تو واپس گیا اور دوسرا قاصد بھیجا گیا جس نے پیغام رسانی کے فرض کو انجام دیا۔

ظہر کی نماز کا وقت آنے پر اُن کی فرض شناسی کا بہترین نمونہ آپ کے سامنے آچکا ہے کہ اُنھوں نے سخت وقت پر امام سے یہ خواہش کی کہ میں چاہتا ہوں نماز جماعت آپ کے ساتھ پڑھ لوں پھر خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔ امام اس پر اتنا خوش ہوے کہ دعائیں دینے لگے۔ فرمایا "تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا۔ خدا تم کو نماز گزاروں میں محسوب کرے" اس کے بعد امام نے اصحاب سے فرمایا کہ ان لوگوں سے نماز کی مہلت طلب کرو۔ اسی مہلت نماز کے سوال پر ہنگامہ ہو گیا جس میں حبیب بن مظاہر اور حُر درجۂ شہادت پر فائز ہوے۔ جہاں تک تاریخ کے بیان پر غور کیا جاتا ہے یہ سوچ کر نہایت تکلیف ہوتی ہے کہ ابو ثمامہ کی یہ تمنا کہ وہ نماز ظہر امام کے ساتھ پڑھیں پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی ہنگامہ میں اپنے قبیلہ کے ایک شخص کے ہاتھ سے جو فوج دشمن میں تھا وہ شہید ہو گئے

(نماز ظہر)

جنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی اور نماز کی مُہلت نہیں مل سکی۔ ایسے موقع کے لئے شرع نے مخصوص حکم "نماز خوف" کا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ فوج کے دو حصّے ہو جائیں۔ ایک حصّہ دشمن سے مقابلہ کرے اور دوسرا حصّہ نماز میں شریک ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فرادیٰ پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ پہلا حصّۂ فوج کا میدان جنگ سے آکر نماز میں شریک ہو مگر یہ تو اُس وقت ہے جب فوج کی اتنی تعداد ہو بھی کہ اُس کے دو حصّے ہو سکیں اور اُس کا نصف حصّہ دشمن کے ساتھ مقاومت کر سکے اور فوج حسینی اُس کی تو مجموعی تعداد ہی بہت کم تھی مگر واہ ری امام کی فرض شناسی اور اپنے اصحاب کی شجاعت پر اعتماد کہ آپ نے زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی سے فرمایا کہ تم دونوں میرے سامنے آکر ٹھہرو

یہاں تک کہ میں نماز ظہر پڑھ لوں۔ یہ دونوں آدمی اصحاب کی تقریباً نصف جماعت کے ساتھ آگے بڑھے اور حضرت نے نماز خوف ادا کی۔

(۶۶) سعید بن عبداللہ حنفی

کوفہ کے معزز شیعوں میں سے تھے اور شجاعت و عبادت کی صفت سے موصوف تھے۔ اہل کوفہ کے جو دعوتی خطوط امام کے پاس مکہ گئے تھے ان میں سب سے آخری خط کو لے کر امام کی خدمت میں جو گئے تھے وہ ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی تھے۔ حضرت امام حسین نے ان خطوط کا جواب انہی دونوں نمایندوں کے سپرد کیا تھا۔ اپنے خط میں ان کے نام کا حوالہ بھی دیا۔ آپ نے لکھا تھا "ہانی اور سعید میرے پاس تمھارے خطوط لے کر آئے اور یہ دونوں سب سے آخری تمھارے نمایندے تھے جو میرے پاس پہونچے ہیں" اس کے بعد تحریر فرمایا تھا کہ "میں تمھاری جانب اپنے چچازاد بھائی اور معتمد عزیز مسلم بن عقیل کو بھیجتا ہوں" دونوں آدمیوں کو اس خط کے ساتھ حضرت مسلم کے آگے روانہ کیا۔

جب حضرت مسلم کوفہ میں وارد ہوئے اور مختار کے مکان میں فروکش ہوئے اور شیعیان کوفہ آپ کے پاس مجتمع ہوئے اور آپ نے امام حسین کا خط پڑھ کر سنایا تو عابس بن ابی شبیب شاکری اور حبیب بن مظاہر کے بعد سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے تائید کرتے ہوئے نصرت و وفاداری کا عہد کیا تھا۔

شب عاشور جب امام حسین نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا ہے کہ میں اپنی بیعت تمھاری گردنوں سے اتارتا ہوں اور تم جہاں چاہے چلے جاؤ تو اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کے بعد سعید کھڑے ہوئے تھے اور یہ جوش و ولولے بھرے ہوئے الفاظ کہے تھے کہ "خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑینگے۔ بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر جیتے جی جلا دیا جاؤں، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے اور یہی میرے ساتھ ستر مرتبہ سلوک ہو تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہونگا

یہاں تک کہ آخری موت مجھے آپ کے قدموں پر آئے۔

سعید کو اپنی وفاداری و جاں نثاری کے وعدوں کے پورا کرنے کا اب موقع آیا تھا اور اُنھوں نے اسے عجیب استقلال اور وفاداری کے ساتھ پورا کیا۔ اس وقت جب امام نماز ظہر میں مصروف تھے اور سعید اور زہیر بن قین کو بطور محافظ دشمن کے سامنے کھڑا کیا تھا تو سعید نے یہ صورت اختیار کی کہ وہ خاص امام کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر امام کی طرف آنے لگتا تھا اُسے خود اپنے اوپر روکتے تھے، یہاں تک کہ زخموں کی کثرت سے زمین پر گرے اور جاں بحق تسلیم ہوے۔ معلوم ہوا کہ تیرہ[۱۳] تیر اُن کے جسم میں پیوست تھے۔ اس حیرت خیز وفاداری کی مثال بھی تاریخِ عالم میں ناپید ہے۔

(۶۷) زہیر بن قین بن قیس بجلی

اشرافِ عرب میں سے، کوفہ کے باشندہ، بہادر تھے اور لڑائیوں میں شریک ہوچکے تھے۔ جمل اور صفین کی لڑائیوں کے بعد سے مسلمانوں میں "عثمانی" اور "علوی" کے نام کی تفریق پیدا ہوگئی تھی۔ جو لوگ امیر معاویہ کے طرفدار تھے اُن کو "عثمانی" کہا جاتا تھا اور جو جناب امیر کی طرف تھے وہ "علوی" کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ زہیر عام طور پر "عثمانی" جماعت سے متعلق سمجھے جاتے تھے اور اہلبیت کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے۔

زہیر نے ۶۰ھ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ حج کیا۔ اسی میں امام حسین کا ساتھ ہوگیا۔ زہیر اگرچہ امام کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھتے تھے لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی خاندانی شخصیت و عظمت سے مرعوب ضرور رہے یعنی انھیں اس کا خیال تھا کہ اگر حسین مجھ سے کوئی خواہش کریں گے تو مجھے رد کرنا اُس کا ممکن نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ امام حسین کے قافلہ سے دُور دُور رہتے تھے۔ مگر امام اُن کی فطری صلاحیتوں سے واقف تھے اس لئے منزل زرود پر حسین نے زہیر کو بلایا اور اب بالکل زہیر

حسین کے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے۔

ذو حسم کے مقام پر جب حُر کا لشکر امام کی مزاحمت کے لیے آچکا ہے تو حضرت نے اپنے اصحاب کے ساتھ جو خطبہ ارشاد کیا تھا اُس کے جواب میں زہیر نے جس والہانہ انداز سے فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا تھا اُس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اس کے بعد جب حُر نے امام کو کربلا پہونچ کر روکنا چاہا اور نہر کے قریب خیمے ہونے سے بھی انکار کیا تو زہیر ہی نے کہا تھا کہ ہمیں اتنی فوج سے جنگ کر لینے دیجیے اس کے بعد اتنا لشکر آئے گا جس سے مقاومت کی طاقت نہ ہوگی۔ حضرت نے فرمایا میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔

پھر نویں تاریخ کی شام کو فوج عمر سعد کے حملہ کے موقع پر جب حضرت عباس گفتگو کر کے امام سے دریافت کرنے گئے اور حبیب بن مظاہر نے فوج مخالف کو وعظ و پند شروع کیا ہے اور عزرہ بن قیس نے بدتہذیبی کے ساتھ درمیان میں مداخلت کی ہے تو زہیر نے اُس کا جواب دیا تھا کہ بے شک حبیب کے نفس کو خدا نے قابل تعریف بنایا ہے اور اس کی رہنمائی کی ہے۔ اے عزرہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں اور خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اس جماعت کے ساتھ شریک نہ ہو جو گمراہی کی حمایت کر رہی ہے اور پاک نفوس کو قتل کرتی ہے۔ زہیر کی آواز تعجب کے ساتھ سُنی گئی۔ عزرہ نے انھیں پہچان کر کہا "زہیر تم اس گھرانے کے شیعہ نہیں تھے۔ تم تو عثمانی گروہ میں سے تھے" زہیر نے کہا "اب اس وقت میرے یہاں کھڑے ہونے سے تو تم سمجھو کہ میں شیعہ ہوں" خدا کی قسم میں نے نہ حسین کو کبھی خط لکھا تھا نہ کوئی قاصد بھیجا تھا اور نہ نصرت کا وعدہ کیا تھا لیکن راستے میں اتفاق سے میرا اور اُن کا ساتھ ہو گیا۔ جب میں نے انھیں دیکھا تو رسول اللہ یاد آ گئے اور اُن کی قرابت کا رسول سے خیال آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ دشمنوں کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ بس میں نے طے کر لیا کہ مجھے ان کی مدد کرنا چاہیے اور میں اُن کی جماعت میں داخل ہو جاؤں اور اپنی جان اُن پر فدا کروں خدا اور رسول کے اُس حق کو ادا کرنے کے لیے جسے تم لوگوں نے ضایع و برباد کر دیا ہے

پھر شب عاشور جب امام حسین نے اصحاب کو جمع کیا ہے اور انھیں اپنی بیعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا ہے تو مسلم بن عوسجہ اور سعید بن عبد اللہ کے بعد زہیر نے تقریر کی تھی اور کہا تھا "بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ ایک دفعہ قتل ہوں۔ پھر زندہ ہوں پھر قتل ہوں۔ یوں ہی ہزار دفعہ ہو لیکن آپ اور نیز آپ کے خاندان کے یہ جوان قتل ہونے سے محفوظ رہ جائیں"۔

صبح عاشور جب امام نے اپنی مختصر فوج کو ترتیب دیا ہے تو آپ سُن چکے ہیں کہ زہیر بن قین کو میمنہ کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔

زہیر نے میدان میں نکل کر فوج مخالف کے سامنے ایک معرکہ آرا تقریر بھی کی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کا بھی ذکر ہو چکا ہے کہ جب لڑائی شروع ہوگئی اور فوج مخالف سے یسار اور سالم میدان جنگ میں آئے اور عبد اللہ بن عمیر کلبی مقابلہ کے لیے نکلے تو ان دونوں نے کہا کہ ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ کے لیے زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زہیر فوج حسینی کے اُن نمودار اشخاص میں سے تھے جن کا نام فوج دشمن میں خاص طور پر ممتاز اور مشہور تھا۔

اُن کی شجاعت کے کارنامے صبح عاشور سے ظہر تک متعدد بار ظاہر ہو چکے چنانچہ ظہر کے پہلے جب شمر نے مخصوص خیمہ حسین پر حملہ کیا ہے اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا ہے کہ لاؤ آگ لاؤ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں تو آپ کو یاد ہوگا کہ زہیر ہی تھے جنھوں نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور فوج دشمن کو پسپا کر دیا۔ پھر جب حبیب شہید ہو چکے اور حُر میدان جنگ میں آئے تو زہیر نے حُر کے ساتھ مل کر جنگ کی۔

اب وفاداری کے ختم کرنے کا یہ آخری موقع تھا کہ امام نے سعید بن عبد اللہ اور زہیر کو مامور کیا کہ تم میری حفاظت کرو یہاں تک کہ میں نماز ظہر ادا کر لوں۔ آپ کو معلوم ہوا کہ سعید بن عبد اللہ نماز کے ختم ہونے سے پہلے اتنے زخمی ہوگئے کہ وہ

پھر جانبر نہ ہو سکے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ زہیر کے بھی دست و بازو اب جواب دے چکے تھے اور ممکن ہے اُن کے کچھ زخم بھی آ گئے ہوں۔ نماز ظہر کے بعد دشمن بہت قریب آ گئے تھے۔ اب زہیر بن قین نے آخری جنگ کی اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ وہ کہہ رہے تھے:۔

"میں زہیر ہوں اور قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے اُن کو حسین کے پاس سے دُور کروں گا۔" یوں ہی تھوڑی دیر تک وہ شمشیر زنی کرتے رہے۔ آخر کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس دو شخصوں نے حملہ کیا جن کے ہاتھ سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۸) سلمان بن مضارب بن قیس البجلی

زہیر بن قین کے چچازاد بھائی تھے، زہیر ہی کے ساتھ ۶۰ھ میں حج کو گئے تھے واپسی میں جب زہیر امام کی نصرت کے لیے حضرت کے ساتھ ہوئے تو سلمان نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ روز عاشور ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

(۶۹) عمرو بن قرظۃ بن کعب انصاری

نام و نسب:۔ عمرو بن قرظۃ بن کعب بن عمر بن عائذ بن زید مناۃ بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج الانصاری ان کے والد قرظۃ بن کعب اصحاب رسول اللہ میں سے تھے۔ جنگ اُحد اور اُس کے بعد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔

۲۳ھ میں زمانۂ حضرت عمر میں ریہ ان کے ہاتھوں پر فتح ہوا حضرت علی نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اُن کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔ پھر جب آپ جنگ صفین کے لئے جانے لگے تو ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور کوفہ کی حکومت ابو مسعود بدری کے سپرد کی۔ قرظۃ سب لڑائیوں میں حضرت علی کے ساتھ رہے اور آپ ہی کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں انتقال کیا اور آپ نے نماز جنازہ پڑھی۔ دوسرا قول

یہ ہے کہ معاویہ کے ابتدائی زمانہ میں جب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کا حاکم تھا انتقال کیا ان کے دو فرزند تھے عمرو اور علی۔ کربلا میں عمرو امام حسین کی طرف تھے۔ غالباً بڑے یہی تھے۔ اس لئے کہ ان کے والد قرظہ بن کعب کی کنیت انہی کے نام پر ابو عمرو تھی۔ ان کا چھوٹا بھائی علی لشکر عمر سعد میں تھا۔

عمرو بن قرظہ کوفہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ امام کی خدمت میں کربلا پہونچے۔ ابتدائی تاریخوں میں محرم کی جب جنگ ہونے کا قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ امام نے اُن کو عمر سعد کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم مجھ سے شب کے وقت دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات کرو۔

روز عاشور نماز ظہر کے وقت جب تمام اصحاب میں شہادت کا جذبہ تیز ہو گیا تھا اور شمع امامت کے پروانے جانبازی میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے۔ عمرو بن قرظہ نے جنگ کرنا شروع کی۔ وہ اس مضمون کے شعر پڑھ رہے تھے:

"تمام انصار کی جماعت جانتی ہے کہ میں ذمہ داری کے حدود کی حفاظت کرونگا ایسے جوانمرد انسان کی طرح شمشیر زنی جو پیچھے ہٹنے والا نہ ہو حسین پر میری جان اور میرا گھر بار سب فدا ہو۔"

کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر عمرو امام کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، جو تیر آتا اُسے اپنے اوپر روکتے اور جو وار ہوتا خود سپر بن جاتے تھے۔ آخر زخموں سے چور ہو گئے امام کی طرف مخاطب ہو کر کہا "کیوں! فرزند رسول میں نے فرض کو ادا کیا؟" حضرت نے فرمایا، ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے، رسولخدا کو میرا اسلام پہونچا دینا۔ اور کہنا کہ میں بھی عنقریب آتا ہوں۔" بہادر جانباز زخموں کی کثرت سے زمین پر گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔

اُن کا بھائی علی بن قرظہ جو فوج عمر سعد میں تھا صف سے باہر نکلا اور امام کو ناشائستہ الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے میرے بھائی کو گمراہ کیا اور دھوکا دے کر قتل کرا دیا۔" امام نے فرمایا کہ "خدا نے تیرے بھائی کو گمراہ نہیں کیا بلکہ اُس کی ہدایت کی

اور گمراہی میں تجھے چھوڑ دیا ہے۔" اُس نے کہا "خدا مجھے غارت کرے، اگر میں تمھیں قتل نہ کروں یا خود ہلاک ہوں" یہ کہکر حملہ کیا۔ نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر اُسے نیزہ لگایا جس سے وہ گر گیا مگر پھر علاج کے بعد اُس کا زخم اچھا ہو گیا۔

(۷۰) نافع بن ہلال جملی

نام و نسب :- نافع بن ہلال بن نافع بن جمل بن سعد العشیرۃ بن مذحج۔ اپنے قبیلہ کے سردار اور بہادر شخص تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ امیر المومنین حضرت علی کے اصحاب میں سے اور احادیث کے حامل تھے۔ حضرت کے ساتھ، جمل صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شریک بھی ہوئے تھے۔ امام کی روانگی عراق کی اطلاع پاکر کوفہ سے روانہ ہوئے اور امام سے راستے میں جاکر ملحق ہوئے اُس وقت جبکہ جناب مسلم کی خبر شہادت بھی نہ آئی تھی۔ ان کا ایک گھوڑا جس کا نام "کامل" تھا کوفہ میں رہ گیا تھا اور اُس کے متعلق انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ بعد میں ان کے پاس پہونچا دیا جائے چنانچہ عذیب الہجانات میں عمرو بن خالد صیداوی۔ مجمع بن عبد اللہ عائذی اور جنادہ بن حارث سلمانی وغیرہ پانچ آدمیوں کا جو قافلہ امام کے پاس پہونچا ہی اُن کے ساتھ یہ گھوڑا بھی لایا گیا تھا حر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ذو حسم میں امام نے جو خطبہ پڑھا ہی، اُس کے جواب میں ان کی پرزور تقریر اُس موقع کے حالات میں درج کی جا چکی ہی۔

جب عمر سعد کی جانب سے نہر پر پہرے بٹھا دیے گئے اور امام اور اُن کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا گیا اور پیاس کا بہت غلبہ ہوا تو امام نے اپنے بھائی ابو الفضل العباس کو پانی لانے پر مامور کیا۔ یہ غالباً آٹھویں یا نویں شب کا ذکر ہی۔ جناب عباس بیس سوار اور بیس پیادوں کے ساتھ بیس مشکیزے لے کر آگے بڑھے اور نہر کے قریب پہونچے۔ نافع بن ہلال نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور سب سے آگے ہو گئے۔ عمرو بن حجاج زبیدی نے جو نہر کا محافظ تھا ٹوکا اور کہا کون ہے جو نہر پر جا رہا ہی۔ عمرو بن الحجاج قبیلۂ زبیدہ سے تھا جو مذحج اور مراد کی ایک شاخ ہی اور قبیلۂ جمل جس سے نافع تھے، یہ بھی مراد کی ایک شاخ۔

اس لیے نافع نے جب اپنا نام بتایا اور قبیلہ کا پتہ دیا اور یہ کہا کہ ہم پانی پینے آئے ہیں تو عمرو نے کہا "پیو تم شوق سے، تمھیں پینا گوارا ہو" نافع نے کہا "میں اکیلے تھوڑی پیوں گا درصورتیکہ حسین اور اُن کے سب اصحاب پیاسے ہیں" یہ سننا تھا کہ فوج مخالف آگے بڑھی اور کہا "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اُن تک پانی پہونچے۔ ہم یہاں مقرر اسی لیے کیے گئے ہیں کہ پانی فوج حسینی تک نہ جانے دیں" نافع اُن لوگوں سے گفتگو کے لیے آگے بڑھے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ جلدی مشکیں پانی سے بھر لو۔ پیادے تیزی سے بڑھے اور اُنھوں نے مشکیں پُر کرلیں۔ ادھر نگہبانوں کی فوج آگے بڑھی۔ جناب عباس نے اور آپ کے ساتھ نافع بن ہلال اور دوسرے بہادروں نے اُن کا مقابلہ کیا اور پیچھے ہٹا دیا۔ اتنی دیر میں وہ لوگ جو مشکیں لیے ہوئے تھے ساحل سے اوپر آگئے تھے۔ جنگ آزما بہادروں نے اُن سے کہا کہ تم خیموں کی طرف چلو اور خود وہیں کھڑے رہے۔ پاسبانوں کی فوج نے پھر بڑھ کر حملہ کیا اور کچھ جنگ ہوئی۔ اس موقع پر نافع بن ہلال نے عمرو بن الحجاج کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو جو قبیلہ صدا سے تھا نیزہ لگایا۔ بظاہر وار اوچھا تھا اور کوئی اثر محسوس نہ ہوتا تھا مگر اس کے بعد وہ زخم مہلک ثابت ہوا اور وہ شخص ہلاک ہوگیا۔ اصحاب امام پانی لے کر واپس ہوگئے۔

روز عاشور جنگ چھڑنے کے بعد ابتدا ہی سے نافع کا ولولۂ جنگ کام کرنے لگا تھا۔ چنانچہ فوج دشمن کے ایک پہلوان مزاحم بن حریث کے ساتھ اُن کے دست بدست کامیاب مقابلہ کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ابھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ عمرو بن قرظہ کے بعد جب اُن کے بھائی علی بن قرظہ نے امام کو مخاطب کرکے گستاخانہ کلمات کہے ہیں اور حملہ کیا ہے تو نافع نے اُس کا مقابلہ کیا اور اُسے مغلوب کیا۔

نافع تیر اندازی میں بڑے مشاق اور یگانۂ روزگار تھے۔ اُنھوں نے اپنے تیروں کے سوفار پر اپنا نام لکھ دیا تھا اور تیروں کو زہر میں بجھا لیا تھا۔ ظہر کے بعد اُنھوں نے تیر لگانا شروع کیے اور بارہ آدمیوں کو لشکر مخالف سے قتل کیا۔ اس کے علاوہ بہت سوں کو زخمی کیا۔ فوج دشمن نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ دونوں بازو اُن کے شکستہ ہوگئے۔ اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ شمر کچھ سپاہیوں کے ساتھ اُن کو پکڑ کر

عمر سعد کے پاس لے گیا۔ اُس نے کہا "نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" نافع نے کہا "میرے ضمیر سے تو خدا واقف ہے" اُن کی ڈاڑھی پر خون جاری تھا اس حالت میں وہ کہہ رہے تھے ———— "خدا کی قسم میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر میرے بازو ٹوٹ نہ جاتے تو تم مجھے اس طرح ہرگز گرفتار نہ کر سکتے" شمر نے کہا اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے عمر سعد نے کہا "تم گرفتار کر کے لائے ہو تم ہی کو اختیار ہے" شمر نے تلوار کھینچی۔ نافع نے کہا "اگر تم لوگ مسلمان ہوتے تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتے۔ شکر خدا کا کہ اُس نے ہم لوگوں کی موت اپنی مخلوق میں سے بدترین لوگوں کے ہاتھ سے قرار دی" شمر نے تلوار لگائی۔ نافع شہید ہوئے۔ پست حوصلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور مجبور مجاہد کو قتل کر کے فتحمندی کا احساس کرنے لگا اور رجز کے اشعار زبان پر جاری کر کے امام حسین کے باقی ماندہ اصحاب پر حملہ آور ہوا۔

(۱۷) شوذب بن عبداللہ

غلام زادوں میں سے قبیلۂ شاکر کے تھے جو ہمدان کی ایک شاخ تھی۔ اور عابس بن ابی شبیب شاکری کے ساتھ جن کا تذکرہ ابھی بعد میں آئے گا وابستہ تھے۔ شیعیان کوفہ میں اپنے اوصاف کی بنا پر نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور ایک طرف تو میدان جنگ کے شہسوار تھے دوسری طرف احادیث کے حافظ اور امیر المومنین سے استفادہ کیے ہوئے تھے اور کوفہ میں اس باب میں مرجعیت رکھتے تھے، لوگ ان سے احادیث حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

جب عابس جناب مسلم کا خط لے کر کوفہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تو شوذب اُن کے ساتھ ہوئے اور امام کے ساتھ مکہ معظمہ سے پھر عراق آئے اور کربلا پہونچے۔

روز عاشور عابس نے اپنے باوفا غلام سے کہا "کیوں شوذب! تمھارا کیا ارادہ ہے؟" شوذب نے کہا "ارادہ کیا ہے؟! یہی کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزند رسول کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں" عابس نے کہا "شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اچھا تو

پھر بڑھو آگے اور امام پر جان نثار کرو تاکہ امام تمھاری مصیبت بھی اسی طرح دیکھیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی دیکھی اور میں بھی تمھارے غم کو برداشت کر کے ثواب کا مستحق ہوں یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے ساتھ ہوتا جس پر مجھے اس سے زیادہ اختیار ہوتا جتنا مجھے تم پر اختیار حاصل ہے تو میری خوشی یہ ہوتی کہ وہ میرے سامنے جائے تاکہ میں اُس کی مصیبت کو برداشت کروں، کیونکہ آج تو دن ایسا ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اُتنا اجر و ثواب حاصل کرے۔ اس لیے کہ آج کے دن پھر عمل کا دفتر ختم ہے اور حساب کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینانی مواقع پر شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور سے اُن کا کہنا بہت مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصائب کے اُٹھانے کا ایک شوق ہے اور تکالیف کے برداشت کرنے کا ولولہ جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہے۔

شوذب آگے بڑھے۔ امام حسین کو سلام کیا اور پھر جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(۴۷) عابس بن ابی شبیب شاکری

نام و نسب:۔ عابس بن ابی شبیب بن شاکر بن ربیعہ بن مالک بن صعب بن معویہ بن کثیر بن مالک بن جشم بن حاشد الہمدانی الشاکری۔ بنو شاکر قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ تھے اور ان ہی کی نسبت امیر المومنین نے روزِ صفین فرمایا تھا کہ اگر ان کی تعداد ایک ہزار ہو جائے تو خدا کی عبادت اُس طرح ہونے لگے جس طرح کہ ہونا چاہیے۔

یہ لوگ عرب میں بڑے شجاع اور جنگ آزما تھے اور "فتیان الصباح" کے لقب سے مشہور تھے۔ اس کے معنی ہوئے "وقت صبح کے جوانمرد" چونکہ غارت گری اور جنگ زیادہ تر اوقات صبح میں ہوتی تھی اس لیے اس وقت کی طرف نسبت دی گئی۔

ہمدان کی ایک دوسری شاخ بنو وادعہ کے پاس ان لوگوں نے جا کر قیام کیا تو وہ بھی اسی لقب سے ملقب ہو گئے اور اسی لیے عابس کو شاکری بھی کہا جاتا ہے، اور وادعی بھی۔

عابس شیعیانِ کوفہ میں سے رئیس قوم، بہادر، مقرر، عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے۔ بہت سی لڑائیوں میں کارِ نمایاں انجام دے چکے تھے اور دلوں میں اُن کی شجاعت کا سکہ قائم تھا۔

اُس موقع پر جب جنابِ مسلم کوفہ میں وارد ہوئے اور آپ نے پہلا جلسہ منعقد کر کے امام کا خط سنایا تو اُس وقت سب سے پہلے عابس ہی کھڑے ہوئے تھے اور اُنھوں نے کہا تھا کہ "میں دوسروں کا ذمہ دار نہیں مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ آخری دم تک آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔"

اُن کی تقریر اتنی جامع اور پُرمغز تھی کہ حبیب بن مظاہر نے اُن کی تعریف کی اور اُن ہی کی تائید میں اپنی نصرت و وفاداری کا عہد کیا۔

جب جنابِ مسلم کی کوفہ میں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی اور آپ نے اس صورتِ حال سے امام کو اطلاع دینا چاہی تو آپ نے یہ خط عابس ہی کو دیا کہ وہ امام کے پاس لے جائیں چنانچہ عابس اس خط کو لے کر امام کے پاس آئے اور پھر آپ سے جدا نہیں ہوئے یہاں تک کہ کربلا پہونچے۔

اُن کا غلام شوذب اُن کے ساتھ ساتھ تھا جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے۔ یہ بھی آپ سُن چکے کہ اُنھوں نے اپنے غلام کو اپنی طرف سے حسین کے قدموں پر نثار کیا۔

جب شوذب درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو اب عابس خود خدمتِ امام میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "بخدا روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز و محبوب ہو۔ اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز شے آپ کی خدمت میں پیش کروں تو ایسا ہی کرتا مگر اب تو بس میری جان ہی باقی ہے تو پھر اجازت دیجئے۔ میں آخری سلام کرتا ہوں اور خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں آپ کے اور آپ کے باپ کے دین پر قائم ہوں۔"

ان الفاظ کو کہہ کر امام سے رخصت ہوئے اور تلوار کھینچے ہوئے فوجِ دشمن کے سامنے آئے۔ اُن کی پیشانی پر اس وقت ایک زخم تھا جو شاید پہلے کے حملوں میں آگیا تھا

فوج کوفہ کا ایک شخص ربیع بن تمیم جو واقعۂ کربلا میں موجود تھا بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس کو آتے دیکھا تو پہچان لیا۔ میں انھیں اس کے پہلے لڑائیوں میں دیکھ چکا تھا اور اُن کی شجاعت سے واقف تھا۔ میں نے کہا "ایہا الناس یہ شیروں کا شیر ہے۔ یہ ابن ابی شبیب ہے۔ دیکھو کوئی ایک شخص تم میں سے اس کے مقابلہ کو باہر نہ نکلے" عابس نے آواز دینا شروع کی "کیا کوئی مردِ میدان نہیں جو ایک مردِ میدان کے مقابلہ کو نکلے" مگر فوج میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکلا۔ عمر سعد نے کہا اس بہادر کو پتھر مارنا شروع کر دو۔ ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہوئی یہ عجیب طریقۂ جنگ دیکھکر عابس نے زرہ اور خود بکتر اتار کر پھینک دیا اور تلوار لئے فوج پر ٹوٹ پڑے۔ جس صف کی طرف رُخ کرتے تھے سیکڑوں آدمی اُن کے سامنے سے بھاگتے نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد فوج کے بڑے حصہ نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور قتل کیا۔ اُن کو شہید کرنے کے بعد اُن کا سر قلم ہوا اور بہت سے آدمیوں نے فوج کے آپس میں جھگڑنا شروع کیا۔ ہر ایک کہتا تھا اس شخص کو میں نے قتل کیا۔ عمر سعد نے اس کا یہ کہکر فیصلہ کیا کہ جھگڑا نہ کرو۔ اس شخص کا قاتل کوئی ایک نہیں ہو سکتا۔ تم سب اس کے قاتل ہو۔ اس طرح یہ نزاع برطرف ہوئی۔

(۴۳ و ۴۷) عبد اللہ و عبد الرحمن فرزندان عروہ بن حراق غفاری

حضرت ابوذر کے قبیلہ سے حراق غفاری اصحاب حضرت علی میں سے تھے اور حضرت کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان میں شریک رہے تھے۔ ان کے دونوں پوتے، عبد اللہ اور عبد الرحمن اشراف و شجاعان کوفہ میں سے اور شیعیان علی میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ دونوں بھائی امام حسین کے پاس کربلا میں پہونچے اور حضرت کے انصار میں شامل ہوے ظہر کے بعد وقت سخت سے سخت ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اصحاب امام کی اب یہ کوشش تھی کہ ہر ایک چاہتا تھا ہم اپنی جان پہلے نثار کر دیں چنانچہ یہ دونوں بھائی خدمت امام میں حاضر ہوے اور عرض کیا "یا ابا عبد اللہ! ہمارا سلام قبول کیجیے۔ دشمن اب آگے بڑھے چلے آتے ہیں اور ہمارا بس نہیں چلتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ خود آپ کے سامنے قتل ہو جائیں اور

آپ کی حفاظت میں اپنی جان نثار کریں۔ حضرت نے فرمایا خدا تمھارا بھلا کرے۔ آؤ میرے قریب آؤ
یہ دونوں امام کے پاس کھڑے ہوئے اور یہ رجز پڑھنے لگے:۔

"تمام بنی غفار اور خندف و بنی نزار کے قبائل اس بات سے واقف ہیں کہ ہم فاسق و
فاجر گروہ پر حملے کرینگے باڑھ دار براں شمشیروں کے ساتھ۔ اے میرے ساتھیو شریف خاندان
کی طرف سے شمشیر و نیزہ کے ساتھ جنگ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو" آخر وہ دونوں شہید ہوئے۔

(۷۵) حنظلہ بن اسعد شبامی

نام و نسب:۔ حنظلہ بن اسعد بن شبام بن عبداللہ بن اسعد بن حاشد بن ہمدان
الہمدانی الشبامی۔

شیعیان کوفہ میں سے نامور اور خوش تقریر، بہادر اور حافظ قرآن تھے۔ امام کے
پاس کربلا وارد ہونے کے بعد پہونچے اور امام نے گفتگوئے صلح کے دوران میں اکثر ان کو عمر
بن سعد کے پاس نامہ و پیام کے ساتھ بھیجا۔

روز عاشور ظہر کے بعد جب اصحاب میں سے بہت سے افراد شہید ہو چکے ہیں تو وہ امام
کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور فوج کوفہ کو مخاطب کر کے بآواز بلند کہنے لگے۔

"اے میری قوم کے لوگو مجھے تمھارے متعلق اندیشہ ہے اس دن کا جو بہت سی قوموں
کو نصیب ہوا جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والوں کا انجام ہوا اور
خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ ان کی بداعمالیوں ہی کا بدلا دیتا ہے۔ اے میری قوم میں
تمھارے لیے اندیشہ رکھتا ہوں قیامت کے دن کے جس وقت تم اس دنیا سے پشت
پھراؤ گے اور کوئی تمھارا بچانے والا خدا کے عذاب سے نہ ہوگا اور جس کی ہدایت سے خدا
ہاتھ اٹھائے اس کا ہدایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اے میری قوم والو! حسین کو قتل نہ کرو نہیں
تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا اور جھوٹ کہنے والوں کا انجام ناکامی ہے۔"

دشمن پر ایسی تقریروں سے اثر ہی کب ہوتا تھا۔ امام نے پکار کر فرمایا "اے ابن اسعد! خدا
اپنی رحمت تمھارے شامل حال کرے۔ یہ لوگ عذاب کے مستحق تو اسی وقت ہو گئے جب انھوں نے

حق بات کو قبول نہ کیا اور تم لوگوں کے خلاف فوج کشی کی، چہ جائیکہ اب! اب تو یہ تمھارے بہت سے نیک ساتھیوں کو قتل بھی کر چکے ہیں۔"

حنظلہ نے کہا، حضور سچ فرماتے ہیں۔ حضور سے بڑھ کر ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے، اچھا پھر ہم بھی نہ جائیں خدا کی طرف اور اپنے ساتھیوں سے ملحق نہوں۔ امام نے فرمایا "جاؤ دنیا و آخرت کی نیکی اور ایسی سلطنت کی طرف جس کو زوال نہیں ہے" حنظلہ نے رخصتی سلام کیا۔ میدان جنگ میں گئے۔ لڑے اور شہید ہو گئے۔

(۷۶-۷۷) سیف بن حارث بن سریع و مالک بن عبد بن سریع بن جابر ہمدانی

دونوں چچازاد بھائی اور ایک ماں کی اولاد تھے اور کربلا میں ان دنوں میں کہ جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی امام سے آکر ملحق ہوئے، ان کا غلام شبیب بھی ان کے ساتھ تھا جو حملۂ اولی میں شہید ہوا اور اُس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

روز عاشور جب بازار شہادت گرم ہو گیا تو دونوں جوان امام کی خدمت میں آئے اور نزدیک کھڑے ہو کر رونے لگے۔ یہ ان کے دل کی بے چینی تھی جس نے الفاظ کو شکل غم کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اُن کے منھ سے رنج کی وجہ سے بات نہیں نکلتی تھی مگر کیا کہنا امام کے اطمینان قلب کا۔ آپ نے فرمایا "کیوں! میرے بھائی کے فرزندو! روتے کیوں ہو؟ دیکھو تھوڑی دیر میں تمھیں خوشی ہی خوشی کے سامان مہیا ہوں گے۔" دونوں نے عرض کیا "ہماری جان آپ پر قربان! ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آرہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم سے آپ کی حفاظت کا امکان نہیں رہا ہے۔" حضرت نے فرمایا "خدا تم دونوں کو جزائے خیر دے۔ اے میرے بھائی کے فرزندو۔ تمھارے اس صدمہ پر جو میری وجہ سے ہے اور اس ہمدردی پر جو تمھیں میرے ساتھ ہے خدا تمھیں بہترین جزا عطا فرمائے۔"

حنظلہ بن اسعد شامی کی شہادت کے بعد ان دونوں نے امام کو سلام رخصت کیا اور لڑ کر شہید ہوئے

(۷۸) جون (غلام ابوذر غفاری)

نام ونسب:۔ جون بن حوی بن قتادہ بن اعور بن ساعدۃ بن عوف بن کعب بن حوی مولی ابی ذر الغفاری، حبشی نسل سے فضل بن عباس بن عبدالمطلب کے مملوک تھے۔ حضرت علی نے ڈیڑھ سو اشرفی کو انھیں خرید فرمایا اور ابوذر غفاری کو ہبہ کیا کہ اُن کی خدمت کریں۔ وہ جناب ابوذر کے ساتھ رہے یہاں تک کہ انھیں ربذہ کی طرف شہر بدر کیا گیا۔ باوفا غلام اُن کے ساتھ گیا۔ جب ۳۲ھ میں ابوذر کا انتقال ہو گیا تو جون مدینہ واپس آ گئے اور امیر المومنین کی خدمت میں رہنے لگے۔ پھر حضرت کی شہادت کے بعد امام حسن اور پھر امام حسین کے پاس رہے۔

روز عاشور جب جنگ کے شعلے بلند ہو گئے تو جون نے امام سے اجازت جہاد طلب کی۔ حضرت نے فرمایا "میں تمھیں خصوصیت سے کہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اس لیے کہ تم ہمارے ساتھ راحت کے لیے تھے۔ اب ہماری وجہ سے کوئی ضرورت نہیں کہ مصیبت میں مبتلا ہو۔" یہ سننا تھا کہ وفادار غلام امام کے قدموں پر گر پڑا، بوسے دینے لگا عرض کیا "فرزند رسول یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں آپ کے یہاں کے پیالے چاٹے اور اب سختی میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم سے بدبو آتی ہے اور میرا حسب نسب پست ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ آپ اپنے صدقہ میں مجھے جنت کا مستحق بنا دیجیے کہ میری بو خوشبو سے بدل جائے، میرا حسب شریف ہو جائے اور میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہونگا جب تک کہ یہ سیاہ خون آپ لوگوں کے سفید خون میں مل نہ جائے" مجبوراً امام نے اجازت جہاد دی۔ بہادر غلام میدان جنگ میں آیا اور رجز پڑھنا شروع کی:۔

"ذرا گنہگار لوگ دیکھیں تو کہ ایک سیاہ غلام شمشیر و نیزہ سے کس طرح جنگ کرتا ہے۔ آل رسول کی امداد و حمایت میں۔" اس کے بعد اُس نے جہاد کیا اور درجۂ شہادت پر فائز ہوا۔

امام کے دل میں غلام کے الفاظ اثر کر گئے تھے، اس لیے آپ جب لاش پر تشریف لائے تو یہ دعا کی "خداوندا! اس کے چہرہ کو روشن کر دے، اس کی بدبو کو خوشبو سے مبدل کر دے اور اسے نیک آدمیوں کے ساتھ محشور کر اور اسے محمد و آل محمد کی معرفت رکھنے والوں میں محبوب فرما"

(۷۹) غلام ترکی

حافظ قرآن، حضرت امام حسین کا غلام تھا جسے آپ نے اپنے فرزند زین العابدین کو ہبہ کیا تھا۔ امام سے اجازت جہاد مانگی تو حضرت نے فرمایا کہ خیمہ میں جا کر زین العابدین سے اجازت حاصل کرو۔ غلام گیا اور شاہزادہ سے اجازت حاصل کی پھر تمام اہل حرم کو سلام رخصت کر کے میدان جنگ میں آیا اور یہ رجز پڑھنے لگا "سمندر میں میرے نیزہ و شمشیر کی گرمی سے آگ لگ جائے اور فضا میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جائے۔ جب میری تلوار میرے ہاتھ میں چمکتی ہے، مغرور حاسد کا دل شگافتہ ہو جاتا ہے"

اُس نے جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ کچھ دیر لڑنے کے بعد وہ زخمی ہو کر گرا۔ امام حسین نے یہ قدر فرمائی کہ آپ سرہانے تشریف لائے اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنا رخسارہ اُس کے رخسارہ پر رکھا۔ غلام نے آنکھیں کھولیں اور امام کی اس عزت افزائی کو دیکھ کر مسکرایا اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

(۸۰) انس بن حارث اسدی

نام و نسب:- انس بن حارث بن نبیہ بن کاہل بن عمرو بن صعب بن اسد بن خزیمہ اسدی کاہلی اصحاب رسول میں سے۔ حدیث کے راوی ہیں۔ پیغمبر کی زبانی شہادت امام حسین کی خبر سُنی اور اس کے منتظر رہنے لگے۔

واقعہ کربلا میں وہ بہت کبیر السن ہو چکے تھے مگر یہ جذبہ قربانی تھا کہ امام حسین کے ساتھ واقعہ کربلا میں حاضر ہوئے اور اجازت جہاد حاصل کی۔ عمامہ سے اپنی کمر حسبت باندھی اور

اپنی بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹک آئی تھیں اونچا کر کے رومال سے باندھا۔ امام ان کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور دعائے خیر دے رہے تھے شکر اللہ لک یا شیخ اے بڈھے مجاہد خدا تیرے حسن عمل کی قدر کرے۔" وہ جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوے۔

(۸۱) حجاج بن مسروق جعفی

جعف بن سعد العشیرہ کی نسل سے، کوفہ کے معزز شیعہ تھے اور حضرت علی کی صحبت سے شرفیاب ہوے تھے۔ جب امام حسین مکہ میں قیام گزیں ہوے تو یہ کوفہ سے جا کر مکہ میں حضرت کے ہمرکاب ہوے اور اوقات نماز میں اذان کی خدمت انجام دینے لگے۔

جب امام مکہ سے عراق کے ارادہ سے روانہ ہوے تو وہ امام کے ساتھ تھے۔ اُس موقع پر جب حر کے لشکر سے ملاقات ہوی اور نماز ظہر کا وقت آیا تو تاریخ میں یہ تصریح ہی کہ امام نے حجاج بن مسروق کو اذان کا حکم دیا۔ روز عاشور امام سے اذن جہاد حاصل کیا۔ میدان میں جا کر رجز پڑھی۔ بہت سے دشمنوں کو قتل کیا اور شہید ہوے۔

(۸۲) زیاد بن عریب ہمدانی

نام ونسب:۔ ابو عامر زیاد بن عمرو بن عریب بن حنظلہ بن دارم بن عبداللہ بن کعب الصائد الہمدانی۔ ان کے باپ کو خدمت رسول میں حضوری کا شرف حاصل تھا اور زیاد بڑے عابد و زاہد، شب زندہ دار اور تہجد گزار تھے اور شجاعت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ روز عاشور سخت جنگ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوے۔

(۸۳) سالم بن عمرو بن عبداللہ مولیٰ بنی المدنیۃ الکلبی

بنو المدنیۃ قبیلۂ کلب قضاعہ کی ایک شاخ تھے۔ زید بن حارثہ صحابی اور محمد بن سائب کلبی صاحب تفسیر بھی اسی نسل سے ہیں۔

سالم اسی خاندان کے غلام تھے اور شیعیان کوفہ میں محسوب تھے۔ جناب مسلم کے ساتھ

جنگ میں شریک ہوئے اور مسلم کی شہادت کے بعد گرفتار کیے گئے مگر کسی طرح موقع پاکر نکل گئے اور اپنی قوم میں مخفی ہو گئے جب امام حسین کے کربلا پہونچنے کی خبر سنی تو قبیلۂ کلب کے لوگوں کے ساتھ کربلا آئے اور امام کے انصار میں داخل ہوئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۴) سعد بن حارث مولیٰ امیر المومنین

وہ جناب امیر کے غلام تھے۔ پھر امام حسن اور امام حسین کی خدمت میں رہے۔ امام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور کربلا تک ساتھ آئے اور روز عاشور اپنی جان امام پر نثار کی۔

(۸۵) عمر بن جندب حضرمی

شیعیان کوفہ میں سے تھے۔ حضرت علی کے ساتھ جمل اور صفین میں شریک ہوئے ۵۱ھ میں جب حجر بن عدی اور حکومت بنی امیہ کے درمیان تصادم ہوا تو یہ حجر کے اعوان میں محسوب تھے اور اسی لیے جب حجر کو گرفتار کر کے شام بھیجا گیا تو یہ روپوش ہو گئے یہاں تک کہ زیاد بن ابیہ ہلاک ہوا اس وقت کوفہ واپس آئے۔ جب جناب مسلم کوفہ میں آئے تو یہ ان کے انصار میں داخل ہوئے اور مسلم کی شہادت کے بعد مخفی طور پر امام کی خدمت میں پہنچ گئے اور حضرت کے ساتھ رہے یہاں تک کہ روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۶) قعنب بن عمرو النمری

شیعیان بصرہ میں سے تھے حجاج بن زید سعدی کے ساتھ امام کی خدمت میں آئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۷) یزید بن ثبیط العبدی

ان کے دو فرزندوں کا تذکرہ اس کے پہلے آچکا ہے وہ شیعیان بصرہ میں سے

اور ابو الاسود دؤلی (شاگرد حضرت علی) کے مصاحبین میں سے تھے جب حضرت
امام حسین مکہ سے بارادۂ عراق روانہ ہوئے ابن زیاد نے بصرہ کے گورنر کو یہ خط لکھا
کہ بصرہ کے لوگوں سے ہوشیار رہنا، کوئی شخص نصرت حسین کے لیے جانے نہ پائے۔ مگر بصرہ
میں عبد قیس کے قبیلہ کی ایک خاتون ماریہ بنت منقذ بڑی پختہ محب اہلبیت تھیں، اُن ہی
کا مکان شیعیان بصرہ کے اجتماع کا مرکز تھا یزید بن ثبیط نے امام کی نصرت کا ارادہ
کیا۔ اُن کے دس فرزند تھے جنھیں اُنھوں نے اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ دو ان میں
سے تیار ہوئے عبد اللہ بن ثبیط اور عبید اللہ بن ثبیط (انہی دونوں کا تذکرہ
پہلے ہوا ہے) جب ان کے ساتھیوں کو جو اُس مکان میں جمع ہوا کرتے تھے معلوم ہوا سب نے
خوف دلایا اور کہا نکلنا مشکل ہے مگر مجاہد راہ خدا کا ارادہ مستحکم تھا اُس نے جواب دیا کہ
جب میرے قدم باہر نکل گئے تو پھر مجھے کوئی پا نہیں سکتا۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ
رہ گئے امام عراق کے راستے میں الابطح کی منزل پر وارد ہوئے تھے جب یہ لوگ اُس مقام
پر پہونچے اور امام کے خیمہ کی طرف شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے گئے امام خود یہ سنکر کہ
یہ لوگ آئے ہیں ملنے کے لیے دوسرے راستے سے اُن کے جائے قیام پر تشریف لے جا چکے
تھے اور جب اُنھیں نہ پایا تو وہیں انتظار کے لیے بیٹھ گئے یہ لوگ مایوس ہو کر واپس ہوئے
تو امام کو اپنے ہی یہاں بیٹھا پایا۔ اُس وقت کی ان کی خوشی کا اندازہ غیر ممکن ہے۔
اُنھوں نے آیت قرآن پڑھی کہ خدا کے فضل و رحمت سے مومنین کو خوش ہونا چاہیئے
اس کے بعد امام کی خدمت میں سلام عرض کیا اور عزم نصرت کا اظہار کیا۔ امام
نے دعائے خیر دی۔

روز عاشورا اپنے فرزندوں کے بعد جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے

(۸۸) یزید بن زیاد بن مہاصر ابو الشعثاء کندی بہدلی

شیعیان کوفہ میں سے، شریف، بہادر اور جنگ آزما تھے۔ امام کی خدمت میں
حُر کی ملاقات سے پہلے پہونچے اور پھر ہمراہ رکاب رہے۔ جب کربلا کی سرزمین کے

قریب پہونچ کر حُر کے پاس ابن زیاد کا قاصد آیا ہے اور یہ خط لایا ہے کہ امام کو جہاں یہ خط پہونچے وہیں اُترنے پر مجبور کیا جائے تو ابوالشعثار نے اس قاصد کو پہچانا۔ یہ مالک بن نسر بدی تھا۔ چونکہ وہ بھی قبیلۂ کندہ سے تھا۔ اس لیے ابوالشعثار نے اس کو نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔ کہا یہ تو نے کیا غضب کیا۔ اس کام کے لیے تو آیا؟ اس نے کہا میں نے تو اپنے امام کی اطاعت کی اور اپنی بیعت کو پورا کیا۔ ابوالشعثار نے کہا تو نے خدا کی تو نافرمانی کی اور اپنے امام کی اطاعت کی اور اپنے نفس کی ہلاکت کا سامان کیا اور ہمیشہ کے لیے ننگ وعار اور آتش جہنم کا مستحق بنا۔ خداوند عالم نے یہ فرمایا ہے کہ کچھ امام ایسے ہیں جو آتش جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور روز قیامت اُن کی کوئی فریادرسی نہیں ہوگی بے شک تیرا امام ایسا ہی ہے۔

وہ بہت بڑے تیر انداز تھے۔ روز عاشورا اپنے گھٹنے ٹیک کر وہ امام کے سامنے بیٹھ گئے اُنھوں نے آٹھ تیر لگائے جن میں سے پانچ تیر ٹھیک نشانہ پر پہونچے اور پانچ آدمیوں کو فوج دشمن سے ہلاک کیا جب تیر ختم ہوگئے تو وہ تلوار لے کر میدان میں آئے اور یہ رجز پڑھی:۔

"میں یزید ہوں اور میرے باپ مہاصر تھے میں شیر بشیہ سے زیادہ بہادر ہوں خداوندا گواہ رہنا کہ میں حسین کا مددگار ہوں اور ابن سعد سے بے تعلقی اختیار کرنیوالا ہوں"

آخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۹) یزید بن معقل جعفی

اصحاب حضرت علی سے تھے اور حضرت کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے خریت بن راشد ناجی نے جب سرزمین اہواز میں خروج کیا ہے تو حضرت علی نے معقل بن قیس کی سرکردگی میں لشکر روانہ کیا۔ اس میں یزید بن معقل میمنۂ فوج کے سردار مقرر ہوئے تھے۔

مرزبانی نے معجم الشعراء میں اُن کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ تابعین میں محسوب ہیں

اُن کے باپ صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے روز عاشورا امام حسین کی نصرت کی۔ وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے:۔

اگر تم پہچانتے ہو مجھے تو پہچان لو کہ میں مغفل کا فرزند ہوں۔ میدان جنگ کا شہسوار اور مکمل اسلحہ رکھنے والا ہوں۔

میرے ہاتھ میں تیز شمشیر رہتی ہے جس کو میں غبار جنگ کے اندر شہسوار دشمن کے سر پر بلند کرتا ہوں" جنگ کرکے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۹۰) رافع بن عبداللہ مولیٰ مسلم الازدی

مُسلم بن کثیر اعرج کا ذکر حملۂ اولیٰ کے شہدا میں ہو چکا ہے۔ رافع ان ہی کے غلام تھے، اپنے مالک کے ساتھ کربلا آئے اور بعد ظہر جنگ کرکے شہید ہوئے۔

(۹۱) بشر بن عمرو بن الاحدوث الحضرمی الکندی

اصل میں حضرموت کے رہنے والے تھے لیکن کوفہ میں محلہ بنی کندہ میں قیام کرنے سے کندی کہے جانے لگے۔ جب کربلا میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اُس زمانہ میں آکر انصار امام میں شامل ہوئے۔

روز عاشورا انھیں خبر پہونچی کہ اُن کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا۔ اس وقت امام حسین کا اُن سے کہنا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو اور اس پر اُن کا فدا کارانہ جواب اور امام کا حُسن سلوک پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اصحاب میں میں وہ تقریباً بالکل آخر میں شہید ہوئے۔

(۹۲) سوید بن عمرو بن ابی المطاع الخثعمی

ضعیف العمر، عابد و زاہد اور بڑے نماز گزار تھے۔ لڑائیوں میں بھی شریک ہوئے تھے اور کارنمایاں انجام دے چکے تھے۔

روز عاشور شریک جنگ ہوئے اور اصحاب حسین میں سب سے آخر میں وہی ایک باقی رہ گئے

تھے چنانچہ بشر بن عمرو حضرمی کے بعد وہ میدان میں آئے۔ جنگ کی اور زخمی ہو کر گر ے،
وہ اتنے بے حال تھے کہ سب سمجھے اُن کا کام تمام ہو گیا اور روح جسم سے مفارقت کر گئی
مگر اُن میں جان باقی تھی۔ جب حضرت امام حسین شہید ہو چکے تو انھیں ہوش آیا اور اُن
کے کان میں آواز گئی کہ حسین قتل ہو گئے۔ بس وہ بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑے ہوے۔ اُن کی
تلوار لوگ لے جا چکے تھے۔ ایک چھرا موجود تھا۔ اُس سے اُنھوں نے پاس والے جو دشمن
تھے اُن پر حملہ کیا۔ آخر دشمن ٹوٹ پڑے۔ اور اُن کا سر جسم سے جدا کر لیا۔

اب جبکہ اصحاب حسین کا (بنی ہاشم کے علاوہ) سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو بہتر ہے کہ اس
جماعت کی نوعیت اور حیثیت پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔

آپ کو ان اصحاب کے حالات سے جو سلسلہ وار آپ کے سامنے پیش ہوے ہیں یہ اندازہ
ہو گیا ہو گا کہ وہ کچھ گمنام اور مجہول اشخاص نہیں تھے۔ بلکہ اب اعداد و شمار کے ذریعہ سے
یہ معلوم کر لینا آسان ہے کہ اُن میں اتنے اصحاب رسول تھے:۔

(۱) مسلم بن عوسجہ (۲) زاہر بن عمرو اسلمی کندی (۳) شبیب بن عبداللہ
مولی ہمدان (۴) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی (۵) عمار بن ابی سلامہ
دالانی (۶) مسلم بن کثیر صدفی (۷) حبیب بن مظاہر (۸) انس بن حارث اسدی
وفات رسول سے واقعۂ کربلا تک پچاس برس کا زمانہ گذرا ہے، اس لیے اُن
میں سے کسی کی عمر پچپن یا ساٹھ برس سے کم نہیں قرار پا سکتی اور اُن میں سے بعض کی عمر
اس سے یقیناً زیادہ تھی جیسے انس بن حارث۔ عبدالرحمٰن بن عبدرب حبیب
بن مظاہر مسلم بن عوسجہ ان کے علاوہ سوید بن عمرو خثعمی۔ ان ہی بزرگواروں سے
واقعۂ کربلا کے بوڑھے مجاہدین کی فہرست مرتب ہوتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا
نہیں ہو سکتا جو صرف وقتی جوش اور ولولہ کی وجہ سے میدان داری پر تیار ہو جائے۔

حسب ذیل اصحاب حضرت علی تھے:۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی (۲) مجمع بن عبداللہ مذحجی (۳) جنادہ بن حارث سلمانی

(۴) جندب بن حجیر کندی (۵) امیہ بن سعد طائی (۶) جبلہ بن علی شیبانی۔
(۷) حارث بن نبہان (۸) حلاس بن عمرو ازدی (۹) شبیب بن عبداللہ نہشلی
(۱۰) قاسط بن زہیر تغلبی (۱۱) کردوس بن زہیر تغلبی (۱۲) مقسط بن زہیر تغلبی
(۱۳) نعمان بن عمرو ازدی (۱۴) نعیم بن عجلان انصاری (۱۵) ابو ثمامہ صائدی
(۱۶) شوذب بن عبداللہ (۱۷) جون غلام ابوذر غفاری (۱۸) حجاج بن مسروق جعفی
(۱۹) سعد بن حارث (۲۰) یزید بن مغفل جعفی (۲۱) عمر بن جندب حضرمی

ان میں سے اکثر جمل صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں جنگ کر چکے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو حضرت علی کے زمانہ خلافت میں مختلف سرکاری عہدوں پر سرفراز رہے تھے اور بعض حضرت کے شاگرد اور آپ سے علمی استفادہ کئے ہوئے تھے۔

حسب ذیل حفاظ قرآن تھے:۔

(۱) بریر بن خضیر ہمدانی جو سید القراء کے لقب سے ملقب تھے اور کوفہ میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے (۲) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری (۳) کنانہ بن عتیق تغلبی (۴) نافع بن ہلال جملی (۵) حنظلہ بن اسعد شبامی (۶) غلام ترکی۔

حسب ذیل علما اور راویان حدیث تھے:۔

(۱) مسلم بن عوسجہ (۲) حانشتہ بن قیس نہمی (۳) زاہر بن عمرو سلمی (۴) سوار بن ابی عمیر نہمی (۵) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری (۶) حبیب بن مظاہر اسدی (۷) نافع بن ہلال (۸) شوذب بن عبداللہ (۹) انس بن حارث اسدی۔

حسب ذیل شجاعان روزگار تھے جن کی لڑائیوں کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے اور جو خاص طور سے صفت شجاعت کے ساتھ مشہور تھے۔

(۱) حر بن یزید ریاحی (۲) مسلم بن عوسجہ اسدی (۳) حارث بن امرا القیس کندی (۴) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی (۵) سعید بن عبداللہ حنفی (۶) مسعود بن حجاج تیمی (۷) زہیر بن قین بجلی (۸) عابس بن ابی شبیب شاکری (۹) زیاد بن عریب ہمدانی۔ (۱۰) سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی۔

اس کے علاوہ عبادت اور زہد و پرہیز گاری میں تو ان میں سے اکثر افراد جنہیں مختلف عناوین کے تحت میں درج کیا گیا شہرۂ آفاق تھے بلکہ بعض اپنی مشہور شجاعت کے ساتھ خاص طور سے عبادت میں بھی مشہور تھے جیسے عابس بن ابی شبیب اور زیاد بن عریب جن کے متعلق صراحت ہے کہ وہ شب زندہ دار تھے اور سعید بن عبداللہ حنفی جن کے اوصاف میں عبادت کا خاص طور پر تذکرہ ہے۔

یہ تمام وہ لوگ تھے جن کی زندگیاں ایک معیاری حیثیت رکھتی تھیں اور وہ اسلامی اخلاق و اوصاف کی ایک زندہ تصویر تھے۔

حضرت امام حسین کو کربلا میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کی وجہ سے کتنی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ گزشتہ واقعات آپ کے سامنے تھے اور اس لیے آپ عوام کے مجمع کو اپنے ساتھ جتنا زیادہ ہوتا خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ نے کربلا پہونچنے سے پہلے اور یہاں پہونچنے کے بعد اور روز عاشور تک برابر ہر موقع پر یہ کوشش جاری رکھی کہ جن میں کچھ بھی خامی ہو، وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

حقیقت میں آپ ایک ایسے اہم مقصد کے لیے جو آپ کے پیش نظر تھا عوام پر بھروسا کرہی نہیں سکتے تھے۔

حسین کو جس طرح کا کام انجام دینا تھا اس کی نوعیت بالکل انوکھی تھی۔ اس کے پہلے جتنی بھی لڑائیاں کبھی لڑی گئی ہیں ان کا مقصد ہوتا ہے فریق مخالف کو مادی طور پر شکست دینا۔ یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اگر اکھڑ آدمی ہوں اور ان میں سے تھوڑے بھی مثلاً ثابت قدم رہیں اور بہادری سے دشمن پر فتح حاصل کر لیں مگر حضرت امام حسین کو دوسری طرح کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہاں طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں تھا بلکہ طاقت کا مقابلہ کردار سے تھا۔ باطل کا مقابلہ حق سے تھا۔ استبداد و تشدد کا مقابلہ ایک ایسی ثابت قدمی سے تھا جو ظلم اور تشدد کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اپنی حقانیت اور ثابت قدمی کو ایک ایسی دنیا کے سامنے پیش کرنا منظور تھا جس پر بے حسی اور بے ہوشی چھائی ہوئی تھی حسین کردار کے ایسے اونچے

پیش کرنا چاہتے تھے جو موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائیں۔ ایسے نمونے جو بطورِ مثال دنیا کے سامنے پیش ہوتے رہیں۔ یہ مرحلہ بڑا نازک تھا۔ یہاں ساتھ والوں میں اگر ذرا بھی نقص ظاہر ہوا تو مقصد ناتمام رہ گیا۔ اس لیے ساتھ والوں کے انتخاب کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔

ہر ایک شخص اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔ حسینؑ کو اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو ویسی فوج فراہم کرتے۔ بڑے قد آور جوان اور نامور پہلوان بلاتے اور اپنے ساتھ لیتے مگر جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے امام حسینؑ کا مقصد یہ نہیں تھا۔ آپ تو یہ چاہتے تھے کہ بے ہوش اسلامی دنیا کی آنکھیں کھولیں اور ان میں احساس و بیداری پیدا کریں۔ اس کے لیے آپ نے ایسے عابد و زاہد، متقی اور پارسا افراد کو بلایا جن کی نیکی، پارسائی اور زہد و تقویٰ کا سارے ملک میں کلمہ پڑھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے ایسے بوڑھے اپنے ساتھ لیے جن کی بھویں لٹک کر آنکھوں پر آگئی تھیں۔ ایسے ضعیف انسان بھی لیے جن کی عمریں مدتوں سے محرابِ عبادت میں گزری تھیں۔ اُنھوں نے موقع کو دیکھا اور گویا آواز دی کہ آؤ حبیب بن مظاہر تم آؤ، مسلم بن عوسجہ تم آؤ، بریر ہمدانی تم آؤ، انس بن حارث صحابیِ پیغمبر تم آؤ۔ تمھارے میدان میں آنے کا وقت ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ جب کمریں کس کر، تلواریں لے کر میدان میں آئیں گے تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی کہ اسلام پر کیا وقت پڑ گیا ہے کہ ایسے ایسے آدمی بھی تلواریں کھینچ کر میدانِ جنگ میں آگئے ہیں۔

حسینؑ کے ساتھیوں کی شخصیت کا صرف دوسرے مسلمانوں پر نہیں جو غیر جانبدار یا خالی الذہن تھے بلکہ خود فوجِ مخالف پر جو ہوا و ہوس کے پنجوں میں اسیر اور اطاعتِ حکومت کے شکنجہ میں گرفتار تھی بڑا زبردست اثر پڑ رہا تھا۔ جس کے مختلف شواہد گذشتہ واقعات میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ مثلاً مسلم بن عوسجہ کی شہادت پر جب فوج میں خوشیاں ہونے لگی ہیں تو شبث بن ربعی کا کہنا کہ کیا غضب کی بات ہے کہ مسلم بن عوسجہ کا ایسا آدمی قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ میں نے خود خدمتِ اسلام

میں اس شخص کے کارنامے دیکھے ہیں۔ یا جب بریر ہمدانی جنگ کر رہے تھے اور اُن پر حملہ کے لیے ایک شخص بڑھا تو اس پر فوج کے دوسرے لوگوں نے منع کیا کہ ارے یہ تو بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظ قرآن کرایا کرتے تھے۔ یا جب عابس بن ابی شبیب میدان میں آئے تو فوج میں یہ آواز بلند ہوئی کہ یہ شیروں کا شیر ہے یہ عابس بن ابی شبیب ہے
ظاہر ہے کہ اس قسم کے واقعات دوسروں تک صرف فوج مخالف ہی کے افراد کی زبانی پہونچ سکتے تھے اور اس لیے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بہت میں سے کم صرف اکا دکا واقعات ہیں جو ہم تک پہونچ سکے ہیں اور ان سے اُس عام اضطراب اور انتشار کا پتہ چلتا ہے جو اصحاب حسینی کے مقابلہ میں فوج عمر سعد میں پایا جاتا تھا۔
ان اصحاب کی شرکت واقعہ کربلا کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اگر حضرت امام حسین صرف اپنے خاندان کے لوگوں کو لے کر کربلا کی سرزمین پر آگئے ہوتے تو یہ کہا اور سمجھا جاتا کہ یہ ایک خاندانی یا گھریلو جنگ تھی جیسا کہ عام طور سے بتلایا جاتا ہی کہ بنی امیہ اور بنی ہاشم ایک ہی خاندان کی دو شاخیں تھیں اور ان میں خانہ جنگی رہا کرتی تھی۔ اسی کا ایک شگوفہ تھا جو کربلا میں پھوٹا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک خاندان کے دو زمینداروں میں اکثر پٹی داری کی لڑائی ہوا کرتی ہے۔ مگر حضرت امام حسین کربلا میں صرف تنہا نہیں تھے، نہ اُن کے ساتھ صرف اُن کے گھرانے کے لوگ تھے بلکہ آپ کے ساتھ تقریباً عرب کے ہر قبیلہ اور مختلف مقامات کے ممتاز افراد موجود تھے۔ اس اختلاف قبائل اور تنوع سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تمام وہ افراد تھے جن میں نقطۂ مشترک صرف اصول کا احساس اور ایک وجہ خاص ( ) کا اتحاد ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں اور اس اصول کی حفاظت میں حجاز و عراق کے تقریباً تمام اسلامی قبائل کی نمائندگی تھی
اور اس اصول اور مقصد کے پہلو کو زیادہ نمایاں بنا دیا امام حسین کے اس رویہ نے کہ آپ نے سب کو بلا کر فرداً فرداً یہ اصرار کیا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو اور مجھے اس راستے پر اکیلا جانے دو۔ یہ اس لیے تھا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ عوام صاحب الرائے نہیں ہوتے جو کچھ رائے ہوتی ہے وہ لیڈروں کی رائے ہوتی ہے۔ حضرت امام حسین اگر اندھیرے میں

رکھ کر سب کو اقدام کرتے تو وہ صرف حسین کا اقدام ہوتا اور کہنے کو ہوتا کہ دوسروں نے صرف آپ کے اثر اور دباؤ سے اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیا۔ امام حسین یہ چاہتے تھے کہ ہر ایک کے دماغ پر وزن ڈال کر اُسے خود اُس کے فعل کا ذمہ دار بنا دیں۔ وہاں یہ نہیں تھا کہ حسین اپنے مقصد کے لیے ان سب کو نذر کر رہے ہوں بلکہ حقیقۃً ہر ایک نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر خود حسینی مقصد پر نثار کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا محرک خود اصول کا احساس تھا۔ اس طرح کہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کون لے جا رہا ہے اور کون اُس کے پیچھے جا رہا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کے قدم خود اُس کے ضمیر کی تحریک سے اُٹھتے تھے اور یہی اُن کے ثبات قدم اور استقلال کا بڑا راز تھا۔

اصحاب کی شہادت کے بعد امام حسین کے اعزا یعنی بنی ہاشم کی باری ہے حقیقت میں یہ اصحاب کی وفاداری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ جب تک اُن میں سے ایک بھی باقی رہا بنی ہاشم میں سے کسی ایک فرد کو کوئی گزند نہیں پہونچ سکا۔ حالانکہ اس درمیان میں جنگ مغلوبہ بھی ہوئی، تیروں کی بارش بھی ہوئی مگر اس سب میں کوئی ایک زخم تک بھی کسی ایک ہاشمی جوان یا بچہ کو لگنے کا تاریخ میں پتہ نہیں ہے۔

اب جبکہ یہ سب شہید ہو چکے تو اب بس حسین ہی ہیں حسین کے فرزند اور حسین کے بھائی اور بھتیجے ہیں ان شہدا کے حالات بھی ترتیب شہادت کے مطابق درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) علی اکبرؑ

سلسلۂ بنی ہاشم میں سب سے پہلے ان ہی کی ذات ہے۔ علی نام حضرت امام حسین کے فرزند۔ والدہ لیلیٰ بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود بن معبد الثقفی اور لیلیٰ کی ماں میمونہ بنت ابی سفیان بن حرب۔ اس طرح جناب علی اکبر باپ کی طرف سے تو بنی ہاشم میں اور ماں کی طرف سے قبیلۂ ثقیف میں داخل تھے اور پھر آپ کی والدہ امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کی بھانجی اور شہنشاہ وقت یزید کی پھوپھی زاد بہن تھیں

اس لحاظ سے جناب علی اکبر کو موافق اور مخالف سب عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آپ کی عظمت کا احساس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ شام کے دربار میں اُس کا تذکرہ ہوتا تھا اور یوں کہ ایک روز معاویہ نے اپنے حاضرین دربار سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک اس منصب خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ مجمع خوشامدیوں کا تھا سب نے کہا "آپ" کہا نہیں! سب سے زیادہ اس کے مستحق حسین کے فرزند علی ہیں جن کے دادا رسول اللہ ہیں اور اُن میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور قبیلہ ثقیف کی خودداری یہ تمام صفتیں ایک ساتھ موجود ہیں۔

اموی شعراء جناب علی اکبر کی تعریف میں اشعار بھی نظم کرتے تھے چنانچہ ابوعبیدہ اور خلف احمر نے جو دو بڑے ادیب تھے اُن اشعار کو نقل کیا ہے جو علی اکبر کی شان میں کہے گئے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہے:۔

"کوئی بھی زمین پر اُن کے مثل آنکھوں سے دکھلائی نہیں دیا، اُن کے ضیافت خانہ میں مہمانوں کے لیے گوشت برابر پکتا رہتا ہے اور جب پک جاتا ہے تو مہمانوں سے عزیز نہیں کیا جاتا۔ جب اُن کے مہمانخانہ کی آگ روشن ہوتی ہے تو ان کی حمیت اور بزرگی اس آگ میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس آگ کو مصیبت زدہ اور غریب لوگ دیکھیں یا کسی ایسے شخص کی نظر پڑ جائے جو بیکس اور بے بس ہے اور اسے دیکھ کر مہمانخانہ میں چلا آئے۔ آپ کبھی دنیا کو دین پر ترجیح نہیں دیتے اور نہ حق کو باطل کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ میرا مقصود اس سے حضرت علی کے فرزند ہیں جو صاحب عطاو جود ہیں۔ وہ جو بڑے حسب و نسب والی خاتون کے فرزند ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اموی ڈپلومیسی کو جناب علی اکبر سے بڑی امید وابستہ تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی ننھیالی خصوصیت کو نمایاں کرتے ہوئے آپ کے اوصاف و فضائل کو سراکم عام لوگوں کے بھی ذہن نشین کریں اور اس کے ساتھ جناب علی اکبر کے دل میں بھی یہ احساس پیدا کریں کہ وہ اپنے خاندان میں ایک علیحدہ شان اور حیثیت کے مالک ہیں اور اس طرح خاندان بنی ہاشم میں پھوٹ پڑنے کا امکان پیدا ہو۔

یقیناً اگر جناب علی اکبر کی جگہ کوئی کمزور نفس کا انسان ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سیاست کا شکار ہو جاتا مگر علی اکبر کا بلند اور پاکیزہ نفس اس فریب میں آنے والا نہ تھا۔ انھوں نے کبھی ان باتوں کی طرف اعتنا نہیں کی اور اموی سیاست کی شکست پر دائمی طریقے سے مہر کر دی اپنے اس خون سے جو کربلا میں فرزند فاطمہ کی حمایت میں زمین پر بہہ گیا اور یزید بن معاویہ کے مقابلہ میں جہاد کے میدان کو رنگین بنا گیا۔ اور اُن کی والدہ گرامی لیلیٰ نے اپنی وفاداری اور محبت آل رسول میں ثبات قدم سے وہ یگانگت اور اتحاد دکھلایا کہ آج اُن کے تذکرہ میں یہ امر کہ انھیں خاندان بنی امیہ سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے ایک ناگوار ضمیمہ معلوم ہوتا ہے۔

علی اکبر صورت و سیرت دونوں میں رسول اللہ کا نمونہ تھے اور بہت نمایاں شباہت رکھتے تھے اس لیے حضرت امام حسین کو اپنے اس فرزند کے ساتھ بڑی محبت تھی۔

کربلا پہونچنے سے قبل قصر بنی مقاتل میں امام حسین کا خواب کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت اُن کی طرف بڑھ رہی ہے اور اسے سُننا علی اکبر کا سوال کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور امام کا جواب کہ بے شک ہم حق پر ہیں اور پھر علی اکبر کا یہ کہنا کہ اس صورت میں ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔ آپ کے سامنے آچکا ہے اور اس سے علی اکبر کے استقلال اور حق کی راہ میں فداکاری کے جذبہ کا پورا اظہار ہوتا ہے۔

امام نے کربلا میں اپنا ایک خاص گھوڑا جس کا نام لاحق تھا علی اکبر کو سواری کیلئے دیا یقیناً شاہزادہ صبح عاشور ہی سے بے چین ہوگا کہ میدان جہاد میں جا کر ہاشمی شجاعت کے جوہر دکھائے مگر امام کی حکیمانہ نگاہ نے جو نظام قائم کر دیا تھا اُسے شکستہ کرنے کا کسی کو حق نہ تھا۔ اب جبکہ اصحاب سب ختم ہو گئے تو علی اکبر نے اذن جہاد طلب کیا۔ امام نے اپنے فرزند کو میدان جہاد میں جانے سے ذرا بھی روکا نہیں مگر دل کی بے چینی نے جذبات میں تلاطم ضرور پیدا کر دیا۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے، عرض کیا۔

"خداوندا گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسول کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے جب ہم تیرے

پیغمبر کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔"

کوئی شک نہیں کہ یہ مختصر سے الفاظ مناجات کے، اُس بے پایاں اندوہ کی پوری تشریح کر دیتے ہیں جو اس وقت امام کے دل پر غالب تھا مگر اس کے ساتھ ان میں عزت نفس اور بلندی نگاہ کا وہ نمونہ ہے جو حسین ہی سے مخصوص ہے۔ وہ اُس طرح اس غم پر اظہار رنج نہیں کرتے جس طرح ایک کمزور دل کا شخص یا اس دنیا کے تعلقات کا گرویدہ ایسے موقعوں پر اظہار کر سکتا ہے بلکہ اُن کے پیش نظر ہے تو صرف یہ کہ اس وقت میرے جد بزرگوار رسول اللہ کی تصویر مجھ سے جدا ہو رہی ہے اور اس پر وہ خدا کو گواہ کرتے ہیں اور بس یہ وہ شان ہے جس سے حسین حقیقۃً "حسین" معلوم ہوتے ہیں۔

"جا رہا ہے" کے الفاظ میں اذن جہاد خود بخود مضمر ہے اور اس لیے اس مناجات ہی سے علی اکبر سمجھ لیے کہ مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت حاصل ہے۔ وہ میدان میں آئے اور یہ رجز پڑھنے لگے:۔

"میں ہوں علی۔ حسین کا بیٹا اور علی کا پوتا۔ ہم بخدا سب سے زیادہ رسول کے حقدار ہیں۔ خدا کی قسم ہرگز ہم میں حکومت نہیں کر سکتی زنا زادہ کی اولاد۔"

یہ رجز شہدائے کربلا میں سب سے الگ ایک خاص انداز کا حامل ہے۔ دوسرے شہداء کے رجز میں زیادہ تر شجاعان عرب کے انداز پر اپنی شجاعت کا اظہار ہے یا امام کی بارگاہ میں اپنی وفاداری کا اثبات ہے لیکن علی اکبر کا رجز ایک تبلیغی حیثیت رکھتا ہے اُس میں مختصر الفاظ میں رسول کے ساتھ اپنی قرابت داری اور استحقاق ولایت اور اپنے مخالف کی پستی کو دکھلایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُس اموی سیاست کا جواب بھی ہے کہ علی اکبر کی تعریف میں تمام بنی ہاشم اور اولاد رسول سے الگ ننھیالی خصوصیت پر زور دیتے تھے گویا اس فرع کو اُس اصل سے الگ کرتے تھے لیکن جناب علی اکبر اپنے اظہار نام و نسب میں اپنا طرۂ امتیاز صرف ددھیالی رشتہ کو قرار دینا چاہتے ہیں اور اس کی چھاؤں بھی نہیں آنے دیتے کہ آپ میں کوئی دوسرا عنصر شریک ہے۔

طبری نے لکھا ہے کہ علی اکبر نے کئی حملے کئے اور آپ برابر یہی اشعار پڑھ رہے تھے۔ بجار

میں ہے علی اکبر نے اتنی جنگ کی کہ دشمن کثرت مقتولین کی وجہ سے چیخ اُٹھے۔

اتنی شدید جنگ میں آپ زخمی ہو گئے تھے مگر پھر بھی لڑائی میں مصروف تھے۔ فوج مخالف کے ایک سپاہی مرہ بن منقذ بن نعمان عبدی نے کہا۔ اگر اب کی مرتبہ اس جوان نے پھر حملہ کیا اور میری طرف سے گزرا تو میں ضرور اس کے باپ کو اس کے غم میں مبتلا کردونگا ایسا ہی ہوا۔ علی اکبر تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے دشمنوں پر حملہ آور تھے۔ بس مرہ پاس آگیا اور دھوکا دے کر پشت پر نیزہ مارا جو سینہ سے پار ہوگیا۔

علی اکبر گھوڑے سے زمین پر گرے اور دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شاہزادہ کے جسم کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

علی اکبر کی شہادت کا امام پر بڑا اثر ہوا۔ آپ نے فرمایا "خدا فنا کرے اس جماعت کو جس نے تجھے قتل کیا۔ اے میرے فرزند کتنی جرأتیں بڑھ گئیں ان لوگوں کی خدا اور اُس کے رسول کے مقابلہ میں! تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے"

امام نوجوانان بنی ہاشم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "اُٹھاؤ۔ اپنے بھائی کی لاش" سب نوجوان آگے بڑھے اور اُنھوں نے علی اکبر کی لاش کو لاکر اُس خیمہ کے آگے رکھدیا جو مرکز سپاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور جس کے آگے جنگ ہو رہی تھی۔

(۲) عبداللہ بن مُسلم بن عقیلؑ

ان کی والدہ رقیہ بنت علی بن ابی طالب تھیں جو ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ بن یحییٰ بن الشد بن علقمۃ التغلبیہ کے بطن سے تھیں جنھیں حضرت علی نے جنگ یمامہ یا علین التمر کے اسیروں میں سے خرید فرمایا تھا اس اعتبار سے عبداللہ امام حسین کے چچازاد بھائی کے فرزند بھی تھے اور آپ کے بھانجے بھی۔

جناب مسلم کی عالم غربت میں شہادت ابھی بالکل تازہ واقعہ تھی اور اُس کا اثر امام کے دل پر بہت زیادہ تھا اور اسی لئے شب عاشور آپ نے اپنے اصحاب کے سامنے جو تقریر فرمائی ہی اُس کے آخر میں عقیل کی اولاد سے خاص طور پر یہ خطاب فرمایا تھا کہ تمھارے لیے

مسلم کا قتل ہو جانا کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تم کو اجازت دیتا ہوں مگر ان سب نے متفق ہو کر کہا تھا کہ یہ نہیں ممکن۔ ہم سب بھی آپ پر اپنی جانیں نثار کریں گے۔

ان میں سب سے پہلے شہید یہی عبداللہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت کمسن تھے جناب علی اکبر کی شہادت سے خیمہ میں جو کہرام برپا ہوا تو کمسن بچے گھبرا کر باہر آگئے۔ بے رحم دشمنوں کو موقع مل گیا۔ عمرو بن صبیح صدائی نے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو تیر لگایا جو بچہ کی پیشانی کی طرف آیا۔ بچے نے گھبرا کر ہاتھ اپنا پیشانی پر رکھ دیا۔ تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ پھر دوسرا تیر آیا جو سینہ پر پڑا اور اس نے کام تمام کر دیا۔

(۳) محمد بن مسلم بن عقیل

یہ عبداللہ کے مختلف البطن بھائی تھے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ انکی والدہ ام ولد تھیں عبداللہ کے قتل ہونے کے بعد اولاد ابی طالب نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ امام نے آواز دی "ہاں! میرے چچا کے فرزندو موت کے مرحلہ کو سر کر دو" ان میں سے محمد بن مسلم شہید ہو کر گر گئے۔ ان کو ابو مرہم ازدی اور لقیط بن ایاس جہنی نے قتل کیا۔

(۴) جعفر بن عقیل

عبداللہ بن مسلم کی شہادت کے بعد جعفر بن عقیل نے جنگ کی، وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے:۔ "میں مکہ کا رہنے والا ہوں! طالب کے خاندان کا، ہاشم کی نسل اور غالب کے گھرانے سے۔ یقیناً ہم تمام قبائل کے سردار ہیں اور یہ حسین ہیں تمام پاکیزہ اشخاص میں سب سے زیادہ پاکیزہ"

انھیں عبداللہ بن عروہ خثعمی نے تیر مارا اور بشر بن خوط ہمدانی کے ہاتھ سے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵) عبدالرحمن بن عقیل

وہ میدان جنگ میں آئے۔ رجز پڑھی اور جہاد کیا۔ آخر عثمان بن خالد جہنی اور

بشر بن خوط ہمدانی دونوں نے مل کر انھیں شہید کیا۔

(۶) محمد بن ابی سعید بن عقیل

میدان کربلا میں جہاد کیا۔ اور لقیط بن یاسر جہنی نے اُن کی پیشانی پر تیر لگایا جس سے وہ شہید ہو گئے۔

(۷) محمد بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب

امام حسین کے چچازاد بھائی کے فرزند۔ والدہ کا نام خوصا بنت حفصہ بن ثقیف جو قبیلہ بنی بکر بن وائل سے تھیں۔ وہ اور اُن کے بھائی عون جو جناب زینب کے فرزند تھے دونوں اپنے والد بزرگوار عبد اللہ بن جعفر کے بھیجے ہوے امام سے آکر راستے میں ملحق ہوے تھے اُس وقت جب آپ مکہ سے عراق کے ارادہ سے باہر نکل چکے تھے۔

روز عاشور عبد الرحمٰن بن عقیل کی شہادت کے بعد یہ میدان میں آئے اور جہاد کیا اور عامر بن نہشل تمیمی کے ہاتھ سے شہید ہوے۔

(۸) عون بن عبد اللہ بن جعفر

یہ حضرت زینب بنت علی کے بطن سے تھے اس لیے امام حسین کے بھانجے بھی تھے اپنے بھائی محمد کے بعد میدان کارزار میں آئے اور عبد اللہ بن قطبہ طائی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوے۔

(۹) قاسم بن الحسن

حسین کے بڑے بھائی حضرت امام حسن کی نشانی تھی۔ سن واقعہ کربلا میں حد بلوغ سے کم تھا اپنے بھائی کے کمسن یتیم کی جدائی حسین پر بہت شاق تھی مگر مقصد کی عظمت کے سامنے یہ بھی آسان تھا۔

امام نے بھائی کی وصیت پوری کی اور بھتیجے کو رخصت کرتے وقت قاسم کے عمامہ کو اپنے ہاتھ سے باندھا، اُس کے دونوں گوشے سینہ پر لٹکا دیے اور اُن کے پیراہن کو بصورت کفن چاک کر دیا۔

قاسم میدان جنگ میں آئے اور یہ رجز پڑھا:۔

"اگر تم مجھے نہیں جانتے ہو تو اب معلوم کر لو کہ میں حسن کا فرزند ہوں اور پیغمبر کی اولاد میں ہوں۔ کیا غضب کی بات ہے کہ یہ حسین تمہارے درمیان مثل قیدی کے محصور ہو گئے ہیں خدا کرے ابر باراں اس جماعت کو سیراب نہ کرے"

قاسم نے اپنی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی خونریز جنگ کی۔ طبری کی روایت ہے کہ عمرو بن سعد بن نفیل ازدی کی نظر جو قاسم پر پڑی تو اُس نے کہا کہ اس بچہ پر میں حملہ کروں گا۔ بعض لوگوں نے روکا بھی مگر اُس نے نہ مانا اور قاسم کے پاس آ کر سر پر تلوار لگائی۔ قاسم منھ کے بھل زمین پر گر گئے اور اپنے چچا کو مدد کے لیے آواز دی۔ حسین بھتیجے کی مدد کے لیے پہونچے اور غضب ناک شیر کی طرح حملہ کیا۔ عمرو بن سعد بن نفیل جو قاسم کا قاتل تھا ابھی پاس موجود تھا۔ آپ نے اس پر تلوار لگائی۔ وہ اُس کے ہاتھ پر پڑی جو کہنی سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ فوج اُس کے بچانے کے لیے ٹوٹ پڑی مگر اس طرح چاروں طرف سے گھوڑے بے تحاشا دوڑے کہ وہ اپنی ہی فوج کے گھوڑوں سے پامال ہوا اور ہلاک ہو گیا۔

جب مجمع منتشر ہوا تو امام قاسم کے سرہانے کھڑے ہوئے اور حسرت واندوہ کے ساتھ فرمانے لگے:۔

"تیرے چچا پر بڑا ناگوار ہے یہ امر کہ تو اُسے پکارے اور وہ تیری خبر نہ لے سکے یا تیری آواز پر آئے مگر تجھے کوئی فائدہ نہ پہونچا سکے"

اس کے بعد آپ نے خود قاسم کی لاش کو اُٹھایا اور وہیں کہ جہاں علی اکبر کی لاش پہلے سے موجود تھی قاسم کی لاش کو بھی لا کر لٹا دیا۔

(۱۰) ابو بکر بن الحسن

ان کی والدہ کا نام ام اسحٰق بنت طلحۃ التیمی تھا۔ طبری نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابن عقبہ غنوی

نے ابوبکر بن الحسن کو تیر لگایا جس سے وہ شہید ہو گئے۔ ابوحنیفہ دینوری کی تصریح بھی اسی کے مطابق ہے۔

(۱۱) محمدؐ بن علی بن ابی طالب

یہ محمد بن الحنفیہ فرزند حضرت علی سے چھوٹے تھے اس لیے محمد الاوسط اور محمد الاصغر بھی کہلاتے ہیں۔ والدہ اُن کی امامہ بنت ابی العاص تھیں جو زینب دختر حضرت رسول کی بیٹی تھیں۔ حضرت علی نے جناب فاطمہ زہرا کی وفات کے بعد خود جناب فاطمہ کی وصیت کی بنا پر اُن سے عقد کیا تھا۔

محمدؐ اپنے والد بزرگوار کے بعد اپنے بھائی امام حسن اور پھر امام حسین کے پاس رہے، اور روز عاشور میدان جہاد میں جا کر بہت سے دشمنوں کو قتل کیا۔ آخر قبیلہ بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے تیر مارا جس سے وہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور وہ سر اُن کا جدا کر کے عمر سعد کے پاس لے گیا۔

(۱۲) عبد اللہ بن علی

والدہ ان کی ام البنین فاطمہ بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن عامر المعروف بالوحید ابن کلاب تھیں۔ حضرت علی نے اپنے بھائی عقیل سے جو انساب عرب سے خوب واقف تھے یہ فرمائش کی کہ ایک ایسے خاندان کی لڑکی بتایئے جو بہت بڑے بہادران عرب کی نسل سے ہو، میں اُس سے شادی کروں اور چاہتا ہوں کہ اُس سے جو اولاد ہو وہ بڑی بہادر اور جنگ آزما ہو۔ عقیل نے کہا کہ ام البنین الکلابیہ سے عقد کیجیے جس کے باپ دادا سے زیادہ شجاع و بہادر ملک عرب میں کوئی مشہور نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نے اسی بنا پر ام البنین سے عقد کیا۔

ان کے سلسلۂ اجداد میں ملاعب الاسنہ ابوبراء اور طفیل فارس قرزل اور عامر بن طفیل بڑے مشہور عرب کے سورما گزرے ہیں۔

لبید بن ربیعہ شاعر جو معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف ہے وہ بھی اسی خاندان سے تھا چنانچہ اُس نے اپنے خاندانی خصوصیات پر نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ کے بھرے ہوئے دربار میں ان الفاظ میں فخر کیا:۔

نحن بنو ام البنین الاربعۃ ونحن خیر عامر بن صعصعۃ

الضاربون الھام وسط المجمعۃ

اس آواز کو تمام قبائل عرب کے نمائندوں نے خاموشی کے ساتھ سُنا۔ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ام البنین اس سلسلہ میں پہلے بھی کوئی مشہور خاتون گزر چکی تھیں اور ان کے بھی چار بیٹے تھے جو عرب میں شہرت رکھتے تھے۔

جناب ام البنین کے بطن سے حضرت علی کے چار فرزند ہوئے:۔

(۱) حضرت عباس علمدار جوان سب میں بڑے تھے (۲) عبداللہ جن کے حالات اس وقت لکھے جا رہے ہیں (۳) عثمان (۴) جعفر یہ ان سب میں چھوٹے تھے۔

عبداللہ بن ابی المحل بن حزام بن خالد بن ربیعہ بن عامر الوحید جناب ام البنین کا بھتیجا تھا اور کوفہ میں بہت معزز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اُس وقت جب شمر ابن زیاد کا خط لے کر کربلا کی جانب روانہ ہو رہا تھا دربار ابن زیاد میں موجود تھا۔ اس نے عبیداللہ بن زیاد سے کہا کہ ہمارے خاندان کی ایک لڑکی کے فرزند حسین کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ اُن کے لیے امان نامہ لکھ دیجیے۔ ابن زیاد نے منظور کیا اور جناب عباس اور اُن کے بھائیوں کے لیے امان لکھدی۔ عبداللہ بن ابی المحل نے اپنے ایک غلام کے ہاتھ جس کا نام کزمان تھا اس تحریر کو روانہ کیا۔ وہ اُس کو لے کر ان جانباز بہادروں کے پاس لایا اور کہا یہ آپ کے ماموں زاد بھائی نے امان نامہ بھیجا ہے۔ ان چاروں جوانوں نے کہا کہ ہمارے بھائی کو ہمارا سلام کہدینا اور کہنا کہ ہم کو اس امان کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی امان ہمارے لیے ابن زیاد کی امان سے بہتر ہے۔

خود شمر بن ذی الجوشن وحیدی کلابی اس خاندان سے تھا اور اس نے کربلا کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ وہ لشکر حسینی کے سامنے آیا اور پکار کر کہا " کہاں ہیں ہماری

بہن کے بیٹے،، یہ سن کر جناب عباس اور ان کے تینوں بھائی سامنے آئے اور پوچھا کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا ،، تم لوگ امان میں ہو،، بہادروں نے کہا ،، خدا لعنت کرے تجھ پر اور تیری امان پر۔ ہم کو تو امان ہو اور فرزند رسول کو امان نہیں ہے!،، اس سے ان دلیروں کے ثبات و استقلال اور وفاداری کا کامل نمونہ ظاہر ہوتا ہے زندگی کی راہ صاف ہونے کے باوجود موت کو اختیار کرنا کسی معمولی دل کا کام نہیں ہے

جناب عباس کے بعد ان بھائیوں میں عبد اللہ سب سے بڑے تھے اور چونکہ جناب عباس ان کو مثل اولاد کے عزیز رکھتے تھے اس لیے چاہتے تھے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے ان کو راہ خدا میں شہید ہوتے دیکھ لیں، کیونکہ روز عاشور حالت یہ تھی کہ ہر شخص اپنے سے وابستہ انسان کو خود اپنے سامنے میدان میں بھیجتا تھا اور اسے بطور تحفہ اپنے ہاتھ سے پیش کرتا تھا، پھر خود آگے بڑھ کر جان دیتا تھا۔ عابس بن ابی شبیب کے واقعہ میں اس کی مثال آچکی اور ان کے الفاظ سنے جا چکے ہیں کہ انھوں نے اپنے غلام شوذب سے کہا ،، میں چاہتا ہوں تمھاری مصیبت کو اٹھا کر اجر و ثواب کا مستحق بن لوں۔ پھر خود میدان جنگ میں جاؤں،،

جناب عباس نے بھی اسی لیے اپنے بھائیوں کو اپنے پہلے میدان میں بھیجا۔ سب سے پہلے آپ نے عبد اللہ کو بلایا اور فرمایا ،، بڑھو بھائی۔ آگے بڑھو تاکہ میں تمھیں قتل ہوتے اپنی آنکھ سے دیکھ لوں اور اپنے لیے سامان آخرت سمجھوں کیونکہ تمھارے تو کوئی اولاد نہیں ہے،، مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارے اولاد ہوتی اور قابل جنگ ہوتی تو تم اس کا انتظار کرتے کہ پہلے اپنے بیٹے کو اپنے سامنے قتل ہونے بھیجوں۔ پھر خود جاؤں مگر تمھارے کوئی اولاد تو ہے نہیں جس کے لیے تم انتظار کرو۔ جاؤ۔ خود ہی میدان میں جاؤ!،، عبد اللہ میدان میں گئے اور جنگ کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی کی تلوار سے شہید ہوئے۔

(۱۴) عثمان بن علی

جناب عباس کے دوسرے بھائی، ام البنین کے بطن سے، عبد اللہ سے چھوٹے

تھے جب ان کی ولادت ہوی تو حضرت علی نے اُن کا نام عثمان رکھا اور فرمایا کہ یہ میں اپنے دوست عثمان بن مظعون کے نام پر نام رکھتا ہوں۔ یہ عثمان بن مظعون بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ رسول اللہ کے سامنے اُن کا انتقال ہوا اور حضرت نے اُن کو جنۃ البقیع میں دفن کیا۔

جناب عباس نے عبداللہ کے بعد عثمان کو میدان جنگ میں بھیجا۔ انھوں نے جہاد کیا اور آخر خولی بن یزید اصبحی کے تیر سے زمین پر گرے اور بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے سر جسم سے جدا کیا۔

(۱۴) جعفر بن علی

یہ ام البنین کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ عثمان کی شہادت کے بعد جناب عباس ان کی طرف متوجہ ہوے اور کہا "جاؤ! جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدمہ میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا بھی برداشت کروں۔ کیونکہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے"

جعفر نے بھی جہاد کیا اور ہانی بن ثبیت حضرمی کے ہاتھ سے شہید ہوے۔

(۱۵) ابوالفضل العباس بن علی

آپ ان بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی ماں ام البنین کے خاندانی خصوصیات کا تذکرہ اس کے پہلے عبداللہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔

سنہ ۲۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ چودہ ۱۴ برس آپ نے اپنے والد بزرگوار کے سایہ میں پرورش پائی۔ سنہ ۴۰ھ میں حضرت علی کی شہادت ہوی تو دس برس آپ اپنے بھائی امام حسن کے زیر تربیت رہے سنہ ۵۰ھ میں امام حسن نے وفات پائی اس وقت عباس کی عمر ۲۴ برس کی تھی پھر دس برس آپ اپنے بھائی امام حسین کی مخصوص تربیت میں رہے۔ اس طرح واقعہ کربلا میں آپ کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔

وہ حسن وجمال اور قوت وطاقت میں اپنے زمانہ میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے اس لیے "قمر بنی ہاشم" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ آپ بلند بالا اور قد آور تھے۔ یہاں تک کہ اسپ دو رکابہ پر سوار ہوتے تھے تو پاؤں زمین پر خط دیتے تھے۔

یہ تو ظاہری حلیہ ہے اور باطنی صورت کے خط وخال انتہائی شاندار الفاظ میں امام جعفر صادق نے بیان فرمائے ہیں ان الفاظ میں کہ "ہمارے چچا عباس بن علی بڑے دیندار اور مستحکم ایمان والے تھے۔ انھوں نے امام حسین کے ساتھ رہ کر جنگ کی اور کارنمایاں انجام دیا اور آخر درجہ شہادت پر فائز ہوئے"

نافع بن ہلال کے حالات میں جناب عباس کا واقعہ کربلا میں سب سے پہلا کارنامہ آپ کے سامنے آچکا ہے یعنی آٹھویں محرم کی شب کو جب پیاس کی شدت بہت ہوئی تو سب سے پہلے ابوالفضل العباس کو یہ خدمت سپرد کی گئی کہ وہ جاکر نہر سے پانی لائیں۔ امام حسین نے تیس سوار اور بیس پیادے جناب عباس کے ساتھ کیے اور بیس مشکیں ساتھ کیں یہ لوگ نہر کے قریب پہونچے عمرو بن الحجاج جو پانی کا محافظ تھا سد راہ ہوا حضرت عباس نے سواروں کی جماعت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا اور پیادوں سے کہا کہ تم اپنی مشکیں بھر لو انھوں نے مشکیں پانی سے بھر لیں۔ تاد یر یہاں جنگ ہوتی رہی۔ آخر دشمن کی فوج کو شکست ہوئی اور پانی خیام حسینی میں پہونچا دیا گیا۔

یہ واقعہ وہ تھا جس میں پہلی بار جناب عباس نے پانی لانے کی خدمت کو انجام دیا اور "سقّا" کا لقب حاصل کیا۔

ابن زیاد کی تحریری امان کا مسترد کرنا وفاداری کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ اس واقعہ میں اگرچہ تمام بھائی مشترک حیثیت رکھتے ہیں مگر جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے چھوٹے بھائی سب جناب عباس کے بالکل مطیع فرمان تھے اور یہ جناب عباس کی انتہائی پختگی اور وفاداری تھی جس کا اثر دیگر بھائیوں پر بھی پڑتا تھا اگر حضرت عباس کی طرف سے کچھ بھی تزلزل ہوتا تو صورت واقعہ اس طرح نظر نہ آتی جو اس وقت تاریخ میں محفوظ ہے۔

اُس وقت جب نویں تاریخ سہ پہر کو عمر سعد نے دفعتہً حملہ کر دیا ہے تو جناب عباس ہی تھے جو خدمت امام میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "بقیا لشکر آگیا" حضرت اُٹھے اور فرمایا "عباس! سوار ہو میری جان تم پر فدا میرے بھائی اور ان کے پاس جا کر کہو کہ یہ کیا ہے اور ان کا کیا ارادہ ہے اور ان کے حملہ کا سبب دریافت کرو"

ان الفاظ کا لب و لہجہ دیکھنے کے قابل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ امام کو جناب عباس سے کس درجہ محبت تھی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جناب عباس کی سنجیدگی، معاملہ فہمی، وفاداری اور امانتداری پر امام کو کتنا بھروسا تھا۔ ورنہ اس نازک مرحلہ کو آپ جناب عباس کے سپرد نہ فرماتے۔

جناب عباس نے انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اس مرحلہ کو طے کیا اور ایک شب کی مہلت حاصل کی۔

شب عاشور جب امام نے اپنے اصحاب کو جمع کیا ہے اور وہ تاریخی تقریر فرمائی ہے کہ میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اُٹھاتا ہوں، میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ پھر یہ بھی کہا کہ میرے عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ تو جناب عباس بیتاب ہو گئے اور سب سے پہلے اُنھوں نے جانبازی کا اظہار کیا اور کہا "ہم ایسا کس لیے کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں۔ خدا وہ روز بد نصیب نہ کرے" آپ کے بعد دوسرے اعزا تھے جنھوں نے اسی خیال کا اظہار کیا۔

صبح عاشور جب ترتیب لشکر ہوئی تو علمداری کا عہدہ حضرت ابوالفضل العباس کو ملا اور آپ نے اس شان اور آن بان کے ساتھ اس عہدہ کی عزت کو قائم رکھا جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔

میدان جنگ میں عباس و علی اکبر بالکل امام حسین کے پاس رہتے تھے چنانچہ اس وقت جب امام نے اتمام حجت کے لیے ناقہ پر سوار ہو کر صفوف دشمن کے سامنے تقریر فرمائی ہے اور آپ کی آواز خیمہ میں پہونچی اور شور رونے کا بلند ہوا تو حضرت نے جناب عباس و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو، رونے کا وقت تو بعد کو آئے گا۔

آپ کی شجاعت کا ایک بے نظیر مرقع وہ تھا جب عمر بن خالد صیداوی وغیرہ چار بہادروں نے ایک ساتھ فوج دشمن پر حملہ کیا اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے، فوج کوفہ نے ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لشکر امام سے بالکل جدا کر دیا۔ یہ دیکھکر امام نے اپنے بھائی جناب عباس کو اُن کی امداد کے لیے بھیجا۔ آپ نے جاکر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی یہاں تک کہ فوج کو منتشر کیا اور ان زخمی بہادروں کو دشمنوں کے حلقہ سے نکال کر اپنی فوج کی طرف واپس لے چلے۔

یہ جناب عباس کی شجاعت وجرأت اور فن جنگ میں مہارت کا ایک عجیب نمونہ تھا فتحمند لشکر کے حلقہ میں گھرے ہوئے زخمی بہادروں کو محفوظ طریقہ پر نکال لینا کوئی آسان کام نہیں ہے، پھر بھی کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس حملہ میں آپ کو کوئی زخم لگا ہو اور کسی طرح کا بھی گزند پہونچا ہو۔

یہ تذکرہ ابھی ابھی اس کتاب میں ہو چکا کہ عباس نے اپنے تین بھائیوں کو فرزند فاطمہؑ پر نثار کر دیا۔

اب جب کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہا جو امام کی نصرت میں جہاد کر سکے تو ابوالفضل العباس خدمت امام میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی۔ امام نے اپنے بھائی کو بہت حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا "تم تو میرے علمدار ہو!" عباس نے عرض کیا "اب مجھ سے تحمل ممکن نہیں ہے اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں" امام نے فرمایا "اچھا جاتے ہو تو پانی کی فکر کرنا" جناب عباس نے مشک لے لی اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے آپ نے دشمن کی فوج پر حملہ کیا، اس طرح نہیں کہ گویا آپ جنگ کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس طرح جیسے نہر کا راستا صاف کر کے پانی لانا منظور ہے۔

شیر دل عباس اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ وہ نہر پر پہونچے بھی اور پانی مشک میں بھرا بھی۔

دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا یہ واقعہ کہ ہزاروں سپاہیوں نے ایک بہادر کو روکنا چاہا اور نہ روک سکے عباس کے شیرانہ حملہ نے دشمن کو اتنی دور ہٹا دیا تھا کہ انھوں نے

اطمینان سے نہر میں گھوڑا ڈالا اور پانی بھر لیے بے شک خود عباس پیاسے تھے مگر انھوں نے پانی ہاتھ میں لے کر پھینک دیا اور امام کی پیاس کے خیال نے لبوں کو پانی سے تر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

پیاسے نہر سے نکل آئے اور بھری ہوئی مشک دوش پر لے کر خیمہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ فوج عمر سعد کو اب اپنی شکست کا غصہ بھی تھا اور یہ کد بھی کہ پانی کسی طرح پہونچنے نہ پائے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اس وقت عباس کے مشکلات کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ دوش پر مشک مستقل طور پر جنگ سے مانع تھی اور علم بھی موجود تھا مگر کیا کہنا اس بہادر کا جس نے اسی عالم میں جنگ شروع کر دی اور جوش و خروش سے حملے کر رہے تھے اور ان کی زبان پر یہ شعر تھے:۔

"میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک کہ میں تلوار کے سایہ میں زمین پر نہ گر جاؤں میں عباس ہوں۔ مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور جنگ کے ہنگام میں موت کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا"

دشمنوں کی جانب سے اپنی آخری شکست کا اعتراف سمجھیے کہ انھوں نے عباس کے ہاتھوں کی موجودگی میں اپنی کامیابی ناممکن سمجھی۔ اس لیے حکیم بن طفیل طائی سنبسی نے داہنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ عباس کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا۔ انھوں نے علم کو گرنے نہیں دیا۔ بائیں شانہ پر لیا اور کہا:۔

"خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے دین کی حمایت نہ کروں گا۔ اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا"

اس کے بعد زید بن ورقاء جہنی نے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی۔ یہ ہاتھ بھی قطع ہو گیا عباس نے علم کو اپنے سینہ سے لگایا۔ قبیلہ تمیم کے ایک شخص نے سر پر ایک گرز لگایا جس سے جناب عباس زمین پر گرے اور بلند آواز سے پکار کر کہا "بھائی میری خبر لیجیے" امام پر اس آواز کا جو اثر نہ ہوتا کم تھا۔ وہ مثل باز شکاری کے جھپٹے اور زخمی بھائی کی لاش پر پہونچے۔ دیکھا دونوں ہاتھ قطع ہیں پیشانی شکستہ ہے۔ آنکھ پر تیر ہے، زخموں سے چور ہیں

امام جھک گئے اور سرہانے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ شیر دل بھائی کی روح نے جسد سے مفارقت کی۔ اب کوئی نہیں تھا جس کا حسین کو سہارا ہوتا۔ وہ بھائی کی لاش سے اٹھے اور آگے بڑھے۔ تلوار ہاتھ میں تھی۔ بڑے جوش میں داہنے اور بائیں دشمن پر حملہ کر رہے تھے اور وہ سامنے سے بھاگ رہے تھے۔ آپ فرماتے تھے "بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو۔ تم نے میرے بازو کو تو شکستہ کر دیا"

اس کے بعد آپ اپنی جگہ پر آ کر تنہا کھڑے ہو گئے۔

جناب عباس فوج حسینی کے آخری سپاہی تھے جو شہید ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جو قتل ہوئے ہیں وہ کمسن بچے تھے اولاد ابو طالب میں سے جو تلوار اٹھانے کے قابل نہ تھے اب دشمنوں کی فوج تھی اور ایک اکیلے امام تھے اور آپ کو جہاد کا فریضہ انجام دینا تھا۔

سطحی طور پر یہ ترتیب شک و شبہہ کی نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ عملی رہنمائی کا بہتر تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت امام حسین میدان جہاد میں قدم رکھ کے عملی شان پیش کرتے۔ پھر اپنے عزیزوں کو یکے بعد دیگرے میدان جہاد میں بھیجتے اور آخر میں اصحاب کی نوبت آتی۔ یہی رسول اللہ کا طریقہ تھا جسے حضرت علی نے نہج البلاغہ میں بیان فرمایا ہے کہ حضرت خطرہ کے موقعوں پر اپنے اہلبیت اور اعزا کو آگے رکھتے تھے اور انھیں اپنے اصحاب کی سپر بناتے تھے۔ مگر کربلا میں ترتیب اس کے برعکس رکھی گئی۔ یہاں اصحاب پہلے میدان میں بھیجے گئے اور پھر اعزا اور آخر میں خود حضرت امام حسین۔

مگر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعہ کربلا میں اور دوسرے موقعوں میں بہت فرق تھا۔ دوسرے ہر موقع پر یہ یقینی تھا کہ کچھ لوگ قتل ہوں گے اور کچھ صحیح و سلامت محفوظ رہیں گے۔ یہاں یہ کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خطرہ میں وہی لوگ پڑیں جو رسول کے ساتھ قریبی رشتہ رکھتے ہیں اور وہ لوگ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں جو اغیار اور اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں مگر کربلا میں عاشور کے دن یہ بات بالکل یقینی تھی کہ

زندہ بچنے والا کوئی نہیں۔ بہرحال جتنے ہیں اُن سب کو شہید ہونا ہے۔ جہاں تک خطرہ سے بچانے کی کوشش کا تعلق ہے وہ شبِ عاشور کی جاچکی تھی اور اُس وقت حضرت امام حسین نے فرمایا تھا کہ مجھے تنہا اس خطرہ کو قبول کر لینے دو۔ تم لوگ اپنی جانوں کو ہلاکت میں کیوں ڈالو مگر اعزا اور اصحاب سب نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور اپنی جانیں حسین کے سامنے نذر کر دیں۔ اب یہ سوال تو باقی ہی نہیں رہا کہ کون قتل ہو اور کون زندہ رہے۔ زندگی تو بہت پہلے ٹھکرا دی جاچکی۔ اب تو ہر ایک کے سامنے بس موت ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اب اس صورت میں سوال ہے تو صرف قبل اور بعد کا مگر واقعۂ کربلا کی صورت یہ تھی کہ جتنا وقت گزرتا تھا امتحان سخت ہوتا جاتا تھا۔ تین دن کی بھوک اور پیاس اور یہ ظاہر ہے کہ دن چڑھنے کے ساتھ تمازتِ آفتاب میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ میدانِ جنگ میں عرب کے ریگستان اور کھلے ہوئے صحرا کی سخت دھوپ میں پیاس کا طوفان ایک ایک دم ترقی کرتا جاتا ہے۔ پھر اس حالت میں دشمنوں کے بار بار حملے، ساتھیوں کی جدائی اور اُن کے دم توڑنے کے ہولناک مناظر۔ ان کے سہنے کے لیے بڑے دل و جگر کی ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں جتنا کسی مجاہد کے جہاد کا موقع دیر میں آئے اُس کے امتحان کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہے۔

حضرت امام حسین اپنے اصحاب کی وفاداری پر کتنا ہی اعتماد رکھتے ہوں مگر وہ اُن پر اتنا بار نہیں ڈال سکتے تھے جتنا اُن کی طاقت برداشت سے باہر ہو۔ آخر بنی ہاشم کی طاقت برداشت اور انصار کی قوتِ تحمل میں کچھ تو فرق ضرور ہونا چاہیے اور دوسرے انسانوں کے صبر و تحمل اور امام کی قوت مقابلہ میں امتیاز لازمی ہے۔

امام حسین نے ترتیب اسی لحاظ سے قائم کی تھی کہ جو اس منزل صبر و تحمل میں ابتدائی درجہ رکھتے ہیں اُن کے لیے یہ مرحلہ جلد آسان ہو جائے اور جن کی قوت برداشت زیادہ سخت امتحان کی متقاضی ہے وہ آخر کے لیے رکھے جائیں اور اس لحاظ سے بنی ہاشم کے ایک ایک بچہ کو جو سخت اور دشوار گزار منزل طے کرنا پڑی وہ اصحاب میں کسی بڑے سے بڑے مجاہد کو بھی طے کرنے کا موقع نہیں ملا اور امام کی منزل امتحان ان سب سے زیادہ سخت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت آسان بات ہوتی اگر حضرت امام حسین سب سے پہلے میدان قربانی میں اپنی جان کا تحفہ پیش کر دیتے۔ اس صورت میں حسین کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی مگر وہ کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑھی ہوئی نہیں سمجھی جاسکتی تھی جس نے کبھی بھی میدان جہاد میں اپنے نفس کی قربانی پیش کی ہو۔

حسین کی قربانی اُس سے زیادہ نہیں سمجھی جاسکتی تھی جتنی بقول نصاریٰ مسیح کی قربانی تھی کہ وہ دین حق کی حمایت میں سولی پر چڑھ گئے۔ یا جیسی سقراط کی قربانی تھی کہ اصول کی حمایت میں جام زہر پی لیا۔ اور پھر حسین کے لیے یہ منزل مشکل ہی کیا تھی جبکہ وہ اس باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے پرواہ نہیں موت میرے اوپر آپڑی ہے یا میں موت پر جا پڑا ہوں اور جس کا قول تھا کہ میں موت سے اُس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے بلکہ وہ اُس گھرانے کے تھے جس کے بچوں کا یہ قول تھا کہ موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اور یہ اس خاندان پر کیا منحصر بلکہ ملک عرب کے ہر بہادر انسان کا اصول زندگی تھا کہ وہ موت کو تلواروں کے سایہ میں مایۂ فخر و ناز سمجھتے تھے۔ پھر اگر حسین میدان جہاد میں جاکر شہید ہو جاتے تو اُن کی قربانی کو کیا خاص امتیاز حاصل تھا۔

حقیقت میں حسین کی قربانی کو جو خاص امتیاز حاصل ہوا وہ تو یہی ہے کہ اُنھوں نے ہر ایک ایسی ہستی کو جو اُن کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتی ہو راہ حق میں اپنے ہاتھ سے نثار کیا۔

اُن کے لیے اپنی زندگی کتنی ہی عزیز ہو مگر برابر کے بھائی۔ کڑیل جوان بیٹے۔ اور یتیم بھتیجوں سے زیادہ ہرگز عزیز نہیں تھی۔ کم از کم بہتر ساتھیوں کا ایک ایک کر کے جدا ہونا۔ بھتیجوں کا آنکھوں کے سامنے دم توڑنا۔ جوان بیٹے کا خاک پر ایڑیاں رگڑنا اور بھائیوں کا عالم جوانی میں موت کی نیند سونا۔ یہ وہ مصائب تھے جن میں سے ہر ایک انسانی نفس کے لیے موت سے زیادہ ناقابل برداشت ہے حسین کا کمال عمل یہ نہیں تھا کہ وقت آنے پر اُنھوں نے اپنی جان راہ خدا میں دے دی بلکہ اُن کے نفس کا کمال

تو یہ تھا کہ انھوں نے یہ سب قربانیاں یکے بعد دیگرے پیش کیں اور جب تک مجبور نہیں ہوگئے یعنی اُن کا دامن بالکل خالی نہیں ہوگیا، اُس وقت تک اپنی جان نہیں دی۔ یہ وہ طاقت برداشت کا خاص درجہ ہے جہاں صرف حسین نظر آتے ہیں اور کوئی نہیں۔

اس طاقت نفس کی توقع کیا حسین سوائے اپنے کسی اور سے کرتے جو اُسے اپنے بعد کے لیے چھوڑ دیتے۔

اس کے علاوہ یہ دیکھیے کہ حسین کا مقصد کربلا کی جنگ سے کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ فریق مخالف کے اسلام اور انسانیت کی آزمائش کر کے دنیا کو دکھلا دیا جائے کہ انھیں اسلامی احساسات و جذبات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اسی کے لیے حسین نے اپنے ساتھ یہ ساز و سامان کیا تھا کہ عبادت گزار، متقی اور پرہیزگار مسلمان اکٹھا کیے۔ خاندان رسول کے بچے، جوان، بوڑھے ہر طرح کے لوگ بلکہ مخدرات عصمت کو بھی اپنے ساتھ لیا جن میں حقیقی نواسیاں رسول اللہ کی موجود تھیں۔

یہ اس لیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان سے زیادہ قابل عزت اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی نیز انسانی فطرت کے مطابق بوڑھے، بچے اور عورتیں یہ وہ ہیں جن پر ہر ایک کو رحم آہی جاتا ہے۔

حسین اپنے ساتھ ان سب کو لائے تھے، یوں سمجھیے کہ یہ وہ کسوٹیاں تھیں جن پر امام حسین فریق مخالف کے اسلام اور انسانیت کو کس کر دنیا کو دکھلانا چاہتے تھے۔

اصول جنگ یہ ہے کہ ہمیشہ ابتدا میں معمولی ہتھیار لائے جاتے ہیں اور جتنا موقع سخت ہوتا جاتا ہے اُتنا اُتنا بڑے اور موثر ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

امام حسین نے بھی ایسا ہی کیا۔ پہلے سب کے میدان میں اصحاب و انصار کو بھیجا جن میں بریر ہمدانی، حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ وغیرہ ایسے بوڑھے، عبادت گزار اور شب زندہ دار جن کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان، جن کے چہروں پر عبادت خدا کے آثار، جن کے لبوں پر ذکر الٰہی کے اوراد۔ یہ اس لیے کہ ایک مسلمان کے واسطے پہلا موقع آزمائش کا یہی ہے کہ اُس کی تلوار کے سامنے ایک مسلمان آجائے۔

ایسے عابد و زاہد مسلمانوں کو امام حسین نے میدان میں بھیج کر یہ دیکھنے کا موقع دیا کہ فریق مخالف کو ان کے خلاف تلوار اٹھانے سے کوئی جھجک پیدا ہوتی ہے؟ وہ یہ سوچ کر رکتے ہیں کہ ہم ایسے ایسے سچے مسلمانوں کو کس طرح قتل کریں؟

جب ایسا نہیں ہوا تو دوسرا سخت حربۂ جنگ کا استعمال ہوا۔ وہ یہ کہ خاندانِ رسول کے جوان اور بچے میدانِ جہاد میں بھیجے گئے۔ ان میں رسول اللہ کی ہو بہو ایک تصویر بھی تھی جس کے میدانِ جنگ میں جاتے وقت حسین نے دعا کی شکل میں یہ بات ظاہر بھی کر دی کہ یہ صورت و سیرت، رفتار و گفتار میں بالکل رسول سے مشابہ ہے۔ کیا مسلمانوں کے اسلامی جذبات کے برانگیختہ ہونے کا اب بھی موقع نہیں تھا مگر تاریخ نے دیکھا کہ دشمنوں کی تلواروں نے ان رسول اللہ کے جگر پاروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ انھوں نے رسول کی تصویر کے پرزے اڑا دیے۔ اور کچھ رسول کا خیال نہ کیا۔

انسانیت نے بھی یہ منظر دیکھ لیا کہ یہ وہ انسان ہیں جنھیں نہ بوڑھے پر رحم آتا ہے، نہ جوان پر اور نہ نابالغ بچوں پر۔

(۱۶) طفلِ شیرخوار

تمام اصحاب و اعزا کی شہادت کے بعد اب معلوم ہوتا تھا کہ حسین کے صبر و برداشت کی انتہا ہو گئی اور دشمن کے تشدد کی بھی حد پوری ہو گئی۔ مگر نہیں حسین جانتے تھے کہ ابھی فریق مخالف کے ترکش میں تشدد کا آخری تیر باقی ہے۔ اور اس کے لیے حسین کو نشانہ ڈھونڈھ کر پیش کرنا ضروری تھا۔ انھیں وہ قربانی پیش کرنا تھی جہاں پہونچ کر ہر مذہب و ملت کا انسان انگشت بدنداں ہو جائے۔ جہاں پہونچ کر ہر انسان گواہی دے کہ مخالف جماعت کو انسانیت سے کوئی علاقہ نہیں۔

وہ شیرخوار بچہ تھا جس کی مدینہ سے روانگی کے کچھ قبل ولادت ہوئی تھی۔ عبد اللہ نام۔ ”علی اصغر“ کے لقب سے مشہور۔ والدہ رباب بنت امرا لقیس بن

عدی کلبی جن کے بطن سے ایک صاحبزادی سکینہ متولد ہوئیں اور ایک یہ شاہزادہ حسین کا یہ آخری حربہ تھا جسے وہ میدان جہاد میں سب سے آخر میں استعمال کر رہے تھے۔ انسانیت لرزہ براندام تھی جب یہ کمسن بچہ حسین کے ہاتھوں پر تھا اور حرملہ بن کاہن اسدی کے تیر نے اس کی گردن کو توڑ کر بچہ کا کام تمام کر دیا۔

اس قربانی سے حسین کے مقصد میں لازوال جان پڑ گئی۔ دشمن کے چہرے پر نمائشی انسانیت کی نقاب کا یہ آخری تار تھا جو معصوم بچہ کی رگ گردن نے توڑ دیا۔ اب ہر دھندھلی نگاہ کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ جماعت انسانیت سے کتنی دور تھی اور حسین ایسا انسان کامل اُن کے ساتھ اتحاد عمل کیسے کر سکتا تھا۔

جہادِ آخر

یہ سب کچھ ہو گیا۔ اصحاب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ عزیز جدا ہو گئے۔ بھتیجے قتل ہوئے۔ بیٹا تلواروں سے ٹکڑے ہوا۔ بھائی تہ تیغ ہوئے مگر امام حسین نے جنگ نہیں کی۔ ظاہری اسباب کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کو بذات خود جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں۔ نبرد آزمائی کا ولولہ ہی نہیں۔ حقیقت میں امام حسین کی جنگ کا لطف جب ہی تھا کہ جب وہ تلوار لے کر حملہ آور ہوتے اور ایک طرف عباس داد شجاعت دیتے ہوتے ایک طرف علی اکبر معرکۂ جنگ میں جوہر دکھاتے ہوتے ایک طرف اصحاب حفاظت کے لیے ساتھ ساتھ ہوتے۔ اس صورت میں جنگ کا منظر دوسرا ہی ہوتا۔ مگر حسین نے سب کو دنیا سے ایک ایک کر کے رخصت ہو جانے دیا اور کسی وقت میں بھی جوش جنگ نہیں پیدا ہوا۔ پھر اب جبکہ دن بھر کی دھوپ سر پر پڑ چکی ساتھیوں اور عزیزوں کے غم نے دل کو شکستہ کر دیا کمر عباس کے مرنے سے ٹوٹ چکی اور آنکھوں کی بصارت علی اکبر کے ساتھ گویا جا چکی۔ یہ ستاون برس کی بڑھاپے کی عمر کا انسان اب اس عالم میں بھلا تلوار کھینچ سکتا ہے اور جنگ کر سکتا ہے ؟ ! مگر حسین کو تو کربلا میں صبر و برداشت کی منزلوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ فرائض

کے حدود دکھلاتا تھے۔ وہ شرع اسلامی کے آئین کے محافظ تھے اور ان ہی آئین و اصول کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے سامنے "سپردگی" آئین اسلام کے خلاف ہے۔ حفاظت خود اختیاری کے لیے دفاع آخری امکان کے درجہ تک ہر انسان کا فرض ہے حسین نے اس فرض کو اس وقت انجام دیا جب کوئی دوسرا انسان اُسے انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اب چھ مہینہ کے بچّہ کو نذر راہ خدا کرنے کے بعد حسین کے پاس کوئی ایسی قربانی نہ تھی جسے وہ سچائی کی بارگاہ میں پیش کرتے۔ اب بس ایک آخری مرحلہ تھا۔ جو اُن کے لیے پہلے ہی بہت آسان تھا انھوں نے اُسے خود اب تک اپنے لیے مشکل سے مشکل تر بنایا تھا اب جبکہ یہ تمام مشکلیں ختم ہو چکی ہیں۔ اب جبکہ منزل عمل کے درمیانی قلعوں کو تمام و کمال فتح کر چکے ہیں۔ ظاہری طور پر اُن سے بڑھ کر اُس وقت دل شکستہ کوئی نہیں مگر حقیقۃً اُن سے بڑھ کر اس وقت کامیابی کے احساس سے بالبدیہ کوئی دوسرا نہیں۔ کسی کے قدم جن راستوں کے تصور سے ڈگمگا سکتے تھے انھیں وہ عملی طور پر استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ طے کیے ہوئے کھڑے تھے۔ اُن سے بڑھ کر اس وقت فتحمندی کا احساس کسی دوسرے کو ہو نہیں سکتا۔ اب اُن کے لیے اپنا سر شمشیر قاتل کے سپرد کر دینا تھا۔ یہ بالکل آسان تھا مگر وہ پیغمبر اسلام کے نواسے اور علی کے بیٹے نہ ہوتے اگر اپنا سر جھکا کے خاموشی سے دشمنوں کو دعوت دیدیتے کہ آؤ یہ سر تسلیم کر لو۔ ہونے والا ہے آخر میں یہی مگر ذرا میدان جنگ کو صفین کا نمونہ بن جانے دو۔ ذرا بھولی ہوئی دنیا کو علی کی یاد آجانے دو۔ زرا نہ دیکھی ہوئی آنکھوں کے سامنے حمزہ و جعفر کی تصویر کھنچ جانے دو ——

آج ہی تو موقع آیا ہے کہ حسین اپنے نانا کے اس قول کو سچ کر دکھائیں کہ حسین کو میری جرأت اور سخاوت میراث میں ملی ہے۔ سخاوت کے مظاہرے بہت ہوئے تھے مگر جرأت کے عملی اظہار کا وقت اب آیا ہے —— اور سچ پوچھیے تو رسول اللہ کو میدان جنگ میں بھی تلوار لے کر خود جہاد کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ ساتھ والے موجود رہے حسین بھی جب تک ایک شخص بھی ساتھ موجود تھا اپنے نانا رسول اللہ

کی بالکل تصویر بنے ہوئے تلوار کو نیام میں رکھے خاموش رہے۔ مگر اب جبکہ کوئی نہیں رہا تو حسین کو دکھلانے کی ضرورت تھی کہ اگر موقع پڑتا تو میرے نانا رسول اللہ بھی کس شجاعت و جرأت کا مرقع کھینچتے۔

تاریخ گواہ ہے کہ وہ غمزدہ، دل شکستہ، پسر مردہ، تشنہ و گرسنہ انسان جب تلوار لے کر فوج پر حملہ آور ہوا تو گزشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہو گئے اور انسانی حافظہ نے قیامت تک اس شجاعت و جرأت کی تصویر محفوظ کر لی۔

مگر [1] "اس غیر مساوی جنگ کا نتیجہ اب قریب تھا حسین کی فوق البشر ہمت اور لاثانی شجاعت ہزاروں کو جو ان کے سامنے صف آرا تھے فنا نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ یکہ و تنہا ہیں۔ خستہ و مجروح تاہم انھوں نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں وہ دھاک بٹھا دی تھی کہ ان میں سے کوئی تنہا ان پر حملہ کی جسارت نہ کرتا تھا۔ ان کے اس تامل کو دیکھ کر شمر نے چلا کر کہا "خدا تم سے سمجھے۔ کھڑے ہوئے کیا دیکھ رہے ہو۔ انھیں قتل کرو۔ خدا کرے تمھاری مائیں تمھیں روئیں"۔ یوں مجبور کرنے کی وجہ سے لوگ حسین پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے"۔

[2] "تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگا۔ آخر سیکڑوں زخم کھا کر آپ گھوڑے سے زمین پر گرے"۔

(۱۷) عبداللہ بن الحسن

حضرت امام حسن مجتبیٰ کے فرزند۔ واقعہ کربلا میں قاسم سے بھی کم عمر۔ والدہ ام الرباب بنت امرا القیس جو جناب رباب مادر سکینہ و عبداللہ الرضیع کی بہن تھیں۔

جب امام حسین زخموں سے چور ہو گئے تھے اور زمین پر تشریف لا چکے تھے اس وقت یہ بچہ خیمہ سے برآمد ہوا اور امام کی طرف چلا۔ جناب زینب نے اسے روکنا چاہا مگر

---

[1] ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا) [2] پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

بچہ کسی طرح نہ رکا اور دوڑتا ہوا امام کے پاس گیا۔ اس وقت بحر بن کعب بن عبید اللہ
تیمی امام پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا۔ بچہ نے کہا "اے زن خبیثہ کے بیٹے! کیا تو میرے
چچا کو قتل کرے گا؟" اس نے تلوار لگائی۔ بچہ نے اسے ہاتھ پر روکا۔ ہاتھ جلد کے آخری
حصہ تک کٹ گیا اور لٹکنے لگا۔ بچہ نے آواز دی (ارے میری ماں) امام حسین نے بچہ کو
اپنے سینہ سے لگا لیا اور کہا "اے میرے بھتیجے صبر کر اس مصیبت پر اور اس کے بہتر نتیجہ کا
انتظار کر، تو بھی اپنے بزرگوں کے پاس، رسول اللہ اور علی بن ابیطالب اور حمزہ اور
جعفر اور حسن مجتبیٰ کی خدمت میں پہونچ جائے گا۔" اسی حالت میں حرملہ نے چلہ کمان میں
تیر جوڑ کر بچہ کی طرف روانہ کیا۔ اسی سے عبد اللہ کی شہادت ہوئی۔

(۱۸) امام کی شہادت

ابو حنیفہ دینوری کا "اخبار الطوال" میں بیان ہے کہ دیر تک حضرت امام حسین
زمین پر خستہ و مجروح حالت میں باقی رہے اور اب کوئی بھی آپ کے قتل کرنے میں
انتظار کی ضرورت نہ تھی مگر ہر قبیلہ اسے دوسرے کے حوالہ کرتا تھا اور خود اس بڑے
جرم کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسے بھی افراد ہوا کرتے ہیں جن کا ضمیر بالکل مردہ
ہو گیا ہو۔ آخر زرعہ بن شریک کی تلوار، سنان بن انس کا نیزہ اور پھر شمر بن
ذی الجوشن کا خنجر تھا جس نے اس مجسمۂ حق کی زندگی کا خاتمہ کیا۔ سچائی کی گردن قلم
ہوئی اور "شہید انسانیت" کا سر نیزہ کی نوک پر بلند ہو گیا۔

سنہ ٦١ ہجری کے محرم کی دسویں تاریخ جمعہ یا شنبہ کا دن تھا جب اس جہاد کی
یہ خونریز منزل اپنی انتہا کو پہونچی اور انسانی تاریخ کا ورق اس خون ناحق کے
چھینٹوں سے ہمیشہ کے لیے لالہ زار بن گیا۔

(چھٹا باب)

شہادت کے بعد

عہ "حسین مظلوم کی شہادت ہی پر مظالم کا خاتمہ نہیں ہوتا ہے بلکہ شہید ظلم کے جسم پر جو لباس تھا وہ بھی اُتار لیا گیا"

اسحق بن حیوہ حضرمی نے قمیص لے لی۔ بحر بن کعب نے زیر جامہ۔ اخنس بن مرثد نے عمامہ اور بنی دارم کے ایک شخص نے تلوار لے لی (ارشاد شیخ مفید ص ۲۷۱) عبدالرحمن بن محمد بن اشعث نے قطیفہ (چادر یمانی) لی اور اس لیے وہ کوفہ میں "عبدالرحمن قطیفہ" کے نام سے مشہور ہو گیا (کتاب البلدان ابن فقیہ مطبوعہ لیڈن ص ۱۸۲)

عہ "اس کے بعد یہ اشقیا خیام اہلبیت پر چھاپہ مارتے ہیں اور تمام سازوسامان لوٹ لیتے ہیں حتیٰ کہ مخدرات عصمت کے زیورات اور چادریں بھی چھین لیتے ہیں (تاریخ الطبری جزء ثانی من الجملۃ الثانیہ ص ۳۶۶ مطبوعہ لیڈن و تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ)

اس کے بعد یہ بدبخت خیموں میں آگ لگا دیتے ہیں (روضۃ الصفا جلد سوم ص ۱۸۱) پر بھی ان کو چین نہیں آتا بلکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے شہید راہ خدا کے جسم کو روند کر پامال کر دیتے ہیں (تاریخ الطبری جزء ثانی جملہ ثانیہ ص ۳۶۸)"

اس ظلم کا تاکیدی حکم ابن زیاد کے آخری خط میں موجود تھا اس لیے اس کی تعمیل ہونا درایۃً یقینی ہے مگر یہ ظلم اتنا شدید تھا کہ اُس بے رحم فوج میں سے ہر شخص اس کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا اس لیے عمر سعد نے تمام فوج کے سامنے یہ آواز دی کہ کون وہ ہے جو لاش حسین کو پامال کرنے کے لیے تیار ہو؟ یہ سُن کر دس آدمی آمادہ ہوئے جن میں سے اسحق بن حیوہ اور اخنس بن مرثد کا نام خاص طور سے مذکور ہے۔ انھوں نے

عہ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

اپنے گھوڑوں سے لاش مطہر کو پامال کردیا۔ سر امام حسین کا تن سے جدا کر کے اسی وقت خولی بن یزید اصبحی کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا گیا اور باقی شہدا کے سر قطع کر کے اس کے بعد شمر بن ذی الجوشن اور قیس بن اشعث اور عمر بن الحجاج کے ساتھ روانہ کئے گئے (ارشاد صہ ۲۷۳) عہ ''اب رات کی تاریکی صحرا میں چھا جاتی ہے۔ حسین کے پسماندگان میں صرف ایک بیمار بیٹا ہے (زین العابدین) جس کی زندگی شدت بیماری سے قریب ختم معلوم ہوتی ہے اور پردہ نشین خواتین اور چھوٹے بچے ہیں۔ کیا اس وقت ان کے رنج و حسرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کے دلی تاثرات کو لفظوں میں محدود بنایا جا سکتا ہے؟ کیا ایسے اشخاص کا مشغلہ سوائے آہ و بکا کے کچھ اور ہو سکتا ہے؟ مگر کیا کہنا اُن کے استقلال کا۔ عہ ''عصر کے وقت یتیم ہونے والا بیمار رات بھر عبادت خدا میں گزار دیتا ہے۔ وہ سجدۂ معبود میں خاک پر سر رکھ دیتا ہے اور ایک ہی سجدہ میں پوری رات ختم کرتا ہے اور سجدہ میں یہ کلمات زبان پر ہوتے ہیں لا الہ الا اللہ حقا حقا لا الہ الا اللہ ایمانا وصدقا لا الہ الا اللہ تعبدا ورقا یوں ہی صبح ہو جاتی ہے (ذخیرۃ المآل فی شرح عقد اللآلی۔ علامہ شہاب الدین احمد بن عبد القادر العجیلی الحفظی الشافعی)

۱۱ محرم کو عمر بن سعد نے اپنے کشتوں کو جمع کیا اور اُن پر نماز پڑھ کر دفن کیا (تاریخ الطبری جزو ثانی حصہ ثانیہ صہ ۳۶۹ طبع لیدن و تاریخ الکامل ابن اثیر) لیکن شہدا کی لاشیں اسی طرح بے گور و کفن پڑی رہیں زوال آفتاب کے بعد عمر ابن سعد نے کوفہ کا ارادہ کیا۔ لیکن اس موقع پر بھی اُس نے یہ ظلم کیا کہ خاندان رسالت کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور نبی زادیوں کو گرفتار کر کے مقتل شہدا کی طرف سے گیا، جہاں پامال شدہ لاشہائے شہدا تمازت آفتاب میں بے غسل و کفن پڑی تھیں۔ اس جگر دوز منظر کو جب ان ستم زدوں نے دیکھا تو فریاد کرنے لگیں۔ جناب زینب نے اپنے نانا رسالتمآب کو مخاطب کر کے صدا بلند کی ''اے نانا آپ پر آسمانی فرشتوں نے نماز پڑھی تھی لیکن آپ کا فرزند حسین ریگ گرم پر بے غسل و کفن آغشتہ بخوں ہے جس کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں

عہ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

نانا آپ کی اولاد قتل کر دی گئی جن کی لاشوں پر ہوا گرد اڑا رہی ہے اور آپ کی بیٹیاں قیدی بنائی گئی ہیں (تاریخ الطبری جزو ثانی حملہ ثانیہ صنم ۳۷) یتیموں اور بیواؤں کا یہ لٹا ہوا قافلہ گریہ وزاری کرتا ہوا کوفہ چلا جاتا ہے۔ شہدا کی لاشیں بے غسل و کفن پڑی رہ جاتی ہیں"

کتنا عبرتناک تھا وہ موقع کہ پیغمبر اسلام جنھوں نے مسلمانوں کو احترام میت اور کفن و دفن کے احکام بتلائے اُن ہی کا عزیز نواسا اور خاندان کے دوسرے مقدس افراد اور سچے مسلمانوں کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ دی گئیں اور اُن کے ساتھ وہ سلوک بھی روا نہ رکھا گیا جو ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ چاہے وہ دوسرے فرقہ کا ہو لازم ہے۔ یہ منظر ایسا تھا جسے کوئی حساس انسان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ زہیر بن القین نے راستے سے اپنی زوجہ کو طلاق دیکر اُس کے میکے میں بھجوا دیا تھا زہیر بن قین امام کی نصرت میں شہید ہو گئے ان کی زوجہ کو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے غلام کو ایک کفن سپرد کیا اور کہا کہ جاؤ اور اپنے آقا کو یہ کفن دیدو۔ جب غلام گیا تو اُس نے دیکھا کہ حسین مظلوم کی لاش بے غسل و کفن پڑی ہے یہ دیکھا تو اُس نے کہا کہ یہ کیا غضب ہے کہ میں اپنے آقا کو کفن دوں اور فرزند رسول کی لاش کو ایسے ہی چھوڑ دوں بخدا ایسا کبھی نہ ہوگا۔ چنانچہ اُس نے وہ کفن امام مظلوم کو دے دیا۔ اور دوسرا کفن لاکر اپنے آقا کو پہنایا (تذکرہ خواص الامہ علامہ سبط ابن جوزی)

دفن کے متعلق مشہور روایت یہ ہے کہ ابن سعد کے چلے جانے کے بعد قبیلہ بنی اسد نے جو غاضریہ میں رہتے تھے آکر شہداء پر نماز جنازہ پڑھائی اور انھیں دفن کیا (ارشاد ۲۴۳)

عـ۵ علامہ حسن بن علی طبری دفن شہداء کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ فتح خیبر کے بعد کچھ یہودی جن میں ابراہیم اور رویل نامی یہودی بھی تھے بھاگ کر سرزمین عراق میں صحرائے کربلا کی قریبی آبادی میں آباد ہو گئے تھے۔ یزیدی فوج کے چلے جانے کے بعد ان لوگوں نے شب کو لاشہائے شہداء سے ایک نور کو تابندہ دیکھا

عـ۵ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

اس کرامت کے مشاہدہ کے بعد ان لوگوں نے وہاں کے باشندوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہ لاشیں اولیائے خدا کی معلوم ہوتی ہیں۔ آؤ ہم لوگ ان کو دفن کرکے سعادت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں نے شہدا کو دفن کیا (کتاب کامل السقیفہ معروف بہ کامل بہائی باب ۲۸)"

حضرت امام حسین کو ایک قبر میں جہاں اس وقت ضریح موجود ہے اور حضرت کے پائین پا حضرت علی اکبر کو دفن کیا اور دوسرے اہلبیت و اصحاب کے لیے ایک بڑا گڑھا پائین پا کی طرف کھود کر سب کو یکجا دفن کردیا مگر جناب عباس ساحل فرات کے قریب غاضریہ کے راستے میں شہید ہوئے تھے اس لیے اُن کو وہیں قبر بنا کر دفن کردیا گیا جہاں آپ کا روضہ موجود ہے۔ دوسرے اہلبیت اور اصحاب کے قبور کو تعیین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ کس جگہ پر ہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ حضرت امام حسین کے گرد و پیش ہی دفن ہوئے تھے اندر یہ حائر کا احاطہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے (ارشاد شیخ مفید صـ ۲۷۹)

اُس طرف کی سُنیے کہ عـ ۵ وہ شہر کوفہ جو قبۂ اسلام سمجھا جاتا تھا جس کی آبادی و رونق میں خلیفہ دوم عمر بن خطاب نے کافی اہتمام کیا تھا، مخصوص مخصوص قبائل عرب کو آباد کرکے اُس کی آبادی کو مخصوص نوعیت کے ساتھ بڑھایا گیا تھا، جہاں حضرت زینب و ام کلثوم بحیثیت شاہزادی کے کبھی قیام فرما چکی تھیں۔ آج اسی تاریخی شہر میں عجیب چہل پہل ہے، خوشی و مسرت کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ بازار سجائے گئے ہیں۔ ہزاروں تماشائیوں کا ہجوم ہے (مفتاح النجا محمد معتمد بدخشی) کیوں؟ اس لیے کہ حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کے امیر پر ایک خارجی نے خروج کیا تھا، اُس کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کو کامیابی ہوئی ہے، آج اُسی کے اہل و عیال گرفتار کرکے کوفہ لائے جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ مظلوموں کا قافلہ کوفہ میں داخل ہو،

عـ ۵ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

حاکم کا یہ حکم ہو چکا ہے کہ اس موقع پر کوفہ میں کوئی شخص سلاح جنگ کے ساتھ نہ نکلے، کوئی شخص ہتھیار لگائے ہوئے کوفہ میں دکھلائی نہ دے۔ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے بعد جگہ جگہ پر کسی خاص دہشت کے سبب سے سوار اور پیادوں کی ایک بڑی تعداد (جن کی تعداد دس ہزار بتلائی گئی ہے) مقرر کر دی گئی ہے (روضۃ الاحباب) بازار کوفہ میں ایک اژدہام ہے بعضوں کو اصل واقعہ کی خبر ہے اور بعض بے خبر سرکاری رپورٹ پر اعتبار کرتے ہوئے یہی سمجھ رہے ہیں کہ مخالفین اسلام کی جماعت پسپا ہوئی اور ان کے اہل و عیال گرفتار ہوئے۔ سہل شہرزوری حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر اسی وقت کوفہ میں پہونچے۔ دیکھا کہ بازار سجا ہوا ہے اور لوگوں کے چہروں پر مسرت کے آثار ہیں اس مجمع میں کچھ ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کے چہرے اترے ہوئے ہیں انھوں نے ایک بڈھے سے حال دریافت کیا وہ ان کو ایک گوشہ میں لے گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری کرتے ہوئے خاندان رسالت کی تباہی کی خبر اس مرثیہ کو پڑھ کر دی:۔

الم تران الشمس اضحت مریضۃ لقتل الحسین والبلاد ضمحلت

وکانوا غیاثاثم اضحوا رزیۃ لقد عظمت تلک الرزایا وجلت

وان قتیل الطف من آل ھاشم اذل رقاب المسلمین وذلت

"کیا تم نے دیکھا کہ قتل حسین سے سورج کو گہن لگ گیا اور تمام بلاد تباہی میں پڑ گئے ہائے خاندان رسالت تو لوگوں کے لیے فریاد رس تھا لیکن آج وہ خود مبتلائے مصیبت ہو گئے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ مصیبتیں بڑی عظیم اور سخت ہیں۔ تحقیق کہ شہید کربلا کی شہادت نے مسلمانوں کی گردنوں میں رسوائی و ذلت کے طوق کو ڈال دیا اور در اصل وہ ذلیل بھی ہو گئے"

ابھی یہ مرثیہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ فتح کے باجوں کی آوازیں آنے لگیں اور اہل بیت رسول کا تباہ حال قافلہ بازار میں داخل ہو گیا۔ آگے آگے نیزوں پر شہداء کے سر تھے اور پیچھے اسرائے آل محمد تھے۔ ایک عورت جو اس منظر کو دیکھنے کے لیے اپنے کوٹھے پر بیٹھی ہوئی تھی قیدیوں سے پوچھنے لگی "تم کس قوم و قبیلہ کے قیدی ہو" جواب دیا گیا کہ ہم اسرائے آل محمد ہیں یہ سننا تھا کہ ایک کہرام بپا ہو گیا۔ گریہ و زاری کے شور سے کان پڑی آواز

نہیں سنائی دیتی تھی۔

سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہلبیت رسول کے لیے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حسین کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہونچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔

اگر چشم حقیقت بیں سے نظر کرو تو نیزہ پر سر حسین جس کی پیشانی پر سجدہ معبود کا نشان پڑا ہے، چہرہ سے نور ساطع ہے۔ دوسری طرف مخدرات عصمت جو ان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنع سے محروم ہو جانے کے بعد غیرت و حیا کی مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر، جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں، طہارت و عفت کے اندر ملبوس ہیں۔ یہ چیزیں تھیں جنھوں نے سچائی کے پیکر میں روح پھونکدی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔

اس موقع پر جبکہ قیدیوں کا قافلہ کوفہ سے گزر رہا تھا اس صورت میں کہ جس سے پتھر کا دل پگھل جائے اور زنان کوفہ نے فطرۃً بے چین ہو کر رونا شروع کیا تو سید سجاد نے ضعف و مرض کے باعث بھرائی ہوئی آواز میں کہا " تم ہی لوگوں نے تو ہمارا خون بہایا، اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر روتی ہیں؟ ہمارا تمھارا فیصلہ روز جزا خدا کے سپرد ہے " پھر ذرا واقعی کی درد انگیزی بڑھی اور مرد و زن ہم آواز ہو کر رونے لگے۔ امام نے فرمایا " تم لوگ ہمارے لیے روتے اور نوحہ کرتے ہو، پھر آخر ہم کو قتل کس نے کیا ہے؟ " بشر بن خزیم اسدی ناقل ہے کہ اس موقع پر زینب بنت علی نے مجمع کی طرف رخ کیا اور تقریر شروع کی۔ میں نے آج تک کسی پردہ نشین عورت کو اتنی پُر زور تقریر کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔ گویا علی بن ابیطالب کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔

انھوں نے لوگوں کی طرف سکوت کا اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی انھوں نے کہا " حمد کا مستحق خدا ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفٰےؐ اور ان کی عترت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اے اہل کوفہ، اے اہل مکر و دغا تم روتے ہو؟ خدا کرے ان آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور ان نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون نہ ہونے پائے

(آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ فرمایا)

کیا تم سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ بے شک تم اسی کے مستحق ہو جتنا ممکن ہو زیادہ روؤ اور ہنسی کو کم آنے دو۔ تم سمجھے بھی کہ رسولِ خدا کے جگر کو کیسے تم نے چاک کر دیا اور اُن کے گھرانے کی کیسی عزیز خواتین کو تم نے بے پردہ کیا اور اُن کا کیسا خون تم نے زمین پر بہایا اور اُن کی کتنی بڑی ہتکِ حرمت تم نے کی؟ کیا تم کو اس بات پر تعجب ہے، کہ آسمان سے خون برسا؟ یہ تو کچھ نہیں ہے آخرت کا عذاب بہت سخت ہے اور اُس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا اس چند روزہ مہلت کے زمانہ میں مغرور نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ نہ موقع نکلنے کا خوف ہے۔ وہ یقیناً تمہارے لیے وقت کا منتظر رہے گا۔"

راوی ناقل ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا بے ہوش و حواس دانتوں میں انگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے اور ایک بڈھے کو میں نے روتے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہا تھا کہ "میرے ماں باپ تم لوگوں پر نثار۔ تمہارے بڈھے تمام دنیا کے بوڑھوں سے بہتر اور تمہارے جوان تمام جوانوں سے بہتر اور تمہاری عورتیں تمام عورتوں میں افضل اور تمہاری نسل تمام جہان کی نسل سے بہتر ہے نہ وہ کبھی ذلیل ہو سکتی ہے نہ رسوا۔"

عـــہ اس کے بعد فاطمہ بنت الحسین، حضرت ام کلثوم اور جناب سید سجاد نے خطبے ارشاد فرمائے جن سے اہلِ کوفہ کی آنکھوں کے پردے ہٹ گئے۔ حکومت اپنے مقصد میں ناکامیاب رہی اور بے بس اور مجبور قیدیوں نے حکومت کے خلاف عام پبلک کے سامنے نہایت زور و شور کے ساتھ جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

یہ انقلاب پیدا کرنے والی تقریریں جو بازار کوفہ میں گونجیں ان کو کوئی طاقت روک نہ سکی ایک دوسرے سے نقل ہوتی ہوئی دنیائے اسلام کے ایک سرے سے لیکر دوسرے تک پہونچ گئیں جن کا اثر یہ ہوا کہ عوام میں حکومت کے خلاف جذبۂ تنفر پیدا ہونے لگا۔

خود حسین کے قاتلوں میں سے ایک جب سرِ حسین لے کر ابن زیاد کے پاس آیا تو اُس کی زبان پر حسین بن علی اور اُن کے خاندان کی تعریف تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

عـــہ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

املأ رکابی فضۃ و ذھبا ۔ فقد قتلت الملک المحجبا
ومن یصلّی القبلتین فی الصبا ۔ وخیرھم اذ یذکرون النسبا
قتلت خیر الناس اما و ابا

(یعنی) "میرے بار کو طلا و نقرہ سے بھر دیجئے کیونکہ میں نے (آپ کی خاطر سے) ایک بڑے ذی عزت بادشاہ کو قتل کیا ہے اور اُسے جو بچپنے میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھ چکا تھا اور نسب میں دنیا بھر سے بہتر تھا۔ میں نے اُسے قتل کیا جس کے ماں باپ دنیا میں سب سے بہتر تھے" یہ اُس کے ضمیر کی آواز تھی جو فطری طور پر اُس کے دہن سے بلند ہو رہی تھی اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اُس کے الفاظ سیاست بنی امیہ کے خلاف ہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ابن زیاد غضبناک ہوا اور کہا اگر تو انھیں ایسا ہی سمجھتا تھا تو پھر قتل کیوں کیا؟ بخدا تجھے مجھ سے کوئی اچھا سلوک نہ پہونچے گا اور میں تجھے بھی ان ہی کے پاس بھیجدوں گا چنانچہ اُسے قتل کرا دیا (صواعق محرقہ ص۱۱۸ مطبوعہ مصر)

ع۵ "ابن زیاد نے حکم دیا کہ حسین کا سر نوک نیزہ پر بلند کر کے تمام شہر میں گھمایا جائے (تاریخ الطبری و کامل ابن اثیر) خیال تھا کہ اس سے عام وحشت و خوف کی کیفیت پیدا ہو جائے گی لیکن برخلاف اس کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ تیزی کے ساتھ سلگنے لگی۔ اس کے بعد دربار میں قیدیوں کی حاضری کا حکم دیا گیا۔ آج کوفہ کا دربار بہت زیادہ آراستہ ہے۔ دربار بھی عام ہے۔ ہر شخص بغیر روک ٹوک کے آ سکتا ہے بڑے بڑے لوگ دربار میں موجود ہیں تعجب تو یہ ہے کہ رسول کے صحبت یافتہ بھی نظر آ رہے ہیں۔ ایک جانب خاندان رسالت مقید کھڑا ہے اور امیر تخت حکومت پر بیٹھا ہوا ہے اور حسین کے دندان مبارک کو چھڑی سے ضرب لگا رہا ہے زید بن ارقم صحابی رسول نے جب ابن زیاد کو یہ بے ادبی کرتے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہ لب و دندان ہیں جن کے بوسے رسول اللہ لیا کرتے تھے۔ یہ کہہ کر رونے لگے ابن زیاد نے ان کی صحابیت کا احترام کرتے ہوئے یہ کہکر اُن کو ٹال دیا کہ یہ پیر خرف ہیں، ان کی عقل جاتی رہی ہے"

ع۵ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

زید بن ارقم دربار سے نکل آئے اور لوگوں سے کہنے لگے "مرومان عرب" آج سے تم انسانوں کے غلام ہوگئے۔ فرزند فاطمہ کو تم نے قتل کیا اور پسر مرجانہ کو تم نے اپنا حاکم بنایا پس وہ تمہارے نیکوں کو قتل کرتا ہے اور تمہارے اشرار کو اپنا غلام بناتا ہے۔ تم اپنی ذلت اور رسوائی پر راضی ہوگئے۔ پھٹکار ہو اس پر جو ذلت پر راضی ہو جائے (الطبری ج ۲ حصہ ثانیہ صد ۲۷۱ طبع لیدن)" ترمذی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ انس بن مالک موجود تھے وہ رونے لگے اور کہنے لگے کہ یہ سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ تھے (صواعق محرقہ ص ۱۱۹)

علہ "مدائنی کی روایت ہے کہ جابر نامی ایک شخص جو قبیلۂ بکر بن وائل سے تھا ابن زیاد کے دربار میں موجود تھا۔ اس نے ان حالات کے بعد یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر دس آدمی بھی حکومت کے خلاف خروج کرینگے تو ان میں سے ایک میں ہونگا چنانچہ مختار کے ساتھ یہ شخص تھا اور بڑے اس کے ہاتھ سے ابن زیاد قتل بھی ہوا"

کتنا عبرتناک تھا وہ موقع جب ابن زیاد تخت حکومت پر فتح وظفر کے نشہ میں سرشار بیٹھا تھا۔ تمام ارکان دولت، روسائے قبائل، عمال حکومت حاضر اور سامنے عام ملازمین بارگاہ صف در صف دم بخود ایستادہ تھے۔ دنیا اپنی تمام ظاہری شان وشوکت کے ساتھ مجسم صورت میں موجود تھی اور خاندان رسالت کی مقدس خواتین اسیروں کی صورت میں کھڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اہلبیت بہت بیش قیمت کپڑے پہنتے ہی نہ تھے مگر اس موقع پر حضرت علی کی بڑی بیٹی جناب زینب نے وہ عام کپڑے کہ جیسے آپ پہنا کرتی تھیں ان کو بھی نہیں پہنا تھا بلکہ بہت پست اور معمولی درجے کے کپڑے آپ نے پہنے تھے اور لباس میں بالکل تبدیلی کرلی تھی اور کنیزوں نے گرد آپ کے حلقہ باندھ لیا تھا۔ یہ ایک عنوان تھا پردہ کا جسے آپ نے اس وقت اختیار کیا تھا۔

علہ "ابن زیاد کی کمینہ نفسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بلند ہمت فاتحین کی صورت سے دشمن پر ظفر پانے کے بعد معاف کردے یا باوقار افراد کے طریقہ پر سکوت سے کام لے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی فتح وظفر کا زبانی اظہار کرکے ان دکھے ہوئے

علہ مولانا سبط حسن صاحب ہنسوی علہ علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطا نجفی۔

دلوں کو اور دکھائے عظمت و جلال چھپائے سے نہیں چھپتے۔ اُس نے حضرت زینب کو قرائن سے پہچانا اور ضرور پہچانا لیکن صرف بخیالِ خود ہتک حرمت کے لیے (جس کا نتیجہ خود اُس کی سُبکی اور ہتک کی صورت میں ظاہر ہوا) پوچھنے لگا کہ یہ کون عورت ہے جو لوگوں کی نظر سے بچ کر دور بیٹھی ہے؟ کسی نے کہا کہ یہ زینب دختر علی ہیں۔ اب ابن زیاد کو اپنے فتح و ظفر کے مظاہرہ اور زینب کی شماتت اور دل آزاری کا موقع پیدا ہو گیا۔ اُس نے کہا "کیوں زینب! دیکھا خدا نے تمہارے بھائی اور اُن کے باغی ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

اس سوال کا جواب ایک ستم رسیدہ عورت جو قیدی کی صورت میں ہو کیا دے سکتی ہے؟ کیا اُس کے دل میں اتنی طاقت، زبان میں اتنی قوت باقی رہ سکتی ہے کہ وہ جواب سنجیدگی کے ساتھ دے لیکن ذرا ان لفظوں میں غور کرو جو زینب کبریٰ نے جواب کی صورت میں کہیں۔ ان میں کہیں اضطراب، خوف، بے صبری یا ناسمجھی کی جھلک ہے؟ فرماتی ہیں "میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر قتل ہونا خط تقدیر نے لکھ دیا تھا وہ اپنے پیروں سے اپنے مقتل کی طرف گئے اور وہ دن دور نہیں کہ جب خدا کے سامنے تیرا اور اُن کا مقابلہ ہوگا اور تجھ کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ اُس وقت دیکھنا کہ فتح کس کی ہے؟"

زینب کے جملے معانی کا دفتر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں فلسفۂ مظلومیت کے تمام نکات و اسرار ان چند کلموں میں مضمر ہیں اور عقیدۂ معاد اور دار آخرت کی تبلیغ ان کا مخصوص جوہر ہے۔

ابن زیاد کے لیے سنجیدہ بحث کا دروازہ بند تھا۔ اس کی زبان رُک چکی تھی۔ اُس کی تمام ظاہری شان و شوکت، دولت و ثروت ان الفاظ کا جواب دینے کے لیے کام آنے والی نہیں تھی۔ اُس کو سب و شتم اور عامیانہ گفتگو کے سوا چارہ کار نظر نہ آیا اُس نے کہا "خدا کا شکر کہ تم لوگوں کو قتل کیا۔ تمہیں رسوا کیا اور تمہاری باتوں کا جھوٹ ظاہر کر دیا"

اس کے جواب میں کیا جناب زینب بھی ایسی ہی غیر سنجیدہ اور انسانیت سے گری ہوئی تقریر کرتیں؟ لا واللہ؟ زینب کی شان اس سے ارفع و اجل تھی۔ وہ اس موقع پر

باطل کا مقابلہ حق سے، لغو باتوں کا جواب دلیل و برہان سے دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے کتنی شاندار لفظوں میں جواب دیا جن پر بلاغت نثار ہو رہی ہے۔ "حمد ہے اُس خدا کے لیے جس نے ہم کو عزت دی محمد مصطفےٰ کے ساتھ اور ہمیں پاک و پاکیزہ قرار دیا اُس طرح جو حق ہے پاکیزہ قرار دینے کا۔ نہ وہ کہ جو تو کہتا ہے۔ رسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق ہو اور جھوٹ اُس کا کھلتا ہے جس کو سچائی کا لحاظ نہ ہو اور وہ ہم نہیں ہیں، ہمارا غیر ہے"

اگر غیرت ہوتی تو ابن زیاد کو منفعل ہونا چاہیے تھا مگر وہاں اقتدار کا نشہ اور سلطنت کا غرور تھا۔ خواہ مخواہ اُسے جناب زینب کے دل دکھانے کا خیال پیدا ہوا اور کہنے لگا "اچھا تم نے دیکھا خدا نے تمھارے گھرانے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" اس طنزیہ فقرہ کے اثر کو کسی عورت کے دل سے پوچھیے اور اس کے بعد جناب زینب کا اطمینانی جواب دیکھیے۔ فرمایا "کیا سلوک کیا خدا نے! اُن کے لیے یہی صورت مقرر تھی کہ وہ قتل ہوں۔ اسی بنا پر وہ اپنی ابدی خوابگاہوں کی طرف اپنے پیروں سے گئے اور عنقریب خدا تیرا اور اُن کا سامنا کریگا تو وہاں حجت تمام ہو جائے گی اور بحث طے پا جائے گی"

بس گفتگو میں شکست کی علامت ہی غصہ کا آنا۔ ابن زیاد کو غصہ آگیا اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ارادہ کیا جس کی بنا پر عمرو بن حریث نے کہا "امیر یہ عورت ہیں اور کہیں عورت کی بھی بات کی گرفت کی جاتی ہے اور اُس کو سزا دی جاتی ہے؟ عورت کی نہ کسی بات کی سزا ہے اور نہ کسی غلطی پر اُسے ملامت کی جاسکتی ہے" مگر ابن زیاد کا دل نہیں مانتا۔ اُس نے جناب زینب کی طرف متوجہ ہو کر کہا "خدا نے میرے دل کی مراد پوری کر دی تمھارے سرکش بھائی اور تمھارے گھرانے کے دوسرے نافرمان اور باغی اشخاص سے"

جناب زینب کے دل پر چوٹ لگی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اُنھوں نے جواب دیا "ہاں بے شک تو نے میرے جوانوں کو قتل کر ڈالا، میرے عزیزوں کا خاتمہ کر دیا میری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور میری جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اگر تیری مراد اس سے بر آگئی ہے تو بے شک اس سے خوش ہو لے"

ابن زیاد نے کہا "یہ بڑی قافیہ باز عورت ہیں اور تمھارے باپ بھی تو زینب

شاعر اور قافیہ باز تھے۔"

یہ فصاحت و بلاغت کا اعتراف ہے جو اس صورت میں کیا جا رہا ہے۔ جناب زینب نے پھر سکوت نہیں کیا۔ فرمایا "بھلا عورت کو قافیہ بندی اور شاعری سے کیا تعلق اور پھر میں تو اس عالم میں ہوں کہ مجھے قافیہ بندی کا ہوش کہاں لیکن دل کی آواز تھی جو بے دہن سے نکل گئی۔"

اس کے بعد بیمار قیدی سید سجاد کا تعارف ابن زیاد سے کرایا گیا۔ اُس نے کہا تمھارا کیا نام ہے۔ امام نے فرمایا "علی بن الحسین" وہ کہنے لگا "کیا اللہ نے علی بن حسین کو قتل نہیں کیا؟" امام نے جواب دیا "وہ میرے ایک بھائی علی تھے جنھیں لوگوں نے قتل کر دیا۔" جاہل سرکش کہنے لگا "نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا"۔ امام نے یہ آیت پڑھی کہ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا" یعنی "اللہ ہی موت کے وقت قبض روح کرتا ہے" اس اعتبار سے تمھارا قول درست ہو سکتا ہے" یہ سننا تھا کہ ابن زیاد کو غصہ آ گیا اور کہا "اچھا تم میں اب بھی میرے جواب دینے اور میری بات کو رد کرنے کی جرأت ہے؟ لے جاؤ ان کو قتل کرو" یہ سننا تھا کہ حضرت زینب دوڑ کر اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا مجھے اس کے ساتھ قتل کیا جائے۔ سید سجاد نے کہا پھوپھی چھوڑ دیجیے اور ابن زیاد کا جواب دینے دیجیے"۔

حقیقت میں ظالم حاکم یہ سمجھا تھا کہ علی بن الحسین موت سے ڈرینگے اس لیے حضرت کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا عہ "لیکن موت پر فتح پانے والے فرزند حسین نے نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ فرمایا کہ

"ابن زیاد تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟! کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت ہے" یہ وہ پر شکوہ آواز تھی جو دربار ابن زیاد میں گونجی اور ہر شخص نے دہشت زدہ ہو کر اُس کو سُنا۔ ابن زیاد عرق انفعال میں ڈوب گیا، قاتل کی تلوار جہاں تھی وہیں پر رُک گئی۔ دربار برخواست کر دیا گیا لیکن قیدیوں کو اُس وقت تک کے لیے قید خانہ میں رکھے جانے کا حکم دیا گیا جب تک کہ دمشق سے ابن زیاد کا قاصد

عہ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

تہنیت نامہ کا جواب لے کر واپس نہ آئے۔"

اس کے بعد ابن زیاد نے تمام اہل کوفہ کو مسجد جامع میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ عہ "کوفہ کی عظیم المرتبت مسجد جو امیر المومنین حضرت علی کے عہد میں نمازیوں اور عبادت کرنے والوں سے آباد رہا کرتی تھی عرصہ سے خالی نظر آتی تھی۔ ہاں ایک عرصہ سے اس مسجد میں صرف ایک عابد شب زندہ دار نظر آتا ہے۔ یہ بزرگ مشہور شیعۂ علی عبد اللہ بن عفیف الازدی ہیں۔ یہ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی کے ہمراہ تھے جن کی دونوں آنکھیں جہاد میں زخم لگنے کی وجہ سے ضائع ہو چکی تھیں۔ وہ کسی وقت مسجد سے جدا نہ ہوتے تھے اور رات تک نمازوں میں مصروف رہتے تھے (طبری)

برخلاف اور دنوں کے آج اس مسجد میں مجمع ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا گوشہ گوشہ بھر جاتا ہے۔ عبید اللہ بن زیاد منبر پر جاتا ہے اور کہتا ہے الحمد للہ الذی اظہر الحق واھلہ ونصر امیر المومنین یزید بن معاویۃ وحزبہ وقتل الکذاب بن الکذاب الحسین بن علی وشیعتہ۔

ان کلمات کو سن کر عبد اللہ بن عفیف بھپر پڑے اور ڈپٹ کر کہنے لگے" اے پسر مرجانہ! تو اور تیرا باپ جھوٹا ہے اور وہ شخص جھوٹا ہے جس نے تجھ کو حاکم بنایا اور اس کا باپ۔ اے مرجانہ زادے پیغمبر کی اولاد کو قتل کرتا ہے اور پھر راستبازوں کی طرح کے کلام کرتا ہے یہ کہکر یہ مجاہد مسجد سے نکل آیا۔ ابن زیاد کی فوج کا ایک دستہ ان کو گرفتار کرنے کے لیے گیا۔ انھوں نے اس یزیدی فوج پر حملہ کر کے اکثر کو جہنم واصل کیا۔ آخر زخمی شیر کی طرح گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے اور ان کی لاش کو دوسروں کی عبرت کے لیے دار پر چڑھایا گیا (تاریخ طبری جز ثانی حصہ ثانیہ صہ ۲۶۳ طبع لیدن)

اہلبیت رسول کوفہ میں قید ہیں۔ حالت اسیری میں جناب زینب نے یہ خواہش فرمائی کہ ہمارے پاس کوئی عربی عورت نہ آئے سوائے غیر ملکی ام ولد اور کنیزوں کے اس لیے کہ وہ بھی قید ہوئی ہیں اور اس وقت ہم بھی قید ہیں۔

عہ مولانا سبط الحسن صاحب

طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں اہلبیت کوفہ میں اسیر تھے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یزید تمام قیدیوں کو قتل کر دینے کا حکم دے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابن زیاد نے اس امر کے لیے یزید سے حکم طلب کیا ہو جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ مورخ طبری لکھتا ہے "اسرائے آل محمد کوفہ میں قید تھے کہ ایک دن قید خانہ میں ایک پتھر کسی نے پھینکا، اس میں اس مضمون کی ایک تحریر بندھی ہوئی تھی کہ آپ کے معاملات کے لیے ایک خط یزید کے پاس بھیجا گیا ہے۔ قاصد اس تاریخ کو جا رہا ہے اور فلاں تاریخ تک پلٹے گا۔ پس اگر تکبیر کی آواز سنائی دے تو اپنے متعلق حکم قتل کا یقین کر لینا اور اگر تکبیر نہ بلند کی جائے تو انشاء اللہ امان ہے لیکن قاصد کے آنے پر تکبیر کی آواز بلند نہیں کی گئی کیونکہ یزید نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کو دمشق روانہ کر دو۔"

نیز سر امام حسین اور سرہائے شہداء کو بھی طلب کیا تھا۔ ابن زیاد نے سرہائے شہداء زحر بن قیس کے سپرد کیے اور ابوبردہ بن عوف ازدی اور طارق بن ابی ظبیان کو بھی ایک جماعت اہل کوفہ کے ساتھ اس کی معیت میں دمشق کی طرف روانہ کیا۔ پھر اہل حرم حسین کو اونٹوں پر سوار کر کے بھیجا گیا اور بیمار سید سجاد کی گردن میں طوق اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں اور ان کو بھی سروں کے پیچھے محفر بن ثعلبہ عائذی اور شمر بن ذی الجوشن کی نگرانی میں روانہ کیا۔ یہ لوگ بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر ان ہی لوگوں سے ملحق ہو گئے جو سروں کو لیے ہوئے جا رہے تھے (ارشاد ص ۲۷۶ الاخبار الطوال ص ۲۵۷)۔

عہ "اسیروں کا لٹا ہوا قافلہ اس شان کے ساتھ جا رہا تھا کہ آگے آگے نوک نیزہ پر شہداء کے سر بلند تھے اور اس کے پیچھے یہ مصیبت زدہ تھے۔ اہلبیت کی تباہی اور اپنی کامیابی کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے عراق سے دمشق جانے کا وہ راستہ اختیار کیا گیا تھا جس میں آبادیاں زیادہ پڑتی تھیں۔ کسی آبادی میں داخل ہونے سے پہلے وہاں یہ مشہور کیا جاتا تھا کہ یہ سر مسلمانوں کے دشمنوں کے ہیں جنھوں نے اسلامی خلیفہ پر خروج کیا تھا اور یہ ان ہی کے اہلبیت ہیں جو کفار ترک و دیلم کے قیدیوں کی طرح مقید کیے گئے ہیں لیکن اہلبیت حسینی

عہ مولانا سبط الحسن صاحب

کی اس طرح کی تشہیر حسینی مقصد کو کامیاب بناتی جاتی تھی - سوائے چند بستیوں کے جن آبادیوں سے گزر ہوتا تھا اموی حکومت کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے ۔

اہل موصل نے کسی طرح یہ گوارا نہ کیا کہ یزیدی فوج ان کی آبادی سے گزر جائے ۔ تکریت میں پہلے تو یزیدی پروپیگنڈے کی بنا پر یہ سمجھا گیا کہ کسی خارجی نے حکومت کے خلاف خروج کیا تھا - یہ ان ہی کے سر ہیں جن کی تشہیر ہو رہی ہے اس لیے بازاروں کو سجا کر فوج کا استقبال کرنا چاہا لیکن بروقت ایک عیسائی نے ان مسلمانوں کو غیرت دلا کر یہ بتلایا کہ میں کوفہ میں موجود تھا - مجھکو معلوم ہے کہ یہ سر تمھارے نبی کے نواسے کا ہے اور یہ انھی کے اہلبیت ہیں جن کو قید کیا گیا ہے - تکریت کے عیسائیوں اور مسلمانوں نے حسین کے نام پر مل کر یزیدیوں کے خلاف محاذ جنگ قائم کر دیا - یزیدیوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے راستہ بدل دیا اور معرۃ النعمان کی طرف چل دیے - مقام شیزر کے لوگوں نے بھی یہی کیا - قلعہ کفرطاب میں بھی نہیں داخل ہو سکے - مقام سیبور کے لوگوں نے بھی مقابلہ کیا - جناب ام کلثوم نے ان لوگوں کو ان الفاظ میں دعائے خیر دی "خدا ان چشموں کو میٹھا کرے، گرانی ان کے یہاں سے دور ہو اور ظالموں کے شکنجہ سے نجات پائیں" اہل حماۃ بھی جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا - اہالی حمص نے باقاعدہ جنگ کی اور چھبیس (۲۶) یزیدیوں کو قتل کیا - صاحب روضۃ الاحباب کی تحقیق کی بنا پر مقام حران میں یحیی حرانی ایک عیسائی راہب نے یزیدیوں سے جنگ کی اور بالآخر شہید ہو گیا"

ایک منزل پر ایک راہب نے جب سر کو دیکھا تو نام پوچھا جب معلوم ہوا تو کہنے لگا "کتنے برے تم لوگ ہو - اچھا کیا تم اس کے لیے تیار ہو سکتے ہو کہ مجھ سے دس ہزار اشرفیاں لے لو اور ایک رات کے لیے اس سر کو میرے پاس رہنے دو - یہ لوگ راضی ہو گئے - اس نے سر مبارک کو لیکر پانی سے دھویا اور خوشبو میں لبایا اور اپنے زانو پر رکھے رات بھر بیٹھا رہا (صواعق محرقہ ص ۱۱۹)" ع۵ "یاقوت الحموی کی تحریر کی بنا پر راہ

ع۵ مولانا سبط الحسن صاحب

دمشق میں تکالیف سفر کی وجہ سے ایک تازہ سانحہ بھی گزرا جس کو علامہ موصوف نے اپنی کتاب معجم البلدان میں دو جگہوں پر اس طرح لکھا ہے۔

ا۔ جوشن ایک پہاڑ ہے حلب کے غربی سمت اور یہاں تانبے کی کان ہو رکتے ہیں کہ یہ کان اُس دن سے خراب ہوگئی جبکہ عراق سے دمشق جاتے ہوئے اہلبیت حسینی کا قافلہ اس طرف سے گزرا تھا۔ اس وقت ازواج حسین میں سے کوئی مخدرہ حاملہ تھیں لیکن اس مقام پر اتعب سفر کی وجہ سے اسقاط ہوگیا۔ ان بی بی نے وہاں کے لوگوں سے پانی مانگا۔ ان لوگوں نے نہیں دیا۔ اس پر ان مظلومہ نے ان پر بددعا کی ۲ اس وقت سے اس معدن سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ پہاڑ کے سامنے مزار ہے جو "مشہد سقط" کے نام سے مشہور ہے اور اس بچہ کا نام محسن بن حسین تھا۔ معجم البلدان جلد دوم صہ ۱۵۶)

(۲) حلب اس کے غربی سمت جوشن نامی پہاڑ ہے۔ یہاں محسن بن حسین کا مزار ہے خیال کیا جاتا ہے کہ جب مخدرات اہلبیت قید ہو کر اس طرف سے دمشق جاتے ہوئے گزرے تو اس مقام پر ایک بی بی کو اسقاط ہوگیا تھا یا ان کے ہمراہی میں کوئی بچہ تھا جو یہاں مر گیا اور دفن کر دیا گیا (معجم جلد ۲ صہ ۳۰۸)

غرضنکہ طرح طرح کے اندوہ و مصائب کو برداشت کرنے کے بعد بنابر تحقیق علامہ شہاب الدین احمد بن عبد القادر الشافعی صاحب ذخیرۃ المآل چھٹی ماہ صفر کو یا بنابر مختار علامہ حسن بن علی الطبرسی روز چہارشنبہ سولھویں ربیع الاول کو دمشق میں داخل ہوئے (کامل البہائی باب ۲۸)

جس دن اہل حرم کا قافلہ دمشق میں داخل ہوا ہے اُس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے۔ تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی۔ فتح کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے چنگ و رباب کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لباس عید سے لوگ آراستہ تھے۔ نووارد تو دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ شامیوں کی آج کوئی خاص عید ہے۔ مجمع کی یہ کثرت تھی کہ باوجود اس کے کہ آفتاب نکلنے کے ساتھ ہی اسیران آل محمد دمشق میں داخل کئے گئے تھے لیکن زوال کے وقت تک دربار یزید میں پہونچ سکے تھے۔ جس وقت یہ قافلہ

بازار سے گزر رہا تھا، ابراہیم بن طلحہ بن عبد اللہ (جنگ جمل کے ایک مشہور افسر طلحہ کے فرزند) نے حضرت سید سجاد سے طنزاً پوچھا "اے فرزند حسین کس کی فتح ہوی؟" حضرت نے جواب میں فرمایا "تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ کس کی فتح ہوی ہے تو جب نماز کا وقت آئے اور اذان اقامت کہنا اُس وقت معلوم کر لینا کہ کس کی فتح ہوی ——— "

عـ۵ "تاریخی واقعہ ہے کہ جب اسیران اہلبیت دروازہ مسجد دمشق پر پہونچے تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اُس نے ان اسیروں کو دیکھکر کہا "حمد ہے اُس خدا کی جس نے تم کو قتل اور ہلاک کیا اور ملکوں اور شہروں کو تمھارے مردوں سے خالی اور پر امن بنایا اور امیر المومنین یزید کو تم پر غلبہ عطا فرمایا" اس بوڑھے کے یہ کلمات سُن کر اسیران اہلبیت کے قافلہ سالار اور بیمار کربلا علی بن الحسین نے فرمایا "اے شیخ کیا تو نے یہ آیت قرآن مجید میں پڑھی ہے قل لا اسئالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ" کہدو اے ہمارے حبیب کہ میں سوائے اپنے ذوی القربیٰ (اہلبیت) کی مودت و محبت کے تم سے اور کوئی اجر و معاوضہ اس تبلیغ رسالت پر نہیں مانگتا۔ بوڑھے نے کہا ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے۔ فرمایا وہ ذوی القربائے رسول ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض ہے۔ پھر فرمایا۔ اور یہ آیت بھی پڑھی ہے واعلموا انما غنمتم من شیئی فان للہ خمسہ و للرسول ولذی القربیٰ الآیہ "یاد رکھو کہ جو تم کچھ منفعت حاصل کرو اور جو مال بغیر مشقت پاؤ اُس میں سے پانچواں حصہ اللہ، رسول اور اُن کے ذوی القربیٰ کا حق نکال دو۔ عرض کیا ہاں یہ آیت پڑھی ہے فرمایا وہ ذوی القربیٰ ہم ہی ہیں جن کا یہ حق خمس میں واجب ہے اور اے بوڑھے یہ آیت بھی قرآن میں پڑھی ہے انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا عرض کیا ہاں پڑھی ہے۔ فرمایا یہ اہلبیت نبوت ہم ہی ہیں جن کو خدا نے بُرائی سے پاک رکھا ہے اور معصوم بنایا ہے۔ بوڑھا یہ سُنکر تھوڑی دیر خاموش رہا اور حیران ہو گیا اور پھر عرض کیا خدا کی قسم سچ سچ تم وہی ہو فرمایا ہاں قسم بخدا ہم وہ ہی آل رسول اہلبیت نبوت ذوی القربائے رسالت ہیں۔ بلا شک و شبہ اور اپنے جد

عـ۵ علامہ سید محمد سبطین صاحب سرسوی (لدھیانہ)

رسول اللہ ہی کی قسم کہ ہم وہی ہیں۔ بوڑھا شیخ رونے لگا۔ عمامہ سر سے پھینکدیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا "خداوندا گواہ رہنا کہ میں ہر دشمن آل محمدؐ جن وانس سے بیزار ہوں اور اُن سے تبرا کرتا ہوں" پھر امام سے عرض کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ فرمایا ہاں اگر تو توبہ کرے تو قبول ہوگی اور تو ہمارے ساتھ ہوگا۔ عرض کیا تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں جو میں نے عدم معرفت کی بنا پر تمھاری شان میں گستاخی کی۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بنی امیہ کے پچاس سالہ پروپاگنڈا نے محمدؐ و آل محمدؐ کو عام پبلک خصوصاً اہل شام سے بالکل ناآشنا کر دیا تھا"

ابن القفطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جس وقت اسرائے آل محمدؐ کا قافلہ اور سرہائے شہدا دمشق میں داخل ہو رہے تھے اُس وقت یزید اپنے ایک محل کے اونچے بالاخانہ پر جو مقام جیرون میں تھا اس منظر کا مشاہدہ کرنے کے لیے موجود تھا اور جوہی سرہائے شہدا نیزوں پر دور سے نظر آئے اُس نے یہ اشعار پڑھے:۔

لما بدت تلک الحمول واشرفت ۔۔۔ تلک الرؤس علی ربی جیرون

نعب الغراب فقلت قل او لا تقل ۔۔۔ فلقد قضیت من الرسول دیونی

"جب وہ سواریاں نظر آئیں اور وہ سر جیرون کے ٹیلوں پر سایہ افگن ہوئے تو کوا کاؤں کاؤں کرنے لگا (یہ نحوست کی نشانی سمجھی جاتی تھی) میں نے کہا تو بول یا نہ بول میں نے بہرحال پیغمبر سے اپنے قرضے وصول کر لیے ہیں"

اس سے یزید کی ذہنیت کا انکشاف بالکل صاف ہے یعنی اہل حرم کے ساتھ جو کچھ مظالم کیے جا رہے ہیں اُسے وہ حضرت محمد مصطفےٰؐ کے مقابلہ میں بطور انتقام اپنا حق سمجھتا تھا۔

ع۵ "پس ماندگان حسینؑ کو کربلا سے دمشق تک تشہیر کرانے اور در بدر پھرانے میں کیا غرض پوشیدہ تھی اور اس سیاسی اقدام میں کیا تدبر پوشیدہ تھا سطور ذیل میں بالاجمال عرض کیا جاتا ہے:۔

حسینؑ کا وجود یزید پر (بہ وجوہ) اس قدر بار تھا کہ وہ مقابلۃً بہت بڑی فوجی

ع۵ ثانی زہرا مصنفہ محمد صادق حسین صاحب بی اے (علیگ) ہردوئی

قوت ان کے مقابل لا یا بھی نہیں بلکہ وہ اپنی خلافت کے منکر کو صفحۂ ہستی سے امکانی ظلم و تشدد کے ساتھ مٹانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا اور حسین معہ اپنے معدودے چند ہم خیال لوگوں کے صفحۂ وجود سے نیست و نابود کر دیے گئے مگر اس فریضہ کی انجام دہی کے بعد وہ مطمئن نہ تھا۔ اُس کا شاہانہ وقار اپنی فتح و فیروزی پر اپنے دشمن اور اپنی پرستار جماعت کے روبرو فخر کرنا چاہتا تھا مگر اب اس کا حریف موجود نہ تھا اس لیے اس نے اپنی یہ حسرت سر بریدہ حسین سے پوری کرنا چاہی اور پوری کی۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی چاہا کہ دنیا میرے مقتول کا تماشا دیکھنے کے ساتھ اس کے پس ماندگان کا نظارہ بھی کرے اور میری حکومت کے یہ جانی دشمن اور منتخب مجرم قید کر کے در بدر پھرائے جائیں اور میں اُن کی موجودگی میں اپنی فتح و ظفر اور ان کی شکست و ہزیمت کی دلچسپ سرگذشت خود سنوں اور دنیا کو سناؤں اور اپنی فتح اور اُن کی شکست کے اثر سے لطف اندوز ہوں ـــــ

یہ دوسری بات تھی کہ اہلبیت اطہار کی توہین و تذلیل کی مصلحت غلط تھی اور بساط سیاست پر یزید کو اس چال سے شکست فاش ہوئی۔ کامیابی کا نشہ اور وہ بھی ایک مست سر میں انسان کو اُس کے اقدام کے پس و پیش پر اکثر غور نہیں کرنے دیتا۔ حسین کو خاک کربلا میں ملانے والا خون ناحق کی قوت اور اثر کا صحیح اندازہ نہ کر سکا ورنہ وہ اپنے اس اقدام سے حسین کی خاموش زبان کو ہمیشہ کے لیے ہرگز گویا نہ کرتا (تفصیل اس کی بعد میں آئے گی)

دمشق کم و بیش تیس پینتیس برس سے بنی امیہ کا مرکز حکومت اور موجودہ بادشاہ کا پایۂ تخت تھا جس میں مختلف نسل اور مختلف مذہب کے لوگ بہ کثرت آباد تھے اور گویا غیرت مند مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم افراد کی ایک کافی تعداد بھی نبی عربی کی اولاد اور ذریت کی اس دربدری اور برہنہ سری کا مشاہدہ کرنے کے لیے موجود تھی۔ شہر کی دکانیں بند تھیں اور دربار کے لیے اذن عام تھا قوت امارت اور شان و شوکت کا انتہائی مظاہرہ کیا گیا تھا۔ شہر کے پہلے دروازہ سے یہ قافلہ داخل کیا گیا تھا اور اس دروازہ کے پاس جو دربار شاہی سے قریب تھا روک دیا گیا۔ وہاں کافی دیر تک ٹھہرائے رکھے جانے کے بعد اُسے اذن حضوری ملا!!

عـ۵ "دربار بھی خصوصیت کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا تخت مرصع پر یزید بیٹھا تھا اور اس کے چپ و راست زریں و سیمیں کرسیاں (جن کی تعداد سات سو بتائی گئی ہے) بچھائی گئی تھیں، جن پر امرا اور صنادید شام بیٹھے ہوئے غیر ممالک کے سفیر بھی خاص طور سے مدعو کیے گئے تھے کیا انقلاب ہے کہ اس بھرے دربار میں خاندان رسالت مثل غلامان حبش و کنیزان ترک و دیلم کے پیش کیا گیا تھا۔ اسی دربار میں طشت طلا میں حضرت حسین مظلوم کا سر یزید کے سامنے پیش کیا گیا"

مورخ دینوری کا بیان ہے کہ سر امام یزید کے سامنے پھینک کر زمین پر ڈال دیا گیا اور شمر نے جنگ کی روداد بیان کرنا شروع کی "یا امیر المومنین یہ عراق کی طرف آئے اٹھارہ آدمیوں کو لیے ہوئے اپنے اہلبیت میں سے اور ساٹھ آدمیوں کے ساتھ اپنے شیعوں میں سے تو ہم ان کے مقابلہ کے لیے گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ یہ ہمارے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلہ کے سامنے غیر مشروط طریقہ پر سر جھکا دیں یا جنگ کریں سورج نکلنے کے وقت ہم نے ان پر حملہ کیا اور چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا جب تلواریں چلنے لگیں تو یہ لوگ پناہ ڈھونڈھتے پھرتے تھے اور ان کو پناہ نہ ملتی تھی جیسے کبوتروں پر شکرے حملہ کردیں۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اُن کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ان کے جسم برہنہ خاک پر تھے اور کپڑے اُن کے خون میں تر اور رخسارے خاک آلودہ تھے۔ ہوائیں اُن پر گرد صحرا ڈال رہی تھیں اور آسمان کے گدھ اور صحرا کے جانور اُن کی لاشوں پر جمع تھے" (الاخبار الطوال ۲۵۶)

عـ۵ "اس وقت یہ بدبخت اپنے ندمار کے ساتھ بیٹھا ہوا شطرنج کھیل رہا تھا اور شراب کے نشہ میں یہ شعر گا رہا تھا:-

الا یا ایھا الساقی   ادر کاسا وناولھا"

پھر اُس کے طرب و نشاط اور اس کے ساتھ بے دینی کا پارہ اور اونچا ہوا اور وہ یہ اشعار پڑھنے لگا۔

لیت اشیاخی ببدر شھدوا   جزع الخزرج من وقع الاسل

عـ۵ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

لاھلّوا واستھلّوا فرحًا   ولقالوا یا یزید لا تشل!

لعبت ھاشم بالملک فلا   خبر جاء ولا وحی نزل

یعنی کاش میرے جنگ بدر والے بزرگ زندہ ہوتے اور وہ دیکھتے کہ محمد مصطفیٰ کے انصار کس طرح تیروں کے پڑنے سے گھبرا گئے ہیں وہ اس صورت میں خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دینے لگتے۔ یہ تو بنی ہاشم نے سلطنت کا ایک کھیل کھیلا تھا۔ حقیقت میں نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔"

اس دربار میں یہ موقع وہ تھا کہ جناب زینب کبریٰ کھڑی ہوگئیں اور وہ تقریر شروع کی جس نے یزید کے تمام جاہ و جلال کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ ان الفاظ کو غور سے سنو اور دیکھو ان الفاظ اور ان کے معانی کی شان و شوکت اور زور و طاقت کس طرح یزید کو اس کے تمام جبروت سمیت پرکاہ سے زیادہ بے وقعت ثابت کر رہی ہے۔ وہ فرماتی ہیں "کہا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد کہ آخر میں ان لوگوں کی جنھوں نے برے اعمال کیے یہ نوبت پہونچی کہ انھوں نے آیات خداوندی کی تکذیب کی اور وہ ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔ تو نے اے یزید! کیا یہ گمان کیا کہ جب تو نے ہم پر زمین و آسمان کے تمام راستوں کو بند کر دیا اور ہماری حالت یہ ہوگئی کہ ہم تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جا رہے ہیں تو اس سے خدا کی نظر میں ہماری حقارت اور تیری کچھ عزت ہو گئی اور یہ کہ تیری کامیابی تیری قوت مراتب کے باعث تھی۔ اس خیال سے تیری ناک چڑھ گئی اور تو خوش ہو ہو کر (غرور کے ساتھ) اپنے شانوں پر نظر ڈالنے لگا جب تو نے دیکھا کہ دنیا تیرے حکم کی پابند اور امور مملکت منتظم و مرتب ہیں اور سلطنت و حکومت تیرے لیے تمام خطرات سے صاف ہوگئی۔ کیا تو بھول گیا خدا کے قول کو کہ وہ نہ خیال کریں وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا کہ ہم جو ان کو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لیے اچھی بات ہے۔ ہم تو ان کو مہلت دیتے ہیں اس لیے کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کریں اور آخر ان کے لیے حقارت آمیز سزا مقرر ہے۔ کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ تو اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردہ میں رکھے ہوئے ہے اور دختران رسول کو قیدیوں کی صورت میں دربدر پھراتا ہے۔ پھر اس پر بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ کہتا ہے

(لاهلوا واستهلوا فرحا) یعنی اگر بدر میں مارے جانے والے بزرگ اس کو دیکھتے تو خوشی
کے مارے چیخ اٹھتے ۔ تو اپنے بزرگوں کو بخیال خود پکارتا ہے ۔ گھبرا نہیں تھوڑے ہی دن
میں تو بھی اسی گھاٹ پر پہونچے گا اور یقیناً اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ
شل اور زبان گنگ ہوتی اور تو نے جو کچھ کہا اس کو نہ کہتا اور جو کیا اس کو نہ کرتا ۔ تیرے
لیے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خدا فیصلہ کرنے والا اور محمد مصطفےٰ تیرے مقابل میں مدعی اور
روح الامین ان کے پشت پناہ اور مددگار ہوں گے ۔ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنھوں
نے تیرے افعال کی تائید کی اور تیرا ساتھ دے کر تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کیا معلوم ہو گا
کہ ظالموں کو کیا برا بدلا دیا جاتا ہے ۔ اگرچہ انقلابات زمانہ نے یہ نوبت پہونچا دی کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں
حالانکہ میں تیری قدر و منزلت کو بہت کم جانتی ہوں اور تیری توبیخ و سرزنش کو اپنے لیے بڑی مصیبت سمجھتی ہوں
لیکن کروں کیا کہ دل بھرا ہوا ہے اور کلیجہ میں آگ لگی ہے ۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ خدا پرست
افراد شیطانی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوں ——— اچھا (اے یزید تجھ کو قسم ہے) تو کوئی
دقیقہ اٹھا نہ رکھنا اور اپنی پوری کوشش کو صرف، اپنی تمام جد و جہد کو ختم کر دے
لیکن (یاد رکھ) خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو محو، ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا اور نہ ہمارے
اصلی مقصد کو تو پہونچ سکتا ہے ۔ اس واقعہ کا ننگ و عار تجھ پر قیامت تک باقی رہے گا۔
اور تو کبھی اس کو دھو نہیں سکتا ۔ تیری رائے یقیناً غلطی پر، تیرے ایام زندگی بہت محدود
اور تیرے اردگرد کا مجمع بہت جلد منتشر ہونے والا ہے ۔ وہ دن بہت نزدیک ہے جب
منادی کی آواز بلند ہوگی (الا لعنۃ اللہ علی الظالمین) شکر ہے اس خدا کا جس نے
ہمارے پیشرو بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام
شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا اور وہ ہمارے لیے کافی اور بہترین ناصر و معین ہے "

عـ٥ "اسی طرح جناب سید سجاد نے ایسی تقریریں فرمائیں جنھوں نے شامیوں کی
نگاہوں سے باطل کے پردے چاک کر دیے ۔ اب یزید ایسے ظالم و جابر کے دربار میں
ابو برزہ اسلمی اور سمرہ بن جنادہ بن جندب ایسے کمزور قلب کے صحابیوں میں بھی

عـ٥ مولانا سبط حسن صاحب ہنسوی

یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ بر سر دربار یزید کو ٹوک دیں؟

اُس وقت جب یزید نے اُسی بے ادبی کا اعادہ کیا جو ابن زیاد کر چکا تھا شاید یہی دیکھنے کے لیے کہ کوفہ تو شیعوں کا مرکز رہ چکا ہے وہاں زید بن ارقم نے بر سر دربار ٹوک دیا مگر کیا دمشق میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ ہوا یہاں بھی یہی ہوا۔ علاوہ ابو برزہ اسلمی اور سمرہ بن جندب کے قیصر روم کے سفیر کو بھی تاب نہ رہی۔ اُس نے کہا ہمارے یہاں گرجا میں ایک سم ہے جو حضرت عیسیٰ کے مرکب کی طرف منسوب ہے۔ صرف اتنے تعلق کی بنا پر تمام عیسائی اُس گرجا میں جاتے ہیں اور اس سم کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ تم کیسے مسلمان ہو کہ اپنے نبی کے نواسے کو قتل کیا اور اب اُس کے سر کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو۔ ایک دوسرے عیسائی نے کہا کہ میرا سلسلہ نسب ستر واسطوں سے حضرت داؤد پیغمبر تک پہونچتا ہے مگر یہود اب تک میری عزت کرتے ہیں اور حسین تو بلا واسطہ پیغمبر کے نواسے ہیں۔ تم نے ان کو قتل کر دیا۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۱۹)

یزید کی ان جرأتوں اور گستاخیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ اہل دربار کی ہمت بڑھی اور ایک شامی سرخ رنگ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "یا امیر المومنین! یہ لڑکی مجھے دیدیجئے" اور اشارہ کیا فاطمہ بنت الحسین کی طرف۔ یہ سننا تھا کہ شاہزادی کانپنے لگی اور اپنی پھوپھی جناب زینب سے لپٹ گئی۔ جناب زینب نے بچی کو تسلی دی اور بلند آواز سے اس شامی سے کہا کہ تو جھوٹا ہے بخدا تو مر بھی جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ یزید ایسا کر سکتا ہے۔"

اس فقرہ پر یزید کو طیش آ گیا اور کہنے لگا تم غلط کہتی ہو۔ مجھے یہ حق ہے اور اگر میں چاہوں تو ایسا کر سکتا ہوں" جناب زینب نے فرمایا "ہرگز نہیں جب تک اسلام کا دعویٰ کرتا ہے تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ تو ہمارے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی دوسرا دین اختیار کر لے۔" یزید کا غصہ اور بڑھا اور کہا "مجھ سے تم ایسی باتیں کرتی ہو۔ دین سے خارج تو تمہارے باپ اور بھائی ہو گئے تھے" جناب زینب نے کہا "اللہ کے دین تو میرے اور بھائی کے دین کو اختیار کر کے تو اور تیرے دادا اور باپ مسلمان کہلائے" یزید پر سنجیدہ جواب کا دروازہ بند تھا وہ صرف سخت کلامی پر اُتر آیا۔ مجبوراً جناب زینب

کو یہ کہنا پڑا کہ یزید تو ایک ظالم حاکم ہے اور اپنی سلطنت سے دبانا چاہتا ہے، تو جو چاہے کر سکتا ہے" اس جواب سے یزید کو کچھ شرم آئی اور خاموش ہو گیا۔ اب جو شامی نے پھر اپنی خواہش کو دہرایا تو یزید نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا دور ہو خدا تجھے غارت کرے (ارشاد صد ۲۷)

عـ۵ "خاندان اموی کا مشہور شخص یحییٰ بن الحکم (مروان کا بھائی) ان حالات سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اپنی بیزاری کا اعلان کر کے حسینؑ مظلوم کا مرثیہ کہتا ہے اور یزید کو خاموشی کے ساتھ سننا پڑتا ہے (الطبری)

اس کے باوجود بھی یزید نے ایسا نہیں کیا کہ ان اہلبیت کو فوراً مدینہ روانہ کر دیا جائے بلکہ کچھ عرصہ تک ایک قیدی کی حیثیت سے اُن کو شام میں ٹھہرا رکھا۔ اس زمانہ میں حسینؑ مظلوم کا فرق مبارک مسجد دمشق کے دروازہ پر جو باب جیرون کے نام سے مشہور تھا ایک مدت تک نصب رہا جہاں کبھی حضرت یحییٰ کا سر لٹکایا جا چکا تھا (تقویم البلدان اسمٰعیل بن ملک نور الدین صاحب حماۃ و کتاب المسالک والممالک محمد بن حوقل بغدادی)

جس زمانہ میں اہلبیت رسول قید شام میں تھے مملکت یزید میں انقلابی آثار پیدا ہو رہے تھے اب اُس نے خیال کیا کہ اس انقلاب کو روکنے کے لیے اہلبیت رسول کو رہا کر دینا چاہیے۔ بعض مورخوں کا یہ خیال ہے کہ مروان نے یزید سے یہ کہا تھا کہ ملک میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کو دبانے کے لیے اہلبیت کو رہا کر دیا جانا ضروری ہے ورنہ سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ بہر کیف جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ یزید نے اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے اسیرانِ بلا کو رہا کر دیا۔"

نعمان بن بشیر انصاری جو کوفہ کی حکومت سے معزول ہونے کے بعد شاید دمشق بلا لیے گئے تھے آلِ رسول کے ہمدرد سمجھے گئے اور اُنھیں بلا کر ہدایت ہوئی کہ ان لوگوں کو مدینہ پہونچا دو۔ اب یزید کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس ہوا تھا اور وہ اپنے اقتدار کے مجروح جسم پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے حضرت امام زین العابدینؑ کو تنہائی

عـ۵ مولانا سبط الحسن صاحب

میں جلایا اور کہا خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے۔ اگر براہ راست آپ کے والد کا مجھ سے سامنا ہوتا تو جو کچھ وہ کہتے میں منظور کر لیتا اور کبھی اُن کے قتل کو گوارا نہ کرتا۔ لیکن خدا کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔ اب آپ مدینہ جائیے وہاں سے مجھے خط لکھتے رہیئے گا اور جو ضرورت ہو اس سے مجھے اطلاع دیجئے گا۔ اس کے بعد نعمان بن بشیر کو بلا کر ہدایت کی کہ ان لوگوں کو رات کے وقت سفر کرانا اور آگے آگے سفر کرنا جب کہیں قیام ہو تو خود علٰحدہ ٹھہرنا اور چاروں طرف اپنے سپاہیوں کو منتشر کر دینا جیسے پہرہ دینے والے ہوتے ہیں اور جہاں یہ کہیں وہاں قیام کرنا (ارشاد ص۲۷۷)

تیس آدمی نعمان بن بشیر کے ساتھ کئے گئے اور نعمان نے حسب ہدایت راستے بھر پورے احترام کا برتاؤ رکھا اور اہلبیت کو مدینہ تک پہونچایا (الاخبار الطوال ص۲۵۸)

ع۱ "اس طریقہ سے مجبور بیچاری عورتیں علی زین العابدین کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اپنے وطن میں واپس آئیں، اُن تمام عزیزوں اور پیاروں کو کھو کر۔ شاید وہ اپنے کو رسول کے پاس لے گئی ہوں جس سبز گنبد کے نیچے وہ آرام کر رہے ہیں اور اُن سے اپنے مصائب اور رنج کو بیان کیا ہو اور شاید رسول نے اُن کو امید اور ہمدردی کا پیغام بھی پہونچایا ہو یعنی اس بات کا یقین کہ شہداء کا خون بے کار نہ جائے گا۔ شاید اس گنبد کی خاموشی سے وہ آواز ہموں کے کان تک پہونچی ہو۔ اس لیے کہ حقیقۃً دریائے فرات کے بہے ہوئے خون کا انتقام جلد ہی لیا جانے والا تھا"

ع۲ "امام حسین کے فرق مبارک کے متعلق آج تک تاریخ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ کہاں دفن کیا گیا؟

ابن بکار اور علامہ ہمدانی کا قول ہے کہ مدینہ میں جنۃ البقیع میں دفن کیا گیا (تذکرۃ خواص الامۃ) بعضوں کا خیال ہے کہ ایک مدت کے بعد فرق مبارک اموی خزانہ میں پایا گیا جس کو شہر دمشق کے باب الفرادیس میں دفن کیا گیا (تاریخ البلاذری و اخبار الدول و آثار الاول علامہ ابی العباس احمد الدمشقی)

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا) ع۲ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت کا فرق مبارک جو دمشق کے باب الفرادیس میں رکھا گیا تھا اُس کو خلفائے مصر نے ابتدا میں شہر عسقلان میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد عسقلان سے نکال کر مصر میں لے جا کر قاہرہ میں دفن کیا گیا اور اس پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جو "مشہد راس الحسین" کے نام سے مشہور ہے (الخطط والآثار علامہ مقریزی و فواتح الانوار علامہ شعرانی)

علامہ عبداللہ بن عمر الوراق اپنے مقتل میں لکھتے ہیں کہ یزید نے حضرت کے سر اطہر کو عثمان کے سر کے عوض میں آل ابی معیط کے پاس بھیجدیا تھا جو دریائے فرات کے کنارے شہر رقہ میں رہتے تھے جس کو ان لوگوں نے دفن کر دیا تھا۔ بعد میں اسی مقام پر مسجد تعمیر کی گئی لیکن باوجود ان اختلافات کے جمہور شیعہ اہلبیت کے احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس بات پر متفق ہیں کہ فرق مبارک جسم مطہر کے ساتھ کربلا میں دفن ہوا۔ یہی مسلک اہلسنت کے اکثر علمائے روحانیین کا بھی ہے (نور الابصار شبلنجی ص ۱۳۳ مطبوعہ مصر)۔"

واقعات آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ ان سے آپ کو پورے طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ حقیقتاً صرف امام حسین کو راہ سے ہٹانا مقصود نہ تھا بلکہ ایسے مرکز کو فنا کرنا اور عوام کی نظروں سے گرانا جو اقتدار حاصل کرنے والی جماعت کے مقاصد سے اختلاف رکھتے تھے یا رکھ سکتے تھے۔

اگر یزید کو اہلبیت رسول کی کوئی توہین منظور نہ ہوتی تو شام بلانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ کربلا یا کوفہ ہی سے ان اہلبیت کو مدینہ روانہ کر دیا جاتا۔ شہادت امام حسین تک تو بالفرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ یزید کو اطلاع نہ تھی یہ ابن زیاد کا فعل تھا مگر شہادت حسین کے بعد تو ابن زیاد نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا بلکہ اہلبیت کو کوفہ میں رکھنا صرف اس غرض سے تھا کہ ان کے متعلق یزید سے ہدایت حاصل کی جائے اور جو کچھ کیا گیا وہ ہدایات آجانے کے بعد۔ پھر کیا کہا جا سکتا ہے کہ سرہائے شہداء اور اہل حرم کا دمشق بھیجنا بھی ابن زیاد کا ذاتی فعل تھا۔ پھر اگر دمشق میں بلایا ہی تھا تو کوئی مکان پہلے سے مہیا ہوتا اور براہ راست

دنیا اہلبیت کو اُتارا جاتا۔ پھر یزید اگر چاہتا تو عزت و احترام کے ساتھ سید سجاد سے ملاقات بھی کر لیتا مگر تاریخیں متفق ہیں کہ اہل حرم شام بلوائے گئے۔ یزید نے دربار کیا اور نامحرموں کے مجمع میں آلِ رسول کو طلب کیا۔ یہ تھا اپنی فتح کا اظہار جس سے اُس کے نفس کی پستی کا پتہ لگتا ہے اور کچھ نہ ہوا ہو تو یہی اہلبیت کی بہت بڑی مصیبت تھی جو بلاواسطہ یزید ہی کے ہاتھ سے پڑی تھی۔ پھر اُس پر چوب خیزراں اور سرِ حسین کے ساتھ بے ادبی! یہ تو قیامت کی بات تھی جس پر مسلمان تو مسلمان، عیسائی بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کوئی شک نہیں کہ ان تمام مظالم کا موقع خود امام حسین نے دیا ان اہلحرم کو اپنے ساتھ لا کر اور اسی لیے امام حسین کے عمل کا یہ ایک بڑا نازک گوشہ سمجھا گیا ہے جہاں واقعہ کے پہلے ہی مشیران کار حسین کے خلاف مشورہ دے رہے تھے مگر حسین نے تمام مشیروں کی رائے کے خلاف ان اہلبیت کو اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا اور نہ آنا چاہیے تھا کہ جسے اتنا بڑا مقصد حاصل کرنا ہو وہ اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر آئے۔ ؏[5] عورتوں اور بچوں کا ساتھ حفاظتی نہ مدافعتی پہلو کو کمزور کر دیتا ہے اور اپنے مشکلات میں انسان کو مبتلا کر دیتا ہے جن سے وہ کمزور اور دشمن قوی ہو جاتے ہیں۔ عیال و اطفال کا ساتھ درحقیقت دشمنوں کی بہت بڑی مدد کرتا ہے۔ ایک شاعرِ عرب کہتا ہے:۔

الهفی بقری سحبل حین احلبت علینا الولایا والعدو المباسل

پھر آخر حضرت امام حسین اپنے ساتھ اہلحرم کو کس لیے لے گئے تھے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے امام حسین نے کسی مشیرِ کار کے ان خیالات کی رد نہیں کی جو آئندہ کے خطرات کے متعلق وہ پیش کرتے تھے پھر بھی آپ نے ان کا ساتھ لے جانا ناگزیر بتلایا کبھی یہ کہہ کر کہ منظورِ الٰہی یہی ہے کہ یہ قید ہوں۔ کبھی یہ کہہ کر کہ جو مقدر میں ہے وہ ہو گا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسین سب خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان اہلحرم کو ساتھ لے جانے پر مصر تھے اس لیے کہ ان کا لے جانا آپ کے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ تھا۔ تشریح

؏[5] مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری

کے لیے اس کی یہ دیکھیے کہ عـ۵ حسین یزیدی سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں ان کا آخری نقطۂ نظر یہ نہیں ہے کہ خود تخت حکومت پر بیٹھ کر دنیا کے مال و منال اور لذت حیات دنیا سے متمتع ہوں بلکہ اُن کا مقصود اصلی یہ ہے کہ امت اسلامیہ کو اس ظالم کے فولادی پنجہ سے رہا کریں جس نے اُن کو دینی و دنیوی ہر قسم کی ہلاکت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ رائے عامہ کو یزید کے خلاف برافروختہ کریں۔ جمہور مسلمین اور تمام رعایا کے سامنے یزید کی اخلاقی پستی اور اسلام دشمنی کو مجسم صورت میں پیش کریں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ یہ شخص کسی صورت سے سلطنت مسلمین کا حقدار نہیں ہے۔ امام حسین کو اس مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ وہ اپنے نفس کو خطرات کے مقابلہ میں پیش کر دیں۔ اپنے تئیں ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بنا کر عالم کے سامنے ظالم اور مظلوم کا انتہائی حیرت انگیز مرقع دکھلا دیں اور اس کے سبب سے مسلمانوں کے دل پر وہ چوٹ پڑے جس کا نتیجہ انقلاب سلطنت کی صورت میں نمایاں ہو۔

صرف قتل ہو جانا اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ عرب قوم میں بات پر مر مٹنا ایک معمولی بات تھی۔ عربی جانبازوں کی آخری سانسیں اکثر تلواروں کی چھاؤں میں چلتی تھیں پھر فرزند رسول بھی اگر اپنی جان سے گزر کر قتل کو منظور کر لیتے تو اس کو کوئی خاص اہمیت عام نفوس میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ حسین نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اہل حرم کو اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہمدردی انسانی طبائع میں فطری طور پر داخل ہے اور بالخصوص عرب قوم میں غیرت و حمیت کے تحت میں یہ جذبہ بخصوصیت پایا جاتا ہے۔ فرزند رسول یزید اور اُس کے بندۂ زر اتباع سے یقین رکھتے تھے کہ وہ بخیال خود فتح پانے کے بعد ان بے والی و وارث عورتوں کے ساتھ رحم و کرم کا کچھ بھی خیال نہ کریں گے اور مظالم و مصائب کا سلسلہ ان اہل حرم کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رہے گا۔ خاندان رسول کے مخدرات مختلف شہروں میں پھرائے جائیں گے۔ قید خانہ میں مقید کیے جائیں گے اور اُن کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھا جائے گا۔ اس کا اثر یہ ہو گا کہ فوراً

عـ۵ علامہ کبیر شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء (نجف اشرف)

نہیں تو کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی اور دلوں میں جذبات حزن و ملال سے تلاطم پیدا ہوگا اور اس طرح بنی امیہ کی سلطنت تباہ ہوگی ــــــــــ"

تاریخ کے طالبعلموں کو معلوم ہوگا کہ بنی امیہ نے ایک طرح کی فتح بنی ہاشم کے مقابلہ میں کیونکر حاصل کی ــــــــ حضرت عثمان کو بحیثیت مظلوم پیش کرکے اور اس خون کی ذمہ داری بنی ہاشم اور بالخصوص حضرت علی بن ابی طالب پر عائد کرکے۔ اس کے لیے عثمان کا خون بھرا کرتہ اور اُن کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوی انگلیاں مدت تک مسجد جامع دمشق میں مجمع کے سامنے پیش کی جاتی تھیں اور مجمع اُن کو دیکھ کر آہ و زاری کرتا اور سر و سینہ پیٹتا تھا۔ اس طرح ایک بہت بڑی جماعت کے دلوں کو اہلبیت رسول سے منحرف کیا گیا۔ اور آل ابوسفیان نے مقتول کے ورثہ دار بن کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کی۔ یہ پروپیگنڈا اُس وقت تک ختم نہیں ہوسکتا تھا جب تک آل بنی ہاشم میں اولاد ابوسفیان کے ہاتھوں ایک ایسا غم انگیز حادثہ نہ ہو جائے جو ہمدردی کے اثرات کو معکوس کردے۔ حسین کی شہادت نے یہی کام انجام دیا۔ بنی امیہ اپنے جوش ظفریابی میں اس کا اندازہ نہ کرسکے ــــ وہ روز عاشور تک اپنے اقدامات کے جواز میں حضرت عثمان کے واقعۂ قتل کا حوالہ دیتے تھے۔ اُنھوں نے حسین اور اُن کے ساتھیوں پر پانی بند کرنے کی سند جواز بھی یہی قرار دی کہ اس کے پہلے حضرت عثمان پر پانی بند کیا جاچکا ہے اس لیے یہ اُس کا بدلا ہے۔ حسین اس سب کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے اور دشمن کو مظالم کا موقع دیتے رہے۔ اُنھوں نے کربلا کی شہادتوں ہی میں جوان اور نوجوانوں اور سب سے آخر میں ششماہہ بچہ کو پیش کرکے وہ ریکارڈ قائم کردیا کہ اب حضرت عثمان کا سانحۂ قتل بالفرض اگر اس کی ذمہ داری بنی ہاشم پر ہوتی بھی تو وہ کالعدم ہوگیا لیکن اس کے بعد اہلبیت اطہار کو اسیری کے لیے اپنے بعد چھوڑ کر اور دشمن کو اپنے اس ظلم کی تکمیل کا موقع دے کر تو اُنھوں نے اپنی مظلومیت کو اُس نقطۂ معراج تک پہونچا دیا جس کے بعد ہوا خواہان بنی امیہ کی زبانیں بند ہوگئیں اور اُنھیں پھر حضرت عثمان کے واقعۂ قتل کا نام لیتے بھی شرم دامنگیر ہونے لگی ــــ لطف یہ ہے کہ حضرت عثمان کے قمیص خون آلود اور انکی زوجۂ محترمہ کی کٹی ہوی انگلیوں کی نمائش تو خود اولیائے مقتول کے ہاتھوں سے ہوی تھی

جس کے ساتھ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ اس ظلم کا مرتکب کون ہوا ہے لیکن حسین کے سر بریدہ اور اُن کے اہلبیت اطہار کی اسیری کی نمائش خود ان ہی ظالموں کے ہاتھ سے ہو رہی تھی جو اس ظلم کے مرتکب تھے اس لیے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کہیں اور ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دنیا بھی جو اس کے پہلے حضرت عثمان کی مظلومیت سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے آل ابوسفیان کے ساتھ اور بنی ہاشم سے منحرف تھی اب اُس کی ہمدردیاں منقلب ہو گئیں۔ وہ اب بنی ہاشم کی ہمدرد بن کر آل ابوسفیان سے منحرف ہو گئی یہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی اگر حضرت امام حسین اہل حرم کو اپنے ساتھ نہ لاتے۔

ع۵ اور پھر یہ دیکھیے کہ امام کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے اور تمام اعوان و انصار بھی۔ کوئی باقی نہ رہے گا مردوں میں سوائے ایک بیمار فرزند کے کوئی نہ بچے گا۔ سب دوپہر کے عرصہ میں قتل کیے جائیں گے۔ یہ بھی یقینی تھا کہ بنی امیہ آپ کے قتل کو مختلف لباس پہنا کر دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرینگے کہ آپ کا قتل مذہبی قوانین کے لحاظ سے قابل اعتراض نہیں بلکہ اصول کے مطابق ہے اور یہ کہ حسین خلیفہ وقت پر خروج کے باعث اسی کے مستحق تھے کہ اُن کو قتل کیا جائے۔ عراق میں حضرت علی کی چند روزہ خلافت کی بدولت اہلبیت رسول کو پہچاننے والے کچھ نہ کچھ موجود تھے مگر شام نے اسلامی دنیا میں آنکھ کھول کر سوائے اموی سلاطین اور اُن کے جاہ و حشم کے کچھ نہ دیکھا تھا۔ اُن کے کان علی بن ابیطالب پر سب و شتم کو نماز کے وظائف اور جمعہ کے خطبوں میں سُننے کے عادی تھے اور اُن میں سے بیشتر افراد اس مقدس ہستی اور خاندان رسول کے محترم افراد کو پہچانتے بھی نہ تھے اُن میں سے ایسے بھی تھے کہ جب اُن سے پوچھا جاتا تھا کہ یہ کون شخص ہے جس پر بعد نماز سب و شتم کی جاتی ہے تو وہ کہتے تھے اراہ لصا من لصوص العرب (یعنی) میرے خیال میں تو یہ عربستان کے ڈاکوؤں میں سے کوئی شخص ہے (عقد فرید)

ان حالات کی موجودگی میں کوئی شبہ نہیں کہ ادھر حسین قتل ہوتے اُدھر مقررین کی زبانیں خلیفۂ وقت کے طرز عمل کو سراہنے اور اُس کے حق بجانب ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتیں

ع۵ علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

کم از کم یہی ہو سکتا تھا کہ حکومت دمشق کو اس جرم سے بری ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی۔
آخر اس کے پہلے امام حسن بھی تو زہر سے شہید کیے گئے مگر اس وقت تک یہ مسئلہ مشتبہ ہی کہ ایسا کس نے کیا؟ پھر کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں بہتر آدمی جو قتل ہو جاتے، کوئی بتانے والا کہاں ہوتا کہ اُنھوں نے کاہے پر جان دی۔ بس قاتل افراد کی زبانیں ہوتیں اور اپنی بے جرمی کی داستانیں اور ادھر سے کوئی جواب دینے والا نہ ہوتا۔ اس طرح حسینی مسلک مشتبہ رہ جاتا اور نوعیت شہادت بالکل بدل جاتی۔
اس صورت میں حسین نے اپنی جان و مال و اولاد سب کو شرع اسلامی کے احیاء اور مذہبی معاد کی نگہداشت میں صرف کیا لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخ کے ورق اور کتب سیر کے صفحات نے یزید کو دمشق دیگر جنگ آزما ہستیوں کے، غازی اور مجاہد کا لقب دیدیا اور پیکر حقیقت حسین بن علی دنیا میں ہمیشہ کے لیے مجرم اور باغی مستحق قتل سمجھ لئے گئے،
یہ قتل حسین بن علی کا صرف اُن کا قتل نہ ہوتا بلکہ اُن کی تحریک، اُن کے مقصد، اُن کی ہر دلعزیزی، اُن کی پاکدامنی اور اس کے ساتھ دین اسلام اور شریعت حقہ کے قتل کا مراد ہوتا اور اس سے بڑھ کر امام حسین کی شکست کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔
امام کے لیے اپنے قتل کے بعد اس مقصد کی حفاظت کا کون سا ذریعہ تھا؟ کس پر وہ اعتماد کرتے کہ وہ اُن کی شہادت کے فلسفہ اور اُن کی حقانیت و صداقت کی تبلیغ کے حق کو ادا کرے گا؟ —— کیا وہ اپنے اعزا و انصار پر بھروسا کرتے؟ وہ تو سب اُن کے سامنے قتل ہو جانے والے تھے۔ کیا وہ بیمار فرزند زین العابدین پر اعتماد کرتے؟ وہ تو خود طوق و زنجیر میں گرفتار اور شدائد مرض میں مبتلا تھے اور اُن کا قتل کرنا سخت دل دشمنوں کے لیے معمولی بات تھی۔ پھر کون تھا جو امام کے بعد اس اہم فریضہ کا ذمہ دار ہو؟ کون دنیا کے سامنے حقانیت و صداقت کو بے نقاب کر کے دشمنوں کی حکمت عملی اور حیلہ سازی کو مکمل شکست دیتا اور بھرے ہوئے مجمعوں میں، بازاروں کے اندر پُر زور مدلل تقریروں سے ناواقف افراد کے سامنے حقیقت کو واضح کرتا؟ اُس وقت کو دیکھو اور اُن حالات پر غور سے نظر ڈالو۔ وہ ہولناک مواقع ایسے نہ تھے کہ کسی بڑے سے بڑے مرد کے قدم وہاں ٹھہر جاتے

فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی مسلمان اپنی جان پر کھیل کر اس موقع پر کھڑا ہوتا تو کیا اُس کو اتنی
مہلت بھی دی جاتی کہ وہ اپنے فرض کو ادا کر سکے۔ کون تھا جو حسین کے مقصد کی تکمیل کرتا؟
بے شک اس مقصد کو پورا کیا تو انہی بے والی و وارث عورتوں نے جو قیدی بنا کر شہر بشہر
پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کی رگوں میں
علوی فاطمی خون جوش کھا رہا تھا۔ جن کی زبانوں سے نبوی بلاغت اور علوی فصاحت
الفاظ کی صورت میں موج زن تھی۔ انھوں نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے پر جگر مردوں
سے نہ ہوتا اور ایسے سخت مواقع پر فریضۂ تبلیغ کو ادا کیا جن میں بہادروں کے دل چھوٹ جاتے

فرزند رسول کو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے اور جتنے یگانے بیگانے
آپ کے ساتھ ہیں سب شہید ہوں گے اور مردوں میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جو اسلامی
افراد کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر کے اُن کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹائے
آپ اگر اس پہلو سے چشم پوشی کرتے اور اپنے بعد کے لیے اس مقصد کا کوئی سرانجام نہ
کر جاتے تو یقیناً آپ کی قربانی غیر مکمل اور عبث رہتی اور اُس سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوتا
اس نصب العین کی تکمیل کے لیے حضرت کو مخدراتِ عصمت کا اپنے ساتھ رکھنا ضروری معلوم ہوا
امام حسین کو خوب اندازہ تھا کہ بنی امیہ اسلامی احکام و قوانین اور عربی عادات و اخلاق
سے جتنا بھی تجاوز کریں لیکن یہ نہیں ممکن کہ اُن کو بے والی و وارث عورتوں کے قتل کی ہمت ہو
نہیں ممکن کہ وہ ایک مصیبت زدہ، غم رسیدہ عورت کو قتل کریں جس کا قصور صرف اتنا ہو کہ
دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُس نے کچھ الفاظ زبان سے نکالے ہوں ۔ روزِ عاشورا اگرچہ
دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے مگر معرکۂ جنگ کے خصوصیات دوسرے
اوقات سے مختلف ہیں۔ ابن زیاد اپنے تمام ظلم و جور اور طغیان و سرکشی کے باوجود ہرگز
اس پر قادر نہ تھا کہ وہ غیر معرکۂ جنگ میں ایک بے کس و بے بس عورت کا خون بہاتا جو اس
کے سامنے ایک قیدی کی صورت میں کھڑی ہو۔ ملکی قوانین کی شرم یا عوام کے جذبات کے
خیال سے سہی۔ وہ کسی عورت کو قتل کرنا تو درکنار ظاہر بظاہر ہاتھ بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔
دیکھیے جب مخدرۂ رسالت زینب کبریٰ نے اپنی باطل شکن تقریر سے اُس کے بلکہ تمام اموی حکومت

کے فسق و فجور اور خبث و شقاوت کو طشت از بام کر دیا تو اُس نے چاہا کہ ہاتھ اُٹھائے اور جنابِ زینبؑ سے اُن کے جگر سوز الفاظ کا بدلا لے مگر اُسی کے لشکر کا ایک بڑا سردار عمرو بن حریث سامنے آگیا اور اُس نے ابن زیاد کو یہ کہہ کر روک دیا کہ عورت کو اُس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی سزا نہیں دی جاتی۔ ابن زیاد کو یہ کہہ کر ساکت ہو جانا پڑا کہ تو نہیں دیکھتا زینبؑ نے میرے ساتھ کتنی بڑی جسارت کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ اور انصارِ حسینؑ نے کربلا میں وہ یادگار نمونہ پیش کیا جس کا مثل ناممکن ہے۔ اُنھوں نے شجاعت و جرأت کا مجسمہ بن کر ثباتِ قدم و استقلال کے وہ جوہر دکھائے جن کی نظیر تاریخی صفحات میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ لیکن اگر غور کرو تو اُس سے زیادہ عظیم اور دہشت انگیز وہ موقف تھا جہاں خاندانِ رسالت کے مخدرات کو ٹھہرنا پڑا تھا اور وہ یزید اور ابن زیاد کا دربار ہے ——————

یہ بالکل حقیقت ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے انصار و اقارب کے قتل ہو چکنے کے بعد ان مخدراتِ عصمت کا ایسے ایسے ہولناک موقعوں پر قیام اور اُن کے حقائق و واقعات سے مملو خطبے نہ ہوتے تو حسینؑ کا قتل بالکل بے اثر اور اُن کا خون رائگاں ہو جاتا۔ اسلامی دنیا میں اُس کی کوئی اہمیت ہوتی نہ کسی شخص میں جذبۂ انتقام پیدا ہوتا۔ اُن کا قتل بالکل عبد اللہ بن زبیر اور اُس کے بھائی مصعب کے قتل کی صورت اختیار کر لیتا جس سے نہ کوئی مقصد حاصل ہوا۔ نہ اُس کا بدلا لیا گیا۔ لیکن حسینؑ نے عالمِ اسلامی میں آگ لگا دی۔ ان محترم خواتین کا قید سے رہا ہو کر مدینہ پہونچنا تھا کہ اموی سلطنت میں انقلاب کے حالات پیدا ہونے لگے اور یزید و ابن زیاد کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ اموی سلطنت نیست و نابود ہوی اور اس طرح کہ قیامت تک کوئی اُن کا نام لیوا پیدا نہ ہوگا "

یزید کا بعد کو قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد پر عائد کرنا ایک شکست کا احساس تھا مگر اہلحرم کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی جا چکی تھیں اُنھوں نے اُس کے افعال میں تاویل کی گنجائش نہ رکھی۔ ابن جوزی کا یہ قول مشہور ہے کہ ابن زیاد کا حسینؑ سے جنگ کرنا اتنا

تعجب خیز نہ تھا جتنا تعجب خیز یزید کا آلِ رسول کو قیدی کی صورت میں دمشق بلانا اور لب و دندانِ حسین سے بے ادبی کرنا باعثِ تعجب ہے اور بہت سی باتیں جو اُس کی بدسلوکیوں کی مشہور ہیں —— اس سب سے مقصود صرف اس مقدس خاندان کی توہین اور رسوائی تھی اور اگر اُس کے دل میں جاہلیت کے کینے اور بدر کی عداوتیں نہ ہوتیں تو وہ سر کا احترام کرتا اور اُس کے کفن و دفن کا حکم دیتا اور آلِ رسول کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آتا۔

(صواعق محرقہ ص ۱۳۱)

آپ نے گزشتہ واقعات اور پھر اس تبصرہ سے پورے طور پر اندازہ کر لیا ہوگا کہ کربلا کا جہاد دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ جو دسویں محرم کو عصر کے وقت ختم ہو گیا اور اُس کے مجاہد مردانِ راہِ خدا تھے اور ایک جہاد دسویں محرم کے بعد شروع ہوا جس کی ممبر زیادہ تر مقدس خواتینِ اہلبیت تھیں اور ایک بیمار حسین کا فرزند۔ اور اس لیے اب محل ہے کہ جس طرح اس کے قبل کے باب میں شہدائے کربلا میں سے ہر ہر فرد کے حالات تفصیلی طور سے پیش کیے گئے۔ اُسی طرح یہاں اسیرانِ کربلا میں سے نمایاں افراد کے حالات بھی علیحدہ علیحدہ بیان کیے جائیں تاکہ یہ کتاب اس حیثیت سے بھی تشنہ نہ رہ جائے۔

(۱) علی بن الحسین

زین العابدین اور سجاد کے القاب سے مشہور۔ حضرت امام حسین کے سب سے بڑے فرزند تھے جن کے ذریعہ سے قدرت کو عرب اور عجم کے کمالات کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا تھا کیونکہ والدۂ گرامی اُن کی یزدجرد بادشاہِ ایران کی بیٹی جناب شہربانو تھیں جن کے بطن سے ۱۵ جمادی الثانیہ ۳۸ھ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت حضرت علی بن ابی طالب کوفہ میں مسندِ خلافت پر متمکن تھے اور شاید دادا ہی نے پوتے کا نام اپنے نام پر علی رکھا۔ اس کے دو سال کے بعد حضرت علی کی شہادت ہو گئی۔ علی بن الحسین نے اپنے چچا اور باپ کی آغوشِ تربیت میں نشوونما پائی اور ۵۰ھ میں اپنے چچا حسن مجتبیٰ کی وفات کے بعد اپنے والدِ بزرگوار

کی خاموش زندگی میں حصہ دار رہے۔ ۶۰ھ میں اُن کی عمر ۲۲ سال کی تھی جب حضرت امام حسین کو سفرِ عراق درپیش ہوا اور آپ کے ساتھ زین العابدین بھی اس سفر میں ساتھ ساتھ رہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ راستے ہی میں یا کربلا پہونچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہو گئے اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو امام حسین کی شہادت کے موقع پر وہ اس قدر بیمار تھے کہ نشست و برخواست مشکل تھی۔ اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ ساتویں سے پانی بند ہونے کے بعد پھر سید سجاد کے لیے بھی پانی کا ایک قطرہ ملنا ناممکن ہو گیا — ایک ایسے بیمار کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تعب کچھ کم نہیں ہے۔ روزِ عاشور دن کے اکثر حصہ میں وہ غشی کے عالم میں رہے اور اسی لیے کربلا کے جہاد میں اُس طرح وہ شریک نہ ہو سکے جس طرح اُن کے دوسرے بھائی شریک ہو سکے۔ مگر قدرت کو اُن کا امتحان دوسری طرح لینا تھا۔ وہ تو اُن لُٹے ہوئے قیدیوں کے قافلہ سالار بننے والے تھے۔ عاشور کے دوسرے دن وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں ایک قیدی کی حیثیت سے تھے اور وہ بہنوں، پھوپھیوں اور دیگر عزیز خواتین کے ساتھ پابزنجیر ہو کر کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔ دربار ابن زیاد میں ان کی بہادرانہ گفتگو اور بازارِ کوفہ میں اُن کا مؤثر خطبہ اور شام میں اُن کا پُرزور احتجاج اس کے پہلے کے واقعات میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ شام سے رہائی کے بعد وہ مدینہ میں رہے اور زندگی عبادتِ خدا میں گزار دی۔ چنانچہ عبادت آپ کی مشہور ہے۔ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تھے تو چہرہ زرد ہو جاتا تھا اور فرماتے تھے کہ تم کو نہیں معلوم کس کی بارگاہ میں حاضری دے رہا ہوں۔ رات دن میں ہزار رکعت پڑھنے کا معمول تھا۔ اس کے ساتھ احکامِ شریعت اور علومِ اہلبیت کی خاموشی کے ساتھ تعلیم بھی دیتے رہے مگر اُن کی یہ خاموش اور خالص الٰہی زندگی ہی طاغوتی سلطنت کے لیے تہدید محسوس ہوتی تھی۔ آخر ۲۵ محرم ۹۵ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں ولید بن عبد الملک اموی کے زہر دلوانے سے شہادت پائی۔

(۲) زینب بنت علی

حضرت امیر المومنین علی اور حضرت فاطمہ زہرا اپنے باپ ماں کی بڑی بیٹی،

پیغمبر اسلام کی بڑی نواسی تھیں اور اس لیے پس ماندگان حسین میں نمایاں شخصیت کی حامل تھیں؛

ع۵ ،، دنیا کی کسی ممتاز ہستی کے واقعات زندگی کا مطالعہ کرو تو اُس کی ذات کو سمجھ سکو گے یعنی ادراک ذات منحصر ہے احساس صفات پر اور رفعت ذات موقوف ہے بلندی عمل پر۔ صاحب عقل وفہم ہونے کے بعد سے برادر سوم (امام حسن) کی شہادت تک کے واقعات ہی فی الاصل وہ بنیاد ہیں جن پر جناب مخدومہ کی سرشت کی تعمیر ہوئی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ حضرت ختمی مرتبت اور خاتون جنت کی وفات کے وقت وہ کم سن تھیں اور خاندان کے دو ایسے بزرگوں کے کنار پرورش سے عملاً متمتع نہ ہو سکیں تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے جد امجد اور والدہ گرامی کی زندگی کے اجزائے خصوصی اُن کی طبیعت کی ترکیب میں نہ تھے۔

نانا اور ماں کے بعد باپ اور بھائیوں کا مسلک وہ نورانی چراغ تھے جو مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک موقع پر انھیں روشنی دیتے تھے۔

واقعۂ فاجعۂ کربلا تک کم وبیش پچاس سال کی طویل مدت میں پیش آنے والے واقعات کی جنس مخصوص یہ تھی کہ وہ غیر معمولی تھے اور ان کا تحمل غیر معمولی قوت برداشت چاہتا تھا۔ اس خاصۂ خاندانی یا خصوصیت آبائی کو کم از کم چار زندہ مثالوں میں شاہزادی نے مشاہدہ فرمایا تھا اور سرزمین کربلا پر جس میں پانچواں اضافہ ہوا جو اور غیر معمولی حد تک غیر معمولی تھا اور جس کا ہر جزو اُن کی آنکھوں کے سامنے کی بات تھی۔

بہر نہج یہ بنیاد تھی جس پر اُن کے اعمال کی اس قدر بلند عمارت قائم ہوئی اور برقرار رہ سکی۔ ارض کربلا کی تیز و تند ہوائیں، کوفہ کے سیاہ بادل اور دمشق کی خوفناک بجلیاں اور ان سب کی مجموعی قوت جس میں نہ کوئی رخنہ ڈال سکی اور نہ نقص پیدا کر سکی۔ اس کا متاثر اور متزلزل ہونا کیسا؟

حکومت یزید کی ابتدا واقعۂ کربلا کی ابتدا ہے اور اسی ہیبت ناک سلسلہ کی پہلی کڑی (۱) بیعت یا (۲) قتل تھی۔ ان دو مصیبتوں نے جلاوطنی کی درمیانی اور تیسری صورت

ع۵ محمد صادق حسین صاحب بی اے (علیگ)

اختیار کی۔ ترکِ وطن کے بعد قیام وہاں تھا جہاں سے قتل کا لفظ خارج تھا۔ لیکن سوچیے بہن کے تاثرات کو جب بھائی کی زبانی اُن کے پوشیدہ قتل یا گرفتاری کی خبر اُن تک پہونچی۔

بہرحال مکہ چھوٹا اور پھر روانگی، غیر مانوس راہیں، طوالتِ سفر، نامعقول مستقبل کون سی زحمت تھی جو نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ غم کی پہلی عملی ضرب لگی اور کوفہ سے حضرت مسلم کی تنہائی آئی۔ اس حادثہ کو شاید چند ہی روز گزرے تھے کہ حُر کا رسالہ دکھائی دیا جو اس لیے تعاقب کر رہا تھا کہ سدِّ راہ ہو۔ جنگ نہ ہوئی مگر شاہزادی اب محصور ضرور تھی یہاں تک کہ بھائی کا مقتل دکھائی دیا۔ فرات اور اس کی خنک لہروں سے بجبر دور فروکش ہونا پڑا۔ بنی ہاشم کے پھول غیر آباد اور آبادی سے دور ریگستان میں اس لیے جمع کیے گئے کہ اُن کی پامالی دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ قیامِ کربلا کے آخری دنوں میں وہ وقت بھی آیا جہاں بہن نے بھائی کی زبانی حسرت آمیز اور یاس خیز اشعار سُنے جو موقع کی ترجمانی کر رہے تھے اور جب سے بہن کے جذبات میں ایک طوفان اور تلاطم برپا ہو گیا۔ زینب کی قوتِ برداشت اور طاقتِ صبر نے جواب دیا جو مضطربانہ گریہ تک منتہی ہوا۔ یہ حسین کے لیے موقع تھا۔ بھائی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بہن کو ایسے صبر کی ہدایت کی جس میں ان کی تحقیرِ منزلت یا شماتت کا موقع نہ ہو۔ حسین کی ایک خواہش تھی اور زینب کا ارادہ تھا۔ ایک عورت کا ارادہ اور عزم مگر اب فولاد اُن کی سختی کو اور پہاڑ اس کے وزن کو نہیں پہونچ سکتا اور یہ محض اس لیے کہ حسین کو ٹھیس نہ لگے۔

کربلا کا قیام کسی طرح پُرامن نہ تھا بلکہ یہاں کی سکونت میں کسی وقت بھی سکون کی حالت نہ تھی۔ فوجوں کی پے در پے آمد جن کی غرض مخفی نہ تھی۔ دشمن نے اپنی بے شمار فوجی زیادتی کے باوجود اس مختصر گروہ پر پانی بند کر دیا۔ اس کے اس عمل میں نہ عرب کی غیرت تھی نہ اسلام کی حمیت اور نہ کسی درجہ کی انسانیت۔

یہ بھی آپ پہلے سُن چکے ہیں کہ عصرِ نہم کو امام ہمام اپنے سجادہ پر غنودگی میں تھے کہ مجموعی فوج کا وسیع اور قوی جسم بیک وقت خیام کی طرف متحرک ہوا۔ لاکھوں ہتھیاروں کی جھنکار، ہزاروں بھالوں سے لرزتی ہوئی زمین، بے شمار پیادوں کا اُڑایا ہوا غبار

اور طبل جنگ کی ڈراؤنی آواز۔ اس مہیب منظر اور ہولناک مرقع نے عورتوں اور بچوں کو خوفزدہ کیا۔ مجبوراً زینب نے بھائی کو ہوشیار کیا۔ حسین کی یہ حالت غنودگی تھی یا نانا اور نواسے کا عالم راز و نیاز تھا جس سے بیدار ہو کر صورت واقعات سے بھائی نے بہن کو فوراً مطلع کر دیا۔ تاریخ کامل کے مطابق جس میں نانا نے نواسے سے فرمایا کہ تو عنقریب ہمارے پاس آ رہا ہے۔

یہ وقت ٹل گیا مگر اس امید کے ساتھ نہیں کہ کل بھی ایسا ممکن ہوگا بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ کل ایسا ناممکن ہوگا یعنی آج کے اولاد والے کل بے اولاد، آج کی سہاگنیں کل رانڈ اور آج کے آزاد کل اسیر ہوں گے۔

صبح عاشور سے عصر تک حسین جتنی لاشیں لائے زینب نے سب کی صف ماتم بچھائی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب زینب کے ماں جائے کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا۔

حسین جب رخصت آخر کے لیے خیمہ میں تشریف لاتے تو بہن نے بھائی کو وہ ملبوس کہنہ دیا جسے امام نے جا بجا سے اور چاک کر دیا تاکہ اس کی بوسیدگی دشمن کو اس کی طرف مائل نہ کرے اور لاش برہنگی سے محفوظ رہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد جناب عظمہ کے پیش نظر اس سے زیادہ نازک موقع اور سخت منظر تھا اور وہ اپنے بھائی کی شہادت کی آخری کیفیت تھی۔

کس کا تصور اس قدر قوی ہے جو اس وقت کی حالت کا نقشہ پیش کر سکے جس وقت بہن نے بھائی کے گھوڑے کو خالی دیکھا۔ زین پر سوار نہیں اور وہ خوں آلود ہے۔ باگیں کٹی ہوئی ہیں اور تیروں سے چھنا ہوا ہے۔

ع۵ "امام حسین کی چاہیتی بہن نے اپنے بھائی کی تعزیت میں یہ چند فقرے فرمائے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ان مختصر الفاظ میں پوری سیرت حسینی کی تصویر کشی فرمائی ہے۔ جناب زینب خاتون بے قرار ہو کر فرماتی ہیں:۔ "آج میرے جد بزرگوار رسولخدا کی وفات ہوئی، آج میرے باپ علی مرتضیٰ دنیا سے گزر گئے۔ آج میری ماں فاطمہ زہرا دنیا

ع۵ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

سے سدھاریں۔ آج میرے بھائی حسن مجتبیٰ راہی جنت ہوے۔ آج آل عبا کا خاتمہ ہو گیا"
یہ وہ الفاظ تعزیت ہیں جو امام حسین کے اخلاق، اُن کی پاکیزہ سیرت، اُن کے علم و حکمت
ناموری، اُن کے وقار اسلامی اور اُن کی شرافت و شان کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک مفسر و
مورخ و فلسفی ان سچے تعزیتی الفاظ سے پوری سیرت امام حسین کی صحیح صحیح لکھ سکتا ہے جو
ذرہ برابر واقعات سے فرق نہ رکھتی ہوگی۔"

عـ۵ ۱۰ ذوبح عظیم کی تکمیل کے فوراً بعد جناب زینب کے ذاتی امتحانات کی ابتدا ہوی
وہ صاحب نفس مطمئن کے دوش بدوش امتحان گاہ میں وارد ہوی تھیں اور ایسے وقت تک
محل آزمائش میں رہیں جب خود ناخدا کشتی کو منجدھار میں چھوڑ کر چل لبا۔

شہادت برادر سے پہلے جناب معظمہ کی حیثیت واقعۂ کربلا میں ضمنی یا ثانوی تھی مگر بعد
شہادت برابر وہ خود صاحب عمل تھیں یعنی شام عاشور تک حسین کے عمل میں زینب کا عمل
لپٹا ہوا تھا وبس یہی ہے جو کوئی سخت سے سخت نقاد کہہ سکتا ہے جس کے معنی یہ ہرگز نہیں
ہو سکتے کہ ان کا عمل اُس وقت عمل نہ تھا لیکن بعد شہادت عظمیٰ واقعۂ کربلا کچھ نہ ہوتا۔ اگر
زینب ہوتیں جسین کے عمل میں زینب کی شرکت تھی مگر زینب کے اقدامات کے وقت
حسین نہ تھے اور اب محض زینب تھیں زینب نے ایسے عجیب مواقع پر بھی اپنے استقلال
اور ثبات سے نہ اپنے صبر کو پامال ہونے دیا اور نہ بھائی کے وقار کو۔

پس ماندگان مظلوم کربلا نے (جن میں بیمار اور بے ہوش سید سجاد کے علاوہ کوئی مرد
نہ تھا) اپنے والی و وارث کی شہادت سے پیدا ہونے والے فطری رنج و الم اور درد
کرب کے اظہار کا موقع بھی نہ پایا تھا کہ عرب کے غیرت دار (!) انسان اور رسول کے ایماندار (!)
کلمہ گو خیام حسینی میں در آئے۔ خیام امام کی غارتگری اور آتشزدگی کے بعد تاریخ کچھ نہیں
بتلاتی مگر مشہور ہے کہ) ابتدائے شب میں پسماندگان حسین کے لیے کچھ آب و دانہ بھیجا گیا
حسین اور ہمراہیان حسین پر جب سے پانی بند ہوا اُس وقت سے اہلبیت بھی بے
آب و غذا تھے۔ بندش آب کی سخت آزمائش حسین اور جاں نثاران حسین پر

عـ۵ محمد صادق حسین صاحب بی اے

زیادہ سے زیادہ عرصہ تک فرض کی جا سکتی ہے مگر زینب اس امتحان شدید میں شہدائے کربلا سے آگے تھیں اور اُن کو کم از کم شام عاشور تک پانی نصیب نہیں ہوا تھا۔

شاید ہی دنیا میں کسی پر ایسی سخت و صعب رات گزری ہو جیسی زینب پر اُن کے بھائی کی شہادت کے بعد گزری۔ شب گزشتہ کا شب موجودہ سے محض خیالی تقابل ہی انسانی قلب کو بھرا دے گا۔

محال ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ عالم اندوہ کا خیال کر سکے اور شاید کبھی کسی خاندان پر اس سے زیادہ طویل اور اس سے زیادہ سخت رات نہیں گزری۔ اس رات کا زیادہ حصہ جناب معظمہ نے بھائی کے خورد سال اطفال کی حفاظت میں گزارا۔

صبح ہوئی، یزیدی مقتول دفن کیے گئے مگر شہید راہ خدا اور اُن کے ہمراہیوں کی لاشیں زمین کربلا پر چھوڑ دی گئیں۔

۱۱ محرم کی صبح کو جب یہ بے والی و وارث قیدی بنائے جا چکے اور یہ قافلہ ابن زیاد کے جائزہ کے لیے چلا تو مقتل شہداء سے ہو کر گزرا۔

خود حضرت سید الساجدین اس جگر خراش منظر کی تاب نہ لا سکے۔ کتاب کامل الزیارہ میں خود سید سجاد سے منقول ہے کہ جب ہم مصیبت زدوں کا قافلہ مقتل شہداء میں پہونچا تو مجھ سے میری پھوپھی نے بیتاب ہو کر دریافت کیا کہ اے یادگار رفتگاں، یہ تمہاری کیا حالت ہے کہ روح تمہارے جسم سے پرواز کرنا چاہتی ہے میں نے عرض کیا کہ میں کیونکر نہ روؤں اور کیسے ان مصائب پر صبر کروں حالانکہ میں اپنے آقا پدر بزرگوار اور اپنے چچا اور بھائی اور تمام عزیز و اقارب کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سب کے سب اس میدان لق و دق میں اپنے خون میں نہائے بے دفن اور برہنہ پڑے ہیں اور کوئی نہ ان کا نگراں ہے نہ پرساں۔ جاں بہ لب بھتیجے کی اس نازک حالت سے مطلع ہو کر جناب زینب نے فرمایا بیٹا! اس حسرت ناک منظر پر جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو صبر کرو۔ خدا کی قسم یہ ایک عہد تھا جو تمہارے جد نامدار، عم بزرگوار اور پدر عالیمقدار سے لیا گیا تھا۔

زینب نعش برادر سے جدا کی گئیں، برہنہ سر اور بے چادر قیدی کی حیثیت سے کوفہ

(جو کبھی ان کے والد بزرگوار کا دارالسلطنت تھا) لے جائے جانے کے لیے تم بلا پس و پیش تسلیم کر سکو گے کہ صفحۂ عالم پر اس وقت اُن سے زیادہ کوئی اندوہ ناک نہ تھا۔ اُن سے زیادہ مظالم دنیا نے ایک وقت میں دیکھے نہ تھے اور اُن سے زیادہ کوئی مبتلائے بلائے عظیم نہ تھا اور زینب کا دل ان بے عدیل مظالم اور بے نظیر شدائد کی وجہ سے داغ داغ تھا۔ آلام و مصائب جن پر انسان خون کے آنسو رونا چاہے گا۔

شتر لاغر پر سر برہنہ سوار اور عام نظروں سے دوچار زینب نے اس سے پہلے شاید بلکہ یقیناً کسی عام مجمع میں کوئی تقریر نہ کی تھی اور نہ شاید کسی مقید اور مقہور انسان نے اس سے زیادہ مخالف ماحول میں کبھی تقریر کی ہو مگر جب آپ نے تقریر شروع کی (جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے) تو کوفہ کا وہ حصہ جو جناب معظمہ کے حدِ نظر میں تھا آپ کے ایک اشارہ کے ساتھ خاموش ہو گیا اس کامل خاموشی میں تقریر ہوئی جس کا ہر لفظ اپنے حدِ سماعت پر چوٹ مار رہا تھا اور سننے والے مجبور، منفعل اور مبہوت سُن رہے تھے اور وہ سُن رہے تھے جس کی انھیں امید نہ تھی اور جس کا اُنھیں خیال نہ تھا۔ اپنی اندوہ ناک حالت نہیں دکھائی جاتی اور اُس پر اُن سے کسی رحم و کرم کی التجا نہیں کی جاتی بلکہ بولنے والی زبان خود اُن کے نفوس کی اصلیت اور ان کے گناہ کی حقیقت کو اُن کے سامنے چیر کر رکھ دیتی ہے۔ وہ آنکھیں جو ان قیدیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے بلند ہوئی تھیں زمین میں گڑ گئیں اور ہر نفس اپنے کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ علی کی بیٹی کا نفس مجمع پر چھا گیا تھا اور ان کی قوتِ ارادی اُس پر حکومت کر رہی تھی۔"

دوسرا موقع وہ تھا جب دربارِ ابن زیاد میں خاص طور سے ابن زیاد نے حضرت زینب سے خطاب کیا ہے اور آپ سے گفتگو کی ہے۔ کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ یہ موقع اپنی نوعیت میں بڑا ہولناک اور جگر فگار تھا۔ جہاں شجاعانِ روزگار کے قدم تھرا جائیں۔ اس جہاد کے میدان میں ثباتِ قدم زینب کبریٰ ہی کا کام تھا۔

ع۵ "حسین اور انصارِ حسین نے روزِ عاشور دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اُن کے ہاتھوں میں کیا چلتی ہوئی تلواریں تھیں اُن کے دوش پر باڑھ دار نیزے تھے۔ عزت اُن کے سر پر

ع۵ علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

سایہ فگن اور شرف اُن کے ہمرکاب تھا۔ اُن میں سے ایک اُس وقت قتل ہوتا تھا جب وہ دشمنوں میں سے سیکڑوں کو قتل کر لیتا تھا۔ وہ خوش تھے اُن کے لبوں پر تبسم تھا صرف اس خیال سے کہ تھوڑی دیر میں وہ دنیوی آلام سے نجات حاصل کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنۃ الفردوس میں جاکر قیام کرنے والے ہیں۔ یہ اُس موقف کی صورت تھی جہاں شہدائے کربلا کو کھڑا ہونا پڑا تھا لیکن وہ موقع جو زینب کبریٰ اور اُن کے ساتھ کی مخدرات عصمت کو برداشت کرنا پڑا اس سے مختلف ہے۔ وہ دربار ابن زیاد میں قیدی کی صورت میں کھڑی تھیں۔ وہ نظر اٹھا کر جدھر دیکھتی تھیں سوائے شماتت کرنے والے دشمنوں اور ہنس ہنس کر طعن و تشنیع کرنے والے اشقیا کے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ جفاکار اشخاص موجود تھے جن کی تلواروں نے اُن کے جوان فرزندوں، بھائی بھتیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔ وہ اپنے تئیں ایک ایسے مقام پر قیدی کی صورت میں دیکھ رہی تھیں جہاں وہ ایک وقت میں سلطنت کر چکی تھیں یہ تمام باتیں وہ ہیں جو انسان کو بے قابو، عقل و حواس کو مختل اور زبان کو بے طاقت بنا دیتی ہیں جن کی موجودگی میں شجاع ترین انسان ایک کلمہ زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہوا کرتا۔

زینب کبریٰ کے ان خصوصیات و حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کسی شخص کو یہ کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے کہ انھوں نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اُس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھی جس کو انصار حسین نے کربلا کے میدان میں قطع کیا۔ اس کے باوجود کیا کوئی شخص دعوے کر سکتا ہے کہ اُن طاقت ربا اور ہمت شکن حالات میں ابن زیاد کے سامنے زینب کی زبان میں لکنت یا اُن کے دل میں کسی قسم کا اضطراب یا اُن پر کسی خوف و دہشت کا اثر تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انھوں نے اس موقع پر ایسی برجستہ تقریریں کیں جن کو اگر ایک فارغ البال اور مطمئن شخص کئی راتوں دن کی فکر میں تیار کرتا تب بھی وہ اپنی نوعیت میں یادگار کی حیثیت رکھتیں۔ پھر جناب زینب نے تو ہزاروں اشخاص کے مجمع میں ایسے موقع پر ان خطبوں کو ارشاد فرمایا تھا جب وہ مصائب اور شدائد کے بتیس[۳۲] دانتوں میں زبان کی طرح گھری ہوئی تھیں، جبکہ مظالم کی چکی اُن پر چل رہی تھی اور اُن کی زندگی کا مشکل ترین موقع تھا زینب کی شجاعت و جرأت ایک مرتبہ دو مرتبہ سے مخصوص نہیں بلکہ اُس کا ظہور

ہر اُس موقع پر ہوتا رہا کہ جب مشکلات کا ہجوم اور مصائب کا اژدہام تھا جبکہ تماشا یوں سے بازار کوچے اور در آمدے مملو تھے۔ کوفہ میں داخلہ کے وقت، کوفہ سے نکلنے کے موقع پر، راہ میں، بازار شام کے اندر ہر مناسب موقع پر زینب کی زبان فریضۂ تبلیغ میں گویا تھی۔ انھوں نے حق کو واضح کرنے میں کوئی وقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انھوں نے ہر موقع پر ایسی تقریر کی جو کسی ایسے خطیب سے بھی ناممکن ہے جس کے لیے تمام خاطر جمعی اور راحت و اطمینان کے اسباب موجود ہوں۔

عـ۵ "راستے میں ہر منزل اور ہر مقام پر حکومت وقت کی طرف سے بالخصوص بلائے ہوئے لوگ سیر دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ ان اسیروں سے فطرۃً کوئی ان کے جرم کی نوعیت پوچھتا تھا تو کوئی قید کی مدت دریافت کرتا۔ کوئی نام و نسب کا جویا تھا تو کوئی مظالم کی تشریح چاہتا تھا۔ سراپا غم و الم زینب دل پر ہاتھ رکھ کر ہر جگہ اپنی سرگزشت بیان کرتی تھیں یعنی جناب معظمہ کی دربدری کے ضمن میں واقعۂ کربلا ایک منزل سے دوسری منزل تک منتقل ہوتا رہا۔ زینب کے فطری تاثرات واقعہ شہادت کو منزل بہ منزل لے گئے۔ اثر کا کیا پوچھنا! زینب کی زبان تھی اور حسین کا مرثیہ تھا۔ زینب کی یہ اسیری اور دربدری شہادت حسین کی علمبردار بن گئی بہن کے فطری نالے بھائی کی شہادت کا اعلان بن گئے اور قاتل کا عشرتکدہ مقتول کا ماتمکدہ بن گیا سب سے آخری موقع دربار یزید کا تھا۔ تمام دنیا کی کسی جری کا دنیا کی تاریخ کو پڑھ کر جس نے یزید ایسے عظیم الشان حکمران کے تخت شاہی کے اس قدر قریب اُس کی حکومت کی ایسے الفاظ میں تحقیر کی ہو۔ نہ کہ وہ جس کے بازو بندھے ہوں اور جس کی زبان تک آہ بھی نہ آسکتی ہو۔

ایسے ناقابل اظہار اور ناممکن الادراک ماحول میں گرفتار ہونے کے باوجود اس محترم خاتون نے اپنے سکون دماغی کو قائم رکھا۔ اپنے محسوسات کے اظہار کا خیال کیا اور اس اظہار کیلیے الفاظ پائے۔

یہی زینب تھیں جن کو حسین اپنی مصلحت کا ذمہ دار بنا گئے تھے۔ غور کرو اور بتاؤ کہ کیا زینب نے وہ ذمہ داری نہیں پوری کی؟ فطرت انسانی کے کچھ مخصوص جوہر پوشیدہ رہتے

عـ۵ محمد صادق حسین صاحب بی اے

اگر زینب نہ ہوتیں، انسانیت کی بلندی میں اُن سے امداد ملی۔ ان کی غیرت، شرافت اور استقلال صنف نازک کے لیے ایک مایۂ ناز اضافہ ہے۔

آج چاردانگ عالم میں حسین کا نام لیا جاتا ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں حسین کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ کثرت ذکر بہت کچھ مجالس کا نتیجہ ہے اور مجالس کی بنیاد بھی اسی سوگوار اور جاں نثار بہن کی قائم ہوئی ہے۔

جناب زینب نے علی الترتیب پہلی مجلس عزا دمشق میں (رہائی کے فوراً بعد) دوسری کربلا میں (شہید بھائی کی قبر پر) اور پھر مدینہ منورہ میں برپا کی۔

یزید جس کو ارض کربلا پر ممکن ظلم و جور کے ساتھ فنا اور برباد کر چکا تھا دمشق میں اُس کا ماتم ہوا۔ یوں سمجھیے کہ یزید نے جس کو مٹایا زینب نے اُسے زندۂ جاوید کر دیا۔

(۴۳) ام کلثوم بنت علیؑ

علی و فاطمہ کی چھوٹی بیٹی۔ رسول کے زمانہ کے آخر میں متولد ہوئیں۔ شاید دو ایک سال ہی کی عمر میں نانا سے اور اس کے ایک سال کے اندر ہی ماں سے جدا ہو گئیں۔ پھر باپ اور بھائیوں کی تربیت میں رہیں۔ حضرت علی نے اپنے بھتیجے محمد بن جعفر بن ابی طالب کے ساتھ ان کا عقد کر دیا۔

ع۱ "پھر بیوہ ہونے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ رہیں اور آپ کے ساتھ کربلا تشریف لے گئیں"

قدیم مورخ ابوحنیفہ دینوری نے تصریح کی ہے کہ "امام حسین مکہ تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ آپ کی دونوں بہنیں زینب اور ام کلثوم تھیں (الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۰)

ع۲ "روز عاشورا آپ ہی نے جناب امام ہمام کو شاہزادہ علی اصغر کی پیاس کی اطلاع دی" (ینابیع المودۃ صفحہ ۳۴۶)

امام حسین کا وقت آخر جو سلام منقول ہے اُس میں بھی آپ کا نام خصوصیت کے ساتھ

ع۱ مولانا معین شاہ نظامی حیدرآباد دکن۔

درج ہے:۔ یا ام کلثوم و یا زینب اختی و یا فاطمۃ و سکینۃ ابنتی و یا رقیۃ و عاتکہ والی باب و ام لیلیٰ علیکن السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ (ینابیع المودۃ ص۳۴۶)

اہل کوفہ اپنے بچوں پر سے جوز و خرما تصدق کر کے پھینکتے تھے تو ام کلثوم نے کہا صدقہ ہم پر حرام ہے۔ (ینابیع المودۃ)"

بازار کوفہ میں جناب زینب کے خطبہ کے بعد ام کلثوم نے بھی خطبہ پڑھا ہے۔

"دربار یزید میں ام کلثوم نے یزید سے خواہش کی کہ مجھ اتنی اجازت دو کہ میں اپنے بھائی کا سر اٹھالوں اور اُس کو بوسہ دے لوں اور رو لوں۔ یہ سُن کر اہل دربار رونے لگے (ینابیع المودۃ ص۳۵۴)"

واپسی پر جب مدینہ کی دیواریں نظر آئیں تو ام کلثوم رونے لگیں اور یہ اشعار پڑھے۔

مدینۃ جدنا لا تقبلینا فبالحسرات والاحزان جینا

خرجنا منک بالاھلین جمعا رجعنا لا رجال ولا بنینا

یعنی اے نانا کے مدینہ ہم اس کے لائق نہیں کہ تجھ میں داخل ہوں اس لیے کہ ہمہ تن رنج و حسرت ہو کر آئے ہیں جب نکلے تھے تجھ سے تو تمام عزیز موجود تھے اور اب واپس آئے ہیں اس طرح کہ نہ مرد باقی رہے اور نہ بچے"

آپ کی وفات ۵۴ھ میں واقع ہوی

(۴) رقیہ بنت علی

ان کا عقد حضرت مسلم بن عقیل کے ساتھ ہوا تھا۔ مدینہ سے اپنے شوہر کی معیت میں حسین کے ساتھ چلی تھیں۔ جناب مسلم مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ رقیہ اپنے بھائی امام حسن کے ساتھ رہیں۔ مکہ سے روانگی کے بعد راستے میں اپنے شوہر کی خبر شہادت سُنی اور کربلا میں پہونچ کر اپنی اولاد بھی حسین پر نثار کی۔ پھر اسیری میں اپنی دونوں بہنوں زینب و ام کلثوم کے ساتھ رہیں۔

ع مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

(۵) لیلیٰ ثقفیہ

حضرت علی اکبرؑ کی والدۂ محترمہ تھیں ان کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ شاہزادہ علی اکبرؑ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ کربلا میں موجود تھیں اور اسیری میں جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کے ساتھ رہیں مگر اس کے بعد ان کے حالات تاریکی میں ہیں اور تاریخ میں ان معظمہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

(۶) رباب بنت امرءالقیس کندی

جناب علی اصغرؑ کی والدۂ بزرگوار جن کا تذکرہ اسی شاہزادہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ واقعۂ کربلا میں موجود تھیں اور اسیری میں بھی اہل حرم کے ساتھ شریک رہیں لیکن رہائی کے بعد تاریخ بتلاتی ہے کہ اس مقدس خاتون نے مدینہ جانے سے انکار کر دیا اور ایک سال تک قبر حسینؑ پر خیمہ لگا کر مجاور رہیں اور گریہ و بکا میں مصروف رہیں۔ یہ بھی شاید مظلومیت حسینؑ کی اشاعت کا ایک طریقہ تھا۔ ایک سال کے بعد خیمہ اکھڑوا دیا اور مدینہ واپس ہوئیں۔

(۷) فاطمہ بنت الحسینؑ

حضرت امام حسینؑ کی عزیز بیٹی تھیں جن کی شادی بھی حسینؑ نے اپنے بھتیجے فرزند امام حسنؑ کے ساتھ کر دی تھی۔

عصر عاشورا اور بازار کوفہ اور دربار یزید کے واقعات میں ان کا ذکر موجود ہے یہ واقعۂ کربلا کے بعد عرصہ تک زندہ رہیں اور راویان احادیث میں داخل ہیں۔

(۸) سکینہ بنت الحسینؑ

جناب رباب کے بطن سے، شاہزادہ علی اصغرؑ کی حقیقی بہن تھیں۔ واقعۂ کربلا میں

نہایت کمسن تھیں۔ تاریخی طور پر ان کا بقاء واقعۂ کربلا کے بعد مشکوک ہے

کامل بہائی وغیرہ میں زندان شام میں امام حسین کی ایک دختر کی وفات لکھی ہے۔ وہ فاطمہ یقیناً نہ تھیں سکینہ ہوسکتی ہیں۔

جبکہ خواتین اہلبیت کا تذکرہ ہو رہا ہی تو بعض ایسی خواتین کا بھی یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو واقعہ کربلا میں خود تو موجود نہ تھیں مگر کربلا کے واقعات سے اہم تعلق رکھتی ہیں۔

---

(۹) ام المومنین ام سلمہؓ (زوجہ حضرت رسول)

بڑی بلند مرتبہ معظمہ اور ازواج رسالتمآب میں انتہائی پاک نہاد اور مقدس بڑے درجہ کی بی بی تھیں۔ حضرت نے ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر کے بعد اُن سے عقد کیا پیغمبر کی وفات کے بعد ام سلمہ کو حضرت کے اہلبیت یعنی علی بن ابی طالب اور حسن و حسین سے خاص خصوصیت رہی۔ اُس موقع پر جب ام المومنین عائشہ نے حضرت علی کے مقابلہ میں صف آرائی کی اور یہ خبر مدینہ میں پہونچی تو ام سلمہ نے حضرت علی سے کہا کہ اگر میرے لیے گھر سے نکلنا شرعاً ممنوع نہ ہوتا اور مجھے یقین نہ ہوتا کہ آپ اسے کبھی گوارا نہ کرینگے تو میں خود آپ کے ساتھ جنگ میں چلتی مگر مجبور ہوں کہ میرا نکلنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

بہرحال یہ میرا فرزند ہے عمر جس کو میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ اسے میں آپ کے ساتھ بھیجتی ہوں اور یہ آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک رہے گا۔ عمر بن ابی سلمہ برابر حضرت علی کے ہمراہ رکاب تھے اور آپ نے انھیں بحرین کا حاکم بنا دیا جس پر وہ ایک عرصہ تک قائم رہے (تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۶۷)

جب حضرت امام حسین نے سفر عراق اختیار کیا تو حضرت نے تبرکات رسول اور اہلبیت کے مخصوص علوم کی کتابیں یہ سب چیزیں جناب ام سلمہ ہی کے سپرد کیں (تنقیح المقال فصل الکنی والالقاب والنساء ص ۷۲)

ترمذی کی روایت ہے کہ ام سلمہ نے روز عاشور حضرت رسول اللہ کو خواب میں دیکھا کہ رو رہے ہیں اور حضرت کے سر و ریش پر خاک پڑی ہوئی ہے۔ جناب ام سلمہ نے سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ابھی ابھی حسین قتل ہوئے (صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر صہ ۱۱۸)

صحیح مسلم کی ایک روایت سے جناب ام سلمہ کا وجود ۶۳ھ تک معلوم ہوتا ہے مگر ایک قول یہ ہے کہ جناب ام سلمہ نے اُسی روز یعنی ۶۱ھ کے عاشور کو انتقال کیا۔

فرنگی محل کے مشہور عالم ابو الحسنات الحاج مولوی عبد الحی انصاری نے مقدمہ ہدایہ میں بسلسلہ حالات ام سلمہ لکھا ہے کہ امام حسین کی خبر شہادت سننے کے بعد اُن کی وفات ہوئی (مقدمہ ہدایہ صہ ۵۰)

(۱۰) امّ البنین (زوجہ حضرت علی بن ابیطالب)

ان کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ حضرت ابو الفضل العباس اور اُن کے بھائیوں کے حالات میں ہو چکا ہے۔

جس ماں کے اکیلے چار بیٹے ہوں اور وہ چاروں ایک ساتھ قتل ہو جائیں اُس کے تاثرات قلم کی زبان سے کہاں ادا ہو سکتے ہیں۔ شرح کامل میں ابوالحسن اخفش عرب کے بہت بڑے ادیب کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ ام البنین واقعۂ کربلا کی اطلاع پانے کے بعد سے برابر روزانہ بقیع کی طرف چلی جاتی تھیں اور جناب عباس کے بچے عبید اللہ کو اپنے ساتھ لے جاتی تھیں اور عباس کا مرثیہ پڑھتی تھیں۔ یہ نوحہ اتنا دردناک ہوتا تھا کہ مدینہ کے لوگ اُس کو سُننے جمع ہوتے تھے اور مروان بن الحکم ایسا دشمن بھی اکثر وہاں چلا جاتا تھا اور ان پر درد اشعار کو سُن کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ذرا ان اشعار کا مضمون سُنیے، دیکھیے تو وہ کیا ہیں؟ اُن میں فقط درد ہی نہیں بلکہ وہ قوت نفس بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عباس ایسے شیر کی ماں کے دل سے نکلے ہوئے ہیں

"کہاں ہیں دیکھنے والے میرے شیر عباس کے جب وہ حملہ آور تھا بھیڑوں کے گلّے پر اور اُس کے پیچھے تھے حیدر صفدر کی اولاد کے باہمت کئی شیر۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے فرزند کے سر پر گرز لگا۔ اُس وقت جب اُس کے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ ہائے افسوس میرے بچے کے سر کو گرز نے شگافتہ کر دیا۔ اے عباس مجھے یقین ہے کہ اگر تیری تلوار تیرے ہاتھ میں رہتی تو کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ تیرے قریب آسکے"۔

یہ اشعار بھی جناب ام البنین کے ایک خاص اثر کے حامل ہیں:۔

"اے لوگو اب مجھے "ام البنین" (فرزندوں کی ماں) نہ کہو۔ اس سے تو مجھے میرے شیر یاد آجاتے ہیں۔ تھے کبھی میرے کئی بیٹے جن کے نام سے میں پکاری جاتی تھی۔ اب تو میرے بیٹے ہی نہیں رہ گئے۔ چاروں جیسے باز ہائے شکاری سب موت کے گلے میں باہیں ڈال چکے۔ نیزوں نے اُن کے جسم کے ٹکڑے کئے اور سب زمین پر بے جان ہو کر گر گئے۔ ارے کیا یہ صحیح ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ عباس کے ہاتھ بھی قطع ہو گئے تھے!!"

ساتواں باب

حسینی شخصیت تاریخ، مذہب اور اخلاق و انسانیت کے نقطۂ نظر سے

کارنامۂ حسینی پر مختصر مگر جامع تبصرہ

گزشتہ واقعات کی روشنی میں

علہ "دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں اور انشا نویسوں نے جن کی تخئیل کی بلند پروازی پر ایک زمانہ ایمان لا چکا ہے کامل انسان کی خیالی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے مگر اُن کے خیالی مخلوقات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو فضائل اخلاق میں امام حسینؑ کا مقابلہ کرسکے جن لوگوں نے اس بشریت سے بالاتر انسان کی سیرت کا غور سے مطالعہ کیا ہے اُن کے نزدیک لفظ "حسین" ایک مرقع ہے جس میں بہترین و شریف ترین خصائل انسانی کی بے نظیر اور غیر فانی تصویریں نظر آتی ہیں۔"

علہ۲ "ہر مادہ میں تو قوت کشش ثابت ہی ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بعض اسمار اور اوقات میں بھی یہ کشش خاص طور پر پائی جاتی ہے اس حد تک کہ وہ ہماری توجہ خود بخود اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے ناموں اور چیزوں کو مختلف سرخیوں کے ماتحت فہرستوں میں مرتب کر دیتی ہے۔ چنانچہ شہدار کی فہرست میں حسینؑ کا نام سرے پر نظر آتا ہے اور یہ بسبب اپنی جاذبیت کے ہے جس نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔"

اس جاذبیت کا سبب صرف حسینی کردار کی بلندی اور بے داغ ہونے کی خصوصیت ہے

علہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی علہ۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

جس سے وہ بشریت کا ایک مثالی نمونہ بننے کے قابل ہوا ہے، ایسی بشریت جس میں خود
بشریت کی کمزوریاں بے مثال درجہ پر معدوم نظر آتی ہیں۔ عام طور پر ؎ انسان
کی حیات نفسی دو مختلف و متباین عناصر سے مرکب نظر آتی ہے۔ اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کو
نفس شاعرہ کہتے ہیں جس کے تحت میں وہ تمام کیفیتیں داخل ہیں جن میں انسان اپنے پورے
شعور و ارادہ سے کام لیتا ہے۔ دوسرے شعور خفی یا نفس نیم شعوری جس کے تحت میں آدمی
سے اکثر ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جنہیں اپنے کامل شعور و ارادہ سے وہ کبھی عمل میں لاتا
اس طرح انسان کی زندگی میں بکثرت ایسے موقعے آتے ہیں جب دماغ بجائے حاکم کے محکوم
ہو جاتا ہے۔

مثلاً سقراط ایسے یونانی فلسفی کو ہم پیش کرتے ہیں جس نے ارسطو، افلاطون، دیوجانس
اپیکورس ایسے فلک فلسفہ کے آفتاب پیدا کئے اور آج تک اس کی علمی روشنی سے دنیا چکاچوند
میں ہے ساتھ ہی اس کی جلالت علمی کے زہد و تقویٰ، پاکبازی، دیانتداری، راستبازی،
حلم، ضبط نفس اور تمام محاسن اخلاق اس کی ذات میں مجتمع تھے۔ لیکن دفعتہً اس مرقع کا دوسرا
رُخ نظروں کے سامنے آتا ہے کہ "اسپیشیا" مشہور زن بازاری کے حلقہ بگوشوں کے مجمع میں
سقراط بھی نظر آتے ہیں۔ پھر آبرو باختہ عورت "ڈیوٹیما" کے خلوت سرا میں سقراط سا زاہد
نظر آتا ہے۔ تیسرے موقع پر "الکیابنڈس" ہوشربا ساقی کے ہاتھوں سے مینا بانہ ساغر شراب
لے کر پیتے نظر آتے ہیں اور بھی ایسی بیسیوں نظیریں ہیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں بھی جب ایسے
نمونے ہم کو ملتے ہیں تو ہم کو مایوس ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ نفس کی نیم شعوری کارگزاری سے
کوئی نفس انسانی مستثنیٰ نہیں ہے۔۔۔ پھر اگر ایسے کچھ نفوس مل جائیں جن کے کردار کا کوئی
گوشہ اس قسم کی کمزوریوں سے آلودہ نظر نہ آئے تو یقیناً انسانیت کے سرتاج قرار پائیں گے۔
امام حسین کی سیرت زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں کسی جگہ شعور
کامل کے خلاف کوئی بات نظر نہیں آتی اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ انسان کامل تھے
جنہوں نے اپنے ساتھیوں کے بہتر نمونے ایسے پیش کئے جو عدالت، حریت، مساوات، عزیمت،

؎ علامہ ہندی مولانا سعید احمد صاحب۔

جوشِ عمل، عزتِ نفس، ایثار و قربانی، شجاعت، صبر و رضا، خدا شناسی، پاکبازی و پاکدامنی کے مجسمہ تھے۔

کربلا سے بڑھ کر کون سا موقع دہشت و ہراس کا ہو سکتا ہے جس میں بڑے بڑے بہادر بدحواس ہو جاتے ہیں لیکن کربلا والے اس گیر و دار میں ایک دوسرے سے مزاح کرتے نظر آتے ہیں۔ بچے موت کو شہد سے زیادہ شیریں بتاتے ہیں۔

تاریخیں دیکھو، سخت اشتعال کے وقت کون اپنے آپے میں رہتا ہے۔ کربلا میں قدم قدم پر اشتعال انگیزی تھی مگر اللہ رے صبر و تحمل۔ وہ کوہ وقار کوئی قدم بغیر اپنے قائد کی اجازت کے نہ اٹھاتے تھے۔ اولاد سے بڑھ کر دنیا میں کون چیز محبوب ہے کیا کہنا کربلا کی خواتین کا جو گودوں کے پالوں کو اسلحہ سج کر خدمت امام میں مرنے کے واسطے بھیج رہی تھیں۔

کون ماہر نفسیات بغیر اقرار کئے رہ سکتا ہے کہ قوی ترین ہیجانات اپنی اچانک تیزی سے عام انسانوں کے نفسی توازن کو درہم و برہم کر دیتے ہیں لیکن کربلا والوں میں یہ نفسیاتی قانون اُن کی شعوری طاقت نے بیکار و معطل کر دیا تھا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جو اُن کو اور بالخصوص اُن کے قائد امام حسین کو تاریخ میں ایک عجیب انسان بنا کر پیش کر رہی ہیں۔

عام طور سے فطرت کے معنی وہی سمجھے جاتے ہیں جو عامہ افراد بشر کی افتادِ طبع نظر آتی ہے اور اس اعتبار سے انسان کامل وہ ہے جو خلاف فطرت بات پر قادر ہو۔ امام حسین نے کربلا میں اپنی ذات سے اور اپنے اصحاب کی ذات سے فطرت شکنی کر کے دکھا دی

(۱)۔ فطرت یہ ہے کہ پتھر یا تیر و نیزہ آتے دیکھے تو اپنے کو بچائے یا کم از کم جھجکے۔ مگر وہاں امام حسین نماز ظہر ادا کر رہے ہیں اور سعید بن عبد اللہ اور زہیر بن قین سامنے کھڑے ہیں۔ دشمن کی صف سے جو تیر آتا ہے یہ مقدس جاں نثار جھک کر اپنے اوپر روکتے ہیں

(۲) انسانی فطرت ہے کہ تیروں یا پتھروں کی بارش میں گود کے بچہ کو باپ سینہ کے نیچے چھپا لے گا۔ امام حسین بچہ کو ہاتھوں پر بلند کر کے حرملہ کے تیر کا نشانہ بنوائے دیتے ہیں

(۳) عام فطرت یہ ہے کہ نفس کو کنبہ پر مقدم کیا جاتا ہے اور کنبہ کو غیروں پر۔ امام حسین

اپنے اور اپنے عزیزوں کی پیاس کا خیال نہیں کرتے اور تمام پانی حر کے لشکریوں اور اُن کے مرکبوں کو پلا دیتے ہیں۔

(۴)۔ فطرت ہے کہ زخموں اور شدتِ مصائب سے چہرہ پر آثارِ افسردگی ضرور نمایاں ہوتے ہیں لیکن امام حسین کا چہرہ جس قدر مصائب کی شدت ہوتی اُسی قدر چمکتا جاتا تھا

۵۔ فطرت ہے جب دو مصیبتیں سامنے آئیں ایک بہ نسبت دوسری کے سخت تر ہو تو آسان مصیبت اختیار کی جاتی ہے لیکن امام حسین کے کارنامہ میں دیکھو گے کہ وہ آسان پر سخت کو ترجیح دیتے تھے۔ بیعت نہ کر کے شہادت قبول کر لیتے ہیں اور تنہا اس مہم پر جلنے کے بجائے زن و بچہ کو ساتھ لینا پسند کرتے ہیں۔"

عـ۵ ۔حضرت امام حسین کی عمر کربلا میں ۵۷ سال کی تھی۔ اس عمر میں خیالات پختہ ہوتے ہیں۔ خواہشوں میں استحکام ہوتا ہے۔ جو بات انسان کرنا چاہتا ہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتا ہے اس عمر میں اگر کوئی میدان میں سر دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو جان کر آتا ہے کہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ یہ خود کشی کی منزل نہیں ہوتی حقیقۃً دماغ اور دل دونوں ایک ساتھ سوچتے ہیں، احساسات اور دماغ کی طاقتیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ انسان رو میں کام نہیں کرتا۔ ایک ادنیٰ انسان بھی ۵۷ برس کی عمر میں پختہ کار سمجھا جاتا ہے۔ پھر حسین نے تو آنکھیں بند ہونے کی حالت میں ۵۷ سال نہیں گزارے تھے بلکہ وہ ایسے حادثات اور واقعات سے بھرے ہوئے تھے کہ نہ صرف عرب کی تاریخ نے بلکہ دنیا کی تاریخ نے پلٹے کھائے تھے۔"

ہر ایک کا فلسفۂ حیات ہوتا ہے کسی کا پست اور کسی کا بلند۔ اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا فلسفۂ حیات بلند تو ضرور ہے مگر وہ خیال کے دائرہ تک محدود ہے۔ عمل کا نہ انہیں موقع ملا۔ نہ موقع آنے پر کامیابی ہوئی مگر حسین کا ایک فلسفۂ حیات تھا۔ جس پر وہ زندگی بھر جیے اور اُسی پر آخر کو اس طرح مر گئے کہ اُس فلسفہ کو ہمیشہ کی زندگی دے گئے۔

وہ فلسفہ اُن کے اقوال سے بھی ظاہر ہے اور اُن کے اعمال سے بھی۔

امام حسین کے مقولات

بہت سے ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو اپنے اقوال میں اعمال سے زیادہ دکھائی دیتے ہیں

عـ۵ سید احتشام حسین صاحب ماہلی ایم۔اے

مگر حسین عمل کے انسان تھے اور اُن کا ایک عملی کارنامہ ایسا تھا جس نے دنیا کے زبان و قلم کی تمام طاقتوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اس لیے آپ کے مقولات کو یکجا کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی۔ پھر بھی جستجو سے آپ کے مقولات متفرق طور سے مختلف کتابوں میں کچھ مل جاتے ہیں جنھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اقوال بہت حد تک آپ کی زندگی کے مختلف رخوں کے ترجمان ہیں۔ ان میں نظم بھی ہیں اور نثر بھی۔

عـ۵ " فرماتے ہیں:-

(۱) من جاد ساد ومن بخل ذل

" جس نے دیا لیا اُس نے سرداری پائی اور جس نے کنجوسی کی اُس نے ذلت اٹھائی۔

(۲) اجود الناس من اعطیٰ من لا یرجوہ۔

" سخی داتا وہی ہے جس نے اُس کو بھی دیا جس کو اس سے ملنے کی کوئی توقع نہ تھی "

(۳) من انعم اللہ منکم فلینعم علی غیرہ۔

" جس کو خدا نے دیا ہے وہ اوروں کو بھی دے۔

(۴) حوائج الناس الیکم من نعم اللہ علیکم

" اہل حاجت کا تمھارے پاس آنا بھی خدا کی دین ہے "

(۵) اغن عن المخلوق بالخالق تغن عن الکاذب والصادق

واستورزق الرحمٰن من فضلہ فلیس غیر اللہ من رازق

من ظن ان الناس یغنونہ فلیس بالرحمٰن بالواثق

او ظن ان الناس یغنونہ زلت بہ النعلان من حالق

" خدا سے لو لگا کر مخلوق سے بے نیاز ہو جا تو پھر کسی جھوٹے سچے کی تجھے پرواہ نہ رہے گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگ۔ غیر خدا روٹی دینے والا نہیں ہے۔ جس کا خیال ہو کہ لوگ اُس کو غنی کر دینگے اُس کو خدا پر اعتماد نہیں اور جو یہ سمجھتا ہو کہ لوگ اُس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً بڑی پستی میں گرنے والا ہے "

عـ۵ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

(۶) کلما زید صاحب المال مالا زید فی ھمّہ فی الاشتغال

"ادھر تو مال والوں کے مال بڑھتے ہیں اور ادھر اُن کے افکار و مصائب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے"

(۷) من وصل الی اللہ انقطع عن غیرہ

"جو خدا سے متصل ہوا پھر وہ دوسروں سے جدا ہو گیا"

(۸) ع۱ "فرماتے ہیں:-

سبقت العالمین الی المعالی بحسن خلیقۃ وعلو ھمہ

ولاح بحکمتی نور الھدیٰ فی لیال فی الضلالۃ مدلھمہ

یرید الجاحدون لیطفئوہ ویأبی اللہ الا ان یتمہ

"میں بارگاہ الٰہی میں عشق الٰہی کی تمام منزلیں طے کر کے کل کائنات و مخلوقات سے سبقت لے گیا اور میدان عشق الٰہی جیت لیا۔ میری حکمت علمی اور حسن اخلاق سے گمراہی کی سخت تاریکیوں میں ہدایت کا نور روشن ہو گیا ہے۔ منکر بن چاہتے ہیں کہ اس کو گل کر دیں مگر قدرت اس کو درجہ کمال تک پہونچا کر رہے گی"

(۹) ع۲ "ابن کثیر نے بدایۃ النہایہ میں اسحٰق بن ابراہیم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت امام حسین نے جنۃ البقیع میں قبور شہدا کی زیارت کی اور یہ شعر پڑھے:-

نادیت سکان القبور فاسکتوا فاجابنی عن صمتھم ترب الحشا

قالت اتدری ما صنعت بساکنی مزقت لحمھم وخرقت الکسا

وحشوت اعینھم ترابا بعد ما کانت تأذی بالیسیر من القذا

اما العظام فاننی مزقتھا حتی تباینت المفاصل والشوی

قطعت ذا من ذا ومن ھذا کذا فترکتھا مما یطول بھا البلیٰ

"میں نے قبروں کے رہنے والوں کو آواز دی تو وہ خاموش رہے مگر مجھے جواب دیا اُن کی خاموشی سے خاک مرقد نے۔ کہا کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اپنے رہنے والوں

ع۱ مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی ع۲ علامہ سید محسن عاملی دمشقی (اعیان الشیعہ)

کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے اُن کے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کھال کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اُن کی آنکھوں کے اندر مٹی بھر دی ہے۔ حالانکہ اس کے پہلے ذرا سا تنکا پڑ جاتا تھا آنکھ میں تو چین نہ آتا تھا۔ رہ گئیں ہڈیاں، وہ بھی جدا جدا ہو گئیں یہاں تک کہ جوڑ بند صاف ظاہر ہیں" میں نے اس کو اُس سے اور اُس کو اس سے الگ کر دیا ہے یہاں تک کہ بوسیدگی و کہنگی کے آثار اُن میں صاف ظاہر ہو گئے"

(۱۰) ابو مخنف نے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں،

ذهب الذين احبهم　　وبقيت فيمن لا احبه

فيمن اراه يسبني　　ظهر المغيب ولا اسبه

يبغي فسادي ما استطاع　　وامره مما اربه

حنقا يدب الى الضرا　　ء وذاك مما لا ادبه

ويرى ذباب الشر من　　حولي يطن ولا يذبه

واذا خبا وغر الصدو　　ر فلا يزال يشبه

افلا يعيج بعقله　　افلا يثوب اليه لبه

افلا يرى ان فعله　　مما يسور اليه غبه

حسبي بربي كافيا　　ما اختشي والبغي حسبه

ولقل من يبغي عليه　　فما كفاه الله ربه

"گزر گئے وہ لوگ جنہیں میں محبوب رکھتا تھا اور اب میں ایسے انسانوں میں رہ گیا ہوں جو مجھے کسی طرح پسند نہیں۔ اُن کا کردار یہ ہے کہ میں تو انھیں ذرا بھی برا بھلا نہیں کہتا مگر وہ پیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے مجھے نقصان پہونچاتے ہیں اور میں اُن کے فائدہ کا درپے رہتا ہوں۔ وہ گرد و پیش شرارتوں کے مگس اُڑتے دیکھتے ہیں مگر اتنا گوارا نہیں کہ وہ اُنھیں ہٹا دیں بلکہ جب دلوں میں عداوت کی آگ بجھنے لگتی ہے تو وہ اُسے اور شعلہ ور بنا دیتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ممکن کہ یہ لوگ اپنی سمجھ سے کام لیں؟ کیا ایسا نہ ہوگا کہ ان کی طرف عقل واپس آئے؟ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا

طرز عمل انجام میں خود ان کے لیے تباہ کن ہے؟ میرے لیے میرا پروردگار کافی مددگار ہے جس کے ہوتے مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ بہت کم ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی پر ظلم و ستم کیا جائے اور خدا اس کی مدد نہ کرے"

(۱۱) ابن صباغ مالکی نے فصول مہمہ میں اور علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ میں ابن خشاب کی روایت سے یہ اشعار نقل کیے ہیں:۔

اذا ما عضک الدھر فلا تجنح الی خلق

ولا تسأل سوی اللہ تعالی قاسم الرزق

فلو عشت و طوفت من الغرب الی الشرق

لما صادفت من یقدر ان یسعد او یشقی

"جب زمانہ کے دانت تمھیں زخمی کریں تو مخلوق کی طرف کبھی نہ جھکو اور سوائے خدا برتر کے جو رزق کا تقسیم کرنے والا ہے کسی سے سوال نہ کرو اس لیے کہ اگر تم مغرب سے مشرق تک چکر لگا ڈالو تب بھی کوئی ایسا شخص نہ پاؤ گے جو مقدر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو"

(۱۲) وان تکن الدنیا تعد نفیسۃ فدار ثواب اللہ اعلی و انبل

وان تکن الابدان للموت انشأت فقتل امرئ بالسیف فی اللہ افضل

وان تکن الارزاق قسما مقدرا فقلۃ حرص المرء فی الرزق اجمل

وان تکن الاموال للترک جمعھا فما بال متروک بہ المرء یبخل

"اگر مان بھی لیا جائے کہ دنیا کوئی قیمتی چیز ہے تب بھی خدا کے ثواب کا محل زیادہ بلند اور معزز ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ اجسام موت ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں تو انسان کا تلوار سے قتل ہونا اللہ کے راستے میں زیادہ بہتر ہے اور جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق ہر ایک کا مقرر مقدار ہی میں ملے گا تو رزق کے بارے میں ہوس سے کام نہ لینا ہی زیادہ مناسب ہے، اور جب یہ یقینی ہے کہ اموال جمع ہوتے ہیں بعد میں چھوڑ جانے کے لیے تو کیا حماقت ہے کہ ایسی شے کے ساتھ انسان بخل سے کام لے"

گزشتہ مقالات اور اشعار کا اگر نگاہ تدبر سے تجزیہ کیا جائے تو اُن میں چند عناصر نمایاں طور پر موجود ہیں :۔

(۱) اللہ کی جانب انقطاع کلی۔ یعنی انسان کسی نفع کی امید، کسی نقصان سے بچاؤ کی توقع۔ کسی خواہش کی تکمیل کا آسرا کسی مادی مخلوق سے نہ رکھے یہ وہ چیز ہے جو زبان سے کہنے کو چاہے بہت سے لوگ کہتے ہوں لیکن عملی طور سے وہ مفقود نظر آتی ہے اور اگر یہ ایک انسان کے دل و دماغ پر پورا قبضہ پالے تو وہ اس کے کیرکٹر کے بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

انسان سچائی کے راستے سے الگ ہٹتا ہے زیادہ تر سنہری اور روپہلی امیدوں کی بدولت اور خطرۂ امروز یا اندیشۂ فردا کے سبب سے۔ اور جب یہ خیال پورے طور سے دل و دماغ پر چھا گیا کہ نفع نقصان غیر خدا کسی سے ذرہ بھر بھی وابستہ نہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُسے راہ حق سے منحرف نہیں کر سکتی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ اُس کے ماننے والوں کے ذہنی تخیل میں وہ ایک بلند طاقت ہے جو صرف نیکی کو پسند کرتی ہے اور برائی سے نفرت رکھتی ہے اور ایک ایسی طاقت کو جس نے تفکرات و احساسات کا مرکز بنا لیا ہو پھر کیا ممکن ہے کہ وہ عملی طور پر برائی یا ظلم کے قریب بھی جائے حسین اگر دنیاوی نفع نقصان کی پرواہ کرتے ہوتے اور کسی دنیاوی طاقت کو قبلۂ حاجات بناتے یا اُس کے اقتدار سے مرعوب ہوتے تو یزید کی بیعت شروع میں نہ بھی کی تھی، تو اس وقت کر لیتے جبکہ شہنشاہی طاقتیں پورے جاہ و جلال کے ساتھ اُن کے سامنے صف بستہ ہو گئی تھیں اور قہر و ظلم کی بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوند رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا کی کسی طاقت اور عالم کی کسی نعمت کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اس لیے راہ حق سے اُن کو کوئی شے ہٹا نہیں سکتی تھی۔

نمبر ۵، نمبر ۷، اور نمبر ۱۱ کے مقولات و اشعار غیر خدا سے طمع کی نفی کرتے اور نمبر ۱ کے اشعار غیر خدا سے خوف کا انکار کرتے ہیں۔ جب طمع اور خوف یہی دو جذبے کہ جو انسان کو متاثر بناتے ہیں کسی بندۂ خدا کے دل سے نیست و نابود ہو گئے تو پھر کون چیز ہے جو اُس کے قدم میں تزلزل پیدا کر سکے۔

(۲) خلق اللہ کی خیر اندیشی اور فائدہ رسانی جس کا بلند معیار یہ ہے کہ اس بارے

میں اپنے پرائے، دوست اور دشمن کی بھی تفریق کو کام میں نہ لایا جائے۔

یہ بات اُس صورت میں قائم ہی نہیں ہوسکتی کہ جب انسان کے تعلقات دوسروں کے ساتھ مادی بنیادوں پر قائم ہوں اس لیے کہ مادی تعلقات اور طبعی جذبات میں بہرحال نزدیک دور، ملائم طبع اور مخالف مزاج کا امتیاز لازمی ہے۔ یہ بات اُسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب انسان کا تعلق دوسرے بنی نوع کے ساتھ اُس مشترک رشتہ کی بنا پر ہو جو سب کو ایک خالق کے ساتھ وابستہ کردیتا ہے اور جس کی بنا پر تمام افراد انسانی ایک سلسلہ وحدت میں منسلک ہوجاتے ہیں ایسا ہی انسان وہ ہوگا جو خدا کی نعمت کا صحیح مصرف یہی سمجھتا ہو کہ خدا کی مخلوق کو اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچایا جائے جیسا کہ مقولہ نمبر ۱ اور ۳ کا مضمون ہے۔ ایسا شخص دوسروں کو فائدہ پہونچا کر اپنا احسان دوسروں پر نہیں محسوس کرتا بلکہ خدا کا ایک احسان سمجھتا ہے کہ اسے دوسروں کے فائدہ کا ذریعہ بنایا (مقولہ نمبر ۴) وہ فائدہ کا معیار یہی سمجھتا ہے کہ ایسے لوگوں پر احسان کرے جو عام انسانی امتیازات کی بنا پر اس سے توقع نہ رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایک دشمن اپنے دشمن سے کب اس کی امید قائم کرسکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے گا مگر بلند معیار فیاضی کا یہی ہے کہ ایسے کو بھی اپنے انعام سے محروم نہ کیا جائے (مقولہ نمبر ۲) حسین نے عملی طور پر دکھلا دیا فوج حر کو اپنے ساتھ کا تمام پانی پلا کر جبکہ یہ معلوم تھا کہ وہ مخالفت کے لیے کمربستہ ہو کر سامنے آئے ہیں۔

حسین خدمت خلق کے جذبے کو اتنا پیش نظر رکھتے تھے کہ خداوند عالم کے خاص عبادات میں بھی اُن کی نظر اس پہلو پر سب سے پہلے جاتی تھی اور وہ اُن کی افادی حیثیت بیان کرتے وقت اس پہلو کو خصوصیت کے ساتھ روشن کرتے تھے چنانچہ عہ "حضرت امام حسین سے پوچھا گیا کہ کیوں اللہ نے اپنے بندوں پر روزے فرض قرار دیے آپ نے فرمایا تاکہ مالدار بھوک کی تکلیف محسوس کرکے فقرا پر احسان کرنے پر آمادہ ہوں"

(۳) مادی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر توجہ۔ یہ اُن ہی لوگوں کی صفت ہے جو اللہ کے ساتھ وابستگی پیدا کرکے نیکی کے راستے پر قائم رہنا اپنی بہترین کامیابی سمجھتے ہوں۔ وہ مادی زندگی کے عیش و آرام اور طرب و نشاط کو دیکھ کر فریفتہ نہیں ہوتے بلکہ اس زندگی

عہ مولانا سید مبارک علی صاحب عالم آگرہ

کے آلام و مصائب اور تاریک پہلوؤں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

دنیا کی بہترین خوش قسمتی دولت کو سمجھا جاتا ہے مگر امام حسین دولت کا سب سے بڑا نقص بتلاتے ہیں کہ انسان کی بے فکری اور آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ (نمبر ۶)

وہ حیات دنیا کے پُر کیف مناظر کی مصوری، اُس کی نزہت گاہوں، باغوں اور طرب و نشاط کے موقعوں کی تصویر کشی کرنا کوئی مفید مشغلہ نہیں سمجھتے بلکہ اُس کی گورستانی خاموشی اور عبرتناک بربادی کا تصوّر پیش کرنا زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ (نمبر ۹)

یاد رکھنا چاہیے کہ صرف اقوال ہونے کے لحاظ سے مذکورہ بالا مقولات و اشعار میں کوئی بڑی ندرت اور خصوصیت موجود نہیں ہے۔ اہل اللہ، صوفیائے کرام اور اکثر واعظین کے الفاظ و کلمات میں اس طرح کی چیزیں کو اس سے بھی زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا تمام اقوال میں وزن و قیمت پیدا ہوئی ہے صرف حسین کے عمل اور بلندی کردار سے جس نے اُن میں سے ہر ہر مقولہ کو چلتی پھرتی تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا اور اس لیے یہ مقولات صرف الفاظ نہیں رہے بلکہ ایک سچے عملی انسان کی تاریخ زندگی بن گئے۔

حضرت امام حسین کے اس طرح کے اقوال آپ کی زندگی میں کسی ہنگامی یا اتفاقی موقع سے متعلق نہ تھے بلکہ آپ کے روزمرہ کے نظام زندگی کا ایک جزو تھے چنانچہ روزانہ ہر نماز میں جو مختلف قنوت آپ برابر پڑھا کرتے تھے وہ بھی ہم تک پہونچے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں چنانچہ ایک قنوت کے الفاظ یہ ہیں:۔

اللهم منك البدء ولك المشية ولك الحول ولك القوة ———— اللهم وانی مع ذلك كله عائذ بك لائذ بحولك وقوتك راض بحكمك الذی سبق الی فی علمك جار بحيث اجریتنی قاصد ما اممتنی غير ضنين بنفسی فيما يرضيك عنی اذ به قد رضيتنی ولا قاصر بجهدی عما اليه ندبتنی مسارع لما عرفتنی شارع فيما اشرعتنی مستبصر فيما بصرتنی مراع ما ارعیتنی فلا تخلنی من رعايتك ولا تخرجنی من عنايتك ولا تقعدنی عن حولك ولا تخرجنی عن مقصد انال به ارادتك واجعل علی البصيرة

مدرجتی وعلی الھدی ایدمحجتی وعلی الرشاد مسلکی حتیٰ تنیلنی امنیتی وتحل بی علیٰ مابہ اردتنی و لہ خلقتنی والیہ اٰویت بی۔

"خداوندا تیری ہی طرف سے انعام و احسان کی پہل ہے اور جو کچھ مشیت ہے وہ تیری ہے اور طاقت و قوت صرف تیرے لیے ہے۔ اس سب کے ساتھ میں تیری طرف پناہ لیتا ہوں اور تیری قوت و طاقت کا سہارا ڈھونڈھتا ہوں۔ تیرے اُس فیصلہ پر راضی ہوں جو میرے بارے میں تیرے پہلے ہو چکا ہے۔ چلنے والا ہوں اسی راستے پر جہاں تو نے مجھے چلایا ہے۔ قصد کرتا ہوں وہی جس کا تو نے میرے دل میں قصد پیدا کیا ہے۔ اور اُن باتوں میں جو تیری رضامندی کی باعث ہوں اپنے نفس کے ساتھ ذرا بھی بخل نہیں کرتا اور نہ اپنے جد و جہد میں تیرے احکام کی تعمیل میں کوئی کوتاہی کرنا چاہتا ہوں۔ تیزی سے چلتا ہوں اسی راستے پر جو تو نے مجھے بتلایا ہے۔ نظر میں رکھتا ہوں اسی مقصد کو جو تو نے مجھے دکھلایا ہے۔ حفاظت کرتا ہوں اُن ذمہ داریوں کی جن کا تو نے مجھے محافظ قرار دیا ہے۔ اب تو اپنی نگہبانی مجھ سے الگ نہ کر اور اپنی توجہ سے مجھے باہر نہ نکال اور اپنی طاقت سے مجھے بے دست و پا نہ بنا اور اُس مقصد سے مجھے علیحدہ نہ کر جس کے ذریعہ سے میں تیری مشیت کو پورا کرنا چاہتا ہوں اور بصیرت پر قرار دے میری رفتار کو اور ہدایت پر میرے مسلک کو اور صحیح منزل کی سمت میرے راستے کو، یہاں تک کہ مجھے پہونچا دے تو میری آرزو تک اور مجھے اُتار دے اسی منزل پر جس کا تو نے میرے لیے ارادہ کیا ہے اور جس کے لیے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تو نے مجھے متوجہ کیا ہے۔" (منہج الدعوات سید ابن طاؤس مطبوعہ بمبئی ص ۱۰۷)

کیا اس قنوت کے الفاظ اپنے کہنے والے کے ایک عزم پوشیدہ اور ایک ارادہ مستحکم کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں؟ کیا وہ یہ بھی نہیں بتلاتے ہیں کہ اُن کا متکلم کسی خاص مقصد کی خاطر اپنے کو زندہ سمجھتا ہے اور اُسی مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو صرف کرنا چاہتا ہے۔

سنہ ۶۰ تک یہ الفاظ قول تھے اور سنہ ۶۱ ہجری میں وہ عمل بن کر آنکھوں کے سامنے آگئے۔ سچ کہا ہے مسٹر سی ایس رنگا آئر نے کہ "حسین مستقبل کے لیے زندہ تھے

وہ یزید کی طرح سے صرف "کھاؤ پیو اور خوش رہو" کی پالیسی پر عامل نہ تھے۔ یزید تو اس وجہ سے خوش رہنا چاہتا تھا کہ وہ غم فردا سے گھبراتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ کل ہی مر جائے گا۔

سانحۂ کربلا حسین کے لیے ایک لاہوتی تاج ہے۔ اس میں صرف ایک چیز فنا ہوئی اور وہ یزید کا شہد ہے۔ اُس وقت سے آج تک حسین کی لافانی خوبیاں زندہ ہیں"

یہ دعا بھی حضرت امام حسین کی ہے جو آپ قنوت میں پڑھتے تھے۔

اللّٰھُمَّ من اوی الی مأوی فانت مأوای ومن لجأ الی ملجأ فانت ملجای۔ واحرسنی فی بلوای من افتتان الامتحان ولمّۃ الشیطان بعظمتک التی لا یشوبھا ولع نفس بتفتین ولا وارد طیف بتظنین ولا یلمّ بھا فرح حتی تقلبنی الیک بارادتک غیر ظنین ولا مظنون ولا مراب ولا مرتاب۔

"خداوندا جو کوئی پناہ لے کسی کی طرف تیرے سوا تو لیا کرے، میری جائے پناہ تو تو ہی اور جو شخص بھی سہارا لے دوسرا کا تو لے۔ میرا تو سہارا صرف تو ہے۔ میری حفاظت کرنا میرے امتحان میں فتنہ میں مبتلا ہونے اور شیطان کی جماعت سے مرعوب ہو جانے سے اپنی اُس عظمت کے ساتھ جس میں کسی کی نفسانی خواہش شریک نہیں اور نہ کوئی خواب و خیال کسی طرح کی بدگمانی پیدا کر سکتا ہے، نہ اس میں خواہ مخواہ کی خوشی کی آمیزش ہے۔ یہاں تک کہ تو مجھے اپنی طرف بلائے اس طرح کہ نہ میرے دل میں برے خیالات ہوں، نہ میری نسبت دوسرے برے خیالات قائم کریں۔ نہ مجھے دوسرے کی طرف سے کوئی شک ہو، نہ میری طرف سے دوسروں کو شک ہو۔ (مہج الدعوات صد ۲)

حضرت جو صبح و شام دونوں وقت دعا پڑھتے تھے اُس کے الفاظ یہ تھے:

اللّٰھُمَّ انی اسلمت نفسی الیک ووجھت وجھی الیک وفوضت امری الیک

اللّٰھُمَّ انک تکفینی من کل احد ولا یکفینی منک احد۔

"خداوندا میں سپرد کرتا ہوں اپنے نفس کو تیری طرف اور متوجہ کرتا ہوں اپنا رُخ

تیری جانب اور دیے دیتا ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ میں — خداوندا تو ہر ایک دوسرے شخص سے مجھ کو بچا سکتا ہے لیکن تجھ سے کوئی شخص مجھے نہیں بچا سکتا (مہج الدعوات ۲۴۱)

بتایئے جس شخص کا مستقل عقیدہ یہ ہو، جس نے اپنی زندگی کا نصب العین یہی بنا رکھا ہو جو رات دن اسی کو سوچتا ہو۔ یہی اپنی زبان پر دُہراتا ہو اور اُسی کا اپنی تنہائی کے لمحوں میں، اپنے گوشہ ہائے خلوت میں برابر تصور قائم رکھتا ہو وہ کیا ممکن تھا کہ کسی طاغوتی طاقت سے دب جائے اور خدا کو بھول کر دنیاوی جبروت کے سامنے سر خم کر دے؟ یزید کیا چاہتا تھا؟ یہی تو کہ حسین خدا کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے پر یزید کے ہم سفر بن جائیں حسین جو اپنے جسم و روح کا ہر جذبہ خدا کے حوالے کر چکے تھے اُنھوں نے اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا۔ اُن کا کامل یقین تھا کہ یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ جب تلواریں اُن کے جسم کو ٹکڑے کر رہی تھیں تب بھی اسی یقین کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے کہ یہ تلواریں خدا کے حکم کے خلاف میری ہستی کو فنا کرنے سے قاصر ہیں ——— نتیجہ نے بتلا دیا کہ حسین کا خیال صحیح تھا۔ خوں بہا حسین کی گردن سے اور شہ رگ قطع ہوئی یزید کے اقتدار کی حسین زندہ رہے اور یزید فنا ہوا — یہ نتیجہ تھا صرف حسین کی قوت ارادی کا جس کا مظاہرہ اُن کے ہر روز کے اقوال کرتے رہے تھے۔

حیات دنیا کے دلدادہ دشمن کے نزدیک سب سے بڑا ذریعہ کسی کو دھمکانے کا موت کا تصور پیدا کرنا ہے مگر ایک ایسا انسان جو راہ حق میں موت آنے کو کمال زندگی سمجھتا ہو وہ اس دھمکانے سے کب متاثر ہو سکتا ہے؟

حسین کا فلسفہ زندگی مولانا ابوالکلام آزاد کی لفظوں میں یہ تھا کہ انسان سچائی پر قائم رہے اور نیک مقصد میں کوشاں رہے پھر نتیجہ کی ذمہ داری اُس پر نہیں ہے اس صورت میں وہ اگر ظاہر میں ناکام بھی ہو تو کامیاب ہے اور اگر فنا بھی ہو تو بقا کی شکل اختیار کرے گا۔ یہی خیال تھا جو بیعت یزید کے مطالبہ کے بعد سے ہر ہر موقع پر حسین کے الفاظ اور مخاطبات سے ظاہر ہوتا رہا۔

سب سے پہلے آپ نے اپنے اُس خطبہ میں جو مکہ سے روانگی کے وقت ارشاد کیا تھا فرمایا ہے
کہ "موت انسان کے گلوگیر ہے اس طرح جیسے گردن بند جوان عورت کی گردن میں ہوتا ہے"
مقصود تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا ہے
اور وہ ایک دن دنیا سے رخصت ضرور ہوگا مگر دیکھنے کی یہ بات ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ
کتنے دلکش انداز میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کوئی ناگوار طبع چیز نہیں ہے
بلکہ حسین اور دیدہ زیب ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دہن سے الفاظ ویسے ہی نکلتے ہیں
جیسے خیالات اُس کے دماغ میں راسخ ہوتے ہیں حسین اُس گھرانے کی ایک بزرگ فرد تھے
جہاں موت سے کبھی خوف نہیں کیا گیا بلکہ بہادری سے مرنا زندگی سے زیادہ پسند رہا۔ اور
چونکہ حسین کے سامنے یہ موقع بڑی شدت اور قوت کے ساتھ پیش تھا اس لیے آپ کے تصورات اس
بارے میں بہت زیادہ قوی تھے۔

مکہ سے روانگی کے بعد سب سے پہلی منزل پر جب فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی اور اُنھوں
نے کوفہ کی حالت حضرت سے بیان کی کہ لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ہیں مگر تلواریں اُن کی
بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ تو حضرت نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات خدا کے ہاتھ میں
ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ خدا کی
تقدیر اگر ہماری دلی خواہش کے مطابق ہو تو ہم خدا کا حمد کرینگے اور ادائے شکر کے لیے
اُسی سے مدد طلب کرینگے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے سدراہ ہو تو انسان کے لیے یہی کیا کم
ہے کہ اُس کی نیت میں سچائی اور اُس کے ضمیر میں پارسائی کا خیال باقی رہے"

اس کے معنی وہی ہیں کہ مقصد نیک ہو اور نیت خیر اس کے بعد "ہرچہ بادا باد"

اسی ذہنیت کی روح تھی جو آپ نے اپنے ساتھیوں میں بھی دوڑا دی تھی جب
آپ نے آزما لیا اُس وقت جب راستے میں آپ نے اپنے فرزند علی اکبر سے اس خواب کا تذکرہ
کیا کہ کوئی کہہ رہا ہے "تم تو بڑی تیزی سے راستہ طے کر رہے ہو اور موت تمھیں تیزی
سے جنت کی طرف لے جا رہی ہے" علی اکبر نے کہا کہ "کیوں بابا ہم حق پر تو ہیں؟" حضرت
نے فرمایا "کیوں نہیں، بے شک ہم حق پر ہیں۔ شاہزادہ نے کہا "پھر ہمیں موت

کی کیا پروا "

راستے میں جو گفتگو حُر کے ساتھ ہوئی ہے وہ بھی معنی خیز ہے :۔

حُر کہہ رہا تھا " دیکھئے میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں ۔ آپ اپنی زندگی پر رحم کیجئے ۔ اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً قتل ہوں گے اور اس صورت میں آپ تباہ ہوں گے "

امام حسین نے فرمایا " تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟ "

اس کے بعد حضرت نے قبیلہ اوس کے ایک شاعر کا قول بطور مثال پڑھا :۔

سامضی وما بالموت عار علی الفتی   اذا ما نوی حقا وجاھد مسلما

" میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت میں ایک جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت میں سچائی ہو اور مذہب حق پر جہاد کر رہا ہو "

یہ بظاہر عجیب چیز ہے ۔ انسانی نگاہ میں آخری اور انتہائی انجام قتل ہونا ہے ۔ لیکن حسین فرماتے ہیں کہ " کیا اس سے زیادہ تم کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو " یعنی آپ قتل ہونے کو ایک درمیانی منزل قرار دے کر آخری معیار فتح و شکست کا کچھ اور قرار دے رہے ہیں

ذو حسم ہی کے مقام پر جب حر کا لشکر امام کی مزاحمت کیلئے آچکا ہے تو حضرت نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا :۔

" صورت حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے سوائے تھوڑے حصہ کے جو پانی بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے ۔ اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھاس کے ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی ۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے ۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبال جان ہے (طبری ج ۶ ص ۲۲۹)

اسی کے ساتھ ع۵ "اس پروردگار انقلاب نے حکام اور عوام کے حقوق و فرائض کے حدود قائم کر دیے اور بتایا کہ حکومت عوام کی ذہنی و عملی ترقی کے لیے ہے اور وہ اُس وقت تک قابل احترام ہے جب تک عوام کی زندگی کو اُس سے فائدہ پہونچ رہا ہو ـــــــ ایک موقع پر آپ نے حاکم کے اوصاف ان الفاظ میں بیان فرمائے "حاکم کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دستور پر چلتا ہو۔ عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ حق کا پابند ہو اور رضائے الٰہی میں اپنے نفس کو مقید کیے ہوئے ہو" اور جس حکومت کے خلاف آپ احتجاج کرتے رہے اس کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی بار اظہار خیال کیا۔ حر کے لشکر کے سامنے آپ نے فرمایا "رسول خدا نے فرمایا ہے کہ جو ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ عہد خدا اور سنت رسول کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگان خدا کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آتا ہے اور وہ قول یا فعل سے اس ظالم کو نہ روکے تو خدا اسے بھی اُس جبرہ دست بادشاہ کے زمرہ میں شمار کرے گا۔ دیکھو موجودہ حکومت شیطان کی حلیف بن گئی ہے اور خدا کی فرمانبرداری سے روگردانی کر رہی ہے۔ فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے اور حدود آئین کو بے کار بنا دیا ہے۔ ملک کے سارے سرمایہ کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا ہے۔"

عمر سعد کے لشکر سے خطاب کرکے فرمایا "تم دیکھتے نہیں کہ حکومت حق پر عمل نہیں کر رہی ہے اور باطل سے باز نہیں آتی۔ یہ وہ وقت ہے کہ مومن کو موت کی تمنا کرنا چاہیے میں تو اس ماحول میں موت کو اپنے لیے آسودگی اور نیک بختی اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو سراسر تکلیف سمجھتا ہوں۔"

مقاصد جنگ

ہر جنگ میں مقاصد کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ امام حسین کربلا میں جس معرکہ کو سر کرنے آئے تھے اُس میں آپ کی جنگ کے مقاصد کیا تھے؟ یہ بڑی حد تک تو آپ کے افعال سے ظاہر ہیں جن پر اس کے پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے اُن مقولات سے جن میں سے بعض ابھی آپ کے سامنے آئے۔ ان مقاصد کی تشریح ہو جاتی ہے

ع۵ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری۔

افسوس ہے کہ تاریخ نے اُن تمام خطبوں کو محفوظ نہیں کیا جو حضرت امام حسین نے متعدد مواقع پر ارشاد فرمائے تھے مگر جہاں تک محفوظ ہو سکے ہیں وہ بھی ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

کربلا میں عمر بن سعد کے جواب میں آپ نے فرمایا "خدا کی قسم میں ذلّت کے ساتھ اپنے کو تمہارے قبضہ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمہارے سامنے سے بھاگوں گا" یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔ اسی کو ایک دوسری جگہ فوج شام کو مخاطب کر کے اس طرح ارشاد کیا:

"میں پناہ مانگتا ہوں ایسے ہر شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ موت عزّت کے ساتھ بہتر ہے اُس زندگی سے جو ذلّت کے ساتھ ہو" پہلے فقرہ میں جبّار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرہ میں اس کی تشریح ہے کہ مادّی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزّت انسانی کے خلاف ہے اور اُس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے:

اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا ہے کہ الموت اولیٰ من رکوب العار "مرجانا عار و ننگ سے بہتر ہے"

شب عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا "میں باعزّت مرجانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلّت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں"

عـ "ایک قطعہ بھی حضرت کا اسی مضمون کا ہے۔ جسے علامہ شیخ محمد بن قاسم بن یعقوب علم محاضرات کے ماہر نے نقل کیا ہے کہ حضرت نے روز عاشور فرمایا:

وذل الحیوۃ و ذل الممات   وکلا اراہ طعاما وبیلا

فان کان لا بد احداھما   فسیروا الی الموت سیرا جمیلا

"زندگی کی ذلّت اور قتل ہو جانے کی ذلت دونوں ہی ناخوشگوار ہیں لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک ضروری ہی ہو گئی ہے تو اچھا یہی ہے کہ خوبصورتی کے ساتھ موت کی طرف قدم آگے بڑھیں۔ (روض الاخبار منتخب ربیع الابرار زمخشری صہ ۱۳۲ مطبوعہ مصر ۱۳۰۷ھ)"

عـ مولانا سید آغا مہدی صاحب رضوی۔

امام حسین کے مقاصد جنگ کی کچھ ایسی ہی معصومیت تو ہے جو آج حسین کے عمل کو وہ لوگ بھی سراہتے ہیں جو کسی صورت سے بھی جنگ اور تشدد کے موافق نہیں ہیں۔ اور خصوصیت صرف حسین کی ہی کہ انھوں نے جنگ کرنے کے ساتھ بھی مظلوم ہونے کے معیار کو اس طرح قائم رکھا کہ اُن پر خالص عدم تشدد کا تختی کے ساتھ حامی انسان بھی کسی طرح کی نکتہ چینی نہیں کرتا

واقعۂ کربلا کے خصوصیات

عـ۱ "عراق کی سرزمین پر میدان کربلا دنیا کا کوئی ایک اکیلا خونی میدان نہیں، ہے دنیا میں اور بھی بہت سے میدان جنگ موجود ہیں جنھوں نے اپنے سینوں پر خون کی ندیاں بہائی ہیں۔ مثال کے لیے کرکشتر اور پانی پت کے میدان کافی ہیں لیکن وہ میدان جس پر واقعۂ کربلا ہوا تاریخ دنیا میں آپ اپنی نظیر ہے اس لیے نہیں کہ اس میں خون بہت بہا بلکہ اس لیے کہ اس نے ایسا منظر پیش کیا ہے جو گبن کے الفاظ میں "زمانہ مابعد اور دور دراز ممالک میں بے حس سے بے حس انسان کی بھی ہمدردی حاصل کرلے گا" یہ وہ منظر پیش کرتا ہے جس کو کوئی حساس دل بغیر ہمدردی کا اثر لیے ہوئے نہیں دیکھ سکتا"۔

عـ۲ "حادثۂ کربلا نیکی و بدی، ظلمت و نور، حریت و غلامی کی قوتوں میں جنگ کا وہی قدیم قضیہ ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے لیکن یہ جنگ ایسے درد انگیز حالات میں رونما ہوئی کہ جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور جن کے سبب سے اس کے سامنے دوسرے ایسے سابقہ حادثات سب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے قبل کسی جنگ میں متخاصمین کی تعداد میں ایسا نمایاں فرق نہیں تھا۔ نہ ایسی شجاعت و جرأت کا اظہار ہوا اور نہ صداقت کی راہ میں اس قدر خوشی کے ساتھ اپنی جانوں کی قربانی کے لیے شوق بلکہ بے صبری کا اظہار ہوا جیسا کہ حسین اور اُن کے متبعین سے عمل میں آیا"

تاریخ میں اس کے پہلے جتنی قربانیاں ہوئی ہیں وہ زیادہ تر انفرادی رہی ہیں جیسے سقراط کا جام زہر پی لینا یسوع مسیح کا بقول نصاریٰ صلیب پر چڑھا دیا جانا اور بہت سے

عـ۱ سید امتیاز حسین صاحب مدنی ایڈوکیٹ   عـ۲ خواجہ غلام السیدین صاحب

انبیاء و مرسلین کا قتل ہو جانا مگر کربلا کا واقعہ انفرادی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک رہنما تھا جو قطب کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے گرد ایک جماعت تھی جو کرہ کی طرح گردش کر رہی تھی پھر اس جماعت میں جوان، بوڑھے، بچے ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ ان میں آزاد، غلام، عربی غیر عربی۔ قریش۔ غیر قریش۔ ہر قبیلہ اور ہر نسل کے آدمی تھے جن میں مشترک نقطہ سوائے ایک اتحاد مقصد کے کچھ نہ تھا۔

"سقراط نے تنہا مقابلہ کیا۔ عیسیٰ بھی اکیلے میدان قربانی میں کھڑے رہے اور ان میں سے کسی نے بھی ایک فرد کی عملی ہمدردی نہیں حاصل کی۔ یہ خصوصیت حسین ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے انتہائی شدید امتحان کے وقت بھی اپنی جانب ان بہتر نفوس کی ہمدردی قائم رکھی جو آخر وقت تک حسین کی ہمدردی کا دم بھرتے رہے۔ یہ واقعہ خود حسین کی سحر کن شخصیت اور مقدس کفالت پر تیز ترین روشنی ڈالتا ہے"[۱]

یہ ایک واقعہ ہے کہ اتنے ہم دل، ہم زبان، ہم خیال، ہم آہنگ آدمی دنیا میں واقعۂ کربلا کے پہلے ایک جگہ پر اکٹھا ہوئے نہ واقعۂ کربلا کے بعد دیکھے گئے۔ کس کو نہیں معلوم کہ جذبات انسانی میں ماحول کے اختلاف سے کس قدر اختلاف ہوتا ہے۔ سرزمین کے اختلاف سے کتنا تغیر ہوتا ہے۔ عمر کے اختلاف سے کس قدر تفرقہ ہو جاتا ہے ——— کسی جگہہ پر پانچ آدمی اکٹھا ہوں اور ان میں ایک بوڑھا ہو، ایک بچہ ہو، ایک جوان ہو اور ایک عورت ہو اور پھر ایک ان سب کا بزرگ یا ان کا قائد ہو تو ان چار آدمیوں کی جماعت میں بھی اختلاف مزاج کا اثر نمایاں رہے گا۔

جوان زیادہ تر اقدام پسند ہوتے ہیں اور جلدی سے حرکت میں آجانا چاہتے ہیں۔ جبکہ بوڑھے نسبتہً سکون پسند ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں تدبر و تحمل سے کام لے کر دوسروں کو بھی سنجیدگی کا مشورہ دیتے ہیں۔ عورتیں زیادہ تر کمزور طبیعت کی ہوتی ہیں اس لیے وہ ہولناک واقعات سے متاثر ہو کر دوسروں کے ارادوں کو بھی پست کرنے کی کوشش کرتی اور بچے تو سخت اوقات میں رونے ہی لگتے ہیں۔ یقیناً اگر ایک مرد، ایک عورت،

---

[۱] سید امتیاز حسین صاحب

ایک بچہ اور ایک بوڑھا کسی گھر میں ہو اور کوئی اہم معاملہ درپیش ہو تو اُن میں اختلاف طبع کے لحاظ سے رجحانات میں اتنا اختلاف ہوگا کہ اُن کے ذمہ دار افراد کو کسی ایک راہ عمل کے تعین اور سب کو اُس پر چلانے میں دشواری محسوس ہوگی۔ چہ جائیکہ کم از کم بہتّر آدمیوں کی جماعت جن میں ایک نہیں بہت سے بوڑھے، ایک نہیں بہت سے جوان۔ بہت سے بچے، اور بہت سی عورتیں موجود ہوں مگر کیا تاریخ ان تمام افراد میں راہ عمل کے اختیار کرنے میں ذرہ بھر کسی اختلاف یا کشمکش کا پتہ دے سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

کیا یہ حیرت انگیز چیز نہیں ہے؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ جیسے حسین کی قیادت ایک عجیب کیمیاوی تاثیر رکھتی تھی کہ انھوں نے جوانوں کے خون کی گرمی کو گھٹا کر بوڑھوں کے ساتھ چلنے کی صلاحیت پیدا کی اور بوڑھوں کی طبیعت میں حرارت پیدا کر کے جوانوں کے ہم قدم رہنے پر تیار کیا۔ عورتوں کے دلوں میں ایسی سختی پیدا کر دی کہ وہ شدید سے شدید موقع پر ساکن رہیں اور بچوں کے دلوں میں وہ اطمینان پیدا کیا کہ ہولناک موقعوں پر بھی رونے کے بجائے ہنستے نظر آئیں۔

حسین کا یہ طریقۂ قیادت ہمیشہ ایک راز سربستہ رہے گا۔ دنیا کی ہر لڑائی کے وقت لیڈر کو تقریریں کرنا پڑتی ہیں تاکہ ساتھیوں میں جوش عمل پیدا ہو۔ مگر حضرت امام حسین نے ایسا نہیں کیا۔ آپ نے تقریریں دشمن کے سامنے تو کیں لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ آپ نے اپنے مجاہدین میں جوش عمل پیدا کرنے کے لیے بھی کوئی تقریر کی ہو۔ ہیں تو یہی ملا کہ حسین انہیں اپنے ساتھ چھوڑ کے رخصت ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ سختی کے ساتھ انکار کر رہے ہیں کہ ہم آپ کا ساتھ چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ یا یہ ملا کہ ساتھ والے بے چین ہیں کہ دشمن کی سخت کلامی کا جواب دیا جائے اور حسین فرما رہے ہیں کہ ہماری طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں ہونا چاہیے۔

یہ حسین کی مخصوص ذہنی تربیت تھی کہ انھوں نے اپنے مقصد کی حقانیت اس طرح عنا [illegible] رکھی تھی اور ہر دل میں اُسے اتار دیا تھا کہ وہ خود اپنے ضمیر کی تحریک سے قدم آگے بڑھانے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ یہاں کوئی خاطرداری اور مروّت یا دباؤ کا سوال نہ تھا بلکہ وہ ایک جماعت تھی جو صرف حق کو حق سمجھ کر اُس پر گامزن تھی۔ ایسے ہی ساتھی حسین چاہتے تھے

اور حسین کی قوتِ انتخاب اس بارے میں اعجاز کی حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ کیا کسی ایک فرد کا نام کوئی بتا سکتا ہے جس میں امام حسین کی نگاہِ انتخاب نے دھوکا کھایا ہو؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ایسا آج بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک فریق کی گولہ باری ایک شہر کو بالکل تہس نہس اور ویران کر دے اس طرح کہ کوئی ایک متنفس بھی زندہ نہ رہے مگر ان سب لوگوں میں جن کی جانیں چلی جاتی ہیں ہر ایک کا ضمیر اس مصیبت کے برداشت کرنے پر مستحکم نہیں ہوتا، نہ وہ اختیاری طور پر اس کو گوارا کرتے ہیں۔ اُن میں سے بہت سوں کا بس چلے تو جس قیمت پر بھی ہو اپنے کو اس مصیبت سے بچا لیں۔ مگر اُس جماعت کو کیا کہا جا سکتا ہے جس میں سے ہر ایک کی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلک کی حقانیت پر یقین کر کے خوش خوش آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسی جماعت جن میں سے کسی ایک پر بھی عمل میں کمزوری کا دھبا نہیں آیا۔ غداری اور مخالفانہ سرگرمی کو جانے دو۔ نیک نیتی اور خلوص کا اختلاف جماعت میں نظر آنا تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے مگر اس کے بھی نتائجِ عمل کی ہم آہنگی اور نتیجہ کے استحکام پر جتنا اثر ڈالتے ہیں اُسے کسی بڑے مقصد کے زعیم و قائد ہی کے دل سے پوچھا جا سکتا ہے۔

دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی جماعت ایسے اہم اقدام کے موقع پر جو کربلا والوں نے کیا اتنی ہم آہنگ نہیں رہی جتنے کربلا کے وہ مجاہدین تھے۔ وہاں اختلافِ خیال کا وہم و گمان بھی نہ تھا بلکہ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ پوری جماعت نے اپنے تصور، خیال، ارادہ، عزم اور اقدام کو مستغرق کر دیا تھا ایک انسان کے خیال، ارادہ اور اقدام کے اندر —— ایسے قائد اور ایسی جماعت کی مثال دنیا کے پردہ پر نظر نہیں آئی۔

جماعت میں سے ہر ایک رہنما کی ہستی اور اس کے مسلک پر اپنے کو قربان کر رہا تھا۔ اور رہنما ان میں سے ہر ایک کی مصیبت کو برداشت کرنے کے بعد اپنے کو سخت ترین موقع کی آزمائش کے لیے تیار پا رہا تھا۔ وہ سخت موقع وہ تھا جب آس پاس کوئی نہ رہا تھا اور صرف ایک اکیلے حسین کی ذات تھی مگر اب بھی اس ایک اکیلے انسان کے عزم و ارادہ میں وہی جاہ و جلال اور استحکام تھا جو مددگاروں کے موجود ہونے کے عالم میں موجود تھا چراغ

بجھ گیا مگر اپنی روشنی چھوڑ گیا وہ روشنی جو ہزاروں تاریکیوں کے پردہ میں اب تک جگمگا رہی ہے۔
ظلم کی آگ نے لاکھوں بستیاں ویران کی ہیں مگر مظلومیت میں کبھی شعور و اقتدار و اختیار اور فرائض کی انجام دہی میں اطمینان و سکون و وقار کا یہ مظاہرہ نظر نہیں آیا جو کربلا کے میدان میں نظر آ رہا تھا۔

کربلا کے واقعہ نے سب سے پہلے جبروت و تشدد کے مقابلہ میں بیکسی اور بے بسی کی جنگ کا نمونہ پیش کیا تھا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے تو ہمیشہ ہوتا رہا مگر طاقت کا مقابلہ کردار سے پہلے پہل کربلا کے میدان میں کیا گیا۔

یہی مقابلہ کی نوعیت وہ تھی جسے ایک ناقص درجہ پر ہندوستان کی نجات کے لیے اختیار کیا گیا۔ مگر باوجودیکہ یہاں مقابل کے ظلم و تشدد کا درجہ اتنا سنگین نہ تھا جو بالعموم انسانوں کی بیش قیمت جانوں تک پہونچتا پھر بھی افراد میں وہ ہم رنگی و ہم آہنگی نظر نہ آسکی جو اس قسم کے مقابلہ کی کامیابی کا اصلی راز ہے۔

اس کے ساتھ واقعۂ کربلا میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہاں طاقت کے مقابلہ میں بیکسی اور بے بسی کے ساتھ بھی وہ "سپردگی" نہ تھی جو ظالم کی ہمت افزائی کی باعث ہو سکتی ہے بلکہ وہاں حفاظت خود اختیاری کے اُس فطری آئین پر پورا عمل کیا گیا جو اسلام کا بنیادی قانون ہے اس لیے واقعۂ کربلا میں ایک ایسی نوعیت پیدا ہو گئی ہے جسے دنیا آج تک نہ دہرا سکی ہے نہ دُہرائے جانے کی آئندہ امید ہے۔

کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین کا خواتین کو اپنے ساتھ لانا اور اُن کا اپنی مخصوص حیثیت کے حدود میں مردوں کے ساتھ اتنا نمایاں اور منظم حصہ لینا بھی واقعۂ کربلا کی منفرد خصوصیت ہے۔

اس پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں کی اُس خاموشی کو جو موت کے ہاتھوں چھا گئی تھی ان اہل حرم نے اپنی اسیری سے ایک وسیع اور ہمہ گیر اعلان و اشاعت کی شکل میں منتقل کر دیا جو حسین بن علی کے مقصد کی تکمیل اور یزید کی شکست پر آخری مُہر تھی

حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کربلا میں بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں سب ایک حفاظت حق کی مشین میں پرزوں کی طرح متحرک تھے جن میں سے کوئی ایک بھی اپنے فرائض میں کوتاہی کا مرتکب نہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے محل پر اپنا کام احساس فرض کی تحریک سے انجام دیا۔ ورنہ حسین تو عصر عاشور شہید ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ والوں میں بھی کوئی موجود نہ رہا تھا۔ اب کون تھا جو پسماندہ بیکس اور بے بس خواتین کو اسی راستے پر گامزن بناتا جو امام کے پیش نظر تھا؟ کچھ نہیں۔ وہی احساس فرض جو مردوں میں قائم تھا وہی جوانوں اور بچوں میں تھا اور وہی اب عورتوں میں کارفرما تھا۔ یہ فرض شناسی، خلوص عمل اور ہم آہنگی جس جماعت میں پیدا ہو جائے وہی میدان مقصد میں کامیاب نظر آئے اور یہی جنس وہ ہے جو دنیا میں ہمیشہ کمیاب رہی اور آج بھی کمیاب بلکہ نایاب ہے۔

کربلا کا واقعہ صرف ایک دردانگیز حادثہ نہیں ہے بلکہ وہاں فرض شناسی اور اخلاقی تعلیمات کے وہ گراں بہا نمونے ہیں جو اگر کسی بڑے اطمینان و سکون کے وقت پر ہوتے تب بھی قدر کے قابل ہوتے چہ جائیکہ وہ ایسے پیش اضطراب عالم اور ماحول میں تھے جبکہ عام انسانوں کے ہوش بجا نہیں رہ سکتے

حسینی شخصیت کی بے نظیر رفعت

حسین اپنے کردار کی بلندی میں منفرد ہوتے اگر وہ صرف یزید کی خلافت کے تمام عالم اسلام میں تسلیم شدہ ہونے کے بعد تنہا انکار کی آواز بلند کرتے نظر آتے لیکن اس وقت حسین اور بلند نظر آئے جب انھوں نے ہزاروں تلواروں، نیزوں اور تیروں کے مقابلہ میں بھی اس انکار کو قائم رکھا۔ حسین اس وقت بھی حسین ہوتے جب وہ اکیلے قربانگاہ شہادت میں اپنی جان پیش کر دیتے۔ لیکن حسین اور بلند ہو گئے جب انھوں نے اپنے ساتھ کم از کم بہتّر ۷۲ قربانیاں اپنے ہاتھ سے اور پیش کر دیں۔

حسین بے شک حسین ہوتے اگر وہ اس جماعت کو اپنے ساتھ ترغیب و تحریص یا پرجوش تقریریں کر کے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہوتے لیکن حسین اور بھی اونچی منزل پر نظر آئے جب انھوں نے ساتھ والوں کو کسی ایسے طریقہ پر اپنے ساتھ رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ انھوں نے اپنی حقانیت کو ان کے ذہن نشین ایسا کیا کہ ان میں سے

ہر ایک حسینی روح اور احساس کا حامل ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ ایک انسان کا اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا اور اپنے قدم کا مستقل رکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن حسین نے بہتر(۷۲) دلیروں کے دل و دماغ کو ایک مرکز پر جمع کر کے گویا ہر ایک سینہ میں اپنا دل اور ہر دل میں اپنا استقلال ودیعت کر دیا تھا ——

حسین ایک اکیلے میدان جہاد میں حسین ہو کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ بوقت واحد بہتر(۷۲) حسین میدان قربانی میں پیش کر رہے تھے یعنی ایسے افراد جن میں ہر ایک قوم، قبیلہ اور سن و سال کے باہمی اختلاف کے باوجود اُس ایک روح کا حامل تھا جس روح کو ہم سوائے لفظ "حسین" کے کسی دوسرے نام سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس سلسلہ میں حسین اُس وقت بھی حسین ہوتے جب وہ اپنے دوسرے عزیزوں ساتھیوں کے داغ اُٹھانے سے قبل میدان جہاد میں جا کر قربان ہو جاتے لیکن حسین اُس وقت اور اونچی سطح پر نظر آئے جبکہ دیکھا گیا کہ اُنھوں نے اپنے سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو اپنے ہاتھوں سے راہ حق میں نثار کر دیا —— اور عزیزوں کی لاشیں اُٹھانے سے جو ہاتھ تھک چکے تھے اُنہی پر ایک چھ مہینہ کے بچے کو بھی دشمن کے سامنے اتنی دیر سنبھالے رہ سکے کہ دشمن کے تیر نے اُس کا کام تمام کیا۔

حسین یقینی ایک مخصوص منزل پر ہوتے اگر اس کے بعد وہ بلا مقابلہ تیر و خنجر کے سپرد ہو جاتے مگر حسین اُس سے بھی اونچے نظر آئے جب اُن ہی ہاتھوں سے جو بے شیرؑ کا لاشہ اُٹھا چکے تھے۔ تلوار کے قبضہ کو سنبھالے بہادرانہ مقابلہ پر تیار نظر آئے اور اُس تنہائی کے عالم میں نرغۂ فوج میں بھی اُنھوں نے حمزہ و جعفر اور حیدر صفدر کے روایات کو زندہ رکھا۔

حسین اتنے ہی پر ایک بلند ترین منزل پر پہونچ جاتے ہیں لیکن اُس وقت اور بھی بلند نظر آتے ہیں جب یہ نظر آتا ہے کہ اُنھوں نے شدید امتحانات کے موقع پر اور سخت ترین اوقات میں بھی اسلام کے عام فرائض و تعلیمات کو ایک لمحہ کے لیے نظر انداز نہیں کیا۔ وہ عین اُسی وقت جب اصحاب و اعزا کے لاشے اُٹھا رہے تھے غلاموں کے ساتھ اسلام کی تعلیم کو زندہ کر رہے تھے جون غلام ابی ذر غفاری کے سر کو زانو پر رکھ کے اور غلام حبشی کے

رخسارہ پر رخسارہ رکھ کر اور عین اُس وقت جب وہ تمام ساتھیوں کے ختم ہونے کے بعد تن تنہا میدان جہاد میں جارہے تھے تو کنیز کی عزت افزائی میں اپنی ماں فاطمۂ زہرا کی سنت کو تازہ کر رہے تھے۔ زینبؑ ام کلثوم اور سکینہ و رقیہ کے ساتھ فضہ پر سلام رخصت کر کے۔ اور اُس موقع پر جب ساتھی ایک ایک کر کے جارہے تھے اور جنگ کا موقع نہایت شدید تھا آگ اور خون اور تیروں کی بارش تھی تو یادِ الٰہی کا احساس قائم کر رہے تھے نماز ظہر کو بعزت ادا کر کے۔ گویا بوقت واحد وہ جہاد بھی کر رہے تھے اور اپنے مقاصد جہاد کا عملی اعلان بھی کرتے جاتے تھے۔

پھر حسین اُس وقت بھی عظیم المرتبت حسین ہوتے اگر وہ اپنے ساتھیوں سمیت دنیا سے رخصت ہو جاتے اور اپنے مشن کو اپنی زندگی بھر اپنے سے جدا نہ کرتے مگر اُس وقت حسین اور بھی بلند نظر آئے جب اُنھوں نے اپنے دنیا سے جانے کے بعد اپنے مشن کے پھیلنے کا اپنے بعد انتظام کر دیا اپنے اہلحرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر اور ہم نے دیکھا کہ وہ حسینی روح جو بہتّر میں نظر آرہی تھی صرف حسین کی زندگی اور اُن کی سامنے موجودگی پر منحصر نہ تھی بلکہ وہ روح حسین نے اپنے ساتھ والوں میں سے ہر عورت اور بچے کے دل و دماغ میں بھی اس طرح ودیعت کر دی تھی کہ حسین دنیا سے چلے گئے مگر وہ حسینیت کی روح بے کس عورتوں اور بے زبان بچوں تک کے رگ رگ میں ودیعت چھوڑ گئے —— جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابن زیاد کے دربار اور یزید کے قصر حکومت میں بھی حسین کے پسماندگان میں سے کسی ایک متنفس نے اموی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ وہ بیعت کا انکار جس پر حسین کا سر نیزہ پر پہونچ گیا اب بھی قائم تھا اور اب اس کے علمبردار سید سجاد، زینب خاتونؑ، ام کلثوم ہی نہیں بلکہ کمسن بچے فاطمہ اور سکینہ اور محمد باقر بھی تھے۔

کردارِ حسینی کی رفعت کے گزشتہ منازل میں سے ہر ایک منزل وہ ہے جہاں انسانیت سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور ان سب اور ان کے علاوہ بہت سے اُن پہلوؤں کے اجتماع سے جو گزشتہ واقعات کے ذیل میں جا بجا آپ کے سامنے پیش ہوئے ہیں اور آیندہ کے ابواب میں واقعۂ کربلا کے

اخلاقی نتائج کے ذیل میں آپ کے سامنے پیش ہوں گے امام حسین کی شخصیت ایک ایسے نقطۂ بلند پر نظر آتی ہے جس کے ارد گرد کوئی بھی نمونہ نگاہ کو اپنی طرف موڑنے کے لیے موجود نہیں ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ؏۵ ان کی ذات تاریخ عالم میں ایک نئے انسانی تصور کا اضافہ کرتی ہے وہ تصور جس کے خط و خال سمجھنے میں تیرہ سو برس سے اب تک دنیا مصروف ہے اور ابھی بہت کچھ سمجھنا اور سمجھ کر لفظوں میں بیان کر سکنا باقی ہے۔

حسینی شخصیت کی ہمہ گیری

ایسے بہت سے اشخاص ہوتے ہیں جن کا کردار اختلافی حیثیت رکھتا ہے یعنی اُن کے واقعات زندگی کے تعین ہی میں نقطۂ نظر ایک نہیں ہوتا بلکہ کوئی اُن کے کسی خاص کارنامۂ زندگی کو تسلیم کرتا ہے اور کوئی اس کے وقوع کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔

لیکن ایسے اشخاص جن کے اوصاف اور واقعات متفقہ طور پر متعین ہیں اُن میں بھی باختلاف آراء اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی وصف کسی کے نزدیک قابل تعریف ہو اور کسی کے نزدیک وہی عمل یا اقدام یا وصف مورد مذمت بن جائے۔

یہ صرف حضرت امام حسین کی یگانہ خصوصیت ہے کہ آپ کے کارنامۂ زندگی کو ہر نقطۂ نظر کا انسان سراہتا ہے اور جس رُخ سے آپ کی زندگی کو جانچا جاتا ہے آپ انسان کامل ثابت ہوتے ہیں چنانچہ ذیل میں چند مضامین ممتاز اہل قلم کے درج کیے جاتے ہیں جن میں مختلف حیثیتوں سے امام حسین کے اوصاف اور سیرت زندگی کو جانچا گیا ہے اور ہر ایک کا آخری نتیجہ یہی ہے کہ حضرت امام حسین بلند ترین انسانیت کا معیار ہیں۔

―――― ❊ (۱) ❊ ――――

مذاہب عالم میں حسین کی عظمت

(از قلم علامۂ ہندی مولانا سید احمد صاحب (لکھنؤ)

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص مذہب کے لحاظ سے سراہے جاتے ہیں

؏۵ سید اختشام حسین صاحب ماہلی ایم اے۔

لیکن دوسرے مذاہب کے معیار کی بنا پر وہ قابل تعریف نہیں ہوتے بلکہ کبھی نفرت کے لائق ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تمام دنیائے انسانیت کے ساتھ یکساں تعلق نہیں ہو سکتا لیکن شہید کربلا حسین کی ذات وہ ہے جو تمام مذاہب عالم کے لحاظ سے عظمت اور احترام کی مستحق ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر تمام مذاہب عالم کے لحاظ سے امام حسین کی عظمت پر روشنی ڈالی جاتی ہے

(۱) اسلام اور امام حسین

کسی مذہب میں بزرگ ترین شخصیت کا وہ مالک ہو سکتا ہے جو خود بانی و مبلغ ہو یا اس کا شریک کار اور رکن اعظم ہو یا اس دین کا تحفظ اس ذات پر منحصر ہو اور حفاظت دین میں خود کو مٹا دے۔

اس معیار سے دیکھنے پر کون شخص ہے جو امام حسین کی بزرگی اور عظمت کا انکار کر سکے۔ اسلام نے عظمت کا معیار قرار دیا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم یعنی تم میں سب سے زیادہ معزز وہ شخص ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سب سے زیادہ فرض شناس انسان ہو۔ اس معیار پر کربلا کے مجاہد حسین کی عظمت میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ انھوں نے خدا کی یاد اس وقت تک کی جب کہ موت چن چن کر ان کے ساتھیوں کو لے جا رہی تھی بلکہ اس وقت بھی جبکہ قاتل کا خنجر گلے پر تھا۔ ان کا کربلا کا جہاد اور بے نظیر قربانی صرف فرض شناسی کا نتیجہ تھی۔ اس لیے اسلامی معیار کے مطابق وہ انتہائی عظمت کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔

نیز اسلامی مذہب کے متفقہ روایات کے لحاظ سے کوئی مسلمان امام حسین کی بزرگی و مقدس ہستی کا انکار نہیں کر سکتا۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ جس کو بچپنے میں رسول کاندھوں پر چڑھاتے (طبرانی) جو سجدہ میں پشت رسول پر سوار ہو اور رسول اس وقت تک سر سجدہ سے نہ اٹھائیں جب تک خود حسین پشت سے نہ اتریں (امام احمد بن حنبل۔ طبرانی و ابن سعد) جس کے بارے میں پیغمبر نے کبھی فرمایا ہو "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ (طبرانی و بیہقی) کبھی فرمایا ہو "خداوندا حسن اور حسین کے دوست کو دوست رکھ (ترمذی و ابن ماجہ) کبھی فرمایا ہو حسن و حسین کا دوست میرا دوست ہے اور ان دونوں کا دشمن میرا دشمن

ہے (ابن حبان) کبھی "حسن و حسین اور ان کی اولاد کی تعظیم کیا کرو" (ابن عساکر)
کبھی "جس نے میرے اہلبیت کو ایذا دی اُس نے خدا کو ایذا دی" (حافظ ابو نعیم)۔
ان تمام روایات کی بنا پر ہر مسلمان خواہ وہ کسی فرقہ و جماعت سے تعلق رکھتا ہو حسین
کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

(۲) ہندو مت اور امام حسین

ہندو مت میں ہی "ستوگن بوجہ پاک ہونے کے منور و صحت بخش ہے۔ (۱۰) جب سب
دروازوں سے گیان کی روشنی چمکنے لگے تب سمجھو کہ ستوگن زوروں پر ہے۔ (۱۵) جن
لوگوں کو ستون میں قرار حاصل ہے وہ اُدھر (اعلیٰ کی طرف) جاتے ہیں۔ (۲۰) جو دکھ
سکھ کو یکساں دیکھتا ہے اپنے میں مستقل رہتا ہے جس کے لیے مٹی کا ڈھیلا، پتھر اور سونا
یکساں ہے جس کے لیے اپنے اور پرائے یکساں ہیں اور جو مستقل مزاج ہے اور جو نندا (برائی)
اور تعریف کو یکساں جانتا ہے اور جو عزت و ذلت کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دوست و دشمن
سے یکساں برتاؤ کرتا ہے اور جو دنیا کے سب دھندوں سے کنارہ کش ہو گیا ہے وہ شخص گنوں
کے پار پہونچا ہوا کہلاتا ہے۔ (گیتا ادھیائے ۱۴)

شری کرشن جی نے ارجن مہاراج کو جو اس ادھیائے میں پرمان دیا ہے اب اسی کی روشنی میں
ذرا حسین کی مقدس ذات کو دیکھو کس طرح سے وہ گنوں سے پار ہو کر معصومانہ زندگی کے
مالک بن کر ستون میں قرار حاصل کر کے اعلیٰ علیین پہونچ گئے تھے۔ حسین کی پاکی اور نورانیت
اُن کے پاک اعمال اور نورانی کارناموں سے ظاہر ہے۔ امام حسین کے گیان دھیان کے زور
کو کربلا کے میدان میں آزما لو۔ ہر دل دوز تیر کا استقبال امام حسین خدا کے نام اور رسول
کے دین پر کرتے تھے۔ تیروں کی بارش میں فریضۂ نماز ظہر ادا کیا اور سجدۂ نماز عصر کا زیر خنجر
قاتل بجا لائے جس کی عملی مثال نہیں مل سکتی۔ امام حسین بڑے سے بڑے دکھ اور مصیبت
کو خوشی خوشی اس طرح قبول کرتے تھے کہ عالم کے مؤرخین حیرت زدہ ہیں۔ تین روز کی

بھوک پیاس میں اُس چلچلاتی دھوپ میں، ریگستانی گرمی میں دوست، عزیز، بچوں اور بوڑھوں کو راہ خدا میں قتل کرا دینا اور کلمہ شکایت زبان پر نہ لانا، تاریخوں میں دیکھو۔ جس کی مستقل مزاجی ہمت اور صبر کی یہ حالت ہو، جو دنیاوی عزتوں، راحتوں اور نعمتوں کو یزید سے بیعت نہ کر کے ٹھکرا دے اور زمین کربلا پر جا کر ابدی نیند سو رہے، جو اپنوں اور بیگانوں میں مساوات کا کیا ذکر دشمنوں کو کلیجہ کے ٹکڑوں پر ترجیح دے اور دشمن کی فوج کو پیاسا نہ دیکھ سکے۔ ایسا ستوگی (حسین) کیا شری کرشن جی کے ارشادات کا پورا پورا مصداق نہ تھا؟

امام حسین نے "مضبوط جڑ والے پیپل (درخت) کی طرح سے حب وطن اور تمام دنیاوی نعمتوں کو مضبوط ہتھیار (عزم و ارادہ) سے کاٹ کر اُس مقام (اعلیٰ علیین) کی تلاش کر لی جہاں پہونچ کر واپس نہیں ہوتے۔ (حسین سا) انسان دل میں مصمم ارادہ کر لیتا ہے کہ میں قدیم (لایزال خدا) کی تلاش میں نکلا ہوں جس سے یہ دنیا کا پرانا سامان پھیلا ہے، ایسے انسان (حسین) غرور اور گھمنڈ سے آزاد، دنیا کے بندھنوں پر فتحیاب، اپنی ذات میں ہمیشہ محو، خواہشوں سے پاک، سکھ دکھ روپیہ اور دھندوں کے تصدہ سے چھوٹے ہوئے اور اُس لافانی مقام کو پا لیتے ہیں۔ جہاں نہ سورج ہے نہ چاند۔ نہ آگ کا دخل ہے۔ جہاں پہونچ کر کوئی واپس نہیں ہوتا۔"

(اقتباس از گیتا ادھیائے ۱۵ پرشوتم کا بیان اشلوک الغایۃ ۶)

کیا حسین وہ ملکوتی صفات نہ تھے جن کی تعریف و توصیف میں شری کرشن جی اس طرح فرماتے ہیں:-

"بے خوف و پاک دل رہنمائی، علم و دانائی میں طبیعت کا جمانا، خیرات کرنا، حواسوں کا بس میں رکھنا، سکون قلب (شانتی)، بدگوئی سے پرہیز، رحم دلی، صبر و حیا، سنجیدگی، جلال عفو، استقلال، پاکبازی، صلح جوئی، انکساری یہ سب خصلتیں ایسے لوگوں میں موجود ہوتی ہیں جو فلکی سیرت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ (گیتا ادھیائے ۱۶ اشلوک الغایت ۳)

امام حسین شری کرشن جی کے نظریہ کی بنا پر وہ ولی اور اوتار تھے جو عمل بطور فرض کے اور بلا کسی لاگ اور عمل کی خواہش کے اور بغیر کسی رغبت و نفرت کے کرتے تھے۔ اس لیے

وہ ولی اور اوتار تھے۔ اور جو علم و دانائی سے امر و نہی اور مناسب اور نامناسب میں تمیز کرتے ہیں۔ خوف بیخوفی اور قید و آزادی میں فرق نہیں دیکھتے وہ ولی اور اوتار ہیں۔ وہ استقلال جس سے انسان یوگ سادھن کے ذریعہ نفس و روح اور حواسوں کی حرکتیں روکتا ہے وہ ولی اور اوتار ہے۔ وہ سکھ جس کا لطف آزمائش کے بعد اٹھایا جائے۔ اور جس سے دکھ کا خاتمہ ہو اور جو شروع میں زہر کا سا کڑوا معلوم ہو اور آخرت میں امرت سا میٹھا ثابت ہو اور کامل العلم ہو وہ ولی اوساوتار ہے (گیتا ادھیائے ۱۸ اسنیاس کا بیان اقتباسات اشلوک ۳۰ لغایتہ ۳۸)

(۳) بودھ مت

گوتم رشی ایک جانور کی جان بچانے کے واسطے اپنی گردن پیش کرتے ہیں۔ پھر کیا وہ قدر نہ کرینگے اس کی جو انسانوں کی جان بچانے کے واسطے اپنے کو تلواروں کی نذر کردے وہ زمانہ جب مظلوم میثم تمار کے دست و پا اور زبان کاٹ کر اس لیے سولی دی جاتی ہے کہ وہ داماد رسول علی مرتضیٰ کی مدح و توصیف کرتے تھے۔ محمد بن ابی بکر کو گدھے کی کھال میں لپیٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خلیفہ اول کے بیٹے سہی مگر علی مرتضیٰ کے پیرو اور پروردہ تھے۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو جو عابد و زاہد اور نماز گزار تھے قتل کر دیا جاتا ہے اس لیئے کہ وہ اہلبیت کے طرفدار ہیں۔ فرزند رسول امام حسن کو باوجود حکومت سے دستبردار ہونے کے اس لیے زہر دیا جاتا ہے کہ وہ علی و بتول کے بیٹے تھے ایسے راج کے متعلق اور ایسے پاپیوں کی نسبت کیا بودھ مت حسین کا ساتھ نہ دے گی اور ان کی سنگت کو اپنے دھرم کے مطابق فرض انسانی نہ قرار دے گی؟

(۴) بائبل

توریت، زبور اور انجیل کو نظر انصاف سے دیکھو، جیس بدکاری، ظلم و ناانصافی و بیدینی کے وقت نبیوں نے بے جگری سے مصیبتوں، ظلموں، تکلیفوں کو برداشت کیا ہے

امام حسین نے بھی اپنے زمانہ میں عرب کی بگڑی ہوی بدترین حالت کے سدھارنے میں انبیائے سابقین کے مانند ہمت و مردانگی سے جابر و ظالم سلطنت کا مقابلہ کرکے اپنی قربانی پیش کی ہے اور انسانیت سدھارنے میں نبیوں کے قدم بقدم چلتے رہے اور وہی رنگ ڈھنگ رہا جو انبیا رکا تھا۔

حضرت موسیٰ ظلم فرعون سے بچا کر بنی اسرائیل کو نکال لائے۔ امام حسین نے اپنی شہادت سے کمزور بندگان خدا کو یزیدیت سے بچالیا۔

جناب عیسیٰ نصاریٰ کے نزدیک سولی پر چڑھے۔ امام حسین تنہا نہیں بہتّر تنوں کے ساتھ جن میں چھ مہینہ کا بچہ بھی ہے راہ خدا میں قربانی دے رہے ہیں۔

اسی لیے اس شہادت عظمیٰ پر نبیوں نے خود بھی ماتم کیا اور امتوں کو بھی ماتم کا حکم دیا اس موقع پر صرف یرمیاہ نبی باب ۴۶ آیت ۱۰ کی پیشین گوئی کو سُن لو۔

"کیونکہ خدا رب الافواج کے لیے اتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہوا ہے" کیا یہ ذبیحہ سوائے حسین کے اور کوئی بھی ہو سکتا ہے؟

جس خدا کے دل وزبان سے پیار کرنے کی ہدایت انجیل مقدس میں ہے اُسی کی راہ میں امام حسین نے اپنا تن من دھن سب نثار کر دیا۔ آؤ ہم سب مل کر امام حسین سے محبت کرنا سیکھیں اور اس طرح سے تعلیم مسیح کے سچے پیرو بنیں کیونکہ امام حسین سے محبت انسانیت سے محبت ہے۔

---

(۲۱)

عالم انسانیت میں حسین کا درجہ

(بودھ مذہب کے بڑے عالم بھدنت بودھانند مہا ستھور کے قلم سے)

گہری نظر سے دیکھنے پر اس دنیا میں جنگلی حالت کو چھوڑ کر انسانوں کے چار درجے دکھلائی دیتے ہیں۔ پہلے نارکیہ کوٹی کے یرانی یعنی دوزخی انسان ہیں، جو جوا کھیلنے، نشہ خوری کرنے، زنا کرنے، چوری کرنے، پرائی دولت لوٹنے وغیرہ گناہوں میں ہی غرق رہتے ہیں

کبھی نیک کاموں کی طرف اُن کی توجہ نہیں ہوتی بلکہ نیک راہ پر چلنے والے دوسرے لوگوں
کا وہ لوگ مذاق اُڑایا کرتے ہیں۔ دوسرے سورگیہ کوٹی کے انسان یا دیوتا ہیں جو خلقت
کے اونچے سے اونچے درجے کے عیش و آرام کو بھوگتے ہیں (لطف اندوز ہوتے ہیں) اور
ہزاروں آدمیوں کے آرام کو خود ہی بھوگ لیتے ہیں اپنی بڑی شان سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں
کو اپنے سے اوپر جانے دینا تو درکنار اپنے برابر بھی ہونے دینا پسند نہیں کرتے۔ ہمیشہ اوروں
کو اپنے نیچے دبوچ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ماتحت جو رہے گا وہ آرام سے
رہے گا۔ جو خلاف ورزی کرے گا وہ سزا پائے گا۔ یہ لوگ اپنے ادھی کاروں (حقوق) اور اپنے
عیش و آرام کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے بہت کچھ پوجا پاٹھ، زکات، خیرات وغیرہ
کرتے رہتے ہیں اور اپنی خیریت کے لیے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں
میں دیوتا بھی شامل ہیں جیسا کہ تلسی داس جی نے اپنی رامائن کے اُتر کانڈ میں لکھا ہے:۔

اندرن دوار جھروکھا نانا! — تہہ تہہ سُر بیٹھے کری تھانا!
آوت دیکھہیں وشیہ بیاری — تے ہٹھی دیہہ کپاٹ اُگھاری
جب سو پربھنجن اُرگرہ آئی — تب ہیں دیپ وگیان بجھائی
گرنتھی نہ چھوٹی مٹا سو پرکاسا — بدھی بکل بھئی وشیہ بتاسا
اندر نہہ سر نہہ نہ گیان سہائی — وشیہ بھوگ پر پریتی سدائی

(ترجمہ) جسم میں جو اس خمسہ کے جو تمام دروازے ہیں۔ ہر ایک پر دیوتا لوگ اپنا
اڈا جمائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جب لذات نفوس کی ہوا کو آتے ہوئے دیکھتے ہیں
تو فوراً بصد دروازہ کھول دیتے ہیں اور جب اس ہوا کا طوفان خانۂ دل میں آتا ہے
تو شمع معرفت کو بجھا دیتا ہے۔ عقدہ کشائی نہیں ہوتی یعنی مادہ اور روح میں جو گتھی پڑی
ہوئی تھی وہ نہیں کھل پاتی اور معرفت کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ اُس وقت ضمیر اور عقل سلیم اس
ہوا کی آندھی سے پریشان ہو جاتی ہے سچ تو یہ ہے کہ حواس خمسہ کے دیوتاؤں کو علم و معرفت
اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لذات نفوس ہی سے ہمیشہ ان کی محبت رہتی ہے مطلب یہ ہے کہ
یہ دیوتا لوگ یا دیو کوٹی کے لوگ ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ عام لوگ مادہ پرستی

سے برطرف ہو کر حق پرست ہو جاویں ۔ کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اگر لوگ حق پرست ہو جائیں گے تو پھر دیوتاؤں کی پوجا کون کرے گا ؟ اسی لیے وہ انہیں مادہ پرستی میں کوشش کے ساتھ پھنسائے رہتے یعنی ہمیشہ گمراہ رکھتے ہیں ۔

تیسرے موکش یا رھنت کوٹی کے انسان ہیں ۔ یہ لوگ دنیوی یا مادّی لذّتوں کو بالکل ہیچ اور پوچ سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ دنیوی لذت اور عیش و آرام وغیرہ دوسروں کو تکلیف پہونچائے بغیر نصیب نہیں ہوتا ۔ جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک کا آرام دوسرے کی تکلیف پر، ایک کی آزادی دوسرے کی غلامی پر اور ایک کی زندگی دوسرے کی موت پر منحصر ہے وغیرہ وغیرہ ۔ دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ جس آرام و سکھ کے لیے آج ہم بڑی کوشش و سرگرمی کر رہے ہیں ۔ کل وہ ہمارے لیے معمولی ہو جاتا ہے اور اس سے بڑے سکھ کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس کے لیے ہم بے چین ہوتے ہیں ۔ اسی طرح بڑے سے بڑے سکھ اور عیش و آرام کی خواہش کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہتا ہے اور ہم بے چین ہوتے رہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے اندر بڑے سے بڑے گیانی و عارف لوگوں کے دماغ میں نجات ، مکتی ، ساکوئیا موکش اور نربان کا خیال پیدا ہوا اور اس کی تلاش ہونے لگی ۔

اسی سچائی کو محسوس کر کے اور دنیوی لذتوں کو دکھ اور تکلیف کا باعث سمجھ کر وہ لوگ تارک الدنیا ہو کر مکتی یا نجات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ نجات "وہ پرم شانتی ہے جسے حاصل کر لینے کے بعد کچھ اور حاصل کرنے کو باقی نہیں رہ جاتا ۔ ملک محمد جائسی صاحب نے اس کی کچھ جھلک اپنے پدماوت میں اس طرح دکھلائی ہے :-

سدا نہ راج کرہی اک راجا	سدا نہ باجے مہودر باجا
بھورے سکھیا ملھو سہیلی	دور دشیں میں تو جات اکیلی
رکت آنسو گری بھوییں ٹوٹی	رینگ پڑی جس بیر بہوٹی
سات سمندر پار وہی دیسو	کبھی لے پلوں کبھی پیٹھوں سندیسو
یہی مور بیاہ یہی مور گونا	اب کی جاب بہوری نہیں اونا

یعنی وہ حالت جہاں پہونچنے کے بعد پھر واپس ہونا نہیں ہوتا ۔

چوتھی کوٹی کے انسان وہ ہیں جنھیں ہم "بودھی ستو" کہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی دنیوی لذات میں پھنسنا اچھا نہیں سمجھتے بلکہ انھیں ہیچ و پوچ سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کا انتہائی مقصد "نربان" یا نجات کامل کو حاصل کرنا ہی سمجھتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے، کہ صرف اپنی ہی نجات کے لیے گوشہ نشین ہو کر دھیان سمادھی وغیرہ کے ذریعہ کوشش کرنا کافی نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان کو نجات دلانے کے لیے کوشش کرنا عین ضروری اور ہمارا فرض لازمی ہے۔ یہ لوگ گرے ہوؤں کو اٹھانا، بھولے بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا اور حق و انصاف کے لیے تیاگ اور اپنا بلیدان کرنا یعنی ایثار و قربانی کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں امام حسین کو اسی درجہ کا انسان سمجھتا ہوں۔ انھوں نے کربلا کے میدان میں اپنی، اپنے بال بچوں اور اپنے پیارے ساتھیوں کی بہت بڑی قربانی کر دی لیکن ایک مکار اور ظالم بادشاہ کے سامنے ناجائز طور سے جھکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو وہ خود اپنی زندگی نہایت عیش و آرام کے ساتھ گزار سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے ذاتی عیش و آرام کو نہایت ہیچ و پوچ سمجھا۔ اسی لیے میں امام حسین کو بہت بڑے پیار اور عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ امام حسین کی یہ قربانی بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو، بودھ جین، مسلمان، عیسائی، پارسی وغیرہ سب کے لیے قابل تقلید ہے۔ سب کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔

نمبر (۳)

حسین بحیثیت انسانِ کامل

از قلم پنڈت چندر کا پرشاد صاحب جگیاسو

ہندوستان کے چار خاص مذاہب ہیں جن کا کہ اپنا اپنا ضخیم مذہبی لٹریچر ہے۔ یہاں کا ایک وہ قدیم ترین مذہب ہے، جو آریہ قوم کے اس ملک میں آنے سے قبل یہاں پھیلا ہوا تھا اور جو آج کل "سنت مت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گرو گورکھنا تھ۔ سنت نکارام رامانند کبیر، نانک سب اسی کے پیرو کار ہوئے ہیں اور اس وقت آگرہ کا دیال باغ اس کا اسٹھوڈیٹ اکھاڑا مانا جاتا ہے اور دکھن میں "دروڑ سنسکرتی" (ورڈرین تہذیب)

کے نام سے وہاں کی تامل، تیلگو وغیرہ تیرہ۱۳ دکھنی زبانوں میں جس کا قدیم لٹریچر بھی موجود ہے
دوسرا آریوں کا ویدک دھرم ہے جو ویدوں اور سنسکرت لٹریچر کے تمام ارش گرنتھوں
میں موجود ہے جس کا اپٹوڈیٹ دعویدار مہارشی دیانند سرسوتی کا قائم کیا ہوا آریہ سماج ہے
تیسرا جین دھرم ہے جس کا لٹریچر پراکرت اور سنسکرت زبانوں میں موجود ہے اور چوتھا
بودھ دھرم ہے جس کا ترپٹک، مہاونس اور جاتک وغیرہ عظیم لٹریچر پالی زبان میں ہے
اور جو تبت، سیلون، چین، جاپان، برما و سیام وغیرہ ممالک میں اس وقت بھی شان کے ساتھ
رائج ہے۔

موجودہ ہندو مذہب جس کے ماتحت آج جمیع ہندو چل رہے ہیں ان چاروں مذاہب کا
مجموعہ ہے چونکہ سنت مت کے بزرگ ہمیشہ سے تارک الدنیا اور فقرا رہے ہیں اور اس کا
مذاق محض روحانیت رہا ہے اس لیے وہ روحانیت کے متلاشیوں میں ہمیشہ سینہ بسینہ چلتا
رہا ہے وہ دنیاداری کے سماجی نظام سے ہمیشہ کنارہ کش رہا ہے لیکن باقی تینوں دھرم چونکہ
ہندوستان کے رائج دھرم (شاہی مذہب) رہ چکے ہیں۔ اس لیے ان تینوں دھرموں کے
اصولوں کو لے کر یہاں ایک عام مذہب کی ساخت ہوئی تھی۔ وہی ہندوستان کا عام مذہب
اب "ہندو دھرم" کہلاتا ہے۔ جین، بودھ اور ویدک ان تینوں دھرموں کی ایک ایک خصوصیت
ہے۔ ویدک دھرم کی خصوصیت ہے "یگیہ ہون" جین دھرم کی خصوصیت ہے "تپ" یعنی زہد،
زہد وریاضت اور بودھ دھرم کی خصوصیت ہے "دان" یعنی زکات وخیرات۔

موجودہ ہندو دھرم میں یہ تینوں خصوصیات ہیں۔ ہندو دھرم کی ساخت کے بارے میں
صاف کہا گیا ہے:۔

"تریو دھرم اسکندھ یگیہ تپو دانم اتی" یعنی یگیہ، تپ و دان یہ دھرم کے تین بڑے
کھمبے ہیں جن پر ہندو دھرم کی عمارت کھڑی ہے۔

موجودہ ہندو مذہب کی کوئی ایسی رسم نہیں ہے جس میں اگیاری یعنی کچھ نہ کچھ آگ میں سلگایا
نہ جاتا ہو۔ یہ یگیہ ہے۔ کوئی ایسی رسم نہیں ہے جس میں برت (روزہ) رکھنا ضروری نہ ہو
یہ تپ ہے۔ کوئی ایسی رسم نہیں ہے جس میں برہمن بھوجن یا برہمن کو سیدھا نہ دیا جاتا ہو

یہ وان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جینیوں اور بودھوں کی طرح موجودہ ہندو مذہب بھی انسان کامل یعنی پورن پرش یا Perfect man کے حصول کا قائل ہے۔

جب میں ہندوستان کے ان چاروں ممتاز مذاہب کے اندر انسان کامل کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، اُن کے ساتھ حضرت امام حسین کے مبارک صفات کو منطبق کرتا ہوں تو میں ہندوستان کی مذہبی روح کے نقطۂ نظر سے آپ کو انسان کامل پاتا ہوں اور میرا دل حسینی عقیدت و محبت سے بھر جاتا ہے۔ میں جوں جوں آپ کے پاک اوصاف و صفات پر غور کرتا ہوں۔ آپ مجھے ہندوستان کی مذہبی روح کے ایک روشن مجسمہ نظر آتے ہیں اور میں آپ کو اپنے مذہبی جذبات سے ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز کرنے میں قاصر ہو جاتا ہوں۔

ہندوستان کے فلسفیوں نے متفقہ طور سے نجات (نرمان یا موکش) کو انسان کا انتہائی مقصد تسلیم کیا ہے اور یہاں کا ہر مذہب اپنے جداگانہ طریقوں سے انسانوں کو نجات حاصل کرنے کی تدبیر بتاتا ہے۔ چنانچہ جین مذہب جو اپنی تہذیب کو ویدک تہذیب سے بھی قدیم ترین، اصلی اور بنیادی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، حصول نجات کے قابل انسان کامل کے تین صفات پیش کرتا ہے۔ اس کا مقولہ ہے کہ:-

"سمیک درشن گیان چارترانی ساکشان موکش مارگہ" جس کا مطلب یہ ہے۔

(۱) سمیک درشن یعنی صحیح نظر (Right Vision)

(۲) سمیک گیان یعنی صحیح ادراک و علم (Right Knowledge)

(۳) سمیک چارترانی یعنی صحیح اخلاق (Right Character)

ان تین صفات سے منور انسان حصول نجات کی قابلیت رکھتا ہے۔

آیئے اس جین نظریہ کو سامنے رکھ کر ذرا حسینی سیرت کی زیارت کیجئے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حسین کو "صحیح نظر" حاصل تھی۔ یزید کو شام و عرب کے تمام علماء جبکہ مسلمان سمجھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے اور اُن کے دل و دماغ پر جبکہ یزید غالب ہو رہا تھا۔ تب حسین اُسے مسلمان، نہیں نہیں بلکہ انسان کہلانے کا بھی اہل نہیں دیکھ رہے تھے اس لیے کہ آپ کو صحیح نظر (Right Vision) حاصل تھی۔

حسینؑ جب کوفہ والوں کے بُلانے پر اپنے تمام بیوی بچوں کو بے سروسامان اور بلا تیاری کے اپنے ساتھ لے کر کوفہ کی جانب لے کر چلنے کو تیار ہوئے تو ہر سمجھدار آپ کو منع کرتا تھا اور ہر شخص اسے غلط بتاتا تھا لیکن حسینؑ کی عقل اسی کو صحیح راستہ سمجھ رہی تھی کیونکہ آپ کو "صحیح ادراک" (Right Knowledge) حاصل تھا۔

حسینؑ کے صحیح اخلاق (Right Character) کو کیا کہنا ہی۔ کسی دشمن کو بھی کبھی آپ کے اخلاق میں کوئی رتی بھر لغزش ڈھونڈھے نہیں ملی۔ حالانکہ اُس وقت کے مورخین سب مخالف پارٹی کے لوگ تھے اس لیے جین مذہب کے نقطۂ نظر سے حسینؑ اپنی جگہ انسان کامل تھے۔

دوسرا بدھ مذہب ہے جس نے دنیا کے ایک تہائی انسانوں کے دلوں کو مغلوب کر رکھا ہے۔

بودھ مذہب کی ریڑھ اس کا "آریہ اشٹانگک مارگ" ہی۔ بھگوان گوتم بدھ نے چار "آریہ ستیوں" یعنی چار اصل و اعلیٰ ترین سچائیوں کو دیکھا اور ان پر عمل کیا تھا۔ ان چاروں میں سے چوتھی سچائی پر جس میں کہ آٹھ صفات ہیں خود قادر ہو کر اُنھوں نے اُس کمال کو حاصل کیا تھا جس سے کہ وہ "نروان" میں پہنچے اور بنی نوع انسان کے لیے اُنھوں نے نروان یعنی نجات کاملہ کے حاصل کرنے کی ایک شاہی سڑک تلاش کر دی:

گوتم بدھ کی دیکھی ہوی وہ چاروں سچائیاں یہ ہیں:

(۱) دکھ (Suffering) یعنی اذیت کیا ہے؟

(۲) دکھ سموو ے (Origin of Suffering) یعنی اذیت کی بنیاد کیا ہی؟

(۳) دکھ نرودھ (Distruction of Suffering) یعنی اذیت کی تباہی و تخریب کیا ہے۔

(۴) دکھ نرودھ کا اپایہ (Noble way of distruction of suffering) اذیت کی تخریب کا صحیح راستہ کیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں حسینؑ نے بھی اپنی جگہ پر چار اصل سچائیوں کو دیکھا اور ان کا احساس و علم کیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ:-

(۱) خودداری و نفس پرستی و شرانگیزی لوٹ کھسوٹ جدال و قتال، تباہی و بربادی، بدچلنی و زناکاری، بیماری، موت اور آخر میں دوزخ کی آگ میں جلنا یہ اذیت ہے۔
(۲) ایک خدا کی ذات پاک یعنی حق پرستی اور نیکی پر ایمان کامل نہ لاکر ہزاروں وہموں میں پھنسے رہنا یعنی شرک، بت پرستی، اندھی نفس پرستی و ناعاقبت اندیشی یہ اذیت کی بنیاد ہے۔
(۳) خداشناسی یعنی توحید و نیکی، پرہیزگاری و نفس کشی و آخرت پسندی و قناعت کم استغنا اور یتیموں، مسکینوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا یہ اذیت کی تخریب ہے۔
(۴) رسول کا بتلایا ہوا اسلام ہی اذیت کی تخریب کا صحیح راستہ ہے۔
بھگوان گوتم بدھ نے اذیت کی تخریب کا صحیح رستہ جس پر چل کر انسان انسان کامل (Perfect man) ہو جاتا ہے، اشٹانگ مارگ یعنی آٹھ صفات کا غنی ہونا محسوس کیا تھا۔ کون آٹھ؟

(۱) سمیک درشٹی (Right Views) صحیح نظریہ
(۲) سمیک سنکلپ (Right Aspiration) صحیح آرزو یا صحیح ارادہ
(۳) سمیک اچار (Right Speach) صحیح کلام یعنی حق گوئی۔
(۴) سمیک کرمانت (Right Conduct) صحیح اخلاق یا صحیح فعال
(۵) سمیک آجیو (Right livelihood) صحیح روزگار یا صحیح معیشت
(۶) سمیک ویایام (Right effort) صحیح ورزش یا صحیح جہد یا صحیح کوشش
(۷) سمیک سمرتی (Right Memory) صحیح حافظہ یعنی صحیح یادداشت
(۸) سمیک سمادھی (Right Contemplation) صحیح تصور یا صحیح مراقبہ

جب ہم لارڈ بدھا کی بتائی ہوئی ان آٹھوں صفات کو حضرت امام حسین میں تلاش کرتے ہیں تو ہمیں یہ آٹھوں آپ کی سیرت میں واضح طور سے نمایاں ملتی ہیں۔ مثلاً صحیح نظر اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ صحیح ارادہ یہ بھی بتایا جا چکا۔ صحیح کلام، یہ بھی ظاہر ہے۔ آپ جو بولے صحیح بولے۔ جس موقع پر جس شخص سے جو کچھ کہا درست و صحیح تھا وہی اور اتنا ہی آپ نے

فرمایا کہیں پر ایک نقطہ بھی کم و بیش یا غلط نہیں فرمایا۔

صحیح اخلاق۔ اس کا بھی بیان ہو چکا کہ دشمن کو بھی آپ کے اخلاق میں کبھی کوئی غلطی ڈھونڈے سے نہیں ملی۔

صحیح طریقۂ معاش۔ یہ صفت بھی آپ میں موجود تھی۔ آپ کے والد حضرت علی نے تو بیت المال کے مالک ہوتے ہوئے بھی مزدوری کر کے یعنی یہودی کے باغ میں پانی سینچ کر اپنا گزر بسر کیا۔ وہ بیت المال کو رعایا کی دولت سمجھ کر اُسے رعایا کی بہبودی میں خرچ کرتے رہے اور حسین کی والدہ حضرت فاطمہ چکی پیس کر اور چرخہ چلا کر امور خانہ داری کی خدمت اپنے دست مبارک سے کر کے بسر کرتی تھیں اور ظاہر ہے کہ بچہ ماں باپ ہی کے اخلاق سے سبق لیتا ہے۔

حسین میں صحیح ورزش یا صحیح کوشش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف جہاں آپ روحانیت میں لاثانی تھے وہاں جسمانی بہادری میں بھی بے نظیر تھے۔ آپ نے باوجود تین دن کی فشنگی اور انتہائی دل خستگی کے کربلا میں تن تنہا ہزاروں سپاہیوں کے مقابلہ میں بے نظیر بہادرانہ جنگ کی۔ صحیح جہد کیا ہے؟ یہی کہ اپنے جان و مال سے غریبوں، یتیموں کی مدد کرنا۔ عبادت یعنی نماز روزہ کے ذریعہ دل کو پاک کرنا، نفس کو جیتنا، گمراہوں کو نصیحت اور نیک اخلاق کے ذریعہ سچے دین پر لانا وغیرہ۔

حسین میں صحیح حافظہ یا صحیح یادداشت تھی۔ آپ کبھی کوئی بات، کوئی وعدہ اور کوئی فریضہ کبھی بھولے نہیں۔ آپ ایک لمحہ کے لیے کبھی یہ نہیں بھولے کہ آپ خدا کے پاس سے آئے ہیں اور آخر میں خدا کے پاس جانا اور تمام عمر کے کاموں کا حساب دینا ہے۔ آپ اس بات کو بھی کبھی نہیں بھولے کہ آپ رسول اللہ کے نواسے ہیں، اُن کی پاک گود میں کھیلے ہیں، رسول اللہ نے پیار سے آپ کے لب چومے ہیں اور اس پیار ہی پیار میں آپ نے رسول کی اُمت کے بچانے کا وعدہ کیا تھا اور آپ کے اوپر اسلام کے اصولوں کی انتہائی و کامل پابندی کی بہت بڑی ذمہ داری ہے اس لیے نہیں بھولے کہ آپ کی یادداشت درست اور حافظہ صحیح تھا۔

حسین میں صحیح تصور و مراقبہ تھا۔ اپنے معبود کی یاد نہ آپ اپنے نانا کی مبارک گود میں بھولے اور نہ جنگ کربلا میں ۱۹۴۰ زخم کھانے کے بعد ملعون شمر کے خنجر کے نیچے۔ کیونکہ آپ نے

معبود سے ایک لمحہ بھی الگ نہ ہو سکتے تھے۔ آپ کے صحیح مراقبہ کی زندہ مثال ہے۔

معلوم ہوا کہ حسین ان آٹھوں صفات سے آراستہ تھے جو بودھ مذہب کے نظریہ سے انسان کامل میں ہونا لازمی ہیں۔

جس طرح جین اور بودھ مذہب کے نظریہ سے حسین انسان کامل ہیں اسی طرح ہندو نظریہ سے بھی آپ کامل نظر آتے ہیں۔ موجودہ ہندو دھرم کی سب سے زیادہ مستند کتاب بھگوت گیتا ہے۔ گیتا بھگوان کرشن کا پاک کلام ہے۔ گیتا میں چار خاص یوگ بیان ہوئے مانے جاتے ہیں یعنی (۱) کرم یوگ (۲) گیان یوگ (۳) دھیان یوگ یا راج یوگ (۴) بھگتی یوگ۔ حسین میں یہ چاروں یوگ ہم نمایاں پاتے ہیں۔

کرم یوگ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ جو بلا کسی شخصی بہبودی کی خواہش کے محض دھرم یا فریضہ کی ادائی کے لیے ہر کام کرتا ہے۔ وہی کرم یوگی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ حسین کا کوئی کام کبھی اپنے شخصی مفاد یا شخصی آرام کے لیے نہیں ہوا۔ آپ نے جو کچھ کیا صرف دھرم کے لیے دین و دنیا کی بھلائی اور بہبودی کے لیے کیا۔ یہاں تک کہ دھرم بچانے کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا اس لیے آپ گیتا کے نظریہ کے مطابق سچے کرم یوگی تھے۔

آپ گیان یوگی بھی تھے۔ کیونکہ آپ آخرت کی زندگی کو ہی اصلی زندگی سمجھتے تھے۔ آپ نے گیتا کے اس کلام کے مضمون کو بخوبی سمجھ لیا تھا "متہ پرترم نانیت کنچد استی دھننجیہ" یعنی ایک پرمیشور کی ذات پاک کے سوا باقی اور سب باطل ہے۔ آپ سچے حق شناس یعنی ایشور درشی تھے

حسین دھیان یوگی یا راج یوگی بھی تھے۔ کیونکہ آپ ہر وقت اپنے معبود سے توسل رکھتے تھے۔ کسی وقت ایک لمحہ بھی اس سے جدا نہ ہوتے تھے۔ یہی گیتا کے راج یوگ کا لب لباب ہے کہ انسان کو "یودن یکت" یعنی باطن سے رب میں ہمہ تن مصروف ہونا چاہئے۔ حسین بھگتی یوگی یا پورن بھگت تھے۔ آپ نے ایشور یا اللہ کی مرضی کے لیے ہی اپنا سب کچھ تصدق و قربان کر دیا تھا۔ عبادت آپ کو از حد عزیز تھی۔ اپنے معبود کی عبادت کے لیے آپ نے خاص طور سے دشمن سے ایک رات کا موقع مانگا تھا اور نویں محرم کی تمام رات جو کہ آپ کی زندگی

کی آخری رات بھی آپ نے صرف عبادت میں گزاری۔

علاوہ ان چاروں لوگوں کے بھگوان کرشن نے گیتا میں اپنے عزیز ترین و کامل بھگت کے صفات بھی بیان فرمائے ہیں۔ یہ صفات گیتا کے بارھویں ادھیائے میں بیان ہوئے ہیں جنہیں سے تین اشلوک پیش نظر ہیں ان اشلوکوں میں فرمایا ہے کہ جو کسی سے بغض و کینہ نہیں رہتا۔ جو سب کا دوست اور رفیق ہے۔ جو سب پر رحم کرتا ہے جو ممتا موہ سے خالی ہے۔ جس میں غرور و تکبر نہیں ہے جو رنج و راحت میں ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ جو معافی دینے والا ہے۔ جو ہر حالت میں صبر و شکر کرتا ہے۔ جو یوگی یعنی حق میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے جس نے اپنے نفس یعنی اپنے آپ کو جیت لیا ہے جو عقیدت کا پختہ ہے۔ جس نے اپنے دل و دماغ کو ایشور کے حوالہ کر دیا ہے یعنی جو خدا کی مرضی ہی کو اپنی مرضی سمجھتا ہے۔ جو نہ خود کسی سے مضطرب ہوتا ہے اور نہ اُس سے کوئی دوسرا مضطرب ہوتا ہے اور جو خوشی، غصہ اور خوف کے غلبہ سے کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ ایسا کامل بھگت مجھے عزیز ترین ہے۔

ان چودہ[۱۴] صفات کا جب ہم حسینؑ کی اعلیٰ شخصیت میں پتہ لگاتے ہیں تو ہم آپ کو ہر صفت سے منور و کامل پاتے ہیں۔

اس طرح حسینؑ کو جب ہم ہندوستان کے مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ تو آپ میں اُن تمام صفات کو نمایاں پاتے ہیں جن کے ہونے سے انسان "پورن پرش" یا "پرشوتم" ہو جاتا ہے ہم آپ کو ہر پہلو سے کامل پاتے ہیں اور یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ حسینؑ ایک ایسا انمول ہیرا ہے جسے جس پہلو سے دیکھو بے عیب و بیش قیمت ہے۔ حسینؑ وہ خوشنما گلاب ہے جس کا ہر جزو اپنی خوبصورتی و خوشبو سے دل کو کھینچ لیتا ہے۔ حسینؑ ایسا کھرا سونا ہے جسے جیوں جیوں تپاؤ تیوں تیوں خوشرنگ ہوتا جاتا ہے۔ حسینؑ وہ روشن آفتاب ہے جس میں ہر رنگ موجود ہے اور واقعہ کربلا ایک ایسا مرقع ہے جس میں دنیا کی تمام انفرادی، خانگی و سماجی زندگی میں اٹھنے والے ہر سوال کے حل کی تصویر ہے۔

اس میں باپ بیٹا، بھائی بہن، بیوی شوہر، دوست، اقارب سب کے فرائض کی حد بندی کا عملی نمونہ موجود ہے اسمیں دینی و دنیوی زندگی کا کامل نقشہ موجود ہے، اسمیں سیاسی جد و جہد اور سیاسی مشکلات کا بھی نمایاں حل موجود ہے،

اگر غور سے دیکھا جائے تو دین و دنیا کا کوئی ایسا سوال نہیں ہے جسے حضرت امام حسین نے اپنے کارناموں سے حل نہ کر دیا ہو حسین کا کوئی کام ادھورا نہیں ہے۔ ہر کام پورا اور کامل ہے کیونکہ کامل انسان کا ہر فعل کامل ہی ہوتا ہے۔

(۴)

حسین کی شخصیت

(از خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر)

دنیا کی تاریخ ایک معنی میں اپنی عظیم المرتبت عورتوں اور مردوں کے واقعات پر منحصر ہے جنھوں نے کہ اس کے ارتقائی مدارج کو اپنے بڑے کارناموں سے یقیناً متاثر کیا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض ممتاز مفکرین میرے اس قول سے اختلاف کریں اور کہیں کہ کارلائل کا یہ فلسفۂ تاریخ فرد کو جماعت کے مقابلہ میں ناجائز رفعت دیتا ہے اس لیے کہ جماعت کا منفقہ زور ایک فرد یا افراد کے ایک زمرہ سے بدرجہا قوی ہے۔ اس بحث میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس سے شائد افراد اور جماعت کا وہ رابطہ نظر انداز ہو جاتا ہے جس کی وہ ایک کڑی ہیں۔ یقیناً تمام عظیم تاریخی شخصیتیں اپنے زمانہ اور ماحول کی پیداوار ہوا کرتی ہیں مگر یہ بات بدیہی ہے کہ ان بڑے مردوں اور عورتوں نے اکثر دنیا کے واقعات کے رخ کو موڑ دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں میں کیا زبردست امکانات اچھائی اور برائی دونوں کے لیے پوشیدہ رہتے ہیں۔

جب خیالات اور تحریکوں کے دو دریں دھارے غیر یقینی طریقہ سے تاریکی میں جاتے ہوتے ہیں اور ان کی منزل مقصود غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں ہوتی ہے تو ایسے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن میں غیر معمولی قوت اور دوراندیشی موجود ہوتی ہے اور وہ اُسے صحیح رُخ پر لگا دیتے ہیں۔ ایسے تمام عظیم افراد پر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی عظمت میں یہ امر مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی اور آرام کو بنی نوع انسان کے لیے وقف کر دیا اور اس عظیم مقصد کو اپنی جان اور ذاتی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گرانقدر سمجھا۔ غالباً وہ اپنی زندگی کا یہ مقصد سمجھتے تھے کہ انسان محض خوش رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ جس چیز کو

وہ حقیقی اور بیش قیمت سمجھتا ہے اُس کی خدمت اور حصول کے لیے تکلیف اُٹھانا اور صعوبت برداشت کرنا اُس کا فرض ہے۔

اگر تاریخ وقتاً فوقتاً ایسی شخصیتوں کو نہ پیدا کرتی جو کہ اپنے عزم صمیم سے انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کو سدھارتے رہیں تو یقیناً انسانی زندگی پھر وحشی اور جنگلی قوانین کے ماتحت ہو جاتی جہاں جذبہ بہیمیت نہ کسی سماجی اور اخلاقی اصول اور نہ دماغی رائے کا پابند رکھتا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کا کام بس یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو عمدہ باتوں کی طرف راغب کریں، اُن کو رفعت کی راہیں سمجھائیں۔ اور ان کو ابتدائی بربریت کی طرف مائل ہونے سے مانع ہوں۔

دنیا کے ان سب سے بڑے شہداء کی فہرست میں امام حسین (شہید کربلا) عزت و شرافت کی ایک بڑی منزل پر فائز ہیں۔ اُنھوں نے کسی سائنس کے مسئلہ کی تحقیق نہیں کی تھی، کوئی نیا ملک دریافت نہیں کیا تھا اور نہ کسی نئے مذہب کی بنیاد رکھی تھی، وہ عام معنی میں کوئی بڑے فاتح یا مدبر و منتظم بھی نہ تھے۔ معمولی دماغ والا اُنھیں صرف ایک معمولی انسان سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا جنھوں نے کہ مٹھی بھر جماعت کے ساتھ ایک لاتعداد فوج کے مقابلہ میں شکست کھائی ہو اور سلطنت سے ہاتھ دھویا ہو۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا کے عظماء کے خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت اُن میں نہیں پائی جاتی تھی تو اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ بعد کی تمام نسلوں کی نظر میں اُن کو عزت و احترام کا استحقاق حاصل ہو گیا ہے؟ اُنھوں نے دنیا کو بہادری اور بڑائی کا کون سا نیا سبق دیا ہے۔

میرا پورا مقالہ اسی سوال کا جواب ہے اور میں نے اس باب میں کوشش کی ہے کہ اختصار کے ساتھ اُن باتوں کو واضح کروں جو کہ اُن کی بزرگی و شرف کے عمود ہیں۔

کسی تاریخی شخصیت کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں دو باتوں کا جواب ملنا چاہیے پہلے تو یہ کہ اس مقصد کی نوعیت کیا تھی جس کے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی جان دیدی؟ دوسرے یہ کہ اُس کے کردار کے اخلاقی و ذاتی خصوصیات کیا تھے جن کو کہ اُس نے اپنے مقصد کے حصول میں صرف کیا؟ یہ دو سوالات اس کی قربانی کی صحیح عظمت معین کریں گے۔

اگر ہم اس کی قربانی کے اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر دیں تو چنگیز خاں کی خونی فتح ایک منجم کے ایک نئے ستارہ کو معلوم کرنے یا ایک ڈاکٹر کی تحقیق کے بعد کسی مرض کی دوا معین کرنے سے زیادہ عظیم ہو جائے گی۔ اگر افراد کے کردار کو زیر غور نہ رکھیں تو اچھے اور برے وسائل میں امتیاز مفقود ہو جائے گا اور ہم مانی والے اخلاقیات کو ماننے پر مجبور ہوں گے لیکن جہاں کہ انجام اخلاقی حیثیت سے ممدوح ہے اور وسائل معزز ہیں تو اس وقت انسانی کوشش بہت عظیم ہو جاتی ہے اور انسان ہمیشہ بڑھتے ہوئے تخلیقی امور میں خدا کا معاون کار ہو جاتا ہے۔

اب آؤ! حسین کو اس معیار پر جانچیں۔ آخر حسین نے کیوں اتنی عظیم قربانی پیش کی؟ صرف اپنی ہی جان کی نہیں اس لیے کہ یہ تو مقابلۃً آسان ہے بلکہ اپنے اعزا و اقربا وغیرہ کی بھی اُس ہمت اور جواں مردی کے ساتھ جو کہ اب بھی انسانی تاریخ میں عدیم المثال ہے۔

آئندہ صفحات کا مطالعہ جس میں کہ واقعات کے ضمن میں گذشتہ تفصیلات کا تاریخی خلاصہ بھی دیا گیا ہے اس بات کو واضح کر دے گا کہ حسین نے میدان کربلا میں یہ تاریخی جنگ اُن تمام خوبیوں کے تحفظ میں کی جن کی عزت سمجھدار آدمی ہر زمانہ میں کرتے رہے ہیں۔

مذہبی مسلمانوں کی نظروں میں حسین حمایت و تحفظ اسلام کے لیے جنگ کرتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں اُس ناپاک اور بے دین حکمران کے خلاف جو کہ نہ محض خلیفۃ المسلمین بن جانے کی دھمکی دیتا تھا بلکہ مسلمانوں کا رہبر بن بیٹھا تھا اور اسلام کے صاف چہرہ پر اپنی ذاتی خرابیوں اور ناپاک سماجی اور سیاسی اصولوں کا دھبا لگانا چاہتا تھا۔

آؤ دیکھیں کہ "اسلام کے لیے جنگ" کا مطلب عرف عام میں یعنی مسلمانوں اور تمام خدا ترس انسانوں کے نزدیک کیا ہے جس کے لیے حسین نے ایسی بے نظیر قربانی پیش کی۔ اس پر غور کرنے کے بعد ہم اندازہ کرینگے کہ حسین ساری دنیائے انسانیت کے لیے کیا پیغام دیتے ہیں جس میں مذہب و ملت کی تفریق نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ حسین نے انسانی ضمیر کی آزادی کے لیے مقابلہ کیا جو کہ ہر انسان کا فطری حق ہوا کرتا ہے۔ یزید سیاسی اقتدار کو غصب کر چکا تھا اور رشوت، دباؤ اور قوت سے اُس نے تمام لوگوں سے بیعت لے لی تھی، سوائے حسینی جماعت کے۔

جن لوگوں نے مجبوراً یزید کو خلیفہ تسلیم کیا تھا اُنھوں نے گویا ظلمت کی قوتوں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

حسین رسول کے نواسے اور اپنے کردار کی ذاتی خوبیوں اور راستبازی کے سبب لوگوں میں بے حد معزز تھے اور ہمیشہ بھلائی کے کوشاں رہا کرتے تھے جب تک کہ وہ یزید کی بیعت نہ کر لیتے یقیناً وہ اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔

برائی اور ظلم کو جوع البقر ہوتی ہے یعنی ایسی بھوک جو کہ تمام اچھائیوں اور برائیوں کو نگل جائے۔

یزید نے اب حسین کے سامنے بیعت کا مسئلہ رکھا یعنی یہ کہ وہ اُس کی دینی اور دنیوی خلافت کو تسلیم کر لیں جس کا مطلب اُن تمام ذاتی اصولوں اور اخلاقیات کا ترک کر دینا تھا جو کہ حسین کو عزیز تھے اور یا وہ یزیدی فوج کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں جس کا نتیجہ بہت ممکن ہے یہی ہو کہ حسین اور اُن کے انتہا سے زیادہ عزیز اور وفادار ساتھیوں کو موت کا مزہ چکھنا پڑے حسین نے تامل نہ کیا ضمیر کی آواز حسین کے لیے زیادہ قوی تھی بنسبت اُن تمام خوفناک نتائج کے جو کہ ایک شکست کے بعد میدان جنگ میں برداشت کرنا پڑیں

وہ اپنے زمانہ والوں کو اور آیندہ نسل والوں کو یہ بات سمجھا دینا چاہتے تھے کہ اپنا ذاتی تحفظ و آرام، عزیزوں اور دوستوں کی سلامتی اور متعلقین کی فطری محبت کوئی بھی حق کی خاطر لڑنے کے سامنے وقعت نہیں رکھتی۔

کیا آج جبکہ اس دنیا میں ظلم اور تشدد بڑھا ہوا ہے اُس کے لیے حسین کی مثال سے زیادہ اہم کوئی مثال ہو سکتی ہے جنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ برائی کا کیونکر ہر قیمت پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ان قوتوں کو شکست دینے میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جا سکتا حسین کی مثال حق اور انصاف کے مجاہدین کے لیے ہمیشہ منارۂ نور رہے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حسین فرد واحد کے ضمیر کے نمایندہ نہیں تھے بلکہ اُن تمام سماجی رجحانات کے جن کا نتیجہ آزادیٔ قوم ہو۔

یزید جمہور کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے تخت نشین نہیں ہوا تھا بلکہ ظلم اور

مطلق العنان قوت کی وجہ سے حصول خلافت میں کامیاب ہوا تھا وہ اُن تمام شہری اور
مدنی آزادیوں کا باغی تھا جنھیں اسلام نے ہر فرد کا ورثہ قرار دیا تھا۔ رسول کی تعلیم کردہ
سادی زندگی کو جسے اسلام کے سچے پیروؤں نے شعار بنا لیا تھا ذلیل اور حقیر کرنے کے لیے اس نے
کھلم کھلا عیش و عشرت میں بسر کرنا شروع کیا اور علانیہ اسلام کے تعلیم کردہ سماجی اور اقتصادی
مساوات کا مضحکہ اُڑاتا تھا۔

حسین کی شہادت یزیدی حکومت کی ان تمام باتوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج
تھی اور اس نے یقیناً سماجی اور سیاسی زندگی میں انصاف کے اصول کی اہمیت کا پھر سے
احیاء کر دیا۔ اُن تمام لوگوں کے لیے جو کوشش کرتے ہیں یا جنھوں نے کوشش کی ہے یا جو
آئندہ کوشش کریں گے کہ عام انسانوں کے لیے بہترین زندگی کا معیار بن جائے ان سب کے لیے
حسین کی آزادی اور حقوق جمہور کے لیے بہ نفس جنگ کی مثال یقیناً مشعل ہدایت ہوگی
تاریخ میں اور بھی بہت سے اچھے اور سچے انسانوں کی نظیریں موجود ہیں جنھوں نے
کہ خاص مقاصد کے لیے کوشش کی ہے اور وہ یقیناً ہمارے عزت و احترام کے مستحق ہیں
لیکن حسین کی قربانیوں کو اور اُن کے کارناموں کو لاثانی اور بے نظیر بنا دینے والے
عناصر کون ہیں؟

جس چیز نے حسین کی قربانی اور عمل کو عدیم المثال بنا دیا ہے وہ حق کو قوت پر فتحمند
بنانے کے لیے وہ غیر معمولی طریق کار ہے جو حسینی سیاست و تدبر و کردار کی جان ہے۔
(جیسا کہ اس کتاب میں پہلے بھی تشریح ہو چکی ہے) اُس تاریک زمانہ میں بھی حسین
کا اثر عربوں کے دلوں پر تھا۔ ہزاروں آدمی جنھوں نے کہ رسول کو دیکھا تھا اور اُن کی صحبت
میں رہے تھے۔ اُنھوں نے رسول کی حسین سے انتہائی محبت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگر حسین
اپنا اثر اور قوت کو یزید کے خلاف ایک فوج جمع کرنے میں صرف کرتے تو کوئی وجہ نہیں
معلوم ہوتی کہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوتے ۔ اگر وہ اپنی جنگ میں عسکری سیاست
اور حکمت عملی کو دخل دیتے اور بہر صورت فتح حاصل کرنا چاہتے تو جنگ کے لیے جو طریقہ انھوں
نے اختیار کیا تھا یقیناً اس سے مختلف طریقہ پر اُن کی جنگ ہوتی۔ یقیناً انھوں نے فوج

جمع کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی تھی۔ انھوں نے اس کو بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مقابلہ ایک لشکر جرار سے ہوگا اور وہ اس میں قتل ہوں گے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو دوران سفر میں کئی مرتبہ متنبہ بھی کیا تھا کہ وہ اُن کا ساتھ دے کر اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں شب عاشور کو بھی انھوں نے (جیسا کہ پہلے آپ دیکھ چکے ہیں) اپنی مٹھی بھر فوج کو جمع کر کے ایک مؤثر تقریر کی اور کہا کہ اے بہادرو دیکھو میرا ساتھ دینے میں ایک نہایت تکلیف دہ اور یقینی موت کا سامنا کرنا ہے لہٰذا جسے جانا ہو وہ پردۂ شب میں کسی حفاظت کی جگہ پر چلا جائے انھوں نے شمع بھی گل کر دی تاکہ جس کو جانے میں پہلے تامل ہو رہا تھا وہ اب چلا جائے۔ کس نے سنا ہے کہ ایک لشکر جرار کے مقابلہ میں کوئی سپہ سالار اپنی فوج کی تعداد کو ہر ممکن طریقہ سے برابر گھٹا ہی رہا ہو۔

دوسرا عنصر جو اس سپہ سالار میں حیرت خیز ہے وہ یہ کہ دوسروں کو تو وہ اپنا ساتھ دینے سے منع کرے لیکن اعزا اقربا کو اپنے خطرناک سفر میں ساتھ ساتھ رکھے یعنی اپنی بیوی بھائیوں، بہنوں، بیٹوں، بیٹیوں، بھتیجوں، اور بھتیجیوں کو۔ کس نے سنا ہے کہ ایک بے حد محبت کرنے والا باپ اپنے بیٹوں یہاں تک کہ ششماہہ بچہ کی بھی زندگی کو خطرہ میں ڈال دے؟ کس نے سنا ہے کہ ایک چاہنے والا شوہر اور بھائی اپنی بیوی اور بہن کو معرض خطر میں خود سے لا کر چھوڑ دے؟ مگر یہاں تو جنگ کی نوعیت ہی مختلف تھی۔

(جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) وہ کوئی عسکری فتح یا حفاظت جانی کے طالب تھے بلکہ یزید نے موجودہ اور آئندہ اسلامی دنیا کو جس نازک حالت میں کر دیا تھا۔ اُس کا مقتضیٰ ہی یہی تھا کہ قربانی نمایاں اور مکمل ہو۔

اگر حسینؑ قوت و فوج ہی سے فتح کے طالب ہوتے تو آج تاریخ واقعۂ کربلا کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دیتی کہ دو حریفوں میں جنگ ہوئی جن میں سے ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوئی اور اس طرح اس معرکہ کی اصل نوعیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں ساری دنیا والوں کے ضمیروں کو انتہائی درجہ متحرک کر دینے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہتی۔ اگر وہ جنگ کی طرح سے جنگ کرتے یعنی اپنے ساتھ مضبوط اور قوی سپاہیوں کو لڑاتے اور قتل کرا دیتے تو اس

وقت میں لوگ ان کی جنگ کو ایک عام جنگ سمجھتے احساس کا انتہائی اثر جو اب ہی ہرگز باقی نہ رہتا۔ اس لیے موقع حسین کے لیے اسی امر کا متقاضی تھا کہ قربانی بہت نمایاں اور تمثیلی حقیقت رکھنے والی ہو۔

تاریخ کسی زمانہ میں بھی ہمیں کسی دوسری ایسی جنگ کا پتہ نہیں دیتی جس میں اتنی بلند، اتنی متنوع اور اتنی دلگداز قربانیاں حق و صداقت کی حمایت میں جان بوجھ کر اور اپنی خواہش سے پیش کی گئی ہوں۔ دیکھو اس جنگ کے لڑنے والے کیسے تھے؟ کچھ تو بڈھے تھے جو پیرانہ سالی کے سبب دُہرے ہو گئے تھے۔ کچھ جوان تھے جو کہ اپنی زندگی کے شباب پر تھے۔ کچھ بچے تھے جو کہ ابھی سن بلوغ تک بھی نہیں پہونچے تھے۔ بہر حال اس میں عزیز، اقارب، دوست، بڈھے، جوان بچے، غلام سب موجود تھے اور قربانی کا وہ حوصلہ تھا کہ اپنے آقا پر جان نثار کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ جب عرب کی بہادری کا یہ پھول کھلانے لگا اور اب قربانی کے لیے کوئی فدیہ راہ خدا باقی نہ رہا تو شش ماہہ اصغر نے بھی ننھے مجاہد کی طرح اپنے کو پیش کیا تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ یزیدی فوج صرف حسین کی دشمن نہ تھی بلکہ تمام عمدہ انسانی ہمدردیوں اور انسانی جذبات کی بھی دشمن تھی۔ اور ان تمام شدائد و تکالیف کے درمیان جن کو چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہو گا حسینؑ ایک چٹان کی طرح مستقل رہے جس کو کہ ہم "مافوق البشر" ہی کہہ سکتے ہیں۔

اگر حسین کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا، اور اُس پر ان مصائب کا عشر عشیر بھی پڑتا تو اُس کے حواس گم ہو جاتے اور ارادہ میں تزلزل پڑ جاتا۔ لیکن حسین نے اس میدان میں جو بازیاں لگائی تھیں وہ نہایت بلند تھیں۔ یعنی وہ اسلام اور انسانیت کے مستقبل کے لیے تھیں اور یہ سب قربانیاں اُس اصل مقصد کا جزو لاینفک تھیں۔ ان تیزی کے ساتھ بڑھنے والی تباہیوں کے سامنے بھی حسین نے اُن تمام بلند انسانی خوبیوں کا مظاہرہ کیا جو ایک بڑے آدمی کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہیں۔ یعنی محبت و وفاداری، اصابت رائے حسن گفتار و کردار، عبادت خدا اور بنی نوع انسان کے حقوق کی مراعات اور اس سب کے ساتھ فوق البشر ہمت اور استقلال کا وہ مظاہرہ کیا جس کی نظیر مفقود ہے۔ یقیناً

سانحہ کربلا کا ایک ایک واقعہ اخلاقیات کا ایک ایک سبق اور انسانی شرافت و بہادری کی غیر معمولی رفعت کا ثبوت ہے۔

جب ظہر کے وقت تک اُن کے وفا شعاروں کے نخل حیات قطع ہو گئے اور وہ برگ خزاں دیدہ کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر گر گئے، تو حسین نے اپنی موت کا سامنا کرنا چاہا اُس ہمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ جو تخیل کو وحشت میں ڈال دیتی ہے۔

جو چیز اور بھی قابل تعجب ہے وہ یہ کہ ایسے نازک اور جان گسل موقع پر حسین اپنی بلند طبعی اور خصوصیت منصبی کے محافظ رہے اور اُن کا نفس اس حد تک اُن کے اختیار میں رہا کہ وہ اپنے قاتلوں کے لیے بھی اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنے دشمنوں کی برائی نہیں چاہی اور اُن کے لیے کبھی بد دعا نہیں کی بلکہ کہا جاتا ہے کہ جب ظالم و بے رحم شمر خنجر لیے ہوئے امام کے سر و تن میں جدائی کر دینے کے لیے بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ امام سجدہ میں ہیں اور خشک ہونٹ خالق کی بارگاہ میں مناجات کر رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھا کہ حسین اپنے دشمنوں کے لیے بد دعا کر رہے ہوں گے لیکن جب اُس نے جھک کر سُنا تو حسین جن کی تربیت اور ورثہ نے اُن کو انسان کامل کا نمونہ بنا دیا تھا خدا کی درگاہ میں یہ دعا کر رہے تھے کہ "اے خدا تو رسول کی اُمت کو صراط مستقیم کی ہدایت فرما اور اُن کو بخش دے"۔ کائنات کا دل حیرت اور تعجب کے عالم میں ہوگا جبکہ قاتل کے خنجر کے نیچے جاں کنی کے عالم میں حسین کی زبان سے دعائے مغفرت کے یہ کلمے نکل رہے ہوں گے۔

حسین کی تکلیفیں موت کے بعد ہی ختم نہیں ہو گئیں۔ حسین کے پسماندگان جنھیں سب بچے اور عورتیں ہی تھیں سوائے ایک بیٹے کے جو کہ عرصہ سے بستر بیماری پر پڑا تھا سب کو اور بھی زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ قیدیوں کی حیثیت سے دربدر پھرائے گئے اور خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں اُن کی تشہیر کی گئی اس طرح ان مخدرات عصمت نے بھی جو کہ رسول کی بہوئیں، پوتیاں اور نواسیاں تھیں گھر بار کو چھوڑ کر اپنے امام اور خاندان کے سرتاج کے مقصد قربانی میں اشتراک عمل کیا۔ جبکہ یہ لٹا ہوا قافلہ دربدر پھرایا جا رہا تھا تو لوگوں میں ان معصوموں اور بے گناہوں کی حالت

دیکھ کر خلیفۂ وقت کے خلاف اشتعال پیدا ہوتا تھا۔ جو لوگ یزید کی مملکت میں پناہ گزیں تھے یا جن میں اُس کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت موجود نہ تھی اُن میں بھی جرأت اظہار پیدا ہو گئی (ان نتائج کی مزید تفصیل اس کتاب میں بعد کو آئیگی)

اس طریقہ سے حسین کی میدان جنگ میں نمایاں قربانیوں نے اور اُن کے اہلبیت کے ان مصائب نے وہ آگ لگا دی جس نے چند ہی سال میں یزیدی قوت کے ناپاک ایوان سلطنت کو جلا کر خاکستر کر دیا اور جس نے یزیدیت کو ہمیشہ کے لیے ظلم اور برائی کا مرادف بنا دیا اور یزید کو جو اسلام کو فنا کرنے کے لیے اٹھا تھا شہادت حسین نے یقیناً نہایت عمدہ طریقہ سے ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس طریقہ سے حسین نے شکست کے بعد فتح حاصل کی۔ ان شہداء کے خون سے از سر نو اسلام میں زندگی پیدا ہوئی اور اُس کے اخلاقی اور سماجی اصولوں کی نمائش ہوئی اسی وجہ سے کہا گیا ہے:۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کیا ان تمام واقعات سے حسین کا جو خاکہ ہمارے دماغ میں آگیا ہے اُسمیں اب کچھ اور زیادہ رنگ آمیزی کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسین نے تاریخ میں شرافت اور بہادری کا ایک نیا باب کھول دیا ہے اور اپنے کردار اور کارنامہ کا وہ نقش مرتسم کر دیا ہے کہ اگر ہم اُسے پورے طور سے سمجھ لیں تو حیران رہ جائیں۔

اُن کی شخصیت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی حقیقۃً انسان کی آزاد ملک نہیں ہے بلکہ خدا کا ایک مستعار عطیہ ہے۔ انسان اس سے اپنی خواہش کے مطابق کام لینے کا حق نہیں رکھتا اُسے خدا کی راہ میں صرف کر دینا چاہیئے یعنی بلند مقاصد کے حصول میں۔ انسان عیش و عشرت کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ کوشش کرنے کے لیئے تکلیف اٹھانے کے لیے اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کے لیے حسین نے باوجود اس کے کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی پر قدرت رکھتے تھے اپنے لیے فقر و فاقہ کی زندگی قبول کی۔ انھوں نے غلبہ اور استبداد کی زندگی کے بجائے جس پر وہ قادر تھے اپنے لیے خدمت خلق کو عزیز

رکھا۔ دن رات غربا اور مصیبت زدوں کی تکلیفوں کو دُور کرنے میں صرف کیا اور اپنے لیے ایسے آرام کو حرام سمجھا جو کہ غریب سے غریب انسان کو بھی میسر نہ ہو۔

ان میں انتہائی بلند قسم کی ہمت تھی جسمانی اور روحانی دونوں۔ جسمانی یوں کہ انھوں نے سخت دھوپ، بھوک اور پیاس برداشت کی اور پھر میدان کارزار میں جہاد کیا اور روحانی ہمت یوں کہ خدا کی راہ میں اپنے اعزا و اقربا کی جان سے بھی دریغ نہ کیا۔ ان میں وہ ہمت تھی کہ انھوں نے تن تنہا خباثت کی صف آرا فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ ایسی ہمت کے مالک تھے جو اعلانِ کلمۂ حق میں بے باک تھی اور سب سے بڑھ کر اُن کی ہمت کی مثال یہ تھی کہ انھوں نے موت کا ایک بچھڑے ہوئے دوست کی طرح استقبال کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

اس "مافوق البشر" ہونے کے باوجود بشریت کے تمام جوہر ان میں موجود تھے محبت اور دوستی و وفاداری کے مراتب سے وہ آگاہ تھے۔ سماجی نظام سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نہیں رہا کرتے تھے۔ وہ اپنی بیویوں سے کمال درجہ محبت کرتے تھے اور اپنے بچوں اور تمام خاندان والوں کو اپنی آنکھ کی پتلی سمجھا کرتے تھے۔ وہ ایک بے حد چاہنے والے دوست کی بھی حیثیت رکھتے تھے جو دوستوں کے انتقال کی خبر سُن کر رنج سے بیتاب ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ایک نہایت رحمدل اور ہمدرد آقا تھے جو اپنے غلاموں کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا کرتے تھے جیسا کہ خاص اپنے گھرانے والوں کے ساتھ۔ تعلقات معاشرت میں منصف، خوش مزاج، دوستوں کے ہمدرد۔ سچا جذبہ رکھنے والے، دشمنوں کے ساتھ بہادر، خود اپنے لیے سخت اور محنتی، دوسروں کے لیے نرم اور عذر خواہ و کریم اصول میں درشت، روزمرّہ کے معاملات میں شکر گزار، صاف، سچے، وفادار، فراخ دل مردم دوست، خدا ترس۔

یہ ہیں حسین جن کی اس ساری دنیا میں سیزدہ صد سالہ یادگار منائی جا رہی ہے۔ کروڑوں جو آج یادگار میں حصہ لے رہے ہیں یقیناً اپنے دل میں اُس قدر کے احساس کی شمع پھر سے روشن کر رہے ہیں جس قدر کی حفاظت کے لیے خود حسین زندہ رہے اور مرے۔

کسی شاعر نے سچ کہا ہے:-

ہر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

سارے زمانہ کے محبوب ترین شخص کی بارگاہ میں اُس کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے اس قاصر اور ناموزوں مقالہ کو اسلام کے بڑے شاعر اقبال کے لاجواب قلم سے نکلے ہوئے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

آں امام عاشقاں پورِ بتول — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنی "ذبح عظیم" آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل
سُرخ رو عشق غیور از خون او — سُرخی ایں مصرع از مضمون او
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الہ گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر — خود نکردے با چنیں ساماں سفر
دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد — دوستان او بہ "یزداں" ہم عدد
سرِ ابراہیم و اسمٰعیل بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود
عزم او چوں اسپ ان استوار — پائدار و تند سیر و کامگار
تیغ بہر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد — ملت خوابیدہ را بیدار کرد

نقش "الااللہ" بر صحرا نوشت | سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسین آموختیم | ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت | سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز | تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں | اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

(اسرارِ بیخودی)

(۵)

حسینؑ اور انقلاب

(از شاعرِ انقلاب، جوشؔ ملیح آبادی)

ہمراز یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ | دو دن کی زندگی کا غمِ این و آں نہ پوچھ
کیا کیا حیاتِ ارض کی ہیں تلخیاں نہ پوچھ | کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں نہ پوچھ

تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرطِ شرم سے منھ ڈھانپنے لگے

یوں تو غمِ معاش کا سوزِ نہاں ہے اور | تکلیفِ جاں گدازیٔ عشقِ بتاں ہی اور
لب تشنگیٔ شیب و عذابِ خزاں ہی اور | اعلانِ امرِ حق کی مگر داستاں ہی اور

"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود" صائب

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا | رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا | قرناؤ طبل و ناوک و رہبت کا سامنا

لاکھوں میں ہی وہ ایک کروروں میں فرد ہے
اُس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دمبدم — دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جراتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسمِ گرامی حسین ہے

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا وہ حسینؑ — جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا وہ حسینؑ
جو خلوتیِ شاہدِ قدرت تھا وہ حسینؑ — جس کا وجود فخرِ مشیت تھا وہ حسینؑ

سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسینؑ — گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسینؑ
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسینؑ — جو اک سنِ جدید کا بانی تھا وہ حسینؑ

جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لیے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لیے ہوئے

عزت پہ جس نے سر کو فدا کر کے دم لیا — صدق و منافقت کو جدا کر کے دم لیا
حق کو ابد کا تاج عطا کر کے دم لیا — جس نے یزیدیت کو فنا کر کے دم لیا

فتنوں کو جس پہ ناز تھا وہ دل بجھا دیا
جس نے چراغِ دولتِ باطل بجھا دیا

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا — تختہ الٹ کے قصرِ حکومت کو ڈھا دیا
جس نے ہوا پہ رعبِ امارت اڑا دیا — ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا

اس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہو گیا
لفظِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا

پانی سے تین روز رہے جس کے لب تر — تیغ و تبر کو سونپ دیا جس نے گھر کا گھر
جو مر گیا ضمیر کی عزت کے نام پر — ذلت کے آستاں پہ جھکایا مگر نہ سر

لی جس نے سانس رشتۂ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

جس کی جبیں پہ کج ہی خود اپنے لہو کا تاج — جو مرگ و زندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج
سر دے دیا مگر نہ دیا ظلم کو خراج — جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیا کی لاج
سُنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مرد سر فروش نے رکھ لی خدا کی بات

ہر چند اہل جور نے چاہا یہ بار بار — ہو جائے محو، یاد شہیدان کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا — لیکن کسی کا زورِ یزید نہ چل سکا
عباس نامور کے لہو سے دُھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھُلا ہوا

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضَو — یہ جو مچل رہی ہے صبا، پھٹ رہی ہے پَو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرا رہی ہے لَو — در پردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رَو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اُسی جری کی ہے آواز دوستو

جس کا ہجوم درد و الم سے یہ حال تھا — سینہ تھا پاش پاش، جگر پائمال تھا
رُخ پر تھا تشنگی کا دھواں دل نڈھال تھا — اس کرب میں بھی جس کو فقط یہ خیال تھا
آتش برس رہی ہے تو برسے خیام پر
آنے نہ پائے آنچ مگر حق کے نام پر

ہر چند ایک شاخ چمن میں ہری نہ تھی — ماتھا عرق عرق تھا لبوں پر تری نہ تھی
باطل کی ان بلاؤں پہ بھی جاگری نہ تھی — یہ داوری تھی اصل میں پیغمبری نہ تھی
رنگ اُڑ گیا حکومت بدعت شعار کا
عزم حسین عزم تھا پروردگار کا

تھی جس کے دوش پاک پر اہل وفا کی لاش — انصار سر فروش کی لاش اقربا کی لاش
عباس سے مجاہد تیغ آزما کی لاش — قاسم سے شاہزادہ گلگوں قبا کی لاش
پھر بھی یہ دُھن تھی صبر کی زلفوں سے بل نہ جائے
اس خوف سے کہ حق کا جنازہ نکل نہ جائے

نذار و نزار و تشنہ و مجروح و ناتواں — تنہا کھڑا ہوا تھا جو لاکھوں کے درمیاں
گھیرے تھے جس کو تیر و تبر ناوک و سناں — اور سو رہا تھا موت کے بستر پہ کارواں
اتنا نہ تھا کہ حق رفاقت سے کام لے
گرنے لگیں اگر تو کوئی بڑھ کے تھام لے

ہاں وہ حسینؑ، خستہ و مجروح و ناتواں — ساکت کھڑا ہوا تھا جو لاشوں کے درمیاں
سنتا رہا سکون سے جو پیر نیم جاں — اکبر سے ماہ رو کی جوانی کی ہچکیاں
ہے ہے کی آ رہی تھی صدا کائنات سے
پھر بھی قدم ہٹائے نہ راہِ ثبات سے

(۶)

حسینؑ (؟)

(از سید آل رضا صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ)

حسین نام ہے حسنِ کمالِ خلقت کا — حسینؑ نام ہے انسان کی شرافت کا
وہ جد کا خلق وہ ماں کا شرف وہ باپ کی تیغ — حسینؑ نام ہے گلدستۂ نجابت کا
جیے اُسی کے لیے اور مرے اُسی کے لیے — حسینؑ نام ہے اللہ کی محبت کا
وہ شانِ مرگ کہ قاتل بھی شرمسار ہوئے — حسینؑ نام ہے دشمن پہ بھی حکومت کا
وہ قلتِ رفقا اور وہ عزم کے تیور — حسینؑ نام ہے ردِّ غرورِ کثرت کا
سوالِ بیعتِ فاسق پہ جو کہا سو کہا — حسینؑ نام ہے خودداری حمیت کا
یزید مٹ گیا ذلت کی زندگی کی طرح — حسینؑ نام ہے نقشِ دوامِ عزت کا
شفا کے رُخ پہ لگایا مزاجِ انساں کو — حسینؑ نام ہے سنبھلی ہوئی طبیعت کا
وہ نظمِ نفس کہ انسان ہو تو ایسا ہو — حسینؑ نام ہے تکمیلِ آدمیت کا
وہ سخت وقت وہ ماں کی کنیز کو بھی سلام — حسینؑ نام ہے اسلام کی اخوت کا

زمیں پہ سجدہ میں سر رکھ کے سر کو نذر کیا　حسین نام ہے اس شان کی عبادت کا
جوان بیٹے کی میت اٹھا کے شکر کیا　حسین نام ہے مظلوم دل کی طاقت کا
رہا نہ کوئی تو بچہ کو بھی نثار کیا　حسین نام ہے آفت میں زور ہمت کا
ستم بڑھے تو قدم راہ حق میں اور جمے　حسین نام ہے پر جوش استقامت کا
فروغ ماہ بھی ہے ایک پر تو خورشید　حسین نام ہے عباس کی شجاعت کا
حسینیت کو زمانہ یہ چھپا کے رہنا تھا　حسین نام ہے اک مستقل شریعت کا
ملاؤ اپنا عمل اسوۂ حسینی سے　حسین نام ہے آئینۂ حقیقت کا
وقار بڑھ گیا اسلام کا خدا رکھے　حسین نام ہے معراج دین فطرت کا
حسین فدیۂ حق اور رضائے حسین　حسین نام ہے ہر خوبی ہدایت کا

(۷)

شانِ حسینؑ

(از علامہ کیفی چریا کوٹی)

نبی کا نور عین ہے علیؑ کے دل کا چین ہے　نگاہ قبلتین ہے کہ ان کے بین بین ہے
امام مشرقین ہے سلام مشرقین ہے　ادھر ادھر کوئی نہیں حسین ہی حسین ہے
سمجھ سکے جو زندگی بھی اس سے کچھ مزید ہے
شہید اس کا ہے خدا، خدا کا وہ شہید ہے

زمین کربلا نہ تھی مقام ضبط ہوش تھا　جہاں میں خروش تھا حسین ہی خموش تھا
کہ داغ کھا رہا تھا اور دست گل فروش تھا　جھکا سجود کے لیے کہ بار سر بدوش تھا
اٹھا سناں کی نوک پر کہ اس کا یہ سلام تھا
سجود ختم ہو چکے تو لازمی قیام تھا

جہاں میں زندگی شمع صرف ایک رات ہے　مگر دھواں جو اٹھ گیا چھپی ہوئی حیات ہے
حسین کی وہ شان ہے حسین کی وہ ذات ہے　ادھر حسین اور ادھر تمام کائنات ہے

شہادت حسین نے چراغ جاں جلادیا
چراغ جاں جلادیا، چراغ تن بجھادیا

امانت عزیز کا ازل میں جب سوال تھا — امین اس کا کون ہو ہر اک کو یہ خیال تھا
اک گروہ سے بڑھا جو عشق ذوالجلال تھا — عجیب اس کا کیف تھا عجیب اس کا حال تھا

کہا نیاز بے خطر میں، آن بان سے
کہ یہ متاع بے بہا خرید لوں گا جان سے

حسین کربلا وہی امین بے قرار تھا — امانت ازل کا وہ حیات زندہ دار تھا
جہاں کے اعتبار سے خود اپنا اعتبار تھا — کہ دست اختیار تھا کہ چشم انتظار تھا

طلب ہوئی تو اپنے سر کو پیش یار رکھ دیا
اٹھا کے یعنی دوش سے، وہ اپنا بار رکھ دیا

حصۂ سوم

واقعۂ کربلا کے نتائج

پہلا باب

فتح اور شکست

مادی حیثیت سے اور وقتی طور پر اس میں کیا شبہہ ہے کہ واقعہ کربلا کی جنگ میں یزید نے فتح پائی اور امام حسین مکمل طور سے برباد کر دیے گئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ع۵ "انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں قوت حیوانی اور قوت روحانی۔ بسا اوقات اپنی روحانی قوت کو رکھتے ہوئے انسان سطحی نگاہوں میں مغلوب سمجھا جاتا ہے لیکن وہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اصلی فاتح ہوتا ہے

ڈانٹو نے کیا خوب کہا کہ میرا نام برباد ہو جائے لیکن حق کی فتح ہو، روحانی انسان کے لیے مادیت کے مقابلہ میں شکست کھا جانا اُس کی شکست نہیں ہے بلکہ وہ اُس کی کلید فتحیابی ہے"

بقول مسٹر سی ایس رنگا آئر "شہید کا خون عمارت مذہب کے لیے سیمنٹ کا کام دیتا ہے۔ شہید زندۂ جاوید ہوتا ہے اور انسان کی معراج شہادت ہے شہید کبھی اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوتا۔ اگر وہ ابتدا سے انتہا تک شہادت کے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

اصول کو سامنے رکھ کر استاطے کرے تو سب کچھ اُس سے چھینا جا سکتا ہے لیکن کامیابی اُس سے نہیں چھینی جا سکتی۔"

عے "اگر انسان اپنے اصل مقصد میں جو صداقت اور حق پرستی پر مشتمل ہے آخر میں باوجود شکستوں کے کامیاب ہو جائے تو وہی اُس کی اصل کامیابی ہے مثال کے لیے دیکھیے کہ یہودیوں نے جناب عیسیٰ کو سولی دیکر اپنے زعم ناقص میں یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے بہت بڑی فتح حاصل کی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اصل میں فتح کس کو ہوئی؟ حضرت عیسیٰ کو یا یہودیوں کو؟ جناب عیسیٰ آج بھی انتہائی احترام کا مرکز ہیں اور یہود ملعون ہیں۔ اسی طرح یونانیوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ پلا کر اپنی فتح سمجھی لیکن فتح سقراط کی ہوئی اس لیے کہ آج بھی اُس کی یاد تاریخ اور ادب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یوں ہی ابوجہل و ابوسفیان نے حضرت محمد مصطفےٰ کو ترویج اسلام میں بیحد پریشان کیا لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ابوجہل تو میدان بدر میں ذلت کی موت اور بدنامی سے دوچار ہوا اور ابوسفیان بھی ہمیشہ کے لیے اسلامی دنیا میں مردود و مطرود رہا۔ برخلاف اس کے حضرت محمد مصطفےٰ کا نام آج بھی دنیا کی ایک تہائی آبادی کے قلوب کو منور و روشن کیے ہوئے ہے۔

جس طرح شکسپیر کے ڈرامہ اتھلو میں ایاگو اپنی بدمعاشیوں کے سبب بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے لیکن آخر میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ وقت جلد آیا۔ جب اُس کی خباثتیں ظاہر ہو گئیں اور اُسے موت کی چاشنی چکھنا پڑی۔ یوں ہی اس بات پر بھی غور کیجئے کہ ابوسفیان کے پوتے یزید نے رسول کے نواسے امام حسینؑ کو مع اعزا و اقربا میدان کربلا میں قتل کر کے دنیا کی نظر میں اپنے کو فاتح ثابت کیا لیکن در اصل فتح حسینؑ کی ہوئی یا یزید کی؟

یزید کا آج کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے اور جو دو چار اُس کی نسل سے ہیں اُن کو بھی اپنا خاندان ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کے برخلاف حسینی نسل

عے سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

روئے زمین پر باوجود مصائب و شدائد کے زیادہ ہی ہوتی رہی اور وہ اب بھی اُن کی نسل میں ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہے اور حسین کا نام اب تک ہر سال، ہر ماہ، ہر روز، ہر ساعت بلکہ ہر لحظہ و ہمہ وقت انتہائی عزت و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے بلکہ حسین کی قربانی کی جو عظمت عام انسانوں کے دلوں پر بغیر تفریق مذہب اثر انداز ہے ویسی کسی دوسرے شہید کی نہیں ہے۔ حسین کی غیر فانی شہادت بقول اسبرن دا اپنے نتائج کے سبب تاریخ عالم میں اہم ترین واقعہ ہے جو رسول کی خدمتوں کے بعد دوسرا سب سے بڑا اقدام ہے) اور حقیقۃً تمام انصاف پسند مورخین چاہے وہ یورپ کے ہوں یا دوسری جگہ کے شہادت حسینی کے متعلق اسی قسم کی رائے رکھتے ہیں"

فتح کے معنی کسی لغت میں "قتل کرنا" اور شکست کے معنی "مقتول ہونا" نہیں ہیں بلکہ فتح نام ہے کامیابی یعنی مقصد کے حصول کا اور شکست ناکامی یعنی مقصد کا ہاتھ نہ آنا۔

اس اعتبار سے جانچنے کے لیے طرفین کے مقاصد کو سمجھنا بہرحال ضروری ہوگا۔ اس کتاب کو شروع سے یہاں تک آپ نے پڑھا ہو تو آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یزید کا مقصد کیا تھا اور حسین کا اُس کے مقابل میں کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

حضرت امام حسین اور یزید کی باہمی مخالفت کوئی ذاتی اور شخصی حیثیت نہ رکھتی تھی جس میں یزید یہ چاہتا ہو کہ حسین کو قتل کر ڈالے اور حسین کا مقصد یہ ہو کہ یزید کی زندگی ختم کر دیں یا کم از کم اپنے کو اُس کے ہاتھ سے محفوظ رکھیں۔

اگر ایسا ہوتا تو بے شک یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یزید کامیاب ہوا اور امام حسین ناکام ہوئے۔

بحیثیت ایک فرد انسان کے حسین زندہ رہتے اور یزید ایک فرد انسان کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا تو ان دونوں میں باہمی کسی آویزش کا امکان ہی نہ تھا۔ ایک حجاز میں مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ گیر اور ایک ملک شام میں دمشق کے اندر جاگزیں

اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ یزید حسین کے درپے ہوتا اور حسین یزید سے برسر مقابلہ آتے؟

مگر یہاں صورت یہ تھی کہ یزید عالم اسلام میں ایک خودسرانہ اور مطلق العنان شہنشاہیت کا مالک بنا ہوا اپنے کو پیغمبر اسلام کا نائب منوانا چاہتا تھا اور حسین اس کے مقصد میں سدراہ ہو رہے تھے۔ وہ جاہلیت کے مادی دور کے پلٹانے کا علمبردار اور حسین روحانیت اور انسانیت کو قائم کرنے کے ذمہ دار، وہ طاقت و اقتدار کا سکہ چلانے کا درپے، اور حسین حق و راستی کا علم بلند کرنے پر آمادہ۔ وہ اسلامی حدود و امتیازات کے مٹانے پر تلا ہوا اور حسین اسلامی امتیازات کو باقی رکھنے پر کمربستہ۔ ع۵ اور یزید نے کربلا کی جنگ کے متعلق مقصد جنگ کو بتاتے ہوئے اپنے سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کو بے نقاب کر دیا یہ کہکر کہ حسین نے (عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کر کے) ہماری بلند عمارتوں اور آرائش و آسائش کے سامانوں کو خطرہ میں ڈال دیا تھا اس لیے ہمیں اپنے اقتدار اور دولت کو قائم رکھنے کے لیے جنگ کرنا پڑی" اور حسین نے اپنے نقطۂ نظر کو ان اشعار میں صاف کر دیا جو ابن خشاب نے نقل کئے ہیں:۔

الله یعلم ان ما ؛ بیدی یزید لغیره ؛ وبانه لم یکتسبه ؛ بخیره و بمیره
لو انصف النفس الخؤ ؛ ن لقصرت من سیره ؛ ولکان ذالک منه ادنی ؛ شره من خیره

یعنی اللہ جانتا ہے کہ جو کچھ یزید کے ہاتھوں میں ہے وہ دوسروں کی ملکیت ہے، اسے کوئی استحقاق ان چیزوں کا نہیں ہے۔ اگر خائن انسان انصاف سے کام لیتا تو اپنی رفتار بدل دیتا اور شرارت میں کمی کرتا،

یہی نظریہ وہ تھا جس کا پھیلنا اور دوسروں کے دماغوں اور پھر زبانوں تک پہونچنا یزید کے شہنشاہی اقتدار کی موت کا مرادف تھا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خودسرانہ شہنشاہیت اور ظالمانہ حکومت کیا چاہتی ہے؟ دو باتیں۔ ایک افراد قوم سے قوت احساس سلب کرنا، دوسرے جرأت اظہار ختم کرنا

ع۵ مولانا مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

دمشق کی شہنشاہیت نے بڑی تدبیروں سے ان دونوں مقصدوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ عوام نے یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ حکومت جائز ہے یا ناجائز۔ اور جس کسی نے سونچا اور سمجھ بھی لیا اُسے اتنی ہمت نہ رہی کہ وہ اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکے امام حسین کا مقصد اسی کے مقابل تھا یہ کہ جمہور مسلمین میں قوت احساس بھی پیدا ہو اور جرأت اظہار بھی پیدا ہو۔ یہی دونوں چیزیں کسی قوم میں جب پیدا ہو جائیں تو دنیا کی کوئی ظالم سلطنت اطمینان کے ساتھ اُس پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکتی۔

عہ "حسین اپنی شہادت سے ایک عام بیداری چاہتے تھے اور ایک ایسی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے کہ صرف طاقت و اقتدار ہی کو حق نہ سمجھا جائے اور مظلوم ظلم سے گھبرا کر آزادی کی دولت کو نہ کھو بیٹھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ نیکی و بدی، آزادی و غلامی، ہدایت و گمراہی کی جنگ ہمیشہ برپا رہتی ہے لہذا ارباب حق کے لیے ایک ایسا مقدس نظام جنگ چھوڑ رہا ہیں کہ وہ حق کی جنگ کو صرف حق کیلئے اور حق کے اصول پر لڑیں"

قاعدہ ہے کہ عہ۲ "عام خیالات جس سطح پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اُس سے اُس وقت تک نہیں ہٹتے جب تک کوئی خیالات میں ہلچل ڈالنے والا اہم واقعہ پیش نہیں آتا۔

روما کی قدیم تاریخ کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایمفی تھیٹر کے سالانہ تماشوں میں انسانی خون کس بیدردی سے بہایا جاتا تھا اور جسم انسان کے تکا بوٹی ہونے پر سنگدل انسان کیسی خوشی کی تالیاں بجاتے تھے یہ انسانیت سوز وحشیانہ تماشے سالہا سال ہوتے رہے اور کسی کے جذبات میں بھولے کو ہیجان پیدا نہ ہوا۔ آخر ایک دن جبکہ اکھاڑے میں دو شخص برہنہ تلواریں لے کر خونریزی کے لیے کودے تو ایک نیکدل پادری فوراً ان کے بیچ میں آگیا اور کہا نادانو! کیا کرتے ہو۔ انسانی خون اتنا سستا نہیں کہ تماشائیوں کو خوش کرنے کے لیے بہایا جائے۔ مجمع اس رکاوٹ سے بے لطف ہوا اور ہر طرف سے آواز آئی پادری کو مار ڈالو، قتل کر ڈالو، آخر وہیں اکھاڑے میں اُس بے گناہ کا خون بہا دیا گیا۔ تماشا ختم ہوا۔

عہ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری عہ۲ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی۔

اور لوگ اپنے اپنے گھر پہونچے۔ اب ٹھنڈے دل سے اس امر پر غور ہونے لگا کہ پادری نے اپنی عزیز جان کیوں دی؟ رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس قسم کے کھیل تماشے پیکرِ انسانیت پر کھلا ظلم ہیں۔ آخر بے گناہ پادری کا خون رنگ لایا اور وہ تماشے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔"

۶۰ھ میں سلطنت شام کے افعال و اعمال کو مسلمان دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے یعنی ایک عام بے حسی چھا گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرت امام حسین کا ساتھ دینے والے بھی بہت کم تھے۔ اس پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے عـ۵ " بات یہ ہے کہ دماغ کے جو اجزاء اپنا عمل نہیں کرتے اُن کی مخصوص عملی قوت فاعلی بیکار ہو جاتی ہے۔ جرمنی کے اسٹراسبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر (موسیو ریجلر) جرمنی قوم کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ہماری قوم کی امتیازی خصوصیت تمام تر اعتماد پر زندہ رہنا ہے۔ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو مدت سے وصیتوں پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ بسمارک کے مضبوط ہاتھ نے گزشتہ بیس سال کے زمانہ میں ہم سے ملکۂ استنباط اور عاقبت اندیشی کو چھین لیا ہے، گو اس کے عوض میں ہمارے لیے ایک ماضی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تمام چھوٹے بڑے معاملات میں حکومت کا دامن پکڑتے ہیں اور اُسی پر ہر چیز کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ہم نے متمدن قوموں کی مثال کو اس لیے پیش کیا ہے کہ اس سے اندازہ کیا جائے کہ غیر متمدن اور جاہل قوموں کی کیا حالت ہوگی جبکہ وہ کوئی اخلاقی نظام نہ رکھتی ہوں یا جن کی دماغی قابلیتیں استنباط و اجتہاد سے عاری اور مفلوج ہوں اور حریت فکری مفقود کر کے اپنی زندگی کے جملہ معاملات سلطنت و حکومت کے سپرد کر چکی ہوں اور شاہی یا ڈکٹیٹری پر اعتماد کر کے خود گہری نیند سو رہی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ حسین ایسی بزرگ شخصیت کو چھوڑ کر تمام عرب یزید ایسے ظالم و مستبد اور خود غرض کو اپنا دیوتا بنائے ہوئے تھے اور اُس کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقصاں تھے۔"

ضرورت تھی ایک ایسے اچانک حادثہ کی، ایک غیر معمولی واقعہ کی جو عام خلقت کی

عـ۵ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

آنکھیں کھول دے اور اُن کی قوت احساس کو بیدار کر دے۔ امام حسین کی بے نظیر شہادت ایک مؤثر ترین حادثہ تھا جس سے سوتی ہوئی دنیا کا جاگ اُٹھنا لازمی امر تھا۔

اسی کے ساتھ آپ کے عملی اقدام کا نمونہ جرأت اظہار پیدا کرنے کا بھی کامیاب ذریعہ تھا۔ بات یہ ہے کہ انسان جب تک کوئی مثال دیکھتا نہیں اُس وقت تک ہچکچاتا ہے۔ لیکن جب کوئی نمونۂ عمل سامنے آجاتا ہے تو اپنے دل میں بھی ولولۂ اقدام محسوس کرنے لگتا ہے

حضرت امام حسین چاہتے تھے کہ کربلا میں نہ صرف تنہا خود بلکہ بوڑھوں، جوانوں اور بچوں تک کو موت کا کھیل کھیلتے اس اطمینان وسکون سے دکھلا دیں کہ دیکھنے اور سننے والوں کی نگاہ میں موت کوئی ہولناک چیز نہ باقی رہے۔ اس کے ساتھ جان ومال واولاد غرض ہر دنیوی مفاد کی قیمت بلند اصول کے مقابلہ میں گھٹا کر انسانی دماغ پر یہ اثر قائم کر دیں کہ وہ بلند مقاصد کے لیے جان کو ارزان سمجھنے لگے۔

ع۵ حسین کسی ناممکن کام کے لیے نہیں اُٹھے تھے۔ وہ خباثت کو یک لخت فنا کرنے کے جویا نہیں تھے کسی انسان میں یہ قوت نہیں ہے کہ انسانی فطرت میں ایسا عظیم انقلاب پیدا کر دے کہ اس میں سے خباثت کا عنصر یک لخت نکل جائے۔

انسانی زندگی عام طور پر خیر وشر کی ابدی جدوجہد کا ایک مرقع ہے اور انسان کا بس اتنا فرض ہے کہ وہ خیر کو بڑھاتا رہے اور شر کی عنان ڈھیلی نہ ہونے دے لیکن پھر بھی ایسے مواقع آجاتے ہیں جبکہ انسانی کوششوں پر خباثت کی طاقت غالب آجاتی ہے اور خباثت وتقدس آپس میں اس قدر خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ بعض ایسا تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے حسین کا بس یہی مقصد تھا کہ وہ بُرائی کے چہرہ پر سے ہمیشہ کے لیے اس طرح نقاب ہٹا دیں اور اُسے اس طرح پھاڑ کر پھینک دیں کہ انسان کو پھر اچھے اور بُرے اور جھوٹ اور سچ میں امتیاز کرنے میں دقت نہ ہو۔ میدان کربلا میں یہ مقصد پوری کامیابی کے ساتھ حاصل کیا گیا۔ جہاں خیر وشر کی جنگ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور وہ ایسے انسانی کمالات کے ساتھ پیش کی گئی جو کہ دنیا والوں کے لیے

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب ایم اے بیرسٹر سیتاپور

صاف اور واضح رہیں گے۔"

یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر وہی اسباب جو ایک خاص طرح کے نتیجہ کو پیدا کرتے ہیں حد سے بڑھنے کے بعد اس کے خلاف نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ اسی کے لیے عرب کا مقولہ ہے۔ الشیئ اذا انجاوز عن حدہ رجع الی ضدہ "ایک شے جب اپنی حد سے بڑھتی ہے تو اپنی ضد کی طرف راجع ہو جاتی ہے۔"

ایک جابر و قاہر سلطنت کی طرف سے عوام پر یہ اثر قائم ہونا کہ اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہو زیادہ تر جبر و تشدد ہی سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہی جبر و تشدد جب حدوں سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر خلقت کی آواز "ایک بے اختیار چیخ" کی صورت میں بلند ہوتی ہے جو خطرناک زیادہ ہے۔

سلطنت یزیدی اور حضرت امام حسین کے مقابلہ کو کربلا میں ایک مختلف مقصد کے لیے متحدہ کوشش کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یعنی یزیدی طاقت حسین پر ظلم و ستم ڈھا رہی تھی اس غرض سے کہ اس عبرتناک انجام کو دیکھکر پھر کسی کو زرا بھی مخالفت کی جرأت باقی نہ رہ جائے اور حسین اپنے اوپر مظالم کا موقع دے رہے تھے اس غرض سے کہ یہ بے پناہ مظالم انسانی فطرت کو چیخ اٹھنے پر مجبور کر دیں۔

حسین نے اس مقصد کے لیے ایسے سامان فراہم کیے کہ ظلم اپنی عام حدوں سے انتہائی درجہ تک آگے بڑھ جائے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سلطنت کی سیاست نے ایک فرد انسان کے تدبر کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ اس لیے کہ حکومت کو اپنے ذوق ستم رانی میں اس کی تمیز نہ ہو سکی کہ مظالم کی کون سی وہ حدیں ہیں جنھیں جبر کے دباؤ سے خلقت برداشت کر سکتی ہے اور کہاں سے وہ حد شروع ہوجاتی ہے جہاں بے ہوش احساسات بھی پھریری لے کر چونک پڑتے ہیں اور شکنجۂ "جبر" میں گرفتار ملت اس شدت سے پھڑپھڑاتی ہے کہ شکنجہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

امام حسین کی نظر میں شکست و فتح کا مفہوم اس وقت بالکل معین تھا۔ فتح

کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی قتل ہو جائیں۔ آپ کے نزدیک فتح کے یہ معنی تھے کہ کہاں تک آپ اپنے اصُول کی حمایت میں مصائب کا زیادہ مقابلہ کرتے ہیں اور کہاں تک آپ کا دشمن اپنے مقاصد کے تحفظ میں زیادہ تشدد سے کام لیتا ہے۔ دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک مورچہ تھا جسے حسین فتح کرتے تھے اور اُس کا انتہائی متشددانہ اقدام حسین کی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک مکمل فتح تھی۔

حکومت کی توقع تو یہ تھی اور مجرموں کو سزا اسی لیے دی جاتی ہے کہ دوسرے عبرت حاصل کر کے اس کے بعد ایسی جرأت نہ کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب حسین اور اُن کے ساتھیوں کا یہ بلاخیز تاریخی انجام دیکھ کر کسی میں لب کشائی کی ہمت تھی بھی تو جاتی رہے گی۔ اسی لیے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ پس ماندگان حسین کا لٹا ہوا قافلہ اسی صورت سے ہر شہر میں جائے تاکہ ہر شہر کے لوگوں کو مخالف کا انجام دیکھ کر دہشت پیدا ہو اور پھر لوگوں کو اختلاف کی جرأت نہ ہو۔ مگر یہ زعم حکومت کا بہت کم وقت تک قائم رہ سکا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خود عین موقع جنگ ہی پر حر بن یزید ریاحی کے لشکر شام سے جدا ہو کر چلے جانے ہی نے یہ ثبوت دے دیا تھا کہ نتیجہ کا رُخ کس طرف ہے حالانکہ اُس وقت حسینی قربانی صرف تیاری کی منزل میں تھی، پیش نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد شہادت حسین کے تیسرے ہی دن جب ابن زیاد کے دربار میں حسین کے سر کے ساتھ بے ادبی کی جا رہی تھی تو بوڑھے صحابی زید بن ارقم کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہٹالے اس چھڑی کو، میں نے خود دیکھا ہے کہ رسول ان لبوں کے بوسے لیتے تھے ———— ظاہر ہو گیا کہ کربلا کے واقعہ سے حق گوئی کی جرأت کم نہیں ہوئی بلکہ زیادہ ہو گئی۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ مسجد جامع میں لوگ جمع ہوں (یہ تمام واقعات تفصیل سے آپ کے سامنے

آ چکے ہیں) اعلان فتح کے لیے، رعایا کو واقعات جنگ بتانے کے لیے۔ خاص وفاداروں کا مجمع مسجد جامع میں فراہم کیا گیا۔ سرکش حاکم کا خیال ہے کہ اب کس کی مجال ہوگی جو کسی بات پر اعتراض کرے۔ وہ اپنی فتح اور حسین کی شکست کا اظہار کرتا ہے ایسی لفظوں میں جو حسین اور اُن کے والد بزرگوار علی پر ناگوار حملہ کی حیثیت رکھتی تھیں بس ایک دفعہ خاموش فضا میں ہیجان پیدا ہوا۔ ستون مسجد کے پاس ایک نابینا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "کذاب تو اور تیرا باپ۔ ایک تو تو نے اولاد نبی کو قتل کیا۔ اب اُن کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتا ہے!"

یہ بھی حسین کی فتح اور یزیدی حکومت کی شکست۔

اب بھی خیال تھا کہ یہ کوفہ ہے۔ علی کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ یہاں اکادکا ایسے واقعات ہو جائیں تو قابل لحاظ نہیں ہے۔ مگر شام میں یہ بات نہیں ہو سکتی وہاں دربار ہوگا یزید "خلیفۃ المسلمین" کا جہاں برسوں کوشش کی گئی ہے نفرت پیدا کرنے کی اولاد نبی ہاشم سے۔ وہاں شہنشاہیت اپنے پورے عزت و اقتدار اور جلال و جبروت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ یزید تخت حکومت پر ہے خیال بتلاتا ہے کہ وہ ابن زیاد کے اُس طرز عمل کو جو اُس نے سر حضرت امام حسین کے ساتھ اختیار کیا تھا اور زید بن ارقم کی بیباکانہ تنبیہ کو سن چکا تھا اور اس سے وہ خود ایک خفت محسوس کر چکا تھا اس لیے عمداً اُس نے وہی طریقہ اختیار کیا جو ابن زیاد کر چکا تھا اور چوب خیزران سے اُس نے بھی سر حسین کے ساتھ بے ادبی شروع کر دی لیکن یہ دیکھنا تھا کہ ابو برزہ اسلمی کھڑے ہو گئے اور سخت الفاظ میں تنبیہ کی۔ اسی کے ساتھ ایک عیسائی سفیر بادشاہ روم کا موجود تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور وہ بھی یزید کو سرزنش کرنے لگا۔

دیکھیے حسینی فتح۔ لوگ حسین کی طرف سے احتجاج کر رہے ہیں اور صرف مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس واقعہ کو دیکھ کر اپنے میں جرأت اظہار محسوس کرنے لگے۔

اس کے علاوہ راستے میں بھی ع۵ "جب یہ قیدی بحد رنج و محن

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

ایک شہر سے دوسرے شہر تک لے جائے جاتے تھے۔ تو اُن کی مصیبتوں نے لوگوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کر دیا۔ واقعۂ کربلا کی خبر جو کہ ممکن ہے لوگوں تک مسخ کردہ صورت میں پیش کی جاتی اب اسلامی دنیا میں سورج کی کرن کی طرح نہایت جلی اور واضح عنوان میں پہونچی۔ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں نے کون سی ایسی زبردست خطا کی تھی جس کا نتیجہ ایسی ہیبت ناک سزائیں ہیں اور یہ یزید کس قسم کا خلیفہ ہے کہ اس نے آل محمد کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا ہے۔ یہ سوالات یقیناً اُس کو حکمران کے اخلاقیات اور طریق زندگی کے تجسس کی طرف مائل کرتے اور وہ حضرت محمد مصطفےٰ کے آوردہ اسلام کے معیار پر اُسے جانچنا چاہتا جس کے ابتدائی ہیرو اس وقت بھی شہادت دینے اور تصدیق کرنے کے لیے موجود تھے۔ یزید بے نقاب ہو گیا، اُس کا اسلام کو برباد کرنا بالکل ظاہر ہو گیا اور اسلام بچ گیا وہ لوگ جو ابھی تک غیر اسلامی طریقوں پر چل رہے تھے اب کم از کم اصلی اسلام کی زبانی ہمدردی کا دم بھرنے لگے۔ یزیدیوں کی حرکت کے خلاف لوگوں کے احساس میں ایک فوری انقلاب ہوا اور لوگوں کے مجرم ضمیروں کو احساس جرم کا تکلیف دہ جذبہ پیدا ہو گیا۔"

ع۵ "اس واقعہ سے پہلے کس کی مجال تھی کہ یزید کے دربار میں امام حسین کا نام عزت کے ساتھ لے سکے لیکن اس واقعہ کے بعد اس کے منھ پر امام حسین کی تعریفیں ہوتی تھیں اور وہ خاموشی سے سنتا تھا ———— اسی شہادت کا اثر تھا کہ لوگوں کے دل یزید سے پھر گئے۔ یہاں تک کہ اس کی زبردست سلطنت تھوڑے ہی زمانہ میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے دامن کا داغ بن کر رہ گئی اور قاتلان حسین کا نام ایسا مٹا کہ آج ایک شخص بھی اُن کی اولاد میں باقی نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اس واقعہ سے وہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ساری دنیا میں ایک آدمی بھی اپنا انتساب اُن کی طرف پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف وہی حسین

ع۵ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے۔

جن کے ساتھ کربلا کی جنگ میں گنتی کے چند آدمی تھے۔ آج اُن کے نام پر جان نثار کرنے والے کروروں کی تعداد میں موجود ہیں اور جن کی اولاد میں صرف ایک سیّد سجاد باقی رہ گئے تھے آج لاکھوں سادات اُنکی نسل سے ہونے پر فخر کرتے ہیں

کربلا کی جنگ ایک عجیب جنگ تھی جس میں نمائشی فتح حقیقی شکست اور ظاہری شکست باطنی فتح تھی۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے شہدائے کربلا کے متعلق سچ کہا ہے۔

کان قاصدھا بالضرّنا فعھما وان قاتلھا بالسیف محییھما

(یعنی) اُن کے ضرر کا قصد کرنے والا اُن کو نفع پہونچانے والا تھا اور اُن کو تلوار سے قتل کرنے والا اُن کا جلانے والا تھا"

مسٹر سی ایس رنگا آئر لکھتے ہیں "اگر حسین کو حکومت ملتی تو اُن کی حکومت زمین پر آسمانی حکومت ہوتی تاہم مرنے کے بعد بھی وہ ایسی حکومت کر رہے ہیں جو کوئی فانی حکمراں نہیں کر سکتا۔ وہ لازوال تخت و تاج کے مالک ہیں۔ وہ ہمارے غیر فانی بادشاہ ہیں۔ اُنھوں نے فطرت انسانی کو غیر محدود وسعت عطا کی ہے"

اسی حقیقت کو مسٹر سروجنی نائیڈو نے اپنے انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

"ماتمی لباس پہنے ہوئے، ننگے پاؤں اور آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ جو کہ اس غمناک جنگ کی یاد میں اشک افشاں ہیں اور ہاتھ جو اندھا دھند اپنے خوں چکاں سینوں پر ضرب لگاتے ہیں، تیرے اس قدیم درد و غم کے واقعہ کی یاد میں تیرے جان نثار تجھے اس غم کی رات میں پکارتے ہیں دلدوز نوحوں اور المناک رسموں کے ساتھ اے حسین تجھے چلا چلا کر۔ اے حسین! تیرے یہ لاتعداد جان نثار تجھے کیوں روتے ہیں؟ اے پیارے دلی! کیا تیری یہ لاثانی شہادت تیرے نبی کی لائے ہوئے رفیع مذہب کے لیے ایک زندہ علم اور جری مقابلہ نہیں ہے جس نے کہ دنیا کی برکت کے لیے اللہ کا پیارا اور باقی رہنے والا نام چھوڑا" معلوم ہوا کہ عـ۵ "اگر یزید اور امام حسین کے مقاصد

عـ۵ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب

پر نظر کریں اور کامیابی کو حصول مقصد سے علیحدہ کوئی چیز نہ سمجھیں تو امام حسین کو فاتح اور یزید کو مفتوح ماننا پڑے گا۔

یزید کا مقصد کیا تھا؟ یہی کہ روحانیت کے تنہا علمبردار اور بنی ہاشم کی روحانی عظمت کے سب سے بڑے نمائندہ کو قتل کرکے دنیاوی حکومت کے ساتھ روحانیت اور مذہبیت کے قلمرو پر بھی فرمانروائی کرے۔ اور امام حسین کا مقصد کیا تھا؟ یہی کہ اصول اسلام کو یزید کے ہاتھوں تباہ نہ ہونے دیں اور یزید کی بد اعمالیوں کو طشت از بام کرکے دنیا کو یزیدیت سے بیزار کردیں۔ کیا واقعات کربلا کے نتائج پر نظر کرنے کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ یزید کو فتح اور امام حسین کو شکست ہوئی؟"

(دوسرا باب)

مجرموں کی پشیمانی

فتح اور شکست کی خاص پہچان یہ ہے کہ فاتح اپنے کارنامہ پر نازاں ہوتا ہے اور مفتوح اپنے طرز عمل پر پشیمان ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حسین جس راستے پر چلے تھے اس پر قائم رہے اور انھوں نے جو کچھ کیا اس پر نہ وہ خود پشیمان ہوے، نہ اُن کے ساتھی، اُن کے پسماندگان اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک میں سے کوئی پشیمان ہوا نہ اُن کی اولاد یا اُن کے ماننے والوں میں سے کوئی ان کے بعد پشیمان ہوا کہ حضرت امام حسین نے ایسا کیوں کیا جس کا نتیجہ اُن کی بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن اُن کے قتل کرنے والے، یا قتل میں شرکت کرنے والے ہی نہیں بلکہ اُن کی امداد نہ کرنے والے تک بعد میں پشیمان ہوے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔

نفسیاتی طریقہ پر اس پشیمانی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں۔ اپنے عمل کی تاویلیں کرنا اور بہانے ڈھونڈھنا ایک طرح کی پشیمانی ہے۔ اپنے سر سے ذمہ داری ہٹا کر دوسروں کے سر عائد کرنا دوسری طرح کی پشیمانی ہے۔ اور اپنے عمل پر افسوس کرنا اور اظہار ندامت کرنا تو صاف صاف طریقۂ اظہار پشیمانی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا اس کی ابتدا ہوی حر بن یزید ریاحی سے اور اس کی پشیمانی ایک برمحل اور خود اختیاری پشیمانی تھی ———— جس کے نتیجہ میں اُسے یہ موقع حاصل ہو سکا کہ وہ نصرت حسین میں اپنے بہتے ہوے خون سے اپنی فرد عمل کو دھو کر صاف بنا دے اور ظالموں کی فہرست سے نکل کر مظلوموں کا طرفدار بن جائے اس کے بعد جن جن کی پشیمانی تھی وہ بعد از وقت تھی اور زیادہ تر خود اختیاری نہیں

بلکہ نتائج کے جبر کا نتیجہ تھی اس لیے کوئی قابل تعریف بات سمجھی نہیں جا سکتی۔ ہاں شہید کی حقانیت اور فاتحانہ شان کے اظہار کا ذریعہ ضرور ہے
سب سے خفیف درجہ کے مجرم حضرت امام حسینؑ کے بارے میں وہ تھے جنھوں نے آپ کی نصرت نہ کی ان میں وہ تمام اہل کوفہ تھے جنھوں نے نصرت کے وعدے کیے تھے مگر وقت آنے پر ان اسباب سے جن کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ہو چکا ہے کربلا نہ پہونچ سکے یا پہونچنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی پشیمانی نہایت سچے دل سے وقوع واقعہ کے بعد بہت قریبی وقت میں تھی جب انھوں نے اپنی اُن کوششوں سے جو خون حسینؑ کا انتقام لینے کے لیے کی گئیں ایک قابل احترام درجہ دے دیا۔ ان "توابین" کا کسی حد تک تفصیلی حال اس کے بعد کے ابواب میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔

ان ہی نصرت نہ کرنے والوں میں ایک عبد اللہ بن الحر الجعفی وہ شخص تھا جسے راہ کوفہ میں حضرت امام حسینؑ نے خود نصرت کی دعوت دی تھی مگر اس نے حیلہ حوالہ سے اپنی جان بچائی اور اس سعادت سے محروم رہا۔ واقعۂ کربلا کے بعد ہی اُس کے دل میں جذبات غم کا طوفان موج زن ہوتا ہے۔
ع۵ دربایں خیال کہ اب اس فضا میں رہنے کو دل چاہتا نہیں وہ اور چند دوسرے لوگ احمر بن زیاد الطائی کے مکان میں پوشیدہ طریقہ سے مجتمع ہو کر کچھ طے کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ لوگ کوفہ چھوڑ دیتے ہیں اور کربلا میں پہونچ کر شہداء کے قبور کی زیارت کر کے مدائن چلے جاتے ہیں۔
اس زمانہ میں عبد اللہ بن الحر کے جذبات غم مرثیہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کی شہرت عام ہو جاتی ہے۔ (طبری جز ثانی جلد ثانیہ ص۳۸۹) انھیں سے دو شعر یہ ہیں
یقول امیر غادر حق غادر — الا کنت قاتلت الشہید ابن فاطمۃ
فیا ندمی الا اکون نصرتہ — الا کل نفس لا تسدد نادمۃ

ع۵ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

(یعنی) وہ امیر جو انتہائی غدار ہے مجھ سے کہتا ہے کہ تم فرزند زہرا سے جنگ میں کیوں نہ شریک ہوئے؟ حالانکہ مجھے تو اس پر ندامت ہے کہ میں نے ان کی نصرت کیوں نہ کی۔ یقیناً جو شخص بھی صحیح رستہ نہ اختیار کرے اُسے نادم ہونا ہی چاہیے)

ان لوگوں سے زیادہ مجرم وہ سپاہی تھے جو حضرت امام حسین کے مقابلہ میں خود شریک جنگ تھے۔ ان کی بھی پشیمانی کے اقوال جستہ جستہ تاریخ نے ہم تک پہونچائے ہیں مثلاً قرہ بن قیس جو عمر بن سعد کا نمایندہ بن کر امام حسین کے پاس آیا تھا اور اس سے ظاہر ہے کہ وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا واقعہ کربلا کے بعد کہا کرتا تھا کہ اگر حر بن یزید مجھکو بتلا دیتے کہ وہ فوج حسین کی طرف جا رہے ہیں تو میں بھی اُن کے ساتھ ضرور جاتا۔

رضی بن منقذ عبدی جس نے کربلا کی جنگ میں بریر پر حملہ کیا اور اُن سے لپٹ کر کشتی لڑنے لگا تھا اور بریر اُس کو گرا کر سینہ پر سوار ہو گئے تھے تو وہ چیخنے لگا تھا کہ میری مدد کرو اور کعب بن جابر بن عمرو ازدی نے بریر پر نیزہ کا وار کیا اور اُن کو قتل کر دیا تو رضی بن منقذ کپڑوں سے خاک جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ واقعۂ کربلا کے بعد وہ اپنی پشیمانی کا حسب ذیل اشعار میں اظہار کرتا تھا:

لو شاء ربی ما شهدت قتالهم ولا جعل النعماء عندی ابن جابر
لقد کان ذاک الیوم عارا وسبة یعیره الابناء بعد المعاشر
فیا لیت انی کنت من قبل قتله ویوم حسین کنت فی رمس قابر

(یعنی) مقدر میں اس طرح لکھا نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں شریک نہ ہوتا اور نہ ابن جابر کا احسان مجھ پر ہوتا۔ وہ دن ہمیشہ کے لیے ایک عار و ننگ کا موقع تھا جو نسلوں تک طعن و تشنیع کا باعث رہے گا۔ کاش میں بریر کے قتل اور حسین سے مقابلہ کے دن سے پہلے مر کر قبر میں پہونچ گیا ہوتا (طبری ج ۶ ص ۲۴۸)

یہ کمزور نفس کے انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی بد اعمالیوں کو تقدیر کے حوالہ کرتا ہے مگر اس سے اُس کی خجالت و ندامت کا تو پتہ چلتا ہی ہے۔

ان سے بڑھ کر مجرم اس ظالم فوج کا افسر عمر بن سعد تھا۔ اُس نے اپنی پشیمانی کا اظہار صاف طور پر کیا جسے قدیم مؤرخ ابو حنیفہ دینوری نے حمید بن مسلم کی زبانی نقل کیا ہے۔ حمید کا بیان ہے کہ عمر بن سعد میرا دوست تھا۔ وہ جب حسین سے جنگ کے بعد واپس ہوا تو میں نے جا کر حالات دریافت کئے۔ اُس نے کہا کچھ نہ پوچھو کوئی مسافر اپنی منزل کی طرف ایسے برُے انجام کے ساتھ واپس نہیں ہوا جس انجام کے ساتھ میں واپس ہوا۔ میں نے قریبی رشتہ داری کا پاس چھوڑا اور ایک جرم عظیم کا ارتکاب کیا۔ (الاخبار الطوال صـ ۲۵۷)

اس سے بڑا مجرم حاکم کوفہ عبید اللہ بن زیاد تھا جو اس تمام فوج کا بھیجنے والا اور عمر بن سعد کو قتل حسین پر مجبور کرنے والا تھا وہ بھی اس عمل کا ذمہ دار خود بننا پسند نہ کرتا تھا بلکہ اُس کی ذمہ داری یزید پر عائد کرتا تھا چنانچہ اُس وقت جب یزید کے مرنے کی اطلاع پہونچی اور عراق میں بغاوت پیدا ہوئی اور ابن زیاد نے بصرہ سے فرار کیا تو اُس نے قبیلۂ بنی یشکر میں سے ایک شخص کو رستہ بتانے کے لیے اپنے ساتھ لیا۔ راستے میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دیر تک یہ ناقہ پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ہمراہی نے خیال کیا کہ وہ سو رہا ہے، پکار کر پوچھا کہ کیا آپ سو رہے ہیں؟ کہا میں سو نہیں رہا ہوں بلکہ ایک خاص معاملہ میں فکر کر رہا ہوں۔ لشکری نے کہا "میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" ابن زیاد نے کہا اچھا بتلاؤ۔ اُس نے کہا آپ حسین بن علی کے قتل کرنے پر نادم ہیں اور بصرہ میں جو قصر بیضا بنوایا ہے مگر اُس میں رہنا نصیب نہیں ہوا اُسے سوچ رہے ہیں اور بصرہ میں خوارج کو جو صرف بدگمانی اور توہم پر آپ نے قتل کیا ہے اُس پر پشیمان ہیں۔ ابن زیاد نے کہا تم نے کوئی بات ٹھیک نہیں کہی۔ حسین بن علی کے بارے میں جو تم نے کہا تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اُنھوں نے سُلطان وقت کی مخالفت کی تھی اور سلطان وقت نے مجھکو لکھا اور اُن کے قتل کرنے کا حکم دیا تو اگر یہ غلطی تھی تو اُس کی ذمہ داری یزید پر ہے۔ مجھ پر نہیں ہے۔ (الاخبار الطوال صـ ۲۷۸)

ذمہ داری کا اپنے اوپر نہ لینا ہی عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے ورنہ کوئی فاتح ایسا نہیں ہے جو فتح کا سہرا اپنے سر سے اتار کر دوسرے کے سر باندھنا پسند کرے۔

اب اس واقعہ کے سب سے بڑے مجرم یزید کو دیکھئے جسے آپ نے دیکھا کہ ابن زیاد نے بھی اس کا اصلی ذمہ دار قرار دیا اور حقیقت میں وہ ذمہ دار تھا بھی۔ سب سے پہلا خط جو اُس نے ولید حاکم مدینہ کو لکھا تھا اسی کا منشا یہ تھا کہ حسینؑ سے بیعت لی جائے اور اگر بیعت نہ کریں تو قتل کر دیئے جائیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ امام کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کرنا اسی لیے تھا۔ اس کے بعد جب ابن زیاد نے مسلم بن عقیل کو شہید کیا اور ان کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیجا تو یزید نے اُس پر خوشی کا اظہار کیا، ابن زیاد کی حسن خدمت کا اقرار کیا اور یہ ہدایت کی کہ اب حسینؑ کا بھی مقابلہ اسی انداز پر کیا جائے۔

پھر جب امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ابن زیاد کی طرف سے یزید کو اطلاع دی گئی تو سرہائے شہدا اور اہل حرم کو یزید کے پاس بھیجا گیا یہ صرف یزید کی خوشنودی کے لیے اور اُس کے حکم کے مطابق تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس عمل پر یزید ابن زیاد سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوا بلکہ جیسا سبط ابن جوزی نے تذکرہ خواص الامہ میں لکھا ہے یزید نے اُسے دمشق کی طرف بلوا بھیجا اور اُسے کثیر اموال اور بہت تحفے انعام میں عطا کیے اور اتنی خصوصیت بڑھائی کہ زنانخانہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور اپنا ندیم اور حریف شراب قرار دیا اور حسب ذیل اشعار نظم کرکے گانے والوں کو دیئے:۔

اسقنی شربۃ تروی فؤادی	ثم مل فاسق مثلہا ابن زیاد
صاحب السر والامانۃ عندی	ولتسدید مغنمی و جہادی

(یعنی) مجھے شراب پلاؤ ایسی شراب جو میرے دل کو سیراب کر دے۔ پھر ویسی ہی شراب ابن زیاد کو پلاؤ۔ وہ جو میرا رازدار، امانتدار اور اموال غنیمت کی تحصیل

اور جہاد میں میرا مددگار ہے۔"

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ قتل حسین اُس کے منشاء کے مطابق اور اُس کے حکم سے تھا۔ اس لیے جیسا کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے اُس نے شروع شروع شہادت حسینی سے انتہائی شادمانی و مسرت کا اظہار کیا ع۵ لیکن بعد کو آنے والے انقلابات نے جو واقعۂ کربلا کے نتائج تھے چونکا دیا اور حالات نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ کف افسوس ملتا رہے۔ اسی بنا پر یہ نہایت حسرت کے ساتھ وہ یہ کہنے لگا کہ "ہائے حسین کے قتل کر دینے سے ابن زیاد نے مجھ کو مسلمانوں میں قابل نفرت بنا دیا اور اُن کے دلوں میں عداوت کا بیج بو دیا اور قتل حسین کے جرم کو سنگین سمجھ کر نیکوکار و بدکار سب ہی آدمی مجھ کو دشمن رکھنے لگے ہائے ابن مرجانہ (ابن زیاد) نے یہ کیا کیا۔ خدا اُس پر لعنت کرے (الطبری جزو ثانی جملہ ثانیہ ص ۴۳ طبع لیدن)۔"

٭٭٭

پشیمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی بات سے ہٹ جائے۔ امام حسین اور یزید میں صدم ضدا کا ہے کی تھی؟ یہی کہ یزید کو بیعت پر اصرار تھا اور امام حسین کو انکار۔ اچھا اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حسین اپنے انکار سے نہیں ہٹے اگر ہٹ گئے ہوتے تو نیزہ پر سر نظر نہ آتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یزید اپنے مطالبہ پر برقرار رہا یا اس سے ہٹ گیا؟ اس کے لیے پھر آپ کو یہ یاد کر لینا ضروری ہوگا کہ یزید کا حسین سے بیعت پر اصرار، صرف بحیثیت ایک شخص خاص کے نہ تھا بلکہ پیغمبر اسلام کے وارث یعنی خاندان رسول کی ذمہ دار فرد ہونے کے لحاظ سے تھا۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان ہو چکی ہے۔ پھر جب ایسا تھا تو کوئی شک نہیں کہ یہ حیثیت اپنی زندگی میں حسین کو حاصل تھی اور وہی حیثیت اُن کے بعد اُن کے فرزند زین العابدین کو حاصل ہو گئی۔ خود حسین تو اپنی زندگی میں یزید کی گرفت میں کبھی آ نہ سکے تھے اس لیے کہ یزید تھا دمشق میں

ع۵ مولانا سبط الحسن صاحب جنسوی

اور حسین تھے مدینہ، مکہ یا پھر کربلا میں مگر اُن کے پسماندگان کے لیے ایسا وقت آیا کہ نہ صرف سید سجاد بلکہ طبقۂ خواتین میں بزرگ خاندان زینب کبریٰ اور اس کے علاوہ تمام خاندان ابوطالب کے افراد خاص یزید کے دارالسلطنت میں اقتدار حکومت کے شکنجہ میں کھنچی تلواروں کے سایہ میں اُس کے سامنے موجود تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید ان سے بیعت طلب کرے مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے انکار و اقرار کی منزل تو بعد کو ہے، ان میں سے کسی ایک متنفس یہاں تک کہ کسی بچہ کے سامنے بھی بیعت کا سوال اب پیش نہیں ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید اپنے مطالبۂ بیعت سے ہٹ گیا یعنی دنیا میں مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کمزور فریق مرعوب ہو جائے یہاں حسین تو رہی نہیں تھے مگر امید یہ کی جا سکتی تھی کہ حسین کے دردناک قتل کو دیکھ کر اُن کے ساتھ کے عورتیں اور بچے یا ایک باقی ماندہ بیمار فرزند یہ لوگ تو ضرور خوفزدہ ہو گئے ہوں گے مگر غرور ظلم پامال ہو گیا اور جبروت سلطنت کے اس پندار کو شکست ہو گئی جب ابن زیاد کے دربار میں ایسا موقع پیش آیا کہ اُس نے زین العابدین کے قتل کا حکم دے دیا اور حسین کے فرزند نے تیور بدل کر نحیف مگر طاقت دل سے گرجتی ہوئی آواز میں کہا اما علمت ان القتل لنا عادۃ و کرامتنا الشہادۃ (یعنی) کیوں ابن زیاد! ابھی تک تجھے نہیں معلوم ہوا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت کو ہم عزت سمجھتے ہیں" بس یہ سننا تھا کہ ظلم کا سر خم ہو گیا اور دل دہل گیا۔ معلوم ہوا کہ ظلم اُٹھانے والے ظلم کی سنگینی سے خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ ظلم کرنے والے حسینیوں کے صبر و استقلال کو دیکھ کر سہم گئے۔

یزید اپنے تمام جاہ و جبروت کے مظاہروں کے باوجود اتنی ہمت نہ پا سکا کہ وہ اب ان میں سے کسی کے سامنے سوال بیعت پیش کرتا کیونکہ اُس کی آنکھوں کے سامنے حسین کا کٹا ہوا سر موجود تھا اور اُس کے کانوں میں واقعات کربلا کی خبروں کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ابھی اگر سوال بیعت پیش کیا گیا تو دمشق کا دربار صحرائے کربلا بن جائیگا اس لیے سب کچھ دل آزاریاں کی گئیں اور بخیال خود ذلتیں دی گئیں مگر سوال بیعت نہیں کیا جا سکا کیا اس سے بڑھ کر حسین کی فتح اور یزید کی شکست کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟

(تیسرا باب)

عالم اسلامی کے تاثرات

شہادت حسین نے عالم اسلامی میں ہر ایک فرد کے دلمیں غم و غصہ کا احساس پیدا کر دیا اور جو لوگ اس کے ارتکاب کے ذمہ دار سمجھے گئے ہر ایک سے ایک طرح کی نفرت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ قتل حسین اُس جماعت کے لیے رسوائی کی ایک سند بن گیا۔

بدقسمتی سے قریبی ذمہ دار اس شہادت کے اہل کوفہ تھے چنانچہ یہ دھبا اہل کوفہ کے دامن پر لگا ایسا کہ صدیوں تک یاد کیا جاتا رہا یہاں تک کہ آپنے سنا کہ ابو العباس سفاح کے سامنے جب بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا تو ابو بکر ہذلی نے کوفہ کی مذمت میں یہ چیز خاص طور سے پیش کی کہ یہاں کے لوگوں نے حسین کو قتل کیا۔

ابو عثمان نہدی ایک مقدس صحابی تھے۔ کوفہ میں رہا کرتے تھے جب امام حسین شہید ہوئے تو وہ بصرہ کی طرف منتقل ہو گئے اور کہا میں اُس شہر میں نہیں رہوں گا کہ جہاں رسول کا نواسا شہید کر ڈالا گیا۔ (صواعق محرقہ صہ ۱۱)

اس کے بعد ایک وسیع نقطۂ نگاہ سے اس کے ذمہ دار اہل عراق تھے تو یہ چیز عراق کے لیے بھی بطور ننگ پیش کی گئی جیسا کہ امام بخاری اور ترمذی نے اپنی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے عبد اللہ بن عمر سے مچھر کے خون کے متعلق دریافت کیا وہ طاہر ہے یا نہیں۔ اُنھوں نے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہا عراق کا باشندہ ہوں۔ کہا دیکھو تو اسے یہ مچھر کے خون کے متعلق مجھ سے دریافت کرتا ہے اور ان لوگوں نے پیغمبر خدا کے نواسے کو شہید کر ڈالا اُس وقت نہ پوچھا)

حالانکہ میں نے خود پیغمبر خدا سے سُنا کہ وہ حسن و حسین کے بارے میں فرماتے تھے "یہ دونوں کائنات عالم میں میرے دو گلدستے ہیں"

شخصیتوں میں براہ راست متعلق ابن زیاد تھا تو آپ نے سُنا کہ خود یزید بعد میں اُس کو بُرا کہتا تھا اور قبل اس کے کہ یزید کی سیاست میں تبدیلی ہو اور وہ خود اُسے ذمہ دار قرار دے کر مذمت شروع کرے، دوسرے لوگ اُس کے دربار میں اُس کی ماں سمیّہ کے توہین آمیز تذکرہ کے ساتھ اُسے بُرا کہتے تھے اور یزید کو سُننا پڑتا تھا چنانچہ یحییٰ بن الحکم نے جو مشہور دشمن اہلبیت مروان کا بھائی تھا یزید کے پہلو میں بیٹھ کر یہ شعر پڑھے:۔

لہام بجنب الطف ادنیٰ قرابۃ من ابن زیاد العبد ذی الحسب الوغل
سمیۃ ضحیٰ نسلہا عدد الحصیٰ و بنت رسول اللہ لیس لہا نسل

(یعنی) وہ سر جو میدان کربلا میں تنوں سے جدا کر دیے گئے قرابت کے اعتبار سے ہم سے زیادہ نزدیک تھے بہ نسبت غلام زادہ ابن زیاد کے جو کمینہ خاندان کا شخص ہے۔ افسوس سمیّہ (ابن زیاد کی ماں) کی نسل تو سنگریزوں کی تعداد میں ہو گئی اور دختر رسول کی نسل باقی نہ رہی۔"

یزید نے اُس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور کہا خاموش رہو۔ ایک روایت میں ہے کہ چپکے سے کان میں کہا کہ سبحان اللہ! ایک ایسے موقع پر (مجمع میں بھی) تم سے خاموش نہیں رہا جاتا۔

اب خود "خلیفۃ المسلمین" یزید کو دیکھیے، اس کی رسوائی کا عالم خود اُس کی زبان سے آپ سُن چکے کہ ابن زیاد نے مسلمانوں میں مجھکو قابل نفرت بنا دیا اور اب نیکو کار و بدکار سب مجھے دشمن رکھنے لگے۔

نہ صرف یہ کہ خود اُس کے زمانہ میں لوگ اُسے بُرا کہتے تھے بلکہ اُس کے بعد کی نسلوں میں بھی اُس کے خلاف غم و غصہ پایا جاتا تھا یہاں تک کہ خود بنی امیہ کے بعد کے سلاطین اس کے روادار نہ تھے کہ کوئی اُس کا ذکر تعظیم و احترام کے ساتھ کرے

خود اُس کے فرزند معاویہ بن یزید کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا جس نے صاف صاف اپنے باپ کی بد اعمالیوں کا اقرار کیا اور اسی بنا پر سلطنت کی ذمہ داریوں کے اپنے سر لینے سے انکار کر دیا۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل تک یہ جذبہ برقرار رہا چنانچہ عمر بن عبد العزیز کے دربار میں ایک شخص نے یزید کے نام کے ساتھ "امیر المومنین" کی لفظ کہدی تو عمر بن عبد العزیز نے غصہ سے کہا "تم اُسے امیر المومنین کہتے ہو؟!" اس کے بعد حکم دیا کہ اُسے بیس تازیانے لگائے جائیں چنانچہ یہ سزا اُس کو دی گئی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قتل حسینؑ اور یزید کی حکومت امت اسلامیہ کے دامن کا ایک دھبا بن گئی یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری میں مشہور فلسفی شاعر ابو العلاء معری نے اسے محسوس کیا اور ان دو شعروں میں اُس کا اظہار کیا:-

ارى الايام تفعل كل نكر   فما انا بالعجائب مستزيد

اليس قريشكم قتلت حسينا   وكان على خلافتكم يزيد

(یعنی) زمانہ کی نیرنگیاں ہر دن میرے سامنے عجیب نقشے پیش کرتی رہی ہیں یہاں تک کہ اب ان بوقلموں عجائب کے مزید دیکھنے کی مجھے ہوس نہیں باقی رہی کیا تمھارے قریش نے حسینؑ کو قتل نہیں کیا اور کیا تمھاری خلافت کے تخت پر یزید ایسا شخص متمکن نہیں ہوا؟"

ظاہر ہے کہ اتنا وسیع اور دیرپا جذبۂ نفرت جو قاتلان حسینؑ سے پیدا ہوا وہ بے نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا اور ناممکن تھا کہ اس صورت میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو۔

(چوتھا باب)

آثارِ انقلاب

واقعۂ حرّہ خلافت ابن زبیر اضطرابِ عراق اور دیگر جزئی واقعات

بڑے سے بڑے انقلاب کا سنگ بنیاد یہی دو چیزیں ہیں جنھیں حسین اپنی شہادت سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک قوت احساس۔ دوسرے جرأت اظہار جب یہ دو چیزیں کسی خاص سلطنت، کسی خاص نظام، کسی خاص اقتدار کے خلاف پیدا ہو جائیں تو پھر انقلاب ہونا لازمی و ضروری ہے۔

شہادت حسینی سے یزیدی سلطنت کے خلاف انقلاب کے آثار اُسی وقت سے نمایاں ہو گئے تھے کہ جب حسین کے پسماندہ اہل حرم قیدیوں کی صورت سے کوفہ کے بازار میں لے جائے جاتے تھے۔ وہ قیدی جنھیں خود رونے کی اجازت نہ تھی اور حکومت کی طرف سے فتح کی خوشیوں کا اہتمام تھا مگر قیدیوں کو دیکھ کر کوچہ و بازار کے کوٹھوں اور بر آمدوں سے رونے کا شور اور ایک کہرام برپا تھا۔ یہ رائے عامہ کا وہ بے ساختہ مظاہرہ تھا جسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی تھی۔

پھر جب یہ قیدی شام کی طرف لے جائے گئے تو آپ نے سُنا کہ راستے میں بہت سی جگہ شہر کے دروازے بند کر لیے گئے۔ بہت سی جگہ لوگ مسلح ہو کر نکل آئے اور کئی جگہ جنگ کی صورت پیش آئی۔ ان واقعات کی تفصیل دوسرے حصہ کے چھٹے باب میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ یہ آغاز یقیناً ایک بڑے انجام کا پتہ دیتا تھا۔

؎۵ "شہادت امام حسین کی یہ تاثیر تھی جس نے سوتی ہوئی قوم کو یکبارگی جگا دیا قوت استنباط اور حریت فکری قوم میں پیدا کی۔ کمزور ارادوں میں روح عمل پیدا کی اور قوم کی قوم حسین کی ساتھی بن گئی۔ قیدیوں نے جیل خانوں کے دروازے توڑ دیے اور حکومت شام کی بنیادیں اکھیڑنے کے لیے میدان عمل میں آگئی"

اسی کا نتیجہ تھا کہ ابن زیاد افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کاش میں نے ان تمام قیدیوں کو قید نہ رکھا ہوتا بلکہ قتل کر دیا ہوتا تاکہ یہ لوگ اس انقلاب سے متاثر ہونے کے لیے زندہ ہی نہ رہتے۔

؎۵۲ "مدینہ والوں نے آنکھ کھولی۔ عبداللہ بن حنظلہ (غسیل الملائکہ) وغیرہ شرفاؤ بزرگان مدینہ کے وفد نے شام سے واپس آکر یزید کی بیدینی کے حالات کو ظاہر کیا اور بیعت یزید کو توڑ دیا۔ مورخ ابن اثیر کے الفاظ میں انھوں نے یزید کے عیوب ذاتی اور نقائص کو کھلم کھلا بیان کیا اور کہا ہم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں جس کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہ شراب پیتا ہے اور طنبورہ بجاتا ہے اور گانے والیوں سے گانے سنتا رہتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے ہم سب اس کی بیعت کا قلادہ گردن سے اتارتے ہیں۔

(تاریخ کامل ج ۴ ص ۵۲)

علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ ان بزرگان دین نے بیان کیا کہ ہم نے یزید کے خلاف اس وقت بغاوت کی ہے جب ہمیں یہ اندیشہ ہو گیا کہ ہم پر آسمان سے عذاب الٰہی کے پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کی تصرف کردہ کنیزوں (اپنی سوتیلی ماؤں)، بیٹیوں، بہنوں تک کو اپنے لیے حلال سمجھتا، شراب پیتا اور نماز ترک کرتا تھا۔

اگرچہ مدینہ سے جو وفد گیا تھا اس کے ارکان کو اپنا رکھنے کے لیے تمام تدابیر صرف کیے گئے تھے جو اس کے پہلے حکومت دمشق کی طرف سے صرف کیے جاتے رہے تھے اور کامیاب رہے تھے مگر اب کی وہ ذرائع کامیاب نہیں ہو سکے۔

؎۵ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب ؎۵۲ ناموس اسلام مصنفہ خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب پٹیالہ

علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں بتلایا ہے کہ عبد اللہ بن حنظلہ کو یزید نے ایک لاکھ درہم دیے اور ان کے آٹھ بیٹے تھے ہر ایک کو دس ہزار درہم عطا کئے اور منذر بن زبیر کو بھی ایک لاکھ روپیہ دیا گیا مگر جب یہ سب مدینہ واپس ہوئے تو یزید کے حالات فسق و فجور کو ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ منذر بن زبیر نے اپنی تقریر میں صاف اعلان کر دیا کہ یزید نے مجھکو ایک لاکھ روپیہ دیا ہے مگر یہ چیز اس بات سے مجھے مانع نہیں ہو سکتی کہ میں اُس کے حالات آپ لوگوں کے سامنے پیش کردوں وہ شراب پیتا ہے اور مست ایسا ہوتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام الزامات اُنھوں نے عائد کئے جو اُن کے دوسرے ساتھی عائد کر چکے تھے (کامل جلد ۴ صہ ۵۳)

مکہ والوں نے بھی کروٹ بدلی۔ عبد اللہ بن زبیر نے جو عرصہ سے خلافت کے آرزو مند چلے آتے تھے اور یزید کے مخالف بنے رہے تھے اور یزید کی بیعت میں داخل نہیں ہوئے تھے حسینؑ کی شہادت کی خبر سُنکر اور یزید و بنی امیہ کے برخلاف نفرت و ناراضی کے خیالات کو لوگوں میں دیکھ کر موقع کو غنیمت سمجھا اور اُٹھے۔ ایک پرزور تقریر اہل مکہ سے کی۔ کوفہ اور عراق کے لوگوں کی بے وفائی اور نالائقی کی مذمت فرمائی اور حسینؑ کی صداقت و حقانیت کا اظہار و اعتراف فرماتے ہوئے بیان کیا کہ قسم ہے خدا کی حسینؑ نے شرافت و کرامت کے مرنے کو ذلیل و مذموم زندگی پر ترجیح دی۔ حسینؑ کے بعد ہم کبھی اس قوم سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ بیشک ان لوگوں نے ایسے بزرگوار کو شہید کیا ہے کہ جو قلیل النوم اور کثیر الصوم تھا۔ راتوں کو عبادت الٰہی میں طولانی قیام کرنے والا، دنوں کو بکثرت روزہ رکھنے والا، شرف و بزرگی میں اور دین میں سب سے افضل۔ امر خلافت کے لیے سب سے احق اور بہتر تھا۔ قسم ہے خدا کی کہ اُس نے کبھی قرآن کو غلط معنی نہیں پہنائے، خوف الٰہی سے بے حد رونے والا تھا اور بجائے میخواری کے ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور بجائے شکاری کتے پالنے کے یاد الٰہی کے جلسے اُس کے گھر میں برپا رہتے تھے۔ غرض کہ مکہ میں اس طرح سے یزید کے برخلاف عبد اللہ بن زبیر نے

سلسلہ شروع کیا (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۴ ص ۵۱ و ۵۲)

عبداللہ بن زبیر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اپنی بیعت کی خواہش کی، اُس وقت جو خط و کتابت یزید اور حضرت عبداللہ بن عباس کے درمیان ہوئی ہے اُس کو تاریخ کامل نے بھی درج کیا ہے اور سبط ابن جوزی نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب امام حسینؑ شہید ہو گئے تو عبداللہ بن زبیر نے حضرت ابن عباس سے اپنی بیعت کے لیے خواہش کی اور کہا کہ میں یزید فاسق و فاجر سے بہتر ہوں۔ آپ میری سیرت اور اُس کی سیرت کو جانتے ہیں اور نیز میرے باپ زبیر کے فضائل و مراتب اور محبت رسول اللہ اور یزید کے باپ معاویہ کے خصوصیات سے بھی واقف ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ فتنہ قائم ہے۔ خونریزی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

یزید نے یہ سُنا تو ابن عباس کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُس ملحد ابن زبیر نے آپ کو حرم الٰہی میں اپنی بیعت کے لئے بلایا مگر آپ نے ہماری وفاداری کو پورا کرتے ہوئے اُس کی بیعت سے انکار کر دیا پس جو لوگ آپ کے وطن میں ہیں اور جو باہر کے شہروں سے آپ کے پاس آمد و رفت رکھیں اُن لوگوں کو ابن زبیر کی برائیاں اور ہماری نسبت جو آپ کے اچھا خیال اور عمدہ رائے ہیں سمجھاتے رہیں۔ اور ابن زبیر نے بے شک آپ کو اپنی بیعت اور اپنی اطاعت کے لیے اس واسطے مدعو کیا ہے کہ آپ امر باطل اور جھوٹے کام میں اُس کے مددگار اور اُس کے گناہوں میں شریک ہوں۔ آپ ہماری بیعت و اطاعت میں داخل ہیں اور وفائے عہد کے پورے ہیں۔ خدا اس صلۂ رحم کی جزائے خیر دے۔ میں آپ کے اس صلۂ رحم اور نیک سلوک کو بھلانے والا نہیں ہوں اور بہت جلد جس صلہ و انعام کے آپ مستحق ہیں میں آپ کو ادا کروں گا۔ پس آپ آنے جانے والوں کو ابن زبیر کی برائیوں اور اُس کی لقلقۂ لسانی اور چرب زبانی سے بچائیں کیونکہ لوگ اُس کی نسبت آپ کی بات کو زیادہ سُنتے ہیں اور مانتے ہیں۔

حضرت ابن عباس نے اس خط کا جواب یزید کو اس طرح تحریر فرمایا کہ اے یزید! تمہارا خط میرے پاس پہونچا تم نے جو یہ لکھا ہے کہ میں نے ابن زبیر کی بیعت

تمھاری وجہ سے نہیں کی۔ آگاہ ہو مجھے اپنی جان کی قسم ہے میں نے کبھی تمھاری تعریف نہیں کی اور کبھی تم سے محبت کا دم نہیں بھرا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھلا دوں گا کہ تم نے حسینؑ کو قتل کیا اور کیا بنی مطلب کے ان نوجوانوں کی خاک و خون میں بھری لاشوں کو بھلا دوں گا۔ جن کے جسم کے کپڑے اُتار لیے گئے اور بلا کفن گرم چٹیل میدان میں چھوڑ دی گئیں جن پر گرم ہواؤں کے جھونکوں نے خاک ڈال کر پردہ پوشی کی اور جانورانِ صحرائی اُن کی لاشوں کی حفاظت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ خدا نے ایک قوم کو اُن کے دفن و کفن کے لیے بھیجا۔ ہاں ہاں اے یزید! میں نہیں بھولوں گا اور کبھی نہیں بھولونگا یہ کہ تم نے حسینؑ کو حرم خدا اور حرم رسولؐ سے نکالا اور تم نے ابن مرجانہ کو حسینؑ کے قتل کا حکم دیا۔ میں تو خدا سے امید کرتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمھاری گرفت کرے گا اور اپنے عذاب میں مبتلا فرمائے گا کیونکہ تم نے اُس کے نبیؐ کی عترت کو قتل کیا اور اُن کے قتل پر راضی ہوے اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تم مجھ سے صلۂ رحم کروگے اور انعام و اکرام سے نہیں بھولوگے پس تم اپنی اس مہربانی اور صلۂ رحم کو بس اپنے پاس رکھو۔ ہم تمھاری اس مہربانی و انعام سے باز آئے۔ میں نے اپنی محبت کو تم سے قطع کر دیا ہے۔ مجھے قسم ہے اپنی جان کی، جو کچھ تم سے ہم کو مل چکا ہے ہمارے لیے بہت ہی ہے اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ میں لوگوں کو تمھاری طرف مائل کروں اور اور عبداللہ ابن زبیر سے ہٹاؤں اور اُس سے برگشتہ کروں۔ پس تمھارے لیے کبھی برکت و کرامت نہ ہو۔ تم مجھ سے اپنی نصرت و امداد اور محبت کی امید رکھتے ہو حالانکہ تم نے میرے ابن عم کو قتل کیا۔ رسول اللہؐ کے اہلبیتؑ کو ذبح کیا جو ہدایت کے چراغ تھے اور تاریک راتوں میں روشن ستارے تھے جن کو تمھاری فوجوں کی کالی گھٹاؤں نے چھپا دیا۔ تمھارے لشکروں نے تمھارے حکم سے اُن کو جنگلوں میں ایک ایک کر کے قتل کیا اور خون میں نہلایا۔ کیوں اے یزید! کیا تم نے بھلا دیا کہ تم نے اپنے اعوان اور اپنے آدمیوں کو اس لیے حرم الٰہی میں، خانہ کعبہ میں بھیجا کہ حسینؑ کو حرم خدا میں، کعبۂ الٰہی ہی میں قتل کر ڈالیں اور تم ہمیشہ حسینؑ کو برابر ڈراتے رہے یہاں تک کہ تم نے حسینؑ

کو عراق جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ تمھارے دل میں عداوت الٰہی، دشمنی رسول اور اُن کے اہلبیت اطہار کا جن کی شان میں خدا نے آیہ تطہیر نازل فرمائی بغض بھرا ہے۔ اس آیہ تطہیر کے مصداق ہم ہیں نہ کہ تمھارے باپ دادا جو جفا کار، طاغی کافر اور فاجر، دشمن خدا و رسول تھے۔ پس ان کرتوتوں اور ان افعال و اعمال پر تم مجھ سے اپنی محبت کے طالب ہو سکتے ہو؟ اے یزید! سب سے زیادہ عظیم اور شدید شماتت اور بڑی برائی تمھارے لیے یہ ہے کہ تم نے رسول کی بیٹیوں، بچوں اور اُن کے اہلحرم کو سر برہنہ قیدی بنا کر عراق سے شام میں اس لیے بلایا کہ لوگوں پر اپنے غلبہ اور تسلط و تمھاری کا نظارہ دکھلاؤ کہ تم کیسے آل رسول پر غالب اور مسلط ہو گئے اور ہم آل محمد ذریت رسول الٰہی کیسے تمھارے مغلوب و مقہور ہو گئے ہیں اور تم خیال و گمان کرتے ہو کہ اس طرح پر تم نے آل رسول سے اپنے اُن کافر و فاجر بزرگوں کے خون کا بدلا لیا ہے جو بدر کے روز قتل کئے گئے تھے اور تم نے اس امر کہ اُس عداوت اور دشمنی کا انتقام ظاہر کیا جس کو تم چھپائے ہوئے تھے اور جو تمھارے دل میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح چھپی ہوئی تھی۔"

علامہ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب یہ خط یزید نے پڑھا تو سخت برافروختہ ہوا اور ابن عباس کے قتل تک کا ارادہ کیا مگر ابن زبیر کے ساتھ معرکہ جنگ میں مشغول ہو کر قتل ابن عباس کی تدبیر نہ کر سکا۔

علامہ ابن اثیر نے بھی اپنی تاریخ (مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۶۲) میں اس خط و کتابت کو درج کیا ہے۔ قریب قریب خفیف کمی بیشی کے ساتھ ایسا ہی مضمون ہے جیسا کہ سبط ابن جوزی نے لکھا ہے اور اس میں یہ فقرہ بھی آخر میں زیادہ ہے کہ اے یزید تم نے میرے باپ کی اولاد کو قتل کیا۔ تمھاری تلوار سے وہ خون ٹپک رہا ہے۔ میں احمق ہوں کہ تم سے اپنا خون بہا اور انتقام لوں۔ اس پر مغرور نہ ہو کہ آج تم ہم پر غالب آ گئے ہو۔ ضرور ہے کہ ایک دن ہم بھی تم پر غالب ہوں گے۔

حضرت ابن عباس نے اپنے اس خط میں یزید کے متعلق اُن تمام الزاموں اور جرموں کی تصدیق فرمائی ہے کہ جو یزید پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی صفائی کیلیے

ہوا خواہان یزید بڑے زور و شور سے انکار کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے بھی اپنی کتاب تاریخ علم ادب ایران (لٹریری ہسٹری آف پرشیا) کی جلد اول صفحہ ۲۲۸ میں مکہ میں عبداللہ بن زبیر اور نیز مختار کے خروج، یزید و بنی امیہ کے برخلاف بغاوتوں کو شہادت حسین اور واقعہ کربلا کے اثرات کا نتیجہ بتلاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر کی بغاوت جس نے ۹ نو سال تک خودمختارانہ حیثیت سے بطور خلیفہ ارض مقدس پر تسلط رکھا۔ (از سنہ ۶۸۳ء تا سنہ ۶۹۲ء) ـــــ وہ حسین اور ان کے اقربا کے خون کا انتقام لینے کی عام خواہش پر مبنی تھی جو نہ صرف شیعیان علی ہی میں بلکہ اکثر خارجی فرقہ کے مسلمانوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ یزید کی فوج کے ہاتھوں مدینہ منورہ کے قتل و غارت میں (سنہ ۶۸۲ء) اسی جلیل القدر اصحاب رسول اور سات سو حفاظ قرآن مجید تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان شہیدوں کا خون اور خانۂ خدا کی بے حرمتی زبان حال سے انتقام کے لیے پکار اٹھی۔ اس نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر لکھا ہے کہ ہم یزید کے متعلق رائے قائم کرتے وقت اس کے الحاد اور اس کی عیش پرستی اور اس کے اسراف بے جا کو نظر انداز کرکے اس کے روئے زیبا، اشعار پسندیدہ اور شاہانہ تحمل اور اس کی زندگی اور زندہ دلی کو پیش نظر رکھتے، اگر کربلا کا دردانگیز واقعہ اس کے دامن پر سیاہ داغ نہ چھوڑتا۔ الفخری لکھتا ہے اس کا عہد حکومت صحیح حساب کی رو سے تین سال چھ ماہ ہوتا ہے۔ پہلے سال اس نے حسین بن علی کو شہید کیا۔ دوسرے سال اس نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی اور تین روز تک تاخت و تاراج کیا اور تیسرے سال خود خانۂ خدا پر فوج کشی کی۔ ان ہر سہ مظالم میں سے کربلا کے حادثہ نے بالخصوص دنیائے اسلام میں ایک خوفناک سنسنی پھیلا دی۔ جس شخص کے دل میں درد کی جگہ ہو۔ اور وہ اس واقعہ کے حالات کو پڑھے تو ممکن نہیں کہ اس کا دل نہ پسیجے۔ یہ واقعہ شرعی گناہ یا قانونی جرم ہی نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی جس کے سبب سے یزید اور اس کے نالائق و کمینہ احباب ابن زیاد و شمر وغیرہ نے جن اشخاص کے دلوں میں رسول خدا

کی محبت جاگزیں تھی یا مذہب کی کچھ پرواہ رکھتے تھے، اُن کی خاندان بنی امیہ کے ساتھ محبت یا وفاداری تو کیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے مفقود تھی مگر ان سب کے صابرانہ سکوت اور رواداری کے رویہ کو بھی ہمیشہ کے لیے تبدیل کر ڈالا"

عہ "شہادت حسینی نے کمزوروں کو ابھارا اور اُن میں ایسی جرأت پیدا کر دی کہ وہ جابر و ظالم حکومت کے سامنے اپنا سر نہ جھکائیں چنانچہ یزید جب ہلاک ہوا اور اُس کے مرنے کی خبر عبید اللہ بن زیاد کو ملی جو اُس زمانہ میں بصرہ کا گورنر تھا تو اُس نے مسجد بصرہ میں اہل بصرہ کے سامنے ایک تقریر کی اور یہ چاہا کہ اب وہ خود مسلمانوں کا امیر ہو جائے۔ اہل بصرہ نے ابن زیاد کو "امیر المسلمین" کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اس وقت ابن زیاد نے اپنے ماتحت عمرو بن حریث الخزاعی حاکم کوفہ کو یہ لکھا کہ اہل کوفہ کو اس پر مجبور کرو کہ بصرہ والوں نے جس کو اپنا امیر تسلیم کیا ہے، یہ بھی اُس کو اپنا امیر مانیں۔ کوفہ میں جب اس کی تحریک شروع کی گئی تو یزید بن رویم شیبانی نے اس کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ امارت اسلامی کے لیے ہم کو بنی امیہ کی حاجت نہیں ہے اور نہ ہم کو ابن مرجانہ کی حکومت کی ضرورت ہے۔ بیعت اہل حجاز کی ہونا چاہیے"۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ یزید بن رویم حضرت امام حسینؑ کے خلاف میدان کربلا میں فوج ابن زیاد میں شریک تھا اور سرداران فوج یزید سے تھا مگر حسینی شہادت کے بعد وہ خود بھی آج بنی امیہ کی خلافت سے منکر اور اہل حجاز یعنی بنی ہاشم کے لیے خلافت کا مؤید ہے۔

عہ "ایک گروہ نے یہ کہا کہ عمر بن سعد امارت کے لیے سزاوار ہے۔ ایک جماعت اہل کوفہ کی اس پر متفق ہو گئی مگر دفعتہً قبائل ہمدان، کہلان، انصار ربیعہ و نخع کی عورتیں امام حسینؑ پر نوحہ و ماتم اور گریہ و زاری کرتی ہوئی مسجد میں داخل ہوئیں اور یہ کہنے لگیں کہ کیا عمر بن سعد امام حسینؑ کو شہید کر کے ابھی راضی نہیں ہوا جو اب یہ چاہتا ہے کہ ہمارے اوپر امیر بن جائے۔ یہ سننا تھا کہ تمام لوگ رونے لگے اور عمر بن سعد کو امیر بنانے سے باز آئے (تاریخ مروج الذہب للمسعودی جلد ۲ صفحہ ۶۱ مطبع مصر)

عہ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

یہ حسین کی شہادت کا اثر تھا جس نے عورتوں تک میں حریت کے جذبہ کو پیدا کر دیا تھا۔"

بقول جناب نجم آفندی:-

شہید ظلم کلیجے ہلا دیے تو نے | حسین درد کے دریا بہا دیے تو نے
ہر ایک ذرہ جس میں اک تڑپ بھر دی | دماغ وضع کیے دل بنا دیے تو نے

انتہا ہے کہ خود یزید کے جانشین اور فرزند معاویہ بن یزید نے برسر منبر اپنے باپ کے عمل پر انتہائی نفرت کا اظہار کیا۔ اُس کا رد یہ تاریخ میں دیکھیے تو آپ کو جلال حق کے مقابلہ میں باطل کی سپر اندازی مجسم صورت میں نظر آ جائے گی۔ جب یزید کے پاس وہ تخت خلافت پر بیٹھا تو اُس نے منبر پر جا کر حسب ذیل تقریر کی:-

"ایہا الناس۔ یہ خلافت اللہ کی مستحکم رسی تھی۔ میرے دادا معاویہ نے اس معاملہ میں خلافت کے اصلی حقدار حضرت علی بن ابی طالب سے جھگڑا کیا اور وہ افعال اختیار کیے جو آپ سب کو معلوم ہیں۔ اب وہ قبر میں اپنے گناہوں میں گھرے ہوئے ہو کر پہونچ گئے ہیں۔ پھر یہ منصب میرے والد کو پہونچا اور وہ بھی اس کے مستحق نہ تھے۔ انھوں نے رسول کے نواسے سے جنگ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی عمر ختم ہو گئی اور وہ بھی اپنی قبر میں اپنے گناہوں کی قید میں پہونچ گئے۔"

اس کے بعد وہ رونے لگا اور کہا کہ سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے اس امر کا احساس ہے کہ اُن کا انجام بُرا ہوا۔ انھوں نے اولاد رسول کو شہید کیا اور شراب کو مباح کر دیا اور کعبہ کو برباد کیا اور میں نے اب تک خلافت کی مٹھاس نہیں چکھی تو میں اُس کی تلخی کیوں برداشت کروں۔ تم جانو اور تمھارا کام۔ مجھے خلافت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ دنیا اگر کوئی اچھی نعمت ہی تو اب اُس سے بہت کافی حصہ لے چکے اور اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو جتنا ہم اب تک اُس سے لیتے رہے وہی بہت کافی ہے اس کے بعد وہ اپنے گھر کے اندر چلا گیا اور چالیس دن کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا (صواعق محرقہ ص ۱۳۴)

کیا اس کے بعد بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ حسین کو فتح ہوئی اور یزید انتہائی درجہ کی شکست کھا گیا؟

(پانچواں باب)

جماعت توّابین

مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ جب حسین بن علی قتل ہو گئے اور ابن زیاد اپنے لشکر گاہ سے جو نخیلہ میں قرار دیا گیا تھا واپس جا کر کوفہ میں داخل ہوا تو شیعوں نے ایک دوسرے پر ملامت اور اپنی کمزوری پر ندامت کا اظہار شروع کیا اور وہ سمجھے کہ ہم سے بڑا جرم ہوا کہ ہم نے حسین کو نصرت کے وعدہ پر دعوت دی۔ پھر جب وہ آئے تو ہم اُن کی مدد کو نہ گئے اور وہ ہمارے پڑوس میں قتل کر ڈالے گئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اُن لوگوں کو جو اُن کے قتل میں شریک ہوئے ہیں قتل نہ کریں یا خود اس راہ میں اپنی جانیں نثار نہ کر دیں (طبری ج ۷، ص ۴۷)

اس کا نتیجہ تھا کہ سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر اجتماع ہوا اور اس موقع پر مسیّب بن نجبہ نے جو تقریر کی وہ یہ تھی کہ ہم بہت اپنی سچائی پر ناز کیا کرتے تھے اور اپنی شیعہ جماعت کی تعریف کیا کرتے تھے لیکن خدا نے ہمارا امتحان لیا۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے غلط ہیں۔ ہم نے امام حسین کو دعوت دی، اُن کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم آپ کی مدد کریں گے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے اپنی جانوں کو چھپایا یہاں تک کہ وہ ہمارے پڑوس میں قتل ہو گئے، نہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اُن کی نصرت کی اور نہ اپنی زبان سے اُن کی حمایت کی اور نہ اموال سے اُن کو تقویت پہونچائی اور نہ اپنے قبیلہ کو اُن کی امداد پر آمادہ کیا۔ اب ہم خدا اور رسول کو کیا جواب دینگے جبکہ ہمارے ملک میں رسول کا فرزند قتل کر ڈالا گیا۔ بیشک ہمارا کوئی

عذر سننے کے قابل نہیں ہے لیکن اب یہ موقع ہے کہ ہم اُن کے قاتل کو اور جن لوگوں نے اُن کے قتل میں شرکت کی ہے سب کو قتل کریں یا اس سلسلہ میں اپنی جانیں نثار کر دیں (طبری ج ۷ ص ۴۶)

اس کے بعد جب کہ سلیمان بن صرد خزاعی اس جماعت کے قائدِ اعظم کی حیثیت سے منتخب ہو گئے تو انھوں نے جو تقریر کی ہے اور جس کو وہ برابر ہر جمعہ میں دُہرایا کرتے تھے اُس کا مختصر اقتباس یہ ہے کہ "ہم لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اشتیاق کے ساتھ اہلبیتِ رسُول کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور اُن کو نصرت کی امیدیں دلاتے تھے اور آنے پر آمادہ کرتے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے کمزوری اور عاجزی دکھلائی اور سُستی کو کام میں لائے اور منتظر رہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے یہاں تک کہ ہمارے ملک میں اور ہمارے قرب میں فرزندِ رسول قتل کر ڈالے گئے۔ جبکہ وہ فریاد کر رہے تھے لیکن کوئی انصاف سے کام نہ لیتا تھا۔ فاسقین کی جماعت نے ان کو اپنے تیروں کا نشانہ اور نیزوں کا سرِ مشق بنا لیا یہاں تک کہ انھیں شہید کر ڈالا۔ (طبری ج ۷، ص ۴۹)

ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ اصلی سبب قتلِ حسینؑ کا حکومتِ دمشق ہے اس لیے ہم کو براہِ راست اسی سے مقابلہ کرنا چاہیے چنانچہ یہ لوگ دمشق کے ارادہ سے روانہ ہوئے اس فوج کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی مقام "عین الوردہ" میں اس فوج کا شام کے لشکر سے مقابلہ ہوا سب سے پہلے سلیمان بن صرد سالارِ فوج کی حیثیت سے میدان میں آئے یہ سلیمان صحابۂ پیغمبرؐ میں مندرج ہیں اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ہمراہ جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے۔ اس وقت انکی عمر ستر برس سے کم نہ ہو گی جہاد کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے پھر علم مسیّب بن نجبہ فزاری نے لیا یہ بھی اصحابِ حضرت علیؑ میں سے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے جہاد کے بعد وہ بھی شہید ہوئے اس کے بعد علمِ لشکر عبد اللہ بن وال نے لیا۔ وہ بھی طبقۂ تابعین میں سے جلیل القدر شخص ہیں۔ جہاد کر کے وہ بھی شہادت تک پہونچے۔

یہ لڑائی کا چوتھا دن تھا اور اب ان چار ہزار بہادروں میں سے صرف چند سو باقی تھے وہ بھی اکثر زخمی تھے اور جنگ کے قابل نہ تھے۔ علمِ فوج اب رفاعہ بن شداد بجلی کے ہاتھ میں تھا اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب مقابلہ میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ مجبوراً رات کے وقت اپنی قلیل فوج کے ساتھ اپنے خیام میں آگ لگا کر واپس گئے اور اس طرح یہ پہلی کوشش قاتلانِ حسینؑ سے بدلا لینے کی اپنی منزل [illegible]

(چھٹا باب)

خونِ ناحق کا انتقام

سلیمان بن صرد خزاعی اور اُن کی جماعت کی نیت بھی انتقام لینے کی تھی مگر انتقام کا مرکز ان کے نزدیک اصل حکومت شام تھی اور حکومت شام کو براہِ راست وہ اپنی قلیل تعداد سے کوئی نقصان نہ پہونچا سکے۔ اس لیے قاتلان حسین سے کوئی انتقام اُن کے ہاتھوں انجام نہ پا سکا مگر قدرت اس قتل ناحق کے مجرموں کو زیادہ عرصہ تک مہلت دینے پر تیار نہ تھی۔ مشیت ازلی نے اس کام کے لیے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کو پہلے سے منتخب کر رکھا تھا۔

وہ عرب رؤسا میں معزز خاندان سے تھے۔ اُن کے باپ ابی عبیدہ ایران کے اسلامی فتوحات والی لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے اور جسر ابی عبیدہ کی جنگ ان ہی کے نام سے مشہور ہے۔ خود مختار اہلبیت رسول سے ہمدردی میں شہرت خاص رکھتے تھے۔ اگرچہ جو خطوط حضرت امام حسینؑ کے پاس کوفہ سے گئے تھے اُن میں ان کا نام خصوصیت سے نظر نہیں آتا مگر جب مسلمؑ بن عقیل کوفہ پہونچے ہیں تو انھوں نے مختار ہی کے گھر میں قیام کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید جو خطوط دو چار اور دس بیس دستخطوں سے بعد میں گئے تھے اُن پر دستخط کرنے والوں میں وہ بھی ضرور ہوں گے۔ بے شک اس وقت وہ خود کوفہ میں موجود نہیں تھے بلکہ اپنی زمینداری میں کسی موضع پر گئے ہوئے تھے۔ یہاں اس دوران میں حکومت میں انقلاب ہوا۔ جناب مسلمؑ کو مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے مکان میں قیام کرنا پڑا ہانی گرفتار ہوئے۔ جناب مسلمؑ کو جہاد کے لیے نکلنا پڑا۔ آخر جناب مسلمؑ و ہانی دونوں شہید ہوئے۔ اس کے بعد عمرو بن حریث نے رایت امان بلند کیا کہ جو اس جھنڈے

کے نیچے آجائے اُس کا جان و مال محفوظ ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مختار کوفہ میں پہونچے اور واقعات سے آگاہ ہو کر فوراً عمرو بن حریث والے رایت امان کے نیچے آگئے مگر اُن کی ہمدردی اہلبیت کے حق میں اتنی آشکارا تھی کہ انھیں اُس جھنڈے کے نیچے امان نہ مل سکی۔ ابن زیاد کے حکم سے وہ قید کر دیے گئے۔ جب حضرت امام حسین کی شہادت ہوی ہے تو وہ کوفہ کے جیل خانہ میں مقید تھے۔ وہ غالباً اس کے بعد قتل کر دیے جاتے مگر قدرت کا منشا پورا ہو کر رہتا ہے۔ اُن کی بہن عبد اللہ بن عمر کی زوجہ تھیں۔ اُنھوں نے جو اپنے بھائی کی گرفتاری کا حال سُنا تو رو رو کر جان دینا شروع کر دی عبد اللہ بن عمر اگرچہ شروع میں حضرت امام حسین کے ساتھ بیعت یزید سے انکار کرنے میں شریک تھے مگر شہادت امام حسین کو دیکھ کر اُن کا حوصلہ پست ہو چکا تھا اور وہ یزیدی حکومت کے سامنے جھک گئے تھے۔

یزید عالم اسلامی کی ہر فرد کو اپنے سے بیزار دیکھ کر اب ہر ایسے شخص کو بہ ہر قیمت پر حاصل کرنے پر تیار رہتا کہ جو اُس کی خلافت کو تسلیم کر سکے۔ ایسی حالت میں وہ عبد اللہ بن عمر کی کسی بات کو رد کر کے اُن کو اپنے سے منحرف کرنا پسند نہیں کر سکتا تھا عبد اللہ بن عمر نے اپنی بیوی کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر یزید کو مختار کی رہائی کے لیے خط لکھا۔ یزید نے فوراً عبید اللہ بن زیاد کو تاکیدی حکم نامہ بھیجا کہ مختار کو رہا کر دو۔ اب کیا مجال تھی ابن زیاد کی جو اس حکم کی مخالفت کر سکتا چنانچہ ابن زیاد نے مجبوراً اُن کو رہا کر دیا۔

رہا ہونا تھا کہ اُنھیں قتل حسین کے تفصیلات معلوم ہونے لگے اور اُن کا دل جوش انتقام سے بھر گیا مگر وہ تنہا اتنا بڑا کام اپنے ذمہ نہیں لے سکتے تھے جب تک کوئی بڑا شخص ملک عرب کا دوسرا بھی اُن کے ساتھ نہ ہوتا۔ اس لیے اُنھوں نے ابراہیم بن مالک اشتر کے ساتھ تبادلۂ خیالات شروع کیا۔

یہ ابراہیم اُن ہی مالک اشتر کے فرزند تھے جو حضرت علی بن ابی طالب کی فوج کے سالار اور بڑے ہمدرد مددگار تھے۔ جن کے لیے حضرت علی کا یہ قول مشہور ہے

کہ وہ میرے لیے جنگ میں وہ حیثیت رکھتے ہیں جو میں رسول اللہ کے لیے رکھتا تھا۔ جنھیں حضرت علی نے مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا مگر وہ حکومت شام کی سازش سے مصر تک پہونچنے کے قبل ہی قتل کر ڈالے گئے تھے۔

اُن کی شجاعت ورثہ میں اُن کے فرزند ابراہیم کو ملی تھی مگر عرصہ دراز سے وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور سوائے روزہ و نماز کے کوئی شغل نہ تھا۔

مختار خوش قسمتی سے ابراہیم کا اتحادِ عمل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب دوسرے خاندان رسول کے ہمدرد جن میں بڑے بڑے ممتاز اور ذی اثر نمایاں شخصیت کے مسلمان تھے ان کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ جیسے ابوالطفیل عامر بن واثلہ بن اسقع کنانی جو صحابۂ رسول میں داخل تھے۔ رفاعہ بن شداد بجلی جو اس کے پہلے سلیمان بن صرد خزاعی کے ساتھ توابین کے جہاد میں بھی شریک ہو چکے تھے ورقا بن عازب وغیرہ وغیرہ۔

ان لوگوں نے متفق ہو کر یہ رائے قائم کی کہ ہم کو قاتلان حسین سے انتقام لینا ہے تو دمشق جانے کی ضرورت نہیں بلا واسطہ جو قاتلان حسین ہیں وہ اسی کوفہ کے لوگ ہیں اس لیے ہم کو انہی سے بدلا لینا چاہیے۔

اس وقت یزید ہلاک ہو چکا تھا اور عبداللہ بن زبیر کا اقتدار مکہ سے بڑھ کر عراق تک پہونچ چکا تھا اور کوفہ میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے عبداللہ بن مطیع کی حکومت تھی۔ جس طرح بصرہ میں عبداللہ کے بھائی مصعب بن زبیر کی حکومت قائم تھی۔

مختار اور اُن کی جماعت کے لیے قاتلان حسین سے انتقام لینا آزادی کے ساتھ اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ کوفہ میں ایک خودمختارانہ حیثیت حاصل نہ کریں۔ یہ وجہ تھی کہ اُنھیں حکومت ابن زبیر سے تصادم ناگزیر ہوا۔ عبداللہ بن مطیع ان جانبازوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر کوفہ سے فرار ہو گیا اور کوفہ میں مختار کی حکومت قائم ہو گئی۔

حکومت پا کر انھوں نے اپنے نصب العین کو فراموش نہیں کیا اور انھوں نے چن چن کر قاتلان امام حسین کو قتل کرنا شروع کیا۔ یہی واقعہ اُن کی نیت کے متعلق ہمیں اچھی رائے قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عمر بن سعد۔ شمر بن ذی الجوشن۔ سنان بن انس۔ خولی بن یزید۔ زرعہ بن شریک۔ زحر بن قیس۔ حرملہ بن کاہن اور اسی طرح کے ہر ہر ظالم کو جو قتل حسین میں عملی طور سے شریک ہوا تھا پوری سختی کے ساتھ گرفتار کیا گیا اور قتل کیا گیا۔ علامہ ابن حجر مکی نے ان لوگوں کی تعداد جنھیں بحیثیت قاتلان حسین کے مختار نے قتل کیا ہے چھ ہزار بتائی ہے (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۱۱۸)

ابن زیاد ہلاکت یزید کی خبر سننے کے بعد ہی بصرہ سے بھاگ چکا تھا مگر مشیت نے اُسے بھی کشاں کشاں مختار کی فوج تک پہونچا دیا۔ اس طرح کہ وہ دمشق سے ۴۰ ہزار کی فوج کے ساتھ مختار کے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا مختار نے ابراہیم بن مالک اشتر کو چند ہزار کی فوج کے ساتھ اُس کے مقابلہ کے لیے بھیجا فرات کے کنارے دونوں لشکروں کے درمیان مقابلہ ہوا جسمیں لشکر شام نے شکست کھائی اور ابن زیاد عین معرکہ جنگ میں ابراہیم بن مالک اشتر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ علامہ ابن حجر کا بیان ہے کہ یہ ۶۵ھ عاشورا کا دن تھا جب ابن زیاد اور اُس کے بہت سے ساتھی قتل ہوئے اور اُن کے سر قلم کر کے مختار کے پاس بھیجے گئے اور وہ اُسی جگہ نصب کیے گئے جہاں اس کے پہلے سر حسین نصب ہو چکا تھا۔

صحیح ترمذی کی روایت مظہر ہے کہ لوگوں نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ ابن زیاد کے سر کے پاس ایک سانپ دکھائی دیتا تھا جو اُس کی ناک کے ایک نتھنے سے داخل ہوتا ہے اور پھر گردش کر کے دوسرے نتھنے سے باہر آجاتا ہے۔ اسے خواہ حقیقت سمجھیے یا اُس عظیم تخیل کا نتیجہ جو ان اشخاص کے مستحق عذاب ہونے کے بارے میں عام مسلمانوں کے دماغ میں راسخ تھا۔

اب مختار اپنے مقصد حیات کو پورا کر چکے تھے۔ وہ چکی کے دو پاٹوں کے اندر تھے

حکومت شام ایک طرف۔ اور مکہ کی عبداللہ بن زبیر کی حکومت دوسری طرف چنانچہ عبداللہ بن زبیر کے حکم سے اُن کا بھائی مصعب بن زبیر ایک فوج گراں لے کر بصرہ سے مختار کے مقابلہ کے لیے آیا۔ اس موقع پر اتفاق سے مختار کے پاس اُن کی فوج کے روح رواں ابراہیم بن مالک اشتر بھی موجود نہ تھے۔ وہ انھیں گورنر بنا کر مدائن کی طرف بھیج چکے تھے۔ ان کی فوج بھی متفرق تھی۔ مجبوراً اپنی باقی ماندہ فوج کو لے کر اُنھوں نے مصعب کا مقابلہ کیا۔

قاتلان حسین میں سے ایک شخص محمد بن اشعث بھاگ کر مصعب کے پاس چلا گیا تھا اب مختار کے مقابلہ میں جو لشکر آیا اُس میں محمد بن اشعث بھی موجود تھا۔ اب یہی ایک شخص ایسا رہ گیا تھا جس کی مختار کو فکر تھی۔ اتفاق کی خوبی کہ یہ شخص اس لڑائی میں مختار کی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

مختار کے دل نے کہدیا کہ اب میعاد زندگی تمام ہو گئی۔ حیات کا مقصد پورا ہو چکا اور اب موت پر تیار ہو جانا چاہیے۔ آخر بڑی بہادری سے لڑ کر اُنھون نے اپنی جان مالک قضا و قدر کے سپرد کی۔ وہ مر گئے مگر خون حسین کا انتقام لے کر وہ اپنے نام کو ہمیشہ کے واسطے زندہ رکھ گئے۔

خوش قسمت ہے وہ انسان جو مشیت کے کسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ مختار ان ہی خوش قسمت انسانوں میں تھے۔ اُن کی ذات کے ساتھ قدرت نے اپنا ایک پروگرام وابستہ کیا تھا اور اس پروگرام کی تکمیل کے ساتھ اُن کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ جاودانی طور پر باقی ہے۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

❊ ❊ ❊

(ساتواں باب)

اموی حکومت کا انجام

عـ۵ "اعلیٰ درجہ کا تمدن اور اعلیٰ درجہ کی متمدن قومیں کیونکر فنا ہو جاتی ہیں۔ عمران کا یہ اہم سوال ہے جس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تمدن خود تمدن کا دشمن ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ جب کوئی قوم تہذیب تمدن کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر قسم کے قوت و اقتدار کی مالک بن جاتی ہے اور اُس کو ہمسایہ قوم کے حملہ کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ عیش پسند ہو جاتی ہے جو کثرت دولت کا لازمہ ہے اور وہ عیش پرستی تمدنی ترقی کے ساتھ ضروریات تعیش میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور ہر شخص میں خود غرضی اپنا قدم جما لیتی ہے اور اُس کا نقطۂ خیال صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اُس کے ہاتھ آئے اُس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھائے۔ اُن کی نظر میں مصالح عامہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ قوم کے تمام محاسن و اخلاق فنا ہو جاتے ہیں۔ اب اُس پر وحشی یا نیم وحشی قرب و جوار کے حملہ کر دیتے ہیں۔ روم و ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا اگرچہ اُن کا حکومتی نظام نہایت مستحکم تھا تاہم بربریوں نے روم کا خاتمہ کر دیا اور عربوں نے ایران کا۔ قرآن نے اس قانون عمران کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ "جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے دولت مندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں اس لیے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر اُن پر ہمارا قانون فطرت منطبق ہو جاتا ہے اور ہم اُس کو تباہ کر دیتے ہیں۔"

عـ۵ علامہ ہندی مولانا سعید احمد صاحب

یزید کے دور تک اموی سلطنت کی مادی ترقیاں کون بھلا سکتا ہے۔ مال و دولت وحکومت، مملکت کی وسعت، جاہ وحشمت قیصر وکسریٰ کو مات کئے ہوئے تھی۔ حکومت عیش پرستیوں اور خود غرضیوں کا پورا پورا شکار ہو چکی تھی۔ ہوتا تو وہی جو قانون فطرت کا تقاضا تھا لیکن ناعاقبت اندیش یزید نے اُس وقت کے آنے سے پیشتر امام حسین سے تصادم مول لیا اور حسین کے تقدس اور قوت روحانی کا ذرہ برابر دھیان نہ کیا اور شہید کر ڈالا۔ ہوا کیا؟ اُس کا داخلی نظام جو عیش پرستیوں اور خود پرستیوں سے متزلزل ہو رہا تھا اُس نے اس شہادت عظمیٰ سے متاثر ہو کر انقلابات کو جلدی قبول کر لیا۔ ادھر عبداللہ بن زبیر خون حسین کا واسطہ دلا کر کھل کر یزید کے مقابل آ گئے۔ اُدھر اہل مدینہ جنھوں نے چپ چپاتے امام حسین کو قتل ہوتے دیکھا تھا باغی ہو گئے۔ توابین کا گروہ علیٰحدہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ مختار نے ایک طرف علم بغاوت بلند کیا۔ بنی عباس علیٰحدہ خون مظلوم کا بدلا لینے کے نام سے بنی امیہ کے مقابل میں آ ڈٹے۔ حقیقت میں یہ سب کی سب محض سیاسی کروٹیں تھیں جن میں اولاد امام حسین کا ذرہ برابر ہاتھ نہ تھا بلکہ تاریخ بتلاتی ہے کہ اولاد امام انقلاب کنندگان سے علیٰحدہ رہتے ہوئے منع کرتے رہے مگر قانون فطرت "تمدن خود تمدن کا دشمن ہے" کب چوکتا ہے!

عـــہ "نفرت کا بیج جو کربلا میں بو دیا گیا تھا زمین کی گہرائیوں تک پہونچتا گیا یہاں تک کہ وہ ایک بڑے درخت کی شکل میں ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ابومسلم نے مرو میں سیاہ جھنڈا کھولا تو ہزاروں آدمی امویوں کی بیخ کنی کے لیے اس کے نیچے جمع ہو گئے۔ ان کی سلطنت اپنے آخری بادشاہ مروان کے ساتھ جو کہ جنگ زاب میں مارا گیا ختم ہو گئی اور ان سبھوں کے لیے جلاوطنی، ذلت اور قتل حصّے میں آیا۔"

عـــہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

(آٹھواں باب)

بنی عباس کی سلطنت

ع۱ "امام حسین کی شہادت کے بعد جب بنی امیہ کے مقابلہ کا ارادہ کیا گیا اور نفس زکیہ نے اموی حکومت میں انقلاب پیدا کرنا چاہا تو سفاح اور منصور نے ان کی بحیثیت خلیفہ اور بادشاہ کے محکومانہ بیعت کی اور جب سفاح نے انتقام خون بنی فاطمہ کے لیے خود شاہی تاج پہنا اور پہلا خطبہ پڑھا اُس وقت سفاح کے چچا داؤد نے یہ تقریر کی۔ ہم نے روپیہ پیسے سونے چاندی جمع کرنے اور نہر بنانے اور قصر تعمیر کرنے کے لیے خروج نہیں کیا ہے بلکہ بنی امیہ نے ہمارا اور ہمارے بنی اعمام (بنو فاطمہ) کا حق غصب کر لیا ہے اس وجہ سے ہم مقابلہ پر مجبور ہو گئے ہیں"۔ (مختصر اخبار الخلفاء ابن الساعی ص۲)

بنی عباس کے شاعر شبل بن عبداللہ نے ایک درد انگیز نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

واذکروا مصرع الحسین و زید . و قتیلا بجانب المھراس

(حسین اور زید کا قتل یاد کرو اور یاد کرو کہ مقام مہراس میں جنگ احد کے موقع پر ابو سفیان نے حمزہ کو کیونکر قتل کرایا تھا اور ہندہ نے کیونکر ان کا جگر چبایا)

بنی عباس کو بنی فاطمہ کے اثرات اور دعوائے خون حسین کے نتیجہ میں حکومت ملی ورنہ اُس وقت اُن کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا اور نہ وہ اس منصب کو پا سکتے تھے بنی عباس نے علامت کے طور پر دکھ جذبۂ انتقام خون حسین کو

ع۱ مولوی سید سبط محمد صاحب نقوی

ان کی حکومت سے کتنا لگاؤ ہے، اپنے لیے بطور شعار کے سیاہ لباس کو معین کیا یہ سیاہ کپڑے پہنتے تھے، ان کے پھریرے سیاہ تھے اور اس لیے ان کو مسودہ کہا جاتا ہے۔

عبداللہ بن معتز عباسی خلیفہ کی ایک نظم میں یہ شعر بھی ہیں۔

ولا عجب غیر قتل الحسین ظمآن یقصی عن المشروب
وکم من شعار لباسہ یجد وا منہا علی المذنب
وکم من سواد حدنا بہ وتطویل شعر علی المناکب"

(یعنی) سب سے زیادہ حیرت خیز امر حسین کا قتل ہونا ہے پیاس کے عالم میں جب کہ نہر سے اُن کو روکا جا رہا تھا ہم نے اُن کے غم میں سیاہ لباس پہنے اور سر کے بالوں کو بڑھایا ہے۔

گزشتہ ابواب کا خُلاصہ

(اور)

فتح و شکست کا آخری نتیجہ

ع۱۔ "دنیا نے شاید یہ سمجھا ہو کہ حضرت امام حسین کو کوفہ کے لوگوں نے دھوکا دیا اور وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا شاید یہ بھی کہتی ہو کہ آپ نے اس جہاد کو اختیار کر کے اپنے آپ کو اور اہلبیت کو خواہ مخواہ تباہی اور مصیبت میں ڈالا مگر اس وقت بھی جو لوگ بصیرت رکھتے تھے وہ حضرت امام حسین کے اصل مقصد سے بخوبی آگاہ تھے اور اُن کی قربانی کی اہمیت کو سمجھے تھے اور جب وہ غبار جو میدان جنگ پر بادل کی طرح چھایا ہوا تھا دور ہو گیا جب وہ تلواریں جو خون بہانے کے لیے میانوں سے کھینچی گئی تھیں خشک ہو گئیں۔ اور جب وہ فتح و کامیابی کا خمار جو یزید اور اُس کے پیروؤں کے دماغ پر حاوی تھا دُور ہو گیا تو یہ بات تمام دنیا پر روشن ہو گئی کہ اُن کی قربانی رائگاں نہیں گئی۔ حضرت امام حسین میدان سر نہ کر سکے لیکن فتح کا سہرا ان ہی کے سر رہا اس لیے کہ اس جنگ میں حق باطل پر غالب آیا۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اُس خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے جس میں وہ عرصہ سے بے حس پڑے ہوئے تھے۔"

ع۲۔ "حسرت و بدنامی کے ساتھ یزید کا خاتمہ ہو گیا۔ صرف اُسی کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اُس کی نسل سے وہ حکومت بھی جاتی رہی جس کو کہ اُس کے باپ نے حضرت علی

ع۱۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ع۲۔ مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی

سے جنگ کر کے اور امام حسن کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور یہ چاہا تھا کہ خلافت اُس کی میراث ہو کر نسلاً بعد نسل اُس کی اولاد میں قائم رہے۔ یہی نہیں ہوا بلکہ حسین کی کامیابی اس طرح ہوئی کہ یزید کے بیٹے معاویہ نے تمام مسلمانوں کے سامنے علی اور اولادِ علی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے ان تمام جرائم کی نقاب کشائی کر دی جن کا ارتکاب اُس کے باپ اور دادا نے کیا تھا۔

ع۵ "اُس نے ایسے تخت و تاج سے انکار کر دیا جو کہ اپنے دامن پر حسین ایسے شہید کے خون کے دھبے رکھتا تھا۔"

آخر یہ ع۲ "زبردست سلطنت تھوڑے ہی زمانہ میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے دامن کا داغ بن کر رہ گئی اور قاتلان حسین کا نام ایسا مٹا کہ کہ آج ایک شخص بھی اُن کی اولاد میں باقی نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اس واقعہ سے وہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ساری دنیا میں ایک آدمی بھی اپنا انتساب اُن کی طرف پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف وہی حسین جن کے ساتھ کربلا کی جنگ میں گنتی کے چند آدمی تھے آج اُن کے نام پر جان نثار کرنے والے کروروں کی تعداد میں موجود ہیں"

ع۳ "واقعۂ کربلا میں حسین کے پس ماندگان میں محض ایک علی کی ذات تھی جو کہ خاندان ائمہ کے سرگروہ ہوئے اور جو اسلامی تاریخ کو اپنی سنجیدگی اور افادیت سے نویں صدی علیسوی کے اختتام تک متاثر کرتے رہے۔ گویا کہ کربلا کے شہداء کی روحیں انصاف اور رحم کے لیے صدائے احتجاج بلند کر رہی تھیں۔ انصاف ظالم کے ظلم کے مقابلہ میں اور رحم مقتولین کے لیے اور اُن کی یہ صدا سُنی گئی۔

خاندان اموی دنیا سے نیست و نابود ہو گیا اور (حضرت) محمدؐ کا خاندان کروروں کی تعداد میں بڑھ گیا جن میں سے ہر ایک "سیّد" یعنی سردار ہے"

ع۱ سید اشفاق حسین صاحب ع۲ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ع۳ ڈاکٹر سو کمار بنرجی لکھنؤ یونیورسٹی

ع۵ "حسینی فوج کے کشتے میدان جنگ میں بغیر تکفین و تدفین کے چھوڑ دیے گئے تھے - اب اُن کی قبروں پر شاندار عمارتیں بنی ہوئی ہیں - ان مزاروں کو مسمار کرنے کی بھی پیہم کوششیں کی گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ مقبروں کے مسمار کرنے والے تو مدتیں ہوئیں فنا ہو گئے لیکن حسین اور اُن کے ساتھیوں کے مقبرے پورے آب و تاب کے ساتھ آج کروروں انسانوں کے دلوں کو تسخیر کئے ہوئے ہیں جو کہ اُن پر احترام اور عقیدت کی نذر چڑھاتے ہیں۔

کربلا جو پہلے سنسان صحرا تھا آج جسمانی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے پھولا پھلا نخلستان ہے اور اُس کے بے جان ذرّے آج حسین کی لافانی کامیابی کے ساتھ ساتھ چمک رہے ہیں"

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

(نواں ۹ باب)

تبدیل ذہنیت

حسینی شہادت کا ایسا عظیم کارنامہ اپنے اثر کے اعتبار سے ناقص اور ناپائدار ہوتا اگر اس کا نتیجہ صرف کسی سلطنت کا مادی طور پر ختم ہو جانا اور کسی نسل کا تخت و تاج سے محروم ہو جانا ہوتا اور بس۔

حقیقت میں گزشتہ تمام نتائج جو متقدمہ ابواب میں بیان ہوئے ہیں سب ایک ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام حسین کا مقصد بھی جیسا کہ جا بجا اس کتاب میں بتایا گیا ہے یہ نہ تھا کہ یزید یا حکومت بنی امیہ کو مادی طور پر ختم کریں۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو فوج و لشکر فراہم کرتے۔ امام حسین تو در حقیقت ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جو فوج و لشکر سے حاصل نہیں ہوتی۔ فوجوں کی طاقت اور تلوار کی قوت انسانوں کو قتل کر سکتی ہے مگر ذہنیت کو فنا نہیں کر سکتی۔ حسین یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ذہنیت میں تبدیلی کریں۔ ایسی تبدیلی جو مستقل اور دیرپا ہو اور جس کے مظاہرات ہر دور میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہیں۔

امام حسین اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ حضرت امام حسین کا مقابلہ جس جماعت سے تھا اس کا مذہبی مسلک کیا تھا؟

پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد تین خلافتیں اس طرح گزریں کہ ان کے بارے میں اصولی اختلافات کتنے بھی ہوں مگر ان میں خانہ جنگی کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ حضرت عثمان کی وفات کے بعد جمہور مسلمین نے حضرت علی بن ابی طالب کو

خلیفہ تسلیم کیا لیکن شام کی حکومت نے آپ کی بیعت نہیں کی بلکہ امیر شام خود مدعی خلافت ہو گئے اور شام کے مسلمانوں نے ان سے بیعت کی۔ حضرت علی کے طرفداروں میں اور شام والوں میں معرکہ آرائیاں ہوئیں جن میں ایک طرف "شیعۂ علی" تھے اور دوسری طرف اتباع بنی امیہ۔ پہلی جماعت "علویین" اور دوسری جماعت "عثمانیین" بھی کہلاتی تھی۔

اس جماعت میں جو "شیعۂ علی" کہلاتی تھی کچھ تھوڑے وہ تھے جو اصولی طور پر پہلی خلافتوں سے بھی اختلاف رکھتے تھے اور اس لیے اصطلاحی طور پر "شیعہ مذہب" رکھتے تھے لیکن زیادہ تر وہی تھے جو پہلی خلافتوں کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت علی کو خلیفۂ رابع کی حیثیت سے تسلیم کر رہے تھے۔ یہ سب بنی امیہ کے مقابلہ میں اپنے کو "شیعۂ علی" کہنا فخر سمجھتے تھے۔

ان کے بالمقابل شام کی سلطنت اور اس کے ہوا خواہ تین خلفاء کے بعد معاویہ کو خلیفہ جانتے تھے اور حضرت علی کو کسی درجہ پر بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ صفین کا معرکہ ان ہی لوگوں سے تھا۔ امام حسن کی جنگ ان ہی سے تھی۔ کربلا کا جہاد ان ہی کے مقابلہ میں تھا۔

لیکن اب ؟ —— اب مسلمانوں میں جو بھی فرقے ہیں وہ شیعہ اور سنی —— یہ دونوں اسی گروہ کی شاخیں ہیں جو بنی امیہ کے مقابلہ میں اپنے کو "شیعۂ علی" کے نام سے موسوم کرتا تھا اور اسی لیے یہ تمام حضرت علی کی خلافت پر (کسی نہ کسی منزل میں جا کر) متفق ہیں —— خوارج کا بھی وجود ہے۔ یہ بھی "شیعۂ علی" کے اندر کا وہ گروہ ہے جو تحکیم کے معاملہ پر حضرت علی سے منحرف ہو گیا تھا۔ ان کا وجود اب تک باقی ہے لیکن "شیعۂ بنی امیہ" یا "عثمانی" یعنی وہ گروہ جو حضرت عثمان کے بعد براہ راست معاویہ کو خلیفہ مانتا ہو اور پھر یزید کو —— اور اس لیے اہلبیت رسول کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہی نہ کرتا ہو —— یہ مذہب آج روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔ یعنی وہ مذہب جو حضرت امام حسین کے

مقابل میں برسرجنگ تھا دنیا سے ناپید ہوگیا اس طرح کہ اُس کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ کیا اس سے بڑھ کر کھلی ہوئی فتح کوئی ہوسکتی ہے؟

⁂

مسلمانوں کی اکثریت نے خلفائے اسلام کو "اولی الامر" مانا اور اُن کی اطاعت کو اطاعت خدا اور رسول کی طرح فرض قرار دیا۔ اس ذیل میں کسی درجہ تک "حق تشریع" بھی اُن کے لیے تسلیم کرلیا گیا۔ اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ جو خلفار کا راستہ ہو وہ ٹھیک ہے مگر آج شیعوں کا ذکر نہیں جو اس خلافت کو کسی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ جمہور مسلمین یعنی اہلسنت خلافت کے دو حصے قرار دیتے ہیں، ایک "خلافت راشدہ" اور ایک غیر راشدہ جس کو "ملک عضوض" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر حضرت علی اور پھر حضرت امام حسن کی خلافت جو معاویہ سے صلح کے قبل تک رہی خلافت راشدہ کی آخری حد مانی جاتی ہے معاویہ اور پھر یزید اور دیگر خلفائے بنی امیہ وبنی عباس سب خلفار کہے جاتے ہیں مگر غیر راشدین۔ یہ تفریق امام حسین کے بے پناہ احتجاج اور مخصوص رنگ کے جہاد ہی کا نتیجہ ہے۔

عـ۵ "کربلا کے واقعہ سے یزید کی دنیاوی حکومت کا فوراً خاتمہ نہیں ہوا اور نہ خاندان بنی امیہ کی سلطنت فوراً تباہ وبرباد ہوئی لیکن دنیا پر یہ ظاہر ہوگیا کہ یزید اور اُس کے پیرو اسلام کو کس راستے پر لے جارہے تھے اور اپنی ذاتی منفعت اور دنیاوی خواہش کے لیے وہ کیا کچھ کرنے کو تیار تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر امام حسین یہ بڑی قربانی نہ کرتے تو آج دنیا کے مسلمان غالباً یزید کو بھی خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے القاب سے یاد کرتے معصیت اور نیکی کا معیار ہی کچھ اور ہوجاتا ایمان اور کفر کی تمیز باقی نہ رہتی۔ باطل حق ہوجاتا اور حق باطل لیکن خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اسلام کو تباہی سے بچالیا"!

⁂

عـ۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

حضرت امام حسین کی مقاومت نے یہ چیز ہمیشہ کے لیے صاف کر دی کہ خلفاء کو حق تشریع نہیں ہے۔ یہ بھی کہ برے اعمال اگر کوئی عام انسان کرے تو وہ بھی گناہ ہیں اور اگر خلیفۃ المسلمین ان کا ارتکاب کرے تو وہ بھی گناہ ہیں اور سب بڑے گناہ ہیں۔ یہ بھی کہ حاکم وقت کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک مفاد خداوندی سے تصادم نہ ہو لیکن جب الٰہی سلطنت سے بغاوت ہونے لگے تو ہر بندۂ خدا کا فرض ہے کہ جہاں تک ضرورت کا تقاضا ہو وہ مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

اس طرح اس "بھیڑ یا دھسان" والی کیفیت میں جو ۶۰ھ تک نظر آ رہی تھی آپ نے ایک فرض شناسی کا احساس اور حکومت جور سے محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کر دیا جس کی بدولت پھر کسی سلطنت کو اس کا خواب خرگوش پر کیف اور خوشگوار باقی نہ رہ سکا

امام حسین کا نصب العین یہی تھا کہ ؏ "حفاظت اصول میں جان دے دیں اور یہ شہادت حفظ اصول و ناموس اسلام کی ضمانت کرے اور اصول پروروں کی ایک جماعت ایسی قائم ہو جائے جو عدل و حق پر برقرار رہ کر اپنے کو باطل پرستیوں سے علحدہ رکھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امام حسین اس جماعت سازی میں ناکام رہے۔ بے شک اُن کی شہادت نے دنیا میں ایسی جماعت قائم کر دی جس نے اصول پروری کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لی۔ دست و پا کاٹے گئے۔ سولیوں پر چڑھے۔ گردنیں کٹائیں۔ زندہ دیواروں میں چنے گئے۔ قید سخت میں زندگی گزاری۔ زن و بچہ قتل ہوئے۔ زبانیں کاٹی گئیں۔ نہروں میں غرق کر کے مارے گئے۔ مکان جلائے گئے مال لوٹے گئے۔ تہ خانوں میں جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہ تھا گھٹ گھٹ کر مر گئے

(مقاتل الطالبین ابو الفرج اصفہانی وغیرہ)

وہ کون سا ظلم تھا جو دور اموی و عباسی میں اُٹھ رہا ہو مگر اُن کی خداشناسی اور اصول پرستی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو حق پسندی کا بار کاندھوں پر انھوں نے اُٹھا لیا تھا اُس کو ایثار و قربانی سے ٹلنے نہ دیا۔"

؏ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

حسین کا صبر و استقلال ایک دائمی مثال بن گیا جو ہر سخت موقع پر یاد کیا جاتا رہا اور متزلزل دلوں میں استقلال پیدا کرتا رہا چنانچہ اُس وقت جب مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں عبدالملک بن مروان نے لشکر کشی کی اور فوج مخالف کی کثرت سے مصعب کی فوج میں ابتری ہوگئی اور ایک عام رعب طاری ہو گیا تو مصعب نے عروہ بن مغیرہ کو جو قریب تھا پکارا کہ ادھر آؤ۔ جب وہ قریب آیا تو مصعب نے کہا اس وقت حسین کے حالات بیان کرو کہ جب اُن پر وقت پڑا تو انھوں نے کیا کیا؟ عروہ کا بیان ہے کہ میں نے امام حسین کے حالات بیان کئے اور بتلایا کہ کیونکر اُن کے سامنے حاکم کی اطاعت کا سوال پیش ہوا اور انھوں نے انکار کیا اور موت کو قبول کر لیا۔ مصعب نے جوش میں اپنے گھوڑے کو تازیانہ لگایا اور یہ شعر پڑھا۔

فان الالیٰ بالطف من آل ہاشم تأسّوا فسنّوا للکرام التاسیا

(یعنی) "وہ جو کربلا میں ہاشمی گھرانے کی فردیں تھیں ایک ایسی مثال قائم کر گئی ہیں جو شریفوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے" (الاخبار الطوال ص ۳۰۱-۳۰۲)

اس کے علاوہ جب عـہ "عبداللہ بن زبیر کے ساتھیوں اور مددگاروں نے عبداللہ کا ساتھ چھوڑنا شروع کیا اور شام کی فوج میں بنی امیہ کی امان میں جانے لگے حتیٰ کہ عبداللہ کے بیٹے بھی اُن کو چھوڑ کر چلے گئے اور امیر شام کی فوجوں میں جا ملے صرف تھوڑے سے رفیق عبداللہ ابن زبیر کے ساتھ باقی رہ گئے تھے۔ حجاج نے زیادہ سختی شروع کی اور امان کا وعدہ کیا جیسا کہ عبدالملک نے پہلے ہی امان نامہ لکھ کر حجاج کے پاس بھیجدیا تھا۔ اس وقت اس ہاشمی بہادر کے پاؤں ڈگمگا گئے صبر کی طاقت جاتی رہی۔ امیر شام کی امان کو منظور کرنے پر مائل ہو گئے۔ مگر جب انھوں نے اپنی والدۂ گرامی اسماء بنت ابی بکر سے اپنی تنہائی اور مصیبت کا حال بیان کیا اور بتایا کہ سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ میرے خاص اولاد اور اعزا بھی مجھے

عـہ ناموس اسلام

اکیلا چھوڑ کر شام کی فوج میں جا ملے۔ بنی امیہ مجھے امان دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ تو اُس بزرگوار بی بی نے حمیت عرب اور شجاعت کے جوہر دکھاتے ہوئے جواب دیا کہ "اے بیٹے اگر تم اب تک ناحق اُن سے لڑتے تھے اور اپنے آپ کو برحق نہیں سمجھتے تھے تو تم نے بہت بُرا کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو ناحق کٹوا دیا اور اگر تم اپنے کو حق پر سمجھتے ہو تو بس حسین کی طرح حق پر لڑو اور جان دے دو" ماں کی اس بہادرانہ تقریر سے عبد اللہ بن زبیر کو ہمت بندھی اور وہ مرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اس طرح حضرت امام حسین نے جو قوت برداشت اور جرأت اظہار پیدا کر دی تھی وہ ہمیشہ ظلم و جور کی طاقتوں کو چیلنج کرتی رہی اور وہ احساس جو ۶۱ھ میں پیدا ہوا تھا برابر بیدار رہا اور بیدار ہوتا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ "انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ انسانی زندگی کا عقلی پہلو اور انسانی زندگی کا جذباتی پہلو۔ ہم بابانگ دہل کہہ سکتے ہیں کہ اس واقعہ نے انسانی زندگی کے دونوں پہلوؤں پر عظیم الشان اثر ڈالا ہے"

اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمان جو ۶۱ھ میں یزید ایسے فاسق و فاجر اور احکام خدا کے تبدیل کرنے والے کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر رہے تھے تیرہ صدی گزرنے کے بعد امیر امان اللہ خان کی آزادرویوں کو برداشت نہ کر کے بادشاہت سے معزول کرنے پر تیار ہو گئے اور وہ جو اُس وقت یزید ایسے شخص کو امامت کبریٰ کے عہدہ پر دیکھ رہے تھے اور خلاف آواز بلند نہ کر سکتے تھے، اب اتنے بیدار ہیں کہ کسی بڑے عالم فاضل مسلمان کو بھی اگر اپنے سیاسی مسلک سے جدا دیکھتے ہیں تو کلکتہ کی امامت نماز عید سے معزول کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں سے مخصوص نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے حسینی شہادت مشعل راہ بن گئی اس لیے گاندھی جی بھی آزادی ہندوستان کی مہم میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ میں نے شہید کربلا کی زندگی سے سبق حاصل کیا ہے۔ سچ کہا ہے جوش ملیح آبادی نے:۔

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو — یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو — در پردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو — یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

(ع۔ھ خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری کا ہو گا)

(دسواں باب)

اخلاقی نتائج

عـ۵ "واقعہ کربلا کے مستقل نتائج کا بیان کرنا باقی رہ گیا ہے۔ یہ نتائج اُن ردِ عمل اور مادی تجلیات سے بالکل علیحدہ ہیں جو واقعۂ کربلا کے فوری بعد وقوع میں آئے اور جن کا ذکر گزشتہ ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ واقعۂ کربلا کے ان مستقل نتائج کی بہترین تشریح دو مختلف نظریوں سے کی جا سکتی ہے۔ ایک تو اسلام کو ایک مخصوص مذہب مان کر اور دوسرے یہ کہ وسیع معنوں میں انسانیت کو ایک ہمہ گیر چیز فرض کر کے یا مذہب کو ایک بنیادی اور نہایت اہم اخلاقی قوت تصور کریں جو کہ انسانیت کی رہبری اور انسانی مقدر پر حکمرانی کرتا ہے۔

موضوع کی صحیح توضیح اور ٹھیک طریقہ سے سمجھنے کے لیے یہ دو نظریے بنائے گئے ہیں۔ ورنہ در اصل یہ دو مختلف نظریے دو نہیں ہیں بلکہ تحلیل کے بعد دونوں نظریے ایک ہی ثابت ہوں گے۔ اسی حقیقت کو ظاہر کر دینے کے لیے حسین کا جہاد عظیم بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ایک سطحی نظر رکھنے والے انسان کے لیے حسین کی حیثیت ایک مخصوص جماعت کی ایک مقدس فرد سے زیادہ نہ ہوگی مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ لاتعداد جمعیتوں کی فرد ہیں جن کی شہادت کا ماتم ہر سال نہایت تزک و احتشام اور غم و الم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ حسین کی شخصیت کو مسلمانوں کے ایک خاص فرقہ سے متعلق و محدود سمجھ کر جو کہ حسین کے نام کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے، یہ شخص اُن کی عظمت کے دائرہ کو اور بھی تنگ کر دے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے یا اُس

عـ۵ سید اشفاق حسین صاحب ایم اے بیرسٹر سیتاپور

فرقہ یا جماعت کے لیے جو کہ ہر سال نہایت عقیدت اور شان کے ساتھ اُن کی شہادت کا غم تازہ کرتی ہے حسین نے یہ عدیم المثال قربانی پیش نہیں کی۔

ان مصائب کا مقابلہ کرتے وقت حسین کے ذہن میں کسی خاص فرقہ کی نجات کا سوال درپیش نہیں تھا بلکہ اُن کے ذہن میں خاطی انسانیت کی قابلِ رحم حالت کا مسئلہ تھا جسے ہر ممکن قیمت پر صراطِ مستقیم پر لگا دینا اُن کا فرض تھا۔

اگر کوئی خاص فرقہ یا کوئی خاص ملت حسین کو محض اپنا کہنے کی جرأت کرے تو ہم اس سے کہدیں گے کہ آپ کا یہ قول اسی طریقہ سے ناقابلِ قبول ہے جیسے کہ آپ قطبی ستارہ کو خاص اپنا اس وجہ سے کہدیں کہ آپ دوسروں سے بہتر اُس کی روشنی کے مداح ہیں یا دوسروں کے مقابلہ میں جو اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں آپ اس منظم دنیا میں اُس کی جگہہ اور اہمیت سے واقف ہیں۔ بس حسین کی یہی حالت ہے اُن کی حیات و موت کا سوال کسی خاص فرقہ و قوم یا جماعت سے متعلق نہ تھا بلکہ اُن تمام لوگوں سے متعلق ہے جو کہ اُن سے انسانی زندگی کا سبق لینا چاہتے ہیں"

حسین کی ذات اور اُن کے کارنامۂ جاوید سے جس کا نام "واقعۂ کربلا" ہے مذہب، انسانیت اور اسلام کو کیا فوائد پہونچے؟ وہ ذیل کے عناوین میں آپ کے سامنے آئیں گے۔

---(۱)---

مذہب اور روحانیت کی طاقت کا مظاہرہ

مادیت اور روحانیت میں جنگ ہمیشہ ہی برپا رہی اور آج بھی ہے مذہب روحانیت کا علمبردار ہے۔ آج جبکہ دنیا روحانیت کی طرف سے منہ موڑے ہوئے ہے تو وہ مذہبی معتقدات کو اوہام کے نام سے تعبیر کر کے اُن کی اہمیت کو گھٹاتی ہے مگر مذہب اپنی طاقت ہمیشہ منواتا رہا ہے۔

کربلا کی جنگ مذہبیت اور مادیت کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ تھی

جس میں دنیا کی تمام طاقتوں کے مقابلہ میں مذہبی احساس نے اپنی کامل فتحمندی کا ثبوت دیا اگر یہ دنیا ہی قابل اعتبار ہے اور اس کی مادی طاقتیں ہی سب کچھ ہیں تو کیا حسین کو مٹانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی اور کیا یزید کے فتح وظفر میں کوئی کمی بھی جاتی تھی؟ مگر ان دیکھی طاقت (خدا) پر ایمان کی قوت تھی جس نے فنا کو بقا، موت کو حیات بنا دیا۔ وہ جو مٹ گیا تھا ہمیشہ کے لیے باقی رہا اور وہ کہ جو کامیاب ہوا تھا ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ وہ دمشق کے قصر حکومت کا کھنڈر اور تاجدار دمشق کی آخری خوابگاہ ہے جس کی طرف کوئی رُخ بھی نہیں کرتا۔ اور وہ جسے دنیا نے مٹا دیا تھا۔ اسی نے جنگل کو کاشانہ بنا دیا، وہ سنسان میدان اور ریتیلی زمین ہے جو آج دنیا کے کروروں آدمیوں کا قبلۂ مقصود بنی ہوئی ہے۔ حقیقت میں عـہ "مذہب تمدن کا وہ اساس ہے جو اپنی عظیم الشان قوت سے ایک زمانہ میں قوم کے مفاد، قوم کے خیالات کو متحد کر دیتا ہے اس لیے وہ اُن تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے دفعتہً قائم مقام ہو جاتا ہے اور تمام قوتوں کا رخ ایک مقصد کی طرف ہو جاتا ہے —— مذہب کی اس طاقت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم (اے رسول اگر تم زمین کی تمام دولت صرف کر ڈالتے تب بھی اُن کے دلوں کو متحد نہ کر سکتے تھے)

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب لوگوں کے دلوں میں خواہش پرستی، رشک و حسد اور خود غرضیوں سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو کوئی نظام عمران کا قائم نہیں رہ سکتا اور کشمکش حیات سے بے امنی، بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا والوں کا رُخ خدا کی طرف پھیر دیا جائے جس سے مقصد حیات پورا ہو جاتا ہے اور جس قدر اتحاد قوی ہوتا ہے اُسی قدر کشمکش حیات دُور ہوتی ہے، اختلافات کم ہو جاتے ہیں باہمی امداد و اعانت میں سعت ہوتی ہے،

عـہ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

دنیا بھر کا مال و دولت لٹا دینے سے ہیئت اجتماعی کا وجود نہیں ہوتا اور ہو بھی تو وقتی ہو گا۔ حیات اجتماعی و عمرانی کے واسطے تو ضرورت حقیقی شوق و رغبت و محبت کی ہے جو زرپاشی سے ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے یزید کی زرپاشی نے وقتی طور پر امام حسین پر قابو پا کر قتل تو کر دیا لیکن ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ میں یزید مر گیا اور صرف تین سال ڈھائی ماہ کے بعد نہ وہ خود رہا، نہ اس کی سلطنت اس کی نسل میں رہی۔ وہ عسکری قوت، خوشامدی غلاموں کی فداکاری دولت و ثروت و سرمایہ داری کدھر گئی؟ اس لیے کہ ان مادی چیزوں میں کوئی سکت ہی تھی جو حیات اجتماعی کو باقی رکھنے یا قومی تعمیر میں کام آتی۔

روحانی و مذہبی سرمایہ کی جنگ مادی سرمایہ داری سے تھی۔ مذہب اور روحانی طاقت کا ایک طرف مظاہرہ تھا۔ دوسری طرف دولت و ثروت و حکومت و عسکریت کا مظاہرہ زوروں پر ہو رہا تھا۔ تاریخ خود فیصلہ کرتی ہے کہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی فتح حسین کی ہوئی۔

وہ پیکر ایثار و قربانی حسین اور ان کے ساتھی تاریخ میں اقوام عالم کو سبق دے رہے تھے کہ روحانی قوت کا لازوال کرشمہ یہ ہے کہ اقلیت جبار و مستبد اکثریتوں کو مغلوب کر دیتی ہے۔"

جیسا کہ نواب محمد ظہیر الدین خان بہادر امیر پائگاہ نے اجلاس یادگار حسینی حیدر آباد دکن کے خطبۂ صدارت میں کہا:-

"موجودہ زمانہ میں انسان نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ فطرت کی متعدد قوتوں کو انسان نے بڑی حد تک مسخر کر لیا ہے۔ ایجادات اور اختراعات کی بدولت ہر قسم کی جسمانی اور تمدنی آسائشیں اسے حاصل ہو گئی ہیں لیکن یہ ساری ترقی صرف مادی ہے۔ مادیت میں گم ہو کر ہم نے اپنی روح اور باطن کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کا اب مغرب کے ممتاز اہل فکر بھی اعتراف کرنے لگے ہیں۔

موجودہ دنیا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ اب انسان کو اپنی روح اور باطن کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب تک ایسا نہ ہوگا ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی، اخلاقی و روحانی ابتری پھیلتی رہے گی اور باطل کی قوتیں خون سے ہولی کھیلنے والے گمراہوں کے روپ میں پر امن دنیا میں مسلط ہوتی رہیں گی۔ بڑی بڑی توپیں، مشین گنیں، بم، تارپیڈو، آبدوز اور بارودی سرنگیں ایجاد کر کے انسان نے انسان کی جان لینے کے فن کو معراج کمال پر پہونچا دیا ہے لیکن جان دینا نہیں سیکھا۔ حالانکہ یہی انسانیت کا جوہر ہے —— حضرت ختم المرسلین کے نواسے نے حق پر اڑنے، صداقت کے لیے لڑنے اور بلند اور وسیع مقاصد کے حصول میں جان و مال کو قربان کرنے کا سبق دیا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی صدر شعبہ تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی کہتے ہیں:-

"اصل مذہب یہ ہے کہ انسان اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دے تن، من دھن کے قربان کر دینے کا نام مذہب ہے۔ کتابوں سے اصل مذہب حاصل نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کے عمل میں مذہب کی روح نمایاں ہوتی ہے۔ اصل مذہب روحانیت ہے۔ اگر روحانیت کسی مذہب میں نہ ہو تو اس سے فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ امام حسین نے اس روحانیت کو اس طرح قائم کر دیا ہے کہ وہ ہمیشہ آفتاب کی طرح درخشاں و تاباں رہے گی"

اسی کو مہاتما شانتی پرکاش صاحب صدر شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں کہ:-

"امام حسین کی ظاہری شکست قیامت تک حقیقی فتح رہے گی۔ دل و عقل میں حق و باطل کی جنگ ہمیشہ ہوا کرتی ہے ہر ایک انسان رات دن اسی جنگ میں مصروف رہتا ہے۔ دل خراب باتوں کی طرف مائل کرتا ہے اور عقل اس کو ہدایت کرتی ہے اور روکتی ہے۔ دل کی پیروی باطل کی

پیروی ہے اور عقل کی پیروی صداقت کی پیروی ہے۔ یہی حق و باطل کی جنگ تھی جس کو حسین نے فتح کر لیا۔ ہم کو حسین نے اس طرح سکھایا کہ اگر ہم اپنی اندرونی خواہشوں کو زیر کر لیں گے اور اپنے نفس کو قابو میں کر لیں گے تو ہم کو حقیقی فتح حاصل ہو گی"

آخر میں شانتی نکیتن کے فلسفی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا نظریہ بھی سن لیجئے:۔

"حسین نے کیا سکھایا؟ یہ مادی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس وقت اپنا توازن کھو دیتی ہے جب اس کا رشتہ محبت کی دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں نہایت ارزاں اور فرومایہ چیزوں کی قیمت اپنی روح سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب مادیت کی مقید کر لینے والی دیواریں حیات کی آخری منزل ہونے کی دھمکیاں دیتی ہیں۔ جب یہ ہوتا ہے تو بڑے بڑے تنازعے، حاسدانہ فتنے اور مظالم اپنے لیے جگہ اور موقع تلاش کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ محدود ہیں۔ ہمیں اس خرابی کی دلگداز خبر ملتی ہے اور ہم ناقص صداقت کے محدود دائرہ ہی کے اندر توازن قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اس میں ہمیں ناکامیاں ہوتی ہیں۔ اس موقع پر صرف وہ ہماری مدد کرتا ہے جو اپنی حیات مستعار سے یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ ہم روح بھی رکھتے ہیں۔ وہ روح جس کا مسکن محبت کی بادشاہت میں ہے اور پھر جب ہم روحانی آزادی حاصل کر لیتے ہیں تو مادی اشیاء کی مصنوعی قیمتوں کا زور ہماری نگاہوں میں ختم ہو جاتا ہے"

⁂ (۲) ⁂

حقانیت اسلام کی تصدیق اور اشاعت

عہ "مذہبی عقائد ہمیشہ قوموں کی زندگی کا جزو اعظم رہے ہیں۔ تاریخی وحقائق

عہ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب۔

اور نظام حکومت و نظام تمدن مذہبی اصول سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ ہر مذہبی اصول کے ساتھ ایک نیا تمدن لازمی طور پر پیدا ہو جاتا ہے مذہبی خیال کی قوت اور مذہب کا اثر اخلاق پر جس قدر ہوتا ہے دوسری کسی چیز میں یہ قوت نہیں۔ ہر قوم کی سیاست، صنعت و حرفت اور اخلاق کی تاریخ اُس کے مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہے۔ مذہبی عقائد کا ادنیٰ تغیر قومی زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ صرف اسی وجہ سے کہ مذہب خوف سے نہیں بلکہ امید سے پیدا ہوا ہے اس لیے اُس کا اثر دائمی ہوتا ہے مذہب کی یہ اہمیت و تاثیر اس لیے ہے کہ اُس کی آبیاری ایثار اور قربانیوں سے ہوتی ہے۔ اگر مذہب کی راہ میں قربانی و ایثار کرنے والے نہ ہوں تو مذہب زندہ نہیں رہ سکتا اور جب مذہبی زندگی کا خاتمہ ہو جائے تو اُس کے پیدا کردہ آثار کا فقدان لازم ہے۔ مذہب کے واسطے جس قدر بڑی اور اہم قربانی ہوگی اُتنی ہی مذہبی پائداری اور استحکام و بقا کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

مذہب اسلام کو بھی ایک قربانی کی اہم ضرورت تھی جو مٹ رہا تھا۔ امام حسین کے سوا عالم میں وہ کون ہستی تھی جو اپنی قربانی سے مذہب اسلام کی حفاظت کرتا۔ امام حسین نے مذہب کی راہ میں ایسی اہم قربانی پیش کی جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔

دنیا میں آج تک جو قومیں اُبھریں اُن کا دارومدار صرف اُن خیالات پر تھا جن میں جذب کی قوت مضمر تھی۔ اور اُن میں جو قوم اُبھر کر بیٹھ گئی اُس کا سبب صرف ان ہی خیالات کی قوت کا زوال تھا۔

رسول کی پیدا کردہ قوت کشش مُردہ کر دی گئی تھی۔ یہ عہد رسالت کے تاریخی موازنہ سے معلوم ہوگا لہٰذا لازمی نتیجہ اس کا یہ تھا کہ پیدا شدہ خیالات کا زوال ہو جائے۔ مسلمان قوم اُبھر کر بیٹھ چکی تھی، روحانیت کھو کر مادیت کی پوجا رہی تھی حسین ہی کی وہ مقدس ہستی تھی اور اُن ہی کی وہ اہم شخصیت تھی جنھوں نے ایسی عظیم قربانی دے کر قومی خیالات کو بدلا اور اُن کے عقائد و اعمال میں انقلاب پیدا کرتے ہوئے ایسے کیفیات نفسانیہ پیدا کئے جن کی وجہ سے افراد و جماعات میں سعادتمندی

پیدا ہوتی ہے ———"

کسی مذہب کے عقیدت کیشوں میں عام افراد کا مصائب کو جھیل لینا یا اپنے تئیں قربانی کے لیے پیش کرنا کوئی ایسا مستند امر نہیں ہے اس لیے کہ عام افراد اکثر حقیقت حال سے بے خبر اور واقعی دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن میں بہت ممکن ہے کہ وہ سراب کو آب اور مجاز کو حقیقت خیال کر لیں اور اپنے مزعوم باطل کی حمایت میں جان دینے پر بھی تیار ہو جائیں لیکن خود بانی مذہب اور اُس کے مخصوص واقف کار افراد اور گھر والے لوگوں کا جو اُس کے اسرار زندگی اور رموز حیات اور معیار اخلاق و اوصاف سے پورے طور پر واقف ہیں اصُول کی حمایت میں استقلال و ثبات قدم کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور ضرورت کے وقت جان کی قربانی پیش کرنا بے شک اس بات کی دلیل ہوگا کہ اس اصُول میں سچائی اور اخلاص کا جوہر مضمر ہے۔

اسی لیے حضرت رسولؐ کا طرز عمل اپنی لڑائیوں میں بھی یہی تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کو میدان جنگ میں سب سے آگے رکھتے تھے جس کا تذکرہ حضرت علی نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے ان الفاظ میں کہ "جب خونریز جنگ کی صورت سامنے آتی تھی اور لوگوں کے قدم پیچھے ہٹتے تھے تو آپ اپنے گھرانے والوں کو آگے بڑھاتے تھے اور اُن کو اپنے اصحاب کے بچاؤ کا ذریعہ بناتے تھے نیزہ و شمشیر کی آنچ سے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عبیدۃ بن الحارث بن عبدالمطلب (رسول کے چچازاد بھائی) جنگ بدر میں (جو سب سے پہلی اسلام کی لڑائی ہے) قتل ہوئے اور حمزہ بن عبدالمطلب (حضرت کے چچا) احد میں مارے گئے اور جعفر بن ابی طالب (رسول کے دوسرے چچازاد بھائی جو حضرت علی کے حقیقی بھائی تھے) موتہ کے دن شہید ہوئے"

یہ طرز عمل حضرت کا بتلاتا ہے کہ اپنا مذہب حضرت کو کس درجہ عزیز تھا اور آپ اُس کے لیے کیسی قربانیاں پیش کرنے پر تیار تھے۔ آخر میں ضرورت پڑی ایک شہید کی جو کمال مظلومیت کا نمونہ ہو اُس کے لیے بھی رسول کا جگر بند حسین ہی آگے بڑھ گیا۔

یقیناً ع۵ "خود رسول حسین سے بہت زائد قربانی پیش کرسکتے تھے۔ لیکن وہ قربانی بجائے افادیت اسلام کو فنا کر دیتی اس لئے کہ اس کے نظام تمدن کے قیام کو کوئی عرصہ نہ گزرا تھا۔ اس کے علاوہ اگر رسول قتل ہوجاتے تو توریت کی پیشین گوئی پوری ہوجاتی کہ "جھوٹا نبی قتل ہو جاوے گا" لہذا حسین کی قربانی متمم و مکمل وجزو رسالت تھی جو اپنے وقت پر ہوی جس کی بے پناہ قوت نے قوم کے دلوں میں عقائد اسلامی کو منقش کردیا۔"

ع۲ "حسین نے دنیا کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے کھول دیں اور اُنھیں بتادیا کہ اسلام کی سچی تصویر خلیفہ کے شاندار دارالخلافت دمشق یا دریائے فرات کے کنارے مسلح فوجوں کے آئینہ میں نہیں دیکھی جاسکتی بلکہ میدان جنگ کے ان مٹھی بھر بھوکے اور پیاسے غازیوں کے قلوب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کربلا نے نہایت جلی نقوش کے ساتھ حضرت محمد مصطفےٰ کے لائے ہوئے اسلام کے پہلو بہ پہلو اُس جعلی مذہب کی تصویر دنیا کے سامنے پیش ہونے کا موقع دے دیا جو کہ اسلامی مذہب کے نام سے تجارت کا ذریعہ بنا ہوا تھا اور انسانی دماغوں، دلوں اور حافظوں سے حقیقی جوہروں کو سلب کئے لیتا تھا۔"

حسین کی قربانی کوئی خاموش قربانی نہ تھی بلکہ وہ عملی قربانی کے ساتھ ساتھ برابر اپنی زبان سے بھی حقیقت اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے اور اپنے کردار سے بھی احکام اسلام کی عظمت قائم کرتے رہے۔ اُنھوں نے کربلا میں تبلیغ حق کے پہلو کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا۔ وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر رستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت و غیرت کو خیرباد کہکر فرزند رسول کے قتل پر کمر باندھ لی تھی۔ اُن کا گمراہی سے باز آنا ممکن نہ تھا اور حسین اس بات سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کرے اور تبلیغ و دعوت میں کوتاہی نہ کرے اور اس فریضہ کو امام نے خوب ادا کیا۔

ع۵ علامہ ہندی ع۲ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

۹ محرم کو اُس وقت جبکہ خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسین اور اُن کی مختصر جماعت کے قتل کے لیے حملہ کر دیا گیا تھا تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ حسین نے اپنے بھائی کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی صرف اس لیے کہ آج رات بھر خدا کی عبادت کر لیں۔ شب اس طرح گزاری کہ لھم دوی کدوی النحل (یعنی) اس جماعت کی آوازیں ذکر الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔

اس طرح اُنھوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ اسلامی جذبہ عالم کے ہر جذبے سے زیادہ پرطاقت ہے۔

اس سے زیادہ سخت اور کٹھن وہ موقع تھا جب لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ حسینی مختصر لشکر کے بہت سے جوان قتل ہو چکے تھے اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بارش تھی اور کمانوں کے کڑکنے کی گرج لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر بجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امام رو بقبلہ اور مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو بہادر جاں نثار امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے اُسے اپنے اوپر روکیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے اُن دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبد اللہ حنفی زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے وہ مظاہرات اور اسلامی تعلیم کے وہ نمونے جنھوں نے دنیا کو دعوتِ حق کی پرزور آواز سے مملو کر دیا اور افراد اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہوا خواہانِ یزید کے ظالمانہ افعال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

کربلا کی جنگ میں تاریخ شاہد ہے کہ حسینی فوج کا ہر جوان ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریر ہمدانی کا مباہلہ، حبیب بن مظاہر کا مکالمہ، زہیر بن قین کا خطبہ اور تمام انصار و اقربا کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے

اسباب وعلل بیان کرنے میں ایک مبلّغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن ایک مبلّغ کی کامیابی یہ نہیں ہو کہ اُسکی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اُس کی کامیابی یہ ہی کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اُسے پورا کر دے یاد کیجئے وہ وقت جب حسینی فوج کے تمام جوان داد شجاعت دے کر رخصت ہو چکے، ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آگئے۔ صرف مظلوم حسین باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے۔ دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے، مگر وہ مبلغ الٰہی اپنے فریضہ سے ایک سکنڈ کے لیے غافل نہیں ہے۔ اُنھوں نے کوئی دقیقہ اظہار حق میں اُٹھا نہیں رکھا اور آخر نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔

اُس وقت بھی کہ جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفےٰ کے قریب آ چکا تھا اور امامت کا چراغ گُل ہو رہا تھا حسین نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کا فرض ادا کیا اور اپنے نانا کی حقانیت کو ثابت کر دکھایا "اے شمر ذرا اپنے چہرہ سے نقاب اُٹھا" شمر نے نقاب ہٹائی۔ حضرت نے فرمایا "میرے نانا رسول نے سچ کہا تھا کہ اے حسین تیرا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا"

روحی لک الفداء اے حسین بن علی آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیر خنجر بھی ثابت کر دی آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی سرزمین پر گر رہا تھا اسلام کی سچائی کا ایک دائمی نشان تھا۔

منشی پریم چند صاحب ورما لکھتے ہیں:۔

"معاہدوں کے استحکام کے لیے شہادت اور تحریر کی ضرورت ہوتی ہے اگر مُہر ثبت ہو جائے تو استحکام اور بھی مستحکم ہو جاتا ہی۔ حضرت حسین کی شہادت نے معاہدۂ حق کو اسلام کی روح میں داخل کر دیا ہے۔ اس معاہدہ پر حضرت حسین

کے خون پاک کی مہر ہے۔ پھر ضعف اور انحراف کی گنجائش کہاں۔ ممکن ہے حالات اور تغیرات کے زیر اثر کبھی کبھی یہ جذبۂ حق ضعیف ہوتا ہوا نظر آئے لیکن مٹ جانا ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے ایک ہنگامی رد عمل سے اسپر ایک دم ضعف پیدا ہو جائے، مگر اسکی جگہ فوراً ہی ایک نیا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہوتا ہے۔

ع۱ "امام حسینؑ کے اس عظیم الشان کارنامہ پر خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مذہبی زبان میں کتنا مختصر اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین	دین است حسین، دین پناہ است حسین
سر داد و نداد دست در دست یزید	حقا کہ بنائے لاالہ است حسین"

اسی بنا پر گاندھی جی کا بھی قول ہے کہ:-

"امام حسین نے اپنی اولاد نیز اپنے پورے خاندان کے لیے پیاس اور موت کی تکالیف قبول کر لیں مگر ظالم حکام کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی ترقی اُس کے ماننے والوں کی تلواروں کی بدولت نہیں ہوئی بلکہ اُس کے فقراء کی قربانیوں کی وجہ سے ہوئی"

سچ کہا ہے رزم ردولوی نے:-

تو اپنے خون پاک کے چھینٹوں سے اے حسین	انسان کی شرافت خفتہ جگا گیا
اسلام کی کشش کا نہ جن پر اثر ہوا	تو درد بن کے اُن کے دلوں میں سما گیا

۳

اخلاقی اور تمدنی تعلیمات

ع۲ "ہم جس ماحول میں سانسیں لیتے ہیں، جس تہذیب کی آغوش میں پلے ہیں یعنے جس مادیت کا ہمارے دل و دماغ پر پہرہ ہے اس کا اندازہ کرتے ہوئے مشکل ہے کہ ہم کسی ایسی تعلیم کی معنویت اور افادیت کا صحیح اندازہ کر سکیں جس کی بنیادیں ایثار، قربانی اور روحانیت پر رکھی گئی ہوں یا جن کی نیو انسانیت کی سرزمین میں انتہا تک ڈوبی ہوئی ہو——

ع۱ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی   ع۲ سید کلب مصطفٰے صاحب بی۔ اے وکیل لکھنؤ

انسان عام طور پر مادہ پرست ہے، جاہ طلب ہے، ظاہر پر گرویدہ ہوجاتا ہے باطن پر اس کی نظر کم جاتی ہے اور گئی بھی تو نگاہیں باطنی جلووں کی تاب نہ لاکر خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں حضرت امام حسین کے مخصوص اخلاقی تعلیمات کا نقش قائم ہونا آسان کام نہیں ہے۔

ان نقوش کے اُبھرنے کے لیے نہ اس سادہ بساط کی ضرورت ہے جہاں دنیا تج دی گئی ہو۔ نہ اُس پرکار ذہن کی جس میں دنیا ہی کو نصب العین سمجھا جاتا ہو۔ اس کے لیے تو ایسے منور صفحات درکار ہیں جہاں دنیاوی جدوجہد سے روحانی نتایج مرتب کرنا مطمح نظر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ گو امام حسین کا نام تو کافی روشن ہے لیکن اُن کے تعلیمات کا اثر پورے طور پر اُن لوگوں پر بھی نہیں ہے جو حسین کی یادگار منانے کے لیے مادی خزانوں کے لٹا دینے میں قطعی دریغ نہیں کرتے۔

آج کل جماعتوں کا دور دورہ ہے۔ ہر فرقہ ہر مذہب کی الگ الگ جماعتیں ہیں۔ مزدوروں کی جماعت الگ۔ سرمایہ داروں کی انجمن الگ۔ مسلمانوں کے مساجد الگ، ہندوؤں کے معابد الگ۔ اور ان سب کا مقصد اجتماعی طور پر اپنی اپنی جماعتوں کی فلاح و بہبود ہے لیکن انفرادی طور پر انسانوں کو بلند کرنے اور ان میں عزت نفس پیدا کرنے کا جذبہ یا تو پایا نہیں جاتا اور اگر پایا بھی جاتا ہے تو جماعتوں کی ہنگامہ پسندی میں گم ہو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جماعتوں سے کافی کام چلتا ہے لیکن وہ کام جو جماعتوں سے چلتے ہیں ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ ایک عالی شان عمارت کمزور بنیادوں پر کھڑی کر دی جائے۔ بے نیاز عمل افراد سے بنی ہوئی جماعت کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب ٹوٹ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن جماعتیں بنتی اور منتشر ہو جاتی ہیں پھر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں اور ہم اس انتشار اجتماعی کے وجوہ پر غور نہیں کرتے۔

اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ جماعتیں ظاہری طور پر زرا آسانی سے اور جلد قائم ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم جوہر انسانیت کو بروئے کار لانے کے مقابلہ میں مادّی مفاد کے حصُول کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ دوسری صورت ظاہرا زیادہ سہل الحصُول، دلفریب اور حسین بھی ہوتی ہے۔

خیر جب مادیت کا پردہ ہٹے گا اور انسانیت کی قدر دولت سے زیادہ ہونے لگے گی تو دنیا خواہ مخواہ باطنی صفات کی طرف قدم اُٹھائے گی اور اُس وقت سوائے ایسے کارناموں اور ایسے تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا جیسی حسین علیہ السلام کی زندگی کے ایک ایک لمحہ نے پیش کی اور جس کو بالآخر قربانی کی شکل اختیار کرنا پڑی اور جس کے نتیجہ میں اصلاح عالم کی مستقل درسگاہیں قائم ہو گئیں اور اخلاق، ایثار، صبر، خدمت خلق، حریت اور آزادی کی نئی شاہراہیں دنیا کے سامنے کھل گئیں۔

یہ ضرور ہے کہ مادیت کا اثر جلد زائل ہونے کا نہیں۔ پھر بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ آواز استغاثہ جو کربلا کی سرزمین پر بلند کی گئی تھی بلند تر ہوتی جائے گی اور صحیح معنوں میں نصرت کا مطالبہ پرزور ہوتا جائے گا جو درحقیقت اصُول اسلام کی پیروی کے لیے ایک صلائے عام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح ریڈیو کی آواز آتی تو ہے لیکن کچھ سُنتے ہیں، کچھ نہیں سُنتے۔ کسی کو مقدرت ہی نہیں ہوتی کہ سُنے کوئی اپنی دوسری معذوریوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے نہیں سُن سکتا۔ بلاتشبیہ اسی طرح حضرت امام حسین کی آواز اُسی قوت اور ارادہ کی حامل بنی ہوئی فضا میں گونج رہی ہے۔ کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ یہ اُس کا فعل ہے۔ بہرحال امام حسین علیہ السلام کے تعلیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے انفرادی تکمیل اور روحانیت کی کارفرمائی کو نظر میں رکھنا ازبس ضروری ہے۔

دنیا میں بعض واقعات افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ کربلا کی سرزمین پر حسین نے جو کچھ کیا ہے اور جس قدر واقعات رونما ہوئے۔ ان کے پس پشت اگر تاریخ

کے شواہد نہ ہوتے تو انسان آسانی سے ان کو باور نہ کرتا۔ اس لیے بھی ایثار، قربانی، صبر، شجاعت، رواداری، امن پسندی، اصول کی حفاظت، اور خداشناسی کے جو مظاہرے آج سے تیرہ سو[۱۳۰۰] برس اُدھر ہوئے ہیں ان کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ البتہ واقعات گنائے جاسکتے ہیں اور تاریخ کو شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے لیکن محض واقعات دُہرا دینے سے بھی اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے کہ حسین نے تمام انسانی اور اخلاقی صفات کو ایک دوسرے سے اس قدر مربوط کر دیا تھا کہ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ کس صفت کا اثر کیا ہوا اور اگر ان صفات میں سے ایک کا بھی مظاہرہ نہ ہوتا تو کربلا کا کارنامہ کس قدر نامکمل رہ جاتا۔۔۔۔۔۔"

عــ۵ "ہر زمانہ میں اور ہر جگہہ سیاسیین سے لے کر انبیاء تک ایسے لوگ ضرور گزرے ہیں جو کہ مختلف نوعیتوں سے بنی نوع انسان کے معلمین کہے جانے کے مستحق ہوسکتے ہیں لیکن حسین ایسا معلّم پانا دشوار ہے جس نے کہ اپنے ہر قول کو فعل اور ہر علم کو عمل کرکے دکھایا ہو اور جس نے اپنی ذات پر اتنے شدید مصائب اس لیے اٹھائے ہوں کہ انسانیت صحیح راستے سے گمراہ نہ ہو جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا واقعۂ کربلا انسانیت کی تعلیم دینے کے لیے ظہور پذیر ہوا اس لیے کہ اس المیہ ڈرامے میں ابتدا سے انتہا تک تعلیمات کا ایک سلسلہ ہے جس میں حق کے متجسس کو ہر قسم کے عمدہ خصائل انسانی کے مرقعے ملتے ہیں جو کہ ایک تاریک پس منظر رکھنے کی وجہ سے اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں"۔

ہر عمل میں کوئی ایک پہلو ہوتا ہے تعلیم کا۔ واقعۂ کربلا باوجود اپنی مختصر مدت کے تمام اہم تعلیمات کا مرکز تھا۔ ذیل میں کچھ عناوین کو درج کرکے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن سے آپ کو واقعۂ کربلا کی تعلیمی ہمہ گیری کا اندازہ ہو سکے گا۔

(حُرّیت)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مشہور رسالہ "الہلال" کے ایک افتتاحیہ

عــ۵ سید اشفاق حسین صاحب ایم اے بیرسٹر سیتاپور۔

میں لکھا ہے :-

"سب سے پہلے نمونہ جو یہ حادثۂ عظمیٰ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے دعوت الی الحق اور حق حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرتا ہے۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی۔ پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ اور جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو"

حقیقۃً ع۵ "اس حُریت کے ایک لفظ میں حریت نفس، حریت ضمیر اور نوعی حریت سب ہی کچھ شامل ہے اور امام حسین نے ہر قسم کی حریت کا مظاہرہ کیا ہے۔"

ع۵۲ "حسین نے چند نفوس کو آزاد کرانے اور بقیہ کو غلام بنانے کے لیے آزادی کی جنگ نہیں لڑی بلکہ اُن کی آزادی عالمگیر تھی۔ اُن کا فلسفۂ آزادی اخلاقی تھا نہ کہ جسمانی۔ حسین نے اُس آزادی کے حصول کی کوشش کی تھی جو کہ انسانی ضمیروں میں تقویت پیدا کرے اور بہیمی جذبات کو برانگیختہ نہ کرے۔ جو کہ انسانوں کو برائی کے بجائے اچھائی کی طرف لے جائے جو تنظیم کی تعلیم دے، نہ کہ افتراق کی۔ جس میں ضبط نفس کا عنصر موجود ہو، نہ کہ وہ عیش پرستی کی طرف مائل کر دے۔ جس کے خمیر میں قوت برداشت ہو، نہ کہ وہ ظلم و جبر کی حامی ہو۔

حسین یزید ایسے انسان کی بھی آزادی سلب نہ کرتے جب تک کہ اُس کے بُرے نتائج دوسروں کو نقصان نہ پہونچائیں اور اُن کے حقوق میں مخل نہ ہوں۔ وہ ایک معاویہ کو جس نے کہ بری زندگی بسر کی ہو برداشت کر سکتے تھے لیکن وہ ایک ایسے یزید کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے جو کہ اچھی زندگی کو نیست و نابود کر دینے ہی پر تلا ہو۔ یزید آزادی کے انتہائی حدود سے گزر گیا تھا اور اب خود آزادی

ع۵ سید کلب مصطفےٰ صاحب ع۵۲ سید اشفاق حسین صاحب۔

کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اس لیے اُسے روکنا حسین کا فرض تھا۔

اس معنی میں واقعۂ کربلا انسانی آزادی کی بلند ترین عمارت سمجھا جاتا ہے اور اسی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے حسین اور ان کے ہمراہیوں نے آزادی کے چراغ میں اپنا خون ڈال دیا تاکہ اُس کی لو تیز ہوتی رہے ——— "

عہ۵ " ایسے ظالم و جابر ماحول میں جبکہ کمزور فطرتیں دب کر مردہ ہوجاتی ہیں اور شیر دل انسان بھی ظلم کی آنچ سے پگھل کر اپنے ضمیر اور خودداری کو دوسرے کی ملکیت بنادیتے ہیں، حسین کی یہ تاریخی خصوصیت ہے کہ جس قدر ماحول ہیبتناک ہوتا گیا اُن کی ملکوتی طاقت اور اُبھرتی گئی ۔

حسین کی شہادت بزدلوں اور کم ہمتوں پر ایک طنز ہے، جن کے دلوں میں گندہ ماحول کے خلاف نفرت کی موجیں اُٹھتی ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں حسین نے انسانیت کے دبے ہوئے جذبات کو اُبھارنے کا سلیقہ سکھایا اور جھوٹے پروپیگنڈے عسکری تنظیم، مال وزر، رشوت و جاگیر اور مکر و فریب کو بے اثر بنادیا "

عہ۶ " افسوس ہے کہ ان صفات کے بڑھتے ہوئے عروج کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں جس سے معلوم کیا جاسکتا کہ ظرف حریت میں حسین کی شہادت سے قبل کے قطرے تھے اور حسین کے خون کے امتزاج کے ساتھ اس میں کس بلا کا جوش پیدا ہوگیا۔ ورنہ یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جاسکتا کہ دراصل حسین ہی نے سب سے پہلے حریت کی آواز اس بلند آہنگی کے ساتھ صحیح اندازہ اور درست نظریہ کے ماتحت بلند کی ورنہ یزید کے قصر کی دیواریں کیسے زمیں بوس ہوسکتی تھیں۔ پھر بھی پیمانہ تاریخ کے غائر مطالعہ سے اتنا تو معلوم ہو ہی سکتا ہے کہ حسین سے قبل حریت کی آواز صدا بصحرا سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ حسین کی قربانی نے اُسے صدا بہ عالم کردیا اور بتادیا کہ ضمیر اور حریت کی آواز کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے "

عہ۵ مولانا سید مجتبیٰ احسن صاحب کاموں پوری عہ۶ سید کلب مصطفےٰ صاحب

(استقلال)

سخت اور دشوار منزلوں کے سامنے آنے پر قدم میں لغزش نہ ہونا ثباتِ استقلال ہے اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اول ہے۔

کون نہیں جانتا کہ گفتار اور کردار دو مختلف چیزیں ہیں۔ کہنا آسان ہے لیکن عمل کرنا مشکل ہے۔

قریبی چند سال کے عرصہ میں بہت سی قوموں کی آزادی سلب ہوئی ہے۔ اُن میں سے کون وہ جماعت تھی جس نے جنگ کے شروع کے وقت یہ اعلان نہ کیا ہو کہ ہم آخری قطرۂ خون گرنے تک دشمن کی غلامی قبول نہیں کرینگے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ملک جو مفتوح ہوئے اُن میں کوئی بھی قابل فردِ جنگ باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہوتا یہی ہے کہ ان میں بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہتی ہے جو جنگ کرنے کے قابل سمجھی جاسکے مگر مشکلات کے سامنے مجبور رہونا پڑتا ہے۔

اس کے برخلاف اگر کربلا والوں پر نظر ڈالیئے تو آپ کو وہاں کا بچہ بچہ اپنے قول کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہوا دکھائی دے گا۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس فوج کے سردار اور اس کے ساتھیوں نے جو کہا اُس پر عمل کرکے دکھا دیا۔

حضرت امام حسین نے جب یہ فرمایا کہ "بیعت نہیں کروں گا" تو اُس وقت یہ حقیقت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا کیونکہ انسانی تخیل کے حدود اُن امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہونچ گئی۔

دنیا نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس "نہیں" میں کتنے مشکلات کا مقابلہ مضمر ہے لیکن وہ انسان جس وقت "نہیں" کی آواز بلند کر رہا تھا تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوتِ ارادی کا جائزہ لے کر اور وقت کی نزاکت پر غور کرکے یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ شدائد اپنے امکانات کی آخری حد تک پہونچ جائیں گے لیکن میرے عزم کو

نہیں بدلیں گے۔ وقت نے بتلایا کہ اس "نہیں" میں کیا وزن تھا۔

عـه "نام تو اُس مصیبت یا بلا کا یا سختی کا جس کے انتہائی تصرف کے بعد اُن میں کوئی ضعف یا اپنے ارادہ کے ترک کرنے یا بدلنے کا خیال تک پیدا ہوا ہو؟ ظلم کرنیوالے تھک گئے لیکن ظلم سہنے والا نہ تھکا۔ شدائد کی انتہا معلوم ہو سکی مگر حسین کے صبر و ثبات کی حد متعین نہ ہو سکی"

آپ کے اس قوت عزم کا اندازہ دشمن کو بھی تھا۔ یاد کیجئے اُس وقت کو جب شمر ابن زیاد کا خط لے کر نویں تاریخ محرم کو آیا کہ حسین سے غیر مشروط طور پر اطاعت کا اقرار لو یا جنگ کرو۔ اور عمر سعد نے خط دیکھا تو بغیر اس کے کہ امام حسین کے پاس جا کر اُن کو مضمون خط سے اطلاع دے اُس نے اپنی جگہ پر کہہ دیا کہ "حسین اس طرح سے اطاعت نہیں کرینگے وہ اپنے باپ کا دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں"

اُس کا خیال تھا۔ بعد میں سب نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے جو آرہے تھے اور اس کوہ عزم و استقلال سے ٹکرا کر وہ خود واپس چلے جاتے تھے۔ گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں حسین کی زبان تھی اور اُس پر یہ شعر جاری تھا کہ :۔

ان کان دین محمد لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی

"اگر میرے نانا کا دین اُس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ میری رگ حیات قطع نہ ہو جائے تو اے خون آشام تلوارو! آؤ یہ جسم حاضر ہے"

مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں "سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثۂ عظیم کی شان حال اُس کی ترجمانی کرتی ہے راہ مصائب اور جہاد حق میں صبر و استقامت اور عزم و ثبات ہے ؎

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ آنجا کہ لطمہ ہائے یداللہ می زنند

فی الحقیقۃ اس شہادت عظمیٰ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اپنے تمام عزیز و اقارب

عـه محمد صادق حسین صاحب بی اے (علیگ)

اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشتِ غربت و مصائب میں محصورِ اعدا ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدتِ عطش و جوع میں آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر انہیں ایک ایک کی خوں آلودہ لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا حتیٰ کہ اپنے طفلِ شیر خوار کو بھی ظلم و بربریت سے نخچیر پانا، مگر باایں ہمہ راہِ عشق و صداقت میں جو پیمانِ صبر و استقامت باندھا گیا تھا اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشر دقیقہ کے لیے بھی متزلزل نہ ہونا۔ آج بھی اگر گوشِ حقیقت نیوش باز ہو تو خاکِ کربلا کا ایک ایک ذرہ توجہ فرمائے صبر و استقامت ہے ؎

"شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما — تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد"

اُس وقت بھی کہ جب آس پاس کوئی موجود نہ رہا تھا۔ اصحاب و انصار سب شہید ہو چکے تھے۔ خود اُن پر حملے ہو رہے تھے اور زخموں سے چور چور تھے۔ اُس وقت بھی اُن کی ابرو پر شکن نہ تھی۔ خود فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ "خدا کی قسم میں نے کوئی دل شکستہ و زخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد، بھائی، اعزا و انصار سب قتل ہو گئے ہوں ایسا نہیں دیکھا جو حسین سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج ثابت قدم اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم اُن سے زیادہ کیا، میں نے اُن کے قبل اور ان کے بعد انکے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا (طبری ج ۶ صہ ۲۵۹)

جماعتی تنظیم

تنظیمِ اجتماعی ایک جمعیت کے وحدتِ خیال، وحدتِ قصد اور وحدتِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص اگر تنہا ایک خیال پر قائم بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اُسے ساتھی بھی ایسے مل جائیں جو بلا استثنا سب آخر تک اُس کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ پیرووں کا ثبات و استقلال ایک علیحدہ چیز ہی جو کسی انسان کی انتہائی عظمت کے بعد بھی ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہی ہو جائے۔

ہمارے سامنے ہیں انبیاء و مرسلین کے حالات۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ کے

بنی اسرائیل پر کتنے احسانات تھے، اُن کو مظالم سے چھڑایا، مصر کے ملک سے نجات دی، بیت المقدس کے فتح کرنے کے لیے تیار کیا مگر جب یہ لوگ عمل کی منزل کے سامنے پہونچے اور فلسطین کے قدآور آدمی دکھائی دیئے تو انھوں نے موسیٰ سے صاف کہدیا کہ "وہاں تو بڑے بڑے زبردست لوگ موجود ہیں۔ ہم ہرگز نہیں جائینگے جب تک کہ وہ خارج نہ ہو جائیں۔ ہاں جب وہ نکل جائیں گے تو پھر ہم اندر داخل ہوں گے" اس بڑے مجمع میں جو موسیٰ کے ساتھ تھا قرآن نے شمار کر کے بتایا ہے کہ کتنے آدمی تھے جو اپنی بات پر قائم رہے "صرف دو مخصوص آدمی وہ تھے جنھوں نے کہا کہ دروازہ میں داخل ہو جب تم داخل ہو گئے تو تمھیں فتح حاصل ہوگی اور خدا پر بھروسا کرو اگر ایمان رکھتے ہو" مگر دوسرے لوگوں نے کوئی اثر نہیں لیا اور نہایت دل شکن الفاظ میں کہا "ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، جب تک یہ اس میں موجود ہیں۔ ایسا ہی ہے تو آپ جائیے اور آپ کا پروردگار دونوں جا کر جنگ کر لیجیے۔ ہم یہاں بیٹھ کر تماشا دیکھینگے"

حضرت علیؑ کے شاگردوں کا تذکرہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ تھوڑے سے تو وہ لوگ ہی تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔ اُن میں بھی یہ عالم تھا کہ شاگردوں ہی میں سے ایک تھا جس نے اُن کے خلاف خبر رسانی کی اور اُن کو گرفتار کرا دیا۔

انجیل بتا رہی ہے کہ یسوع مسیح نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو میرے بارے میں ٹھوکر نہ کھائے۔ ایک بڑے مخصوص شاگرد پطرس نے کہا کہ اے میرے باپ سب ٹھوکر کھائیں۔ میں نہیں کھاؤں گا یسوع نے فرمایا کہ (صبح کو) مرغ کی بانگ ہونے سے پہلے تو تین مرتبہ میرا انکار کرے گا۔ انجام یہی ہوا کہ جب حضرت مسیح کو گرفتار کر کے لے چلے تو یہ شخص پیچھے پیچھے حالات دیکھنے کے لیے گیا۔ مخالف جماعت کو شک ہوا کہ یہ حضرت علیؑ کا آدمی ہے۔ پوچھا تم اُن کے طرفداروں میں سے ہو؟ کہا نہیں میں اُن کو نہیں جانتا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا اور تیسری مرتبہ اس کے ساتھ حضرت علیؑ کی شان میں کلمات ناز یبا بھی استعمال کیے۔ اس وقت مرغ کی اذان کی آواز آئی اور اس طرح مسیح کی پیشینگوئی

پوری ہوئی۔

ہمارے پیغمبر کی تاریخ زندگی بھی اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے بہت سے اس طرح کے مناظر کی تصویر قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ ایک معمولی سا واقعہ یہ ہے کہ ایک افسر کی ماتحتی میں جس کا نام عبد اللہ بن جبیر تھا پچاس آدمیوں کو درہ کوہ احد پر کھڑا کر دیا گیا تھا کہ چاہے ہمیں شکست ہو چاہے فتح، تم اس جگہ سے نہ ہٹنا مگر جب جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو باوجودیکہ افسر روکتا رہا مگر سوائے چند آدمیوں کے وہاں کوئی باقی نہ رہا اور سب مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہوگئے نتیجہ یہ ہوا کہ فتح شکست کی صورت میں تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کو سخت مصیبت سے دوچار ہونا پڑا

ایسے نمونے تاریخ میں بے شمار ہیں لیکن کربلا میں حضرت امام حسین کے ساتھ جو لوگ جمع ہوگئے تھے، ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس میں قول و عمل کے اختلاف کی جھلک بھی نظر آئے۔

عـ۱ "امام حسین کا ہر جوان و بچہ، زن و مرد ہم خیال و ہم آہنگ تھا۔ ان کا پختہ ارادہ تھا کہ بغیر سوکھے گلے کٹوائے نہ رہیں گے اور اس مہم میں کسی قسم کی کمزوری اور جھجک نہ آنے دیں گے۔ امام حسین نے بیعت یزید سے انکار کر دیا تو کوئی تاریخ نہیں بتاتی کہ ساتھیوں میں سے کسی نے اس ہیبت ناک وقت میں حسین کو اشارہ و کنایہ سے بھی یہ مشورہ دیا ہو کہ آپ بیعت کر کے جان بچا لیجئے بلکہ سب کی یکجہتی خیال سے یہ ثابت ہوا کہ کربلا والوں نے متحدہ طور پر یزید سے بیعت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا،،

عـ۲ "حسین کا خیمہ جو بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے قلعہ تھا اپنی نوعیت میں عدیم المثال تھا۔ یہ ایک ایسی جنگی قیامگاہ تھی جہاں سپاہیوں کو پوری آزادی تھی۔ جس کی تعلیم خود اختیاری تھی۔ ہر شخص آزاد تھا کہ چاہے وہ اس سے الگ ہو جائے یا اس میں داخل رہے۔ ہاں ایک بات اور بھی کہ جو اس میں داخل ہونا چاہتا تھا اسے ان خطرات اور مصائب سے متنبہ کر دیا جاتا تھا جن کا وہ بعد میں شکار ہوگا۔ جو

عـ۱ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب عـ۲ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

لوگ اپنی جان کی حفاظت کرنا چاہتے ہوں اور اُن شدائد و خطرات سے بچنا چاہتے ہوں اُن سے بخوشی چلے جانے کی التماس کی جاتی تھی۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود تقریباً ستر سے زیادہ ایسے افراد تھے جنھوں نے حسین کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

کیا تاریخ کسی دوسرے ایسے لیڈر کا پتہ دے سکتی ہے جس کی طرف لوگوں کی اتنی فطری عقیدتمندی ہو؟ کیا چشم عالم نے اتنے اہم اور نازک موقع پر ایسے وفاداروں اور بے نفس سپاہیوں کی فوج دیکھی ہے؟

حسین اسی وجہ سے فخر کرتے تھے کہ جیسے وفادار اور جان نثار میرے ساتھی ہیں ایسے کسی کے نہیں گزرے۔

حسین کے ہمراہیوں کی عقیدتمندی ویسی ہی فطری اور اختیاری تھی جیسی کہ وہ شدید اور غیر متزلزل تھی۔ وہ تکلیفوں کا مضحکہ اور موت کا استہزا کرتے تھے حبیب بن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ حسین کی جماعت میں تقریباً برابر کے بوڑھے اور آپس میں جگری دوست تھے۔ جب مسلم مہلک طور پر زخمی تھے اور حبیب اُن کی لاش پر پہونچے اور بجائے اس کے کہ اُن کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں اُن کی حسین پر جان قربان کرنے کی خوش قسمتی اور شرف پر مبارکباد دی تو مسلم مسکرائے اور حبیب کو وصیت کی کہ تم بھی یوں ہی اپنی جان نثار کر دینا۔

خوشی سے یہ جان نثار کرنے کا جذبہ مردوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ عورتوں میں بھی موجود تھا۔ جب ام وہب کے شوہر عبداللہ بن عمیر زخمی ہو کر گرے تو وہ بے حد خوش اور مفتخر نظر آتی تھی۔ وہ فوراً دوڑ کر شوہر کی لاش پر پہونچی اور اُن کی موت پر خوشی و محبت سے مبارکباد دی۔

جب جنادہ بن کعب مارے گئے تو اُن کی بیوی نے اپنے بچہ کو بھی حسین پر جان فدا کرنے کی ہمت و ترغیب دلائی۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

واقعۂ کربلا کی ایک اہم نوعیت اور بھی ہے۔ دوبدو جنگوں کے علاوہ جن کا رواج عرب میں تھا۔ دشمن متفقہ طور پر بھی حملہ کرتے تھے اور خیام حسینی کی طرف

تیروں کی بارش کی جا چکی تھی۔ باوجود اس کے یہ واقعہ ہے کہ حسینؑ کے انصار و اصحاب میں سے جب تک ایک بھی باقی رہا اُن کے کسی عزیز کو گزند نہیں پہونچا۔

جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ حسینؑ کے انصار و اصحاب سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھے جن میں سے تقریباً پچاس دشمن کے پہلے ہی حملہ سے دوپہر تک قتل ہو گئے تھے اور دشمن اتنی کثیر تعداد میں اور اتنے اسلحہ اور ہتھیار سے مسلح تھے تو ہمیں ان کی بہادری پر تعجب ہوتا ہے۔

کربلا میں حسینی فوج نے سچی اور جوشیلی وفاداری، غیر متزلزل ارادت مندی کی وہ تصویر پیش کی جس کی مثال ملنا غیر ممکن ہے۔ ایسی ارادت مندی اور وفاداری اگر صرف اعزا کرتے تو بھی لائق تحسین ہوتے لیکن چند نفوس کے علاوہ جن کو حسینؑ سے خونی تعلق تھا اور تمام لوگوں نے جو اتنی خوفناک تکلیفیں اُٹھائیں وہ زیادہ تر اس وجہ سے تھیں کہ وہ لوگ حسینؑ کے اس مقصد سے جس کے لئے حسینؑ ایسی عدیم المثال قربانی پیش کر رہے تھے خود بے حد عقیدت رکھتے تھے۔

وہ یزید کی علانیہ لامذہبیت اور بداطواری سے بے حد بیزار تھے اور صرف حسینؑ کی ذات کو اس شجاعت کے طوفان کے خلاف ایک پشتہ اور حصار سمجھتے تھے اسی وجہ سے حسینؑ کے اصحاب و انصار آخر وقت تک فداکاری و جاں نثاری میں ثابت قدم رہے اور یہی وجہ تھی کہ جب ان میں کوئی شہید ہوتا تھا تو لوگ اُسے مبارکباد دیتے تھے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہوا یعنی اس کی قربانی کی تکمیل گویا حق کی طاقت کی ایک فتح ہوتی تھی۔

حسینؑ کے جانبازوں کی راست کرداری اور جاں بازی نے درندوں کے خلاف انسانی کارنامہ کی تاریخ میں ایک نہیں بہت سے شاندار صفحوں کا اضافہ کر دیا۔ ان جاں بازوں کی قبروں پر حسینؑ کے دہن سے نکلے ہوئے فقرے جو کہ اُنھوں نے مسلم بن عوسجہ کے مرتے وقت کہے تھے موزوں ترین کتبہ ہو سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں سفر آخرت اختیار کرنے والوں میں سے بہت سے رخصت ہو چکے ہیں اور بہت سے

جانے کے منتظر ہیں لیکن ایک نے بھی معینہ راستے سے قدم نہیں ہٹائے (فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا) ـــ"۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد لکھتے ہیں :-

"ہزاروں ہزار مطمئن دشمنوں کے مقابلہ میں چند نفوس کو بھوک اور پیاس نے دل شکستہ نہیں کیا۔ انھیں شب کی عبادت نے سیر نہیں کیا۔ آخری مرتبہ کمربندی کے قبل اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مایوس نہیں ہوئے اپنے اعتقاد میں متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ ایک تالاب تھے جنھیں محیط زمین نے ہوا اور موجوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ اُن کے سکون میں تغیر لانے والی کوئی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی وہ ایک پہاڑ تھے جسے تیز اور تند ہوائیں متحرک نہیں کر سکیں۔ وہ تھے اور عبادت تھی عبادت تھی اور وہ تھے۔ کاش ابن مریم انھیں دیکھتے۔ کاش موسیٰ عمران ان کی زیارت کرتے۔ کاش داؤد ان کا مشاہدہ کرتے۔ کاش رشی گوتم غور کرتے کہ ان کی شانتی کا تصور اپنے درجہ میں اس سے کیا مناسبت رکھتا ہے۔ ان کے لیے کوئی خوف نہ تھا۔ اُن کے لیے کوئی آرزو نہ تھی۔ صرف اُن کے خاموش چہروں میں آنکھیں تھیں جو ادھر اُدھر پھرتی تھیں جدھر امام حرکت فرماتے تھے۔ دل میں ایک حرکت تھی کہ ہم کس طرح اپنے امام کی بہتر طریقہ سے حفاظت کر سکیں۔ اس کی فکر نہ تھی کہ ہم نہ رہیں گے۔ غم اس کا تھا کہ ہمارے بعد امام پر کون قربان ہو کر امام پر آنچ نہ آنے دے گا"

دنیا میں کوئی چھوٹا سا لشکر اس شان سے نہیں کھڑا ہوا جیسے حسین کے یہ چند بچے، جوان اور بوڑھے رفقاء کھڑے تھے۔ ہاں وہ زمین، وقت اور اتفاق پیدا نہیں ہوا جس میں اتنے لشکر کے مقابلہ میں باوجود شدید گرمی اور پیاس کی شدت کے کچھ لوگ اس طرح قلب مطمئن سے تیار اور منتظر ہوتے۔ شاید ہی کسی لشکر کو اپنی شکست اور سپاہی کو اپنے قتل کا ایسا یقین ہو جیسا حسین کے لشکر کو اور سپاہیوں کو تھا۔ اور شاید ہی کوئی لشکر اس یقین کے بعد اس استقلال، اس شان اور شہادت

کے شوق میں موت کا ایسا منتظر ہو اور اُن کی یہ بے خوفی، مصائب پر صبر و استقلال اور جان سے لاپروائی نہ ہوتی اگر وجہ ایسی عظیم نہ ہوتی اور شاید باوجود وجہ کے بھی دنیا کا یہ حیرت خیز واقعہ واقعہ کی صورت میں نہ آتا اگر مرکز ایسا نہ ہوتا جیسے حسین تھے "۔

ع۵ " انسانی صفات میں یوں تو غالباً ہر صفت متعدی ہے لیکن اپنے ارادہ کی مضبوطی دوسروں میں کس قدر عزم پیدا کر سکتی ہے اس کی حقیقت حسین پر روشن تھی جب دوسری طرف فوجوں پر فوجوں کا اضافہ ہو رہا ہو اور حسینی کو وہ عزم کو جنبش نہ ہو۔ رسد بند ہو جائے پھر بھی ارادوں میں تزلزل نہ ہو۔ تباہی کے مناظر روشن ہوتے جائیں اور نظریوں پر دھندلکا غالب نہ ہونے پائے تو پھر کیسے آس پاس والوں پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ کیسے ارادے مضبوط نہ ہو جائیں گے اور کیسے عزم بلند نہ ہو جائیں گے "۔

اصحاب حسینی اپنی حیثیت سے بے مثال تھے اور انہیں بے مثال سردار ملا تھا اس لیے اُن کی بے مثالی میں مکمل اضافہ ہو گیا تھا۔

(جوش عمل)

ع۵ " اسی عزم اور استقلال اور جماعتی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ شمع گل ہی اور مجمع میں کمی نہیں ہوتی۔ جدھر دیکھیے موت کے استقبال کی تیاریاں، جدھر نظر اٹھائیے ارادوں کو بروئے کار لانے کا جذبہ دل و دماغ پر مستولی۔ جس کو دیکھیے ان جذبات کا جلد از جلد مظاہرہ کرنے کے لیے بے چین اور مظاہرہ کا موقع مل جانے کے بعد تپتی زمین، دھوپ کی تیزی اور پیاس کی شدت کے باوجود ہوا کے گھوڑے پر سوار چلا جا رہا ہے۔ بچے قربانی کو کھیل سمجھتے، جوان اُسے ابدی عیش جانتے اور بوڑھے اُس کے حصول کو مقصد حیات بلکہ حیات جاودانی تصور کرتے۔ عورتیں اُسے اپنے بہترین جذبات کے اظہار کا ذریعہ قرار دے کر کسی قربانی سے بھی منھ نہ موڑتی تھیں۔

ع۵ سید کلب مصطفیٰ صاحب

(عزت نفس)

عزت[۱] نفس کے معنی ہیں خودداری یعنی اپنی عزت آپ رکھنا اور ذلت نفس کو کسی طرح قبول نہ کرنا حسینی حیات کا آخری دور یعنی ۶۰ھ تک خصوصیت سے وہ زمانہ تھا جس میں انسانیت اس بلند اخلاقی سیار سے بالکل پست ہو چکی تھی جس کی حسین کے نانا پیغمبر اسلام نے تکمیل کی تھی اور انتہائے معراج کمال پر پہونچایا تھا۔

تاریخ بغداد کے مصنف کے نزدیک اس وقت تک مسلمانوں میں پانچ سو سنتیں بدعتوں کی صورت میں تبدیل ہو چکی تھیں اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حسب تحقیق و تحریر محدث محمد بن اسمٰعیل بخاری ہر علم اسلامی کی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ کوئی عبادت اپنی اصلی صورت پر باقی نہ رہی تھی۔

مسلمانوں کا سردار اس وقت انتہائی پست انسان تھا اور ذلیل ترین حرکات کا مرتکب اور اشرف مخلوقات انسان جس کی شرافت نفس خدا کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت کرنے سے پست بلکہ مردہ ہو جاتی ہے۔ یزید کا بندۂ بے زر بنا ہوا تھا اصلاح نفس کی جگہ فسق و فجور نے لے لی تھی اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ حسین ایسے شریف النفس انسان سے بھی بیعت طلب کی جا رہی تھی حسینی خودداری کب اس کو گوارا کر سکتی تھی جبکہ اس میں صرف نفس حسین کی ذلت نہ تھی بلکہ دین اسلامی اور اس کے ساتھ پیغمبر اسلام کی صریح ذلت تھی۔

حسین خاموشی کے ساتھ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یہ کر سکتے تھے بلکہ کر رہے تھے کہ معاملات ملکی میں دخل نہ دیں اور سیاست وقت سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ فاقہ کشی میں دن گزاریں اور کوئی مالی حق طلب نہ کریں یہ سب کچھ کر سکتے تھے مگر ذلت نفس کبھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔ حسین نے اس ذلت سے بچنے اور انسانی شرافت کو پھر سے زندہ کرنے اور مسلمانوں کی ذہنیت کو بالکلیہ بدلنے کے لیے مظلومیت کی صورت

---

[۱] مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی (لدھیانہ)

سے شہادت اختیار کرکے انسان کو ذلت و عزت کے معنی سمجھائے جس کو مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت بھول چکی تھی۔ یعنی یہ کہ بے کسی، بے بسی اور مظلومی ذلت نہیں بلکہ عین عزت ہے جبکہ اسی مظلومیت سے نوع انسانی کی شرافت کا تحفظ ہوتا ہو اور ایک جان یا بہتر جانیں دے کر کروروں انسانوں کا قیامت تک ایمان بچاکر اُن کو ہلاکت ابدی سے نکال لیا جائے۔

اُسی وقت جب مدینہ میں والی مدینہ کو مروان نے مشورہ دیا ہی کہ ابھی حسین سے بیعت لےلو ورنہ قتل کردو۔ تو حسین نے اپنی شہامت نفس کا پورا ثبوت دیا اور فرمایا کہ جھوٹ بکتا ہی۔ تیری یا اس کی کیا مجال ہے کہ جو مجھ سے یوں بیعت کرائے یا مجھے اس طرح چپکے سے قتل کرادے۔

اور جب یزید نے خفیہ آدمی حاجیوں کے لباس میں بھیجے کہ حسین کو حرم کے اندر چپکے سے قتل کردیں تو آپ نے اس کو محسوس کرکے فوراً حج کو عمرہ سے تبدیل کیا۔ اور کوچ کی تیاری کردی اور اسی وقت اس کی تشریح کردی کہ بس آپ کے سامنے عزت و ذلت کا سوال ہے۔ فرماتے ہیں:۔

الا ان الدعی ابن الدعی قد رکزنی بین السلة والذلة هیهات هیهات ابی الله و رسوله وجدود طهرت و اصلاب طابت ان نوثر الذلة فینا من کان فینا باذلا بهجته موطنا علی لقاء الله نفسه فلیرحل معنا فانی مراحل مصبحا ان شاء الله۔

(یعنی) کم ظرف سلطان وقت نے مجھے موت اور ذلت کی درمیانی منزل پر ٹھہرا دیا ہے۔ حاشا کلا، خدا و رسول اور بزرگ مرتبہ و پاک آباؤ اجداد کا خون اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ہم ذلت کو قبول کریں تو جو شخص ہماری امداد کے سلسلہ میں جان دینے کے لیے تیار ہو اور خدائے پاک کی بارگاہ میں جانے پر آمادہ ہو وہ ہمارے ساتھ سفر کرے، میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔

اور کربلا میں آپ برابر یہی جواب دیتے تھے۔ واللہ لا اعطیکم بیدی

اعطاء الذلیل ولا افر فرار العبید " خدا کی قسم نہ تو ذلیل انسانوں کی طرح میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں بیعت کے لیے دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح ڈر کر اور چھپ کر بھاگوں گا کہ جان بچاؤں،

حسین نے عملاً نوع انسانی کو ظلم سے پرہیز کرنے اور ذلت سے اپنے نفس کو بچانے کا سبق دیا اور کہدیا اور کر دکھایا کہ:-

الموت خیر من رکوب العار والعار خیر من دخول النار

واللہ ما ھذا و ھذا جاری

(یعنی ننگ وعار اور ذلت نفس اختیار کرنے سے مرجانا بہتر ہے اور کافر وجہنمی بننے سے دنیا کی ذلت وخواری برداشت کر لینا آسان ہے اور خدا کی قسم ہمارے لیے یہ دونوں باتیں ممکن نہ ہوں گی - ہم نہ عار اختیار کرینگے اور نہ نار،

نتیجہ نے بتلادیا کہ اسباب کی عدم فراہمی، اصحاب کی قلت، وقت کی ناساعدت خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت حسین کے عزم واستقلال میں خلل انداز نہ ہوسکی آپ اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرماتے تھے:-

(کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق کی پیروی نہیں کی جاتی ہے اور لوگ باطل سے پرہیز نہیں کرتے - بس چاہیئے بندہ مومن لقائے الٰہی کا طالب ہو اور میری رائے میں نہیں ہے موت مگر ایک سعادت دائمی اور نہیں ہے ان ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنا مگر ایک دائمی ذلت، یہ شعر بھی آپ کی زبان پر جاری تھے۔

سامضی فما بالموت عار علی فتی اذا ما نوی خیرا وجاھد مسلما

وواسی الرجال الصالحین بنفسہ وفارق مذموما وخالف مجرما

اقدم نفسی لا ارید بقاءھا لتلقی خمیسا فی الھیاج عرمرما

فان عشت لم اندم وان مت لم الم کفیٰ بک ذلا ان تعیش وترغما

(میں ضرور جاؤں گا - مرنا جوان کے لیے عار نہیں ہے جبکہ نیت بخیر ہو مسلم بن کر جہاد کرے اور اپنی جان دے کر مردان خدا کی غمخواری کرے - قابل مذمت کام سے

دور رہے اور مجرم کا مخالف ہو میں اپنے نفس کو آگے بڑھاتا ہوں اور اس کی بقا نہیں چاہتا تاکہ وہ میدان جنگ میں لشکر کثیر کا مقابلہ کرے اس کے بعد اگر میں زندہ رہ گیا تو پشیمان نہیں ہوں گا اور اگر مر گیا تو کوئی مجھے ملامت نہ کر سکے گا۔ تیری ذلت کے لیے کافی ہے کہ تو (اے انسان) خواری کی زندگی بسر کرے ——— "

حقیقت یہ ہے کہ زندگی عزیز شے ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کی گئی ہے۔ انسان اسی کی خاطر سخت ترین دنیا کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے اور تمام ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کی بقا ممکن ہو صرف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو رد کرنے کی وجہ نہیں پائی بلکہ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو) کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس کو ایک لازمی فریضہ قرار دیا لیکن زمانہ کے لیل و نہار میں ایسے نازک مواقع بھی پیش آجایا کرتے ہیں جب جذبات میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھیں بند کر لینا پسند کرتا ہے اور وہ اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شے قربان کر دیتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

یہ صورت کبھی غیر عقلی، شہوانی، جاہلانہ، ناعاقبت اندیشانہ رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے۔ لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی اور زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو، جس وقت بقائے حیات اہم ترین مقاصد کے پامال ہو جانے پر موقوف ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے وقتی کا سوال درپیش ہو۔ جبکہ میزان عقل نے صورت حال کے مختلف پہلوؤں کو تول کر موت کو حیات پر ترجیح دے دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے حیات دائمی کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حسین بن علی نے کربلا میں جو رستہ اپنے لیے مقرر کر لیا تھا وہ اسی

اصول پر مبنی تھا۔ اُن کی زبان سے نکلی ہوئی مذکورۂ بالا لفظیں (الموت خیر من رکوب العار) "ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے" اگرچہ وسیع صحرائے کربلا میں گونج کر فنا ہوگئیں مگر اُن کا پائدار مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور دیباچۂ زندگی کا عنوان اوّل ہے۔

یہ مختصر لفظیں علوِ ہمت کی منادی اور عزت نفس کی ترجمان ہیں اور ان ہی کو حسین نے عملی صورت سے دنیا کو دکھلا دیا۔

یہ مقولہ ہر انسان کی زبان پر ہے اور نہ معلوم حضرت امام حسین سے پہلے کتنے لوگوں نے یہ الفاظ زبان پر جاری کیے ہوں گے کہ الموت فی عزٍ خیر من حیوٰۃ فی ذل (یعنی) "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"، مگر یاد رکھیے کہ ان الفاظ میں روح پیدا ہوگئی حسین کے عمل سے۔ اگر یہ الفاظ حسین سے پہلے کسی اور کے بھی تھے اور آپ نے بطور کہاوت کے کربلا میں کہے تھے تب بھی آپ نے عمل کر کے ان الفاظ کو اپنی ملکیت بنا لیا۔

حقیقت میں [عہ] "سنہ ۶۱ھ میں کربلا کے چند گھنٹے نوع انسانی کے لیے بہت ہی گرانقدر ثابت ہوئے، جن میں امام حسین نے معیاری زندگی کا ایک نیا نظام پیش کیا اور بتایا کہ انسانی زندگی اور مذہبی آئین میں عزتِ نفس کا درجہ کتنا بلند ہے حسینی نظام میں بزدلی، یاسیت، جمود اور فلسفیوں کی سی فکری و غیر عملی فرسودہ خیالی اور پراگندہ خوابی کے لیے جگہ نہیں ہے۔

حسینی نظام کمزور سے کمزور اور بالکل بے نوا انسان کو بھی ایک متحرک، فعال اور نڈر مخلوق بناتا ہے۔ کربلا کے پہلے بھی عزم و استقلال، شجاعت و بہادری، عشق آزادی، صبر و تحمل، ضبط نفس، استقامت، حلم و رضا، ہمدردی و ایثار، صداقت و شہامت، وفاداری و حق شناسی کے دھندلے نقوش دنیا کے دماغ میں بہت ہوں گے لیکن کربلا نے ان معانی کو اُجاگر کر دیا اور ان کے مفہوم میں وسعت پیدا کی اور عزتِ نفس

[عہ] مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری

کے لیے ایسی اونچی جگہ بنائی جہاں تک اس سے پہلے خیال کبھی نہیں پہونچا تھا۔

ماہرین تاریخ انقلاب امم اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ جب غیر صالح قوتیں مسلط ہوجاتی ہیں تو وہ "قہرمانی" کے نشہ میں چور ہو کر نہایت تمرد و انانیت سے دوسروں کے احساس اور جذبۂ عزت نفس کو روندتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنے سوا کسی کی مرضی کی قائل نہیں ہوتیں اور نہ کسی کو آزادانہ زندگی کا حقدار جانتی ہیں۔ جب سرکشی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو قدرت خود اپنے بے بس انسانوں کی دستگیری کرتی ہے اور اس عہد کے کسی ایسے انسان کو جو اس زمانہ کی بہیمانہ زندگی سے انتہائی آزردہ ہو انقلابات کی زلزلہ افگن طاقتیں دیتی ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا کو بدل دیتا ہے اور ان انسانوں میں عزت نفس اور خودداری کا خون دوڑا دیتا ہے جن سے عزت نفس کا احساس چھین لیا گیا تھا۔

حسین وہ تھے جنھوں نے آخری سانس تک شریف زندگی کی آن بان کو باقی رکھا عزت نفس و خودداری کا پُر اثر نغمہ سُنایا۔ حسین کی مٹھی بھر جماعت۔ اُدھر دشمن کی ٹڈی دل مسلح فوج۔ آفتاب کی جانسوز کرنیں۔ لو کے آتشگیر جھلے۔ پانی کا قحط۔ بچوں کی تپیدگی۔ یہ سب مصائب ہنسی خوشی جھیلے گئے۔ حسین کے قتل کے بعد آپ کے خیمے لوٹے گئے۔ آگ لگی۔ یتیموں اور بے وارثوں سیدانیوں کو اسیر کیا گیا۔ لاشیں پامال کی گئیں۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ناکام و ہزیمت نصیب حکومت اپنی پوری طاقت سے چند ننھے بچوں، جوانوں، بوڑھوں، یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے آزادی ضمیر پر قبضہ نہ کر سکی" ع۱ "اُس کی غلطی یہ تھی کہ اُس نے اس کا اندازہ نہ کیا کہ حسینی عزت نفس یزیدی خزانوں سے کس قدر زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین کا گھر لٹا، سارا کنبہ تباہ و برباد ہوا لیکن نفس کی عزت پر آنچ نہ آئی اور حسین نے مرتے دم تک وہی کہا جس کی تصدیق اُن کا ضمیر کرتا تھا۔" ع۲

"ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ حسین وہ ہیں جنھوں نے عربوں

ع۱ سید کلب مصطفےٰ صاحب ع۲ علامہ ہندی

سکے لیے یہ دستور قائم کر دیا کہ کوئی شخص ذلت نہ اٹھائے۔ چنانچہ بنی زبیر اور بنی مہلب وغیرہ نے اسی طریقہ پر عمل کیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ امام حسین نے جس بنا پر لوگوں کو حمیت کی تعلیم دی اور بتایا کہ موت تلواروں کے سایہ میں ہونا چاہیے یہ ہے کہ لوگ ذلت سے محفوظ رہیں چنانچہ جس وقت امام حسین اور اُن کے دوسرے ساتھیوں سے امان کا وعدہ کیا گیا تو ان لوگوں نے صرف اس لیے موت کو اختیار کیا تاکہ ابن زیاد کے ہاتھ سے انھیں کسی طرح کی بھی ذلت نہ پہونچے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ نقیب ابو زید یحییٰ بن زید علوی بصری نے مجھ سے کہا کہ ابو تمام کے یہ اشعار حضرت امام حسین ہی کے متعلق ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:-

"موت سے بچنا آسان تھا لیکن ان کی حمیت اور غیرت مندی اُس کو ان کی طرف واپس لائی۔ ان کی بزرگ طبیعت نے ظلم و ستم کو قطعاً گوارا نہیں کیا۔ گویا معرکۂ کارزار کے دن ظلم کفر تھا یا کفر اُس سے پیچھے تھا۔ انھوں نے موت کے سُرخ کپڑے پہن لیے اور شام ہوتے ہوتے وہ سُرخ کپڑے سبز ریشم کے ہو گئے۔ یعنی سُرخ خون میں شہادت ہوئی اور جنت میں پہونچ کر بہشتیوں کا لباس پہن لیا جو سبز ریشم کا ہوتا ہے۔"

⁂ (صبر) ⁂

یہ صفت تو حضرت امام حسین کے ساتھ ایسی مخصوص ہوئی کہ "سید الصابرین" (صبر کرنے والوں کے سردار) کا لقب حاصل ہو گیا۔ مصیبت کے ہنگامی طور پر آجانے کے بعد پھر اُس کو برداشت کر لینا تو ایک مجبوری کا سوال سمجھا جا سکتا ہی مگر کربلا میں تو مصیبتوں کا خود استقبال کیا جاتا تھا۔

حضرت امام حسین کا خود تلوار نہ اُٹھانا اور تمام ساتھیوں اور عزیزوں کو اپنے سامنے رخصت کرنا کیا تھا؟ (پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) یہ صرف قوت برداشت کا مکمل امتحان دینا تھا ——

یہی روح آپ کے تمام ساتھیوں میں کارفرما تھی ——

"وہ عابس کا کہنا اپنے غلام سے کہ "تمھارا کیا ارادہ ہے" اور شوذب کا جواب کہ "ارادہ یہی ہے کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزند رسول کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں" اور پھر عابس کا کہنا کہ "شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی ــــــ اچھا تو پھر بڑھو آگے اور امام پر جان نثار کرو تاکہ امام تمھاری مصیبت بھی اُسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی اور میں بھی تمھارے غم کو برداشت کرکے ثواب کا مستحق بنوں۔ یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے پاس ہوتا جس پر مجھے تم سے زیادہ اختیار ہوتا تو میری خوشی ہوتی کہ وہ میرے سامنے جائے تاکہ میں اُس کی مصیبت کو برداشت کروں کیونکہ آج تو دن ایسا ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اُتنا اجر و ثواب حاصل کرلے کیونکہ آج کے دن کے بعد پھر عمل کا دفتر ختم ہے اور حساب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (طبری ج ۶ ص ۲۵۴)

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینان کے موقع پر شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور سے اُن کا کہنا بہت مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصائب کے اُٹھانے کا ایک ولولہ ہے اور تکالیف کے برداشت کرنے کا جذبہ ہے جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہے۔

جناب ابوالفضل العباس کا قول اپنے بھائیوں سے کہ بڑھو آگے بڑھو تاکہ میں تمھیں اپنی آنکھ سے قتل ہوتے دیکھ لوں، وہ بھی اسی ولولہ اور جذبہ کا آئینہ بردار ہے اور خود حضرت امام حسین کا تو ذکر ہی کیا؟

عـ۵ "دنیا میں شاید کبھی ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان اور ایک عمل کے بعد دوسرا عمل اس قدر جلد وارد نہ کیا گیا ہو۔ مگر کربلا میں ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت وارد ہوئی۔ دوسری پر تیسری اور تیسری پر چوتھی یعنی ہر مصیبت ہر آنے والی مصیبت کا پیش خیمہ تھی۔ ان کی تعداد کتنی تھی؟ یہ ایک محیر العقول اور ناقابل ادراک واقعیت ہے اسی کے ساتھ یہ بھی اندازہ کرو کہ ایک مصیبت کے بعد

عـ۵ محمد صادق حسین صاحب بی اے

دوسری آفت کتنے فرق اور وقفہ سے نازل ہوتی تھی؟ مصیبتیں اتنی تھیں اور اتنی جلد جلد وارد ہوتی تھیں کہ اُن کی تعداد اور وقفہ کا محض خیال بھی دماغ کو معطل اور مختل کر دیگا مصائب کا شمار کر لیا جس قدر آسان ہے کاش ان کا احساس بھی اسی قدر آسان ہوتا اور احساس جس قدر سہل فرض کیا جا سکے کاش ان کا برداشت کرنا بھی اُتنا ہی آسان ہو سکتا!"

مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں :-

"حق و عدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر جان و ناموس اور فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں لیکن اسوۂ حسینی مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و ہمت کو اچھی طرح آزمائیں یہ نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر کھا جائیں۔ خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال و متاع، قتل نفس و اولاد یہی جہاں میں انسان کے لیے انتہائی مصیبتیں ہو سکتی ہیں۔ مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کر کے موجود تھے۔ وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پاکر آرام و راحت اور شوکت و عظمت حاصل کر سکتے تھے۔ پر اُنھوں نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی۔"

(شجاعت)

علمِ اخلاق میں طے پایا ہے کہ انسان کی تمام قوتوں کا معتدل ہونا تمام فضائل کا سنگ بنیاد ہے۔

یہ دنیا والوں کی نا سمجھی ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو جو محل بے محل جنگ پر آمادہ ہو جائے بہادر اور شجاع کہتے ہیں مگر شجاعت حقیقتہً یہ ہے کہ انسان کے لیے جس وقت قدم اُٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو اُس وقت پر جگری کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور وہ سب کچھ کرے جو اُس کا فرض معلوم ہوتا ہو چاہے اس سلسلہ میں اُسے جان بھی نذر کر دینا پڑے اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو

اُس وقت تحمل سے کام لے۔ چاہے اس میں کتنے ہی مشکلات درپیش ہوں اور ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔

اس صورت میں خاموشی اسی طرح شجاعت کا ثبوت ہوگی جس طرح پہلی صورت میں نبرد آزمائی دنیا والے عموماً ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ وہ کسی بات کے اصل اسباب پر غور نہیں کرتے حضرت امام حسین نے جس طرح اور جس موقع پر واقعۂ کربلا میں اپنی عظیم قربانی پیش کی اُس کی اہمیت اور عظمت کا احساس کرنے والے بہت کم ہیں مگر ہر شخص ہر موقع پر جوش پیدا کرنے کے لیے واقعۂ کربلا کی مثال ضرور پیش کرتا ہے۔ گویا ہر شخص اپنے وقت میں حسین ہے اور ہر موقع اُس کے لیے کربلا ہے مگر دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ محل کا تقاضا اور اسباب کی صورت مختلف ہوتی ہے۔

حسین بن علی کی شجاعت کا وہ صرف ایک رُخ ہے جسے کربلا پیش کرتی ہے اور اُس کا دوسرا پہلو وہ ہے جسے حضرت نے دس برس تک اپنے بھائی امام حسن کی صلح کا پابند رہ کر پہلے دکھلایا۔ اس دوران میں بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے مگر امام حسین نے انھیں برداشت کیا اور کسی طرح پُرسکون فضا میں اضطراب پیدا نہ کیا

ع۵ "یہ اخلاقی بہادری حیوانی جذبات سے الگ ہے جس میں انسانی قوت برداشت اور فرض شناسی کی رفعت مضمر ہے۔"

حسین جب جوان تھے تو اپنے باپ کے ساتھ بہادرانہ لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے جس شخص میں یہ بہادری اور ہمت ہو وہی شیر خدا علی کا بیٹا حسین ایک دوسرے موقع پر جب جوانی کا خون اُس کی رگوں میں دوڑ رہا ہو اپنے بزرگوں کے ساتھ بد سلوکی اور ظالمانہ برتاؤ دیکھے۔ اپنے بھائی کے جنازہ کی توہین دیکھے اور صبر و خاموشی کے ساتھ ضبط کرے اس کے باپ اور بھائی کو مسجدوں کے منبروں پر اور گلیوں میں علانیہ گالیاں دی جائیں اور وہ اپنے فطری غصہ کو محض اس وجہ سے قابو میں رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ذاتی جذبات جنگ و خونریزی کا

ع۵ سید اشتفاق حسین صاحب بیرسٹر

سبب بن جائیں۔

وہی حسین جن میں جوانی میں اس قدر صبر و تحمل تھا ضعیف العمری میں بھی اپنے دوستوں کی صف کے اندر کھڑے ہیں اُن کے دوست کہتے ہیں دشمن ابھی زیادہ نہیں ہیں۔ آپ دریا کے کنارے سے خیمے نہ ہٹائیں اور اس تپتی ہوئی ریت پر خیمے برپا نہ کیجئے۔ لیکن حسین نے اسے گوارا نہ کیا اور دریا کا کنارہ دشمنوں ہی کے حوالے کر دیا۔ حسین کا یہ شعار نہیں کہ وہ دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھائیں یا ذاتی مفاد اور جسمانی راحت کے لیے جنگ کر بیٹھیں۔"

بے شک جس وقت انھیں یہ فرض محسوس ہوا کہ وہ کھڑے ہوں اور باطل سے ٹکرا جائیں تو پھر پہاڑوں کا استحکام اُن کے استقلال تک نہیں پہونچتا تھا۔ وہ رخ اُن کی شجاعت کا بھی بے نظیر تھا اور یہ رُخ بھی وہ تھا جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی مگر چونکہ سکون سے حرکت زیادہ نمایاں چیز ہے اور نفی سے ثبوت نظروں کو متوجہ زیادہ کرتا ہے اس لیے عام نگاہوں میں شجاعت کا یہ ایجابی ہی پہلو زیادہ کھپتا ہے اور دنیا اُسے دیکھتی ہے تو حسینی شجاعت کا کلمہ پڑھنے لگتی ہے۔

صرف وہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھی بھی اس صفت میں بے نظیر نظر آتے ہیں۔

عـ٥ "ان لوگوں کی ہمت و بہادری کی مثالیں دینا بیکار ہے جن کے سارے اطوار بہادری کے سبق تھے اور جن کی ہر سانس دنیا کو بہادری کی ایک تازہ ہمت دلاتی تھی۔ ان لوگوں کی ہمت بتلانے کی ضرورت ہی کیا اور بیان بھی کون کر سکتا ہے۔ جنھوں نے سو سے زیادہ نہ ہونے پر بھی اپنے دو سو گنا سے زیادہ مسلح فوج کا مقابلہ کیا۔ اس مستحکم فوج کے مقابلہ کا ارادہ کسی معمولی جوش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ معصوم انسانوں کی مستقل اور مسلسل ہمت کا۔ بار بار اُن کو عزت کے ساتھ جنگ سے بچنے کا موقع ملتا رہا لیکن ہر مرتبہ وہ حسین کو نہ چھوڑنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے

عـ٥ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

ایسی خواہش جو حسین کو پوری طرح پہچاننے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔
حبیب بن مظاہر کے جوشیلے الفاظ سنو جو کہ پیرانہ سالی سے دوہرے ہو گئے لیکن مقابلہ کرنے میں اُن میں ایک سچے شہید کی ہمت اور خوشی کا جذبہ موجود تھا۔ حبیب نے زر پرست دشمن فوج سے کہا "تم ہم سے بہت زیادہ اسلحے اور تعداد میں بہت زیادہ ہو لیکن ہمارے اسلحہ وفاداری، بہادری، تسلیم و رضا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا مقصد سچا ہے اور اُس میں سچائی اور حق قوت ہی کی مُہریں ثبت ہیں،"
اسی طرح حسین کے اُن لافانی الفاظ کو کون بھول سکتا ہے جو کہ اُنھوں نے یزیدی سپہ سالار حُر سے گفتگو کرتے وقت کہے تھے۔ حر نے حسین کو کوفہ جانے سے روکا تھا اور دوستانہ مشورہ دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ یزید سے مقابلہ کرنے میں حسین کے لیے کیا مہلک نتائج پیش آئیں گے لیکن حسین نے اُس کی بات کا صرف یہ جواب دیا تھا کہ "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تمھارے بس میں اس سے زیادہ بھی کچھ ہے؟"
یقیناً موت اُن نتائج کے مقابلہ میں نہایت حقیر اور معمولی تھی جو کہ حسین جہاد کر کے حاصل کرنا چاہتے تھے۔
کربلا کی جنگ میں جو بڑے جگری کے مظاہرات سامنے آئے ہیں وہ انسان کے جسم پر رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے آج بھی کافی ہیں۔
یاد کیجیے ظہر کی نماز کو جس طرح ادا کی گئی ہے۔ امام اور اُن کے اصحاب مصلے پر نماز میں مصروف ہیں اور سعید بن عبداللہ حنفی سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جو تیر داہنی یا بائیں طرف سے آتا ہے اُسے اپنے جسم پر روکتے ہیں یہاں تک کہ زخموں سے چور ہوتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔
یا ظہر کے قبل کا وہ وقت جب حملۂ اولیٰ کے بعد پچاس آدمی فوج حسینی کے ایک ہی مرتبہ شہید ہو گئے اور اس سے لشکر مخالف کی ہمت بڑھ گئی۔ اُس کی کوشش تھی کہ اب دم کے دم میں یہ مہم سر ہو جائے مگر وہ حضرت امام حسین کی بے نظیر سیاست حرب اور اُس جماعت کی بے مثال شجاعت ہی تھی جو ہر حملہ کو ناکام بنا دیتی تھی۔ آخر جب

شمر نے مخصوص خیمۂ امام حسین پر حملہ کیا ہے اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا ہے کہ آگ لاؤ میں اس خیمہ کو اُس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں اور خیمہ سے ایک شور رونے کا بلند ہوا ہے تو صرف دس بہادر جاں باز تھے جنھیں لے کر زہیر بن قین آگے بڑھے اور شمر اور اُس کے ہمراہ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دُور ہٹا دیا اور دشمنوں کو ناکام واپس جانا پڑا۔

یا وہ منظر کہ عمرو بن قرظہ جنگ کرتے ہیں اور کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر امام کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں جو تیر آتا ہے اُسے اپنے اوپر روکتے ہیں اور جو وار ہوتا ہے خود سپر بن جاتے ہیں۔ آخر زخموں سے چور ہو گئے امام سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں فرزند رسول میں نے فرض کو ادا کیا" حضرت نے فرمایا "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے" بہادر جانباز زخموں کی کثرت سے زمین پر گرا اور جان بحق تسلیم ہوا۔

یا وہ عالم جب عابس تلوار کھینچے ہوئے فوج دشمن پر حملہ آور ہوئے ہیں اور بزدل دشمن کی فوج نے پتھروں کی بارش کر دی تو عابس نے زرہ اور خود و بکتر اتار کر پھینک دیا اور تلوار لیے فوج پر ٹوٹ پڑے۔

یقیناً ان میں سے ہر منظر شجاعت کا ایک یادگار مرقع ہے اور ان تمام سے زیادہ عظیم حسینی شجاعت کے کام میں لائے جانے کا وقت تھا جب ایک بے کس کمر خمیدہ اور دل شکستہ انسان کے سامنے سے ہزاروں آدمی بھاگتے نظر آتے تھے۔

ع۔ "ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ بنی ہاشم بنی امیہ سے بطور فخر کہتے تھے بتاؤ تم میں سے کون شخص امام حسین سے مقابلہ کر سکتا ہے جو اپنے بھائیوں اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر کس دلیری کے ساتھ شیر غرّاں کی طرح ساحل فرات پر اپنے دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور وہ لوگ ان کی بہادری کو دیکھ کر خواس باختہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور ایسے شخص سے کوئی کیا مقابلہ کر سکتا ہے جس نے

ع۔ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

بیعت کی ذلت گوارا نہ کرکے دشمنوں سے لڑکر جان دے دی اور اُن کے بیٹے بھائیوں نے بھی باوجود وعدۂ امان اپنی جانیں دے دیں۔

وولنٹن نے لکھا ہے حسین کی بہادری و شجاعت کی مثال شاید ہی دنیا کبھی پیش کرسکے۔ اقوام عالم کی تاریخ میں کبھی کوئی سورما ایسا نظر نہیں آیا جو ہزاروں سے یکہ و تنہا جنگ کرنے کے لیے برضا و رغبت تیار و آمادہ ہوگیا ہو۔

جس طرح سے تیز و تند آندھیوں کا زور پہاڑ سے ٹکرا کر ختم ہو جاتا ہے اسی طرح سے عرب کے خاندان ہاشمی میں حضرت علی ایسے بہادر کی شجاعت کے سامنے بڑے بڑے بہادروں کی بہادری کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

بے شک تاریخ علی ایسے بہادر پیدا نہ کرسکی لیکن حسین اُن کے چھوٹے فرزند نے جن کی مصیبت پر دنیا کے بڑے حصّے کے مسلمان آج تک روتے ہیں عاشورِ محرم کے دن وہ بہادری کے جوہر دکھائے کہ اُن کی بہادری ایک نہیں، کئی اعتبار سے حضرت علی کی بہادری سے بڑھ گئی تھی۔ دنیا میں کوئی بہادر ایسی بے سرو سامانی غم و الم کے ہجوم اور بھوک پیاس کی انتہائی تکلیف اور پھر اتنی کثیر فوج سے عرب کی چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں نہیں لڑا اور نہ لڑ سکتا ہے جس طرح سے حسین لڑے۔ یہ بات علاوہ بہادری و قوت کے کمال روحانیت کو ظاہر کرتی ہے کہ حسین اپنے مذہب مقصد کی سچائی میں کس قدر مضبوط ارادہ رکھتے تھے۔

حسین میں صبر و استقلال اور اخلاق کے وہ کمالات موجود تھے جو عام انسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس لیے حسین کی ذات بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ (لطف ساعت محمد کے ساتھ)۔"

(ایثار)

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے اس صفت کا بہترین اور مکمل نمونہ زمین کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا، ان میں سے

ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر اس طرح مقدم جان لیا تھا کہ وہ اپنے کو جیتے جی معدوم سمجھتے تھے۔ سعید کا امام کے مصلے کے سامنے سپر بن کر کھڑے ہونا اور تیروں کا اپنے سینہ پر روکنا نہ بھولنے والا ایثار کا مرقع ہے۔

کربلا میں ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا تھا۔ ہر ایک کے پیش نظر یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لیے سہی ہم دوسروں کو محفوظ رکھیں اور خود اپنی جان دے دیں انجام سب کے پیش نظر تھا۔ معلوم تھا کہ بچنے والا کوئی نہیں۔ مگر یہ تھا کہ جب تک ہم ہیں دوسروں پر آنچ نہ آئے۔

کربلا میں حسینی فوج کی صف بندی عجیب طرح تھی اور ترتیب جنگ عجب طرح قائم ہوئی تھی کہ ایسی خونریز لڑائی کے باوجود ایک ایک دفعہ میں پچاس اصحاب کام آگئے گھوڑے سب بے ہو گئے۔ میدان خون شہداء سے لالہ زار بن گیا اور شمع امامت کے پروانے آتش ظلم کی نذر ہو گئے مگر کوئی تیر، یا کوئی معمولی زخم بھی کسی ہاشمی جوان نوجوان یا بچہ کے آنا تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔

کیا امام حسین اور ہاشمی جوان میدان جنگ میں موجود نہ تھے۔ یہ کہنا واقعات کے خلاف ہے۔ پھر کیا تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ اصحاب حسین ایک طرف بہادرانہ مقابلہ کرتے اور اپنی جان دے رہے تھے اور دوسری طرف اپنے سرداروں اور آقازادوں کی کامیاب حفاظت کر رہے تھے۔

یہ فداکارانہ اور وفادارانہ عزم و ارادہ کی طاقت کے وہ نمایاں پہلو ہیں جن کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا ملنا ناممکن ہے۔ انھیں اپنا غم نہ تھا، اپنی فکر نہ تھی غم تھا اگر تو حسین کا، فکر تھی تو اُن کی تنہائی کی۔ سیف بن حارث اور مالک بن عبد دونوں بھائیوں کا وہ امام کے پاس آکر رونے لگنا اور امام کا فرمانا کیوں روتے ہو؟ اور اُن کا کہنا کہ ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آ رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم سے آپ کی حفاظت کا امکان نہیں رہا ہے، ان واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

یا بشر بن عمر حضرمی کو خبر پہونچتی ہے کہ اُن کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا ہے۔ امام بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو۔ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور وہ باوفا مجاہد کہتا ہے کہ مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

انفرادی نجات کے امکانات ٹھکرائے جا رہے تھے صرف حسین کے ساتھ حق وفاداری ادا کرنے کے لیے جناب ابوالفضل العباس اور اُن کے بھائیوں کو دو امان نامے پہونچے ایک عبداللہ بن ابی المحل کے ذریعہ سے جو اُن کی والدہ گرامی ام البنین کا بھتیجا تھا اور ایک شمر کے ذریعہ سے جو اسی خاندان سے تھا مگر دونوں رد کر دیے گئے۔ اپنے سامنے زندگی کی راہ صاف ہونے کے باوجود دوسرے کی خاطر موت کو اختیار کرنا کوئی معمولی ایثار کا مظاہرہ نہیں ہے۔

(مواسات)

سخت موقع پر دوسرے کو مبتلا پا کر خود شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔ کربلا میں حسین اور انصار حسین نے باہمی مواسات کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

امام کی مواسات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی جس میں امام نے اُن کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار اور عزیزوں کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام کی شہادت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ایک بے کس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اُس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

حسین صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور بے نظیر مثال قائم کر رہے تھے اور اصحاب کی مواسات امام کے ساتھ وہ اپنی نوع میں منفرد تھی۔ ع۵ وہ جناب نوح کا فرزند

ع۵ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

باپ کا ساتھ نہ دے سکا۔ برادران یوسف کی بے وفائی مشہور ہے۔ شاگردان جناب مسیح کے برتاؤ کا انجیل نوحہ پڑھ رہی ہے۔ گوتم بدھ "پتال پتر" میں دوستوں کے مجمع میں کس طرح رہتے تھے لیکن جب جنگل کی راہ لی تو کسی نے ساتھ نہ دیا بیوی تک نے ساتھ چھوڑ دیا۔ رامچندر جی اجودھیا کی راجدھانی میں دوستوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے لیکن بن باس میں بجز بیوی اور بھائی کے کون ساتھ تھا۔

اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ "ڈنکن" اپنے باوفا جنرل "سکتیہ" کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ بروٹس ایسے باوفا کے ہاتھوں قیصر اعظم کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ہزاروں تاریخی و مذہبی واقعات ہیں لیکن امام حسین طرح طرح سے اعزا و احباب کو جان بچا کر نکل جانے کا بار بار مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ پیکر وفا اپنی خداداد شجاعت کے نشہ سے چور، موت سے بے خوف جان دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُن کی شجاعت و بہادری و وفا کے کارناموں سے تاریخ پُر ہے۔"

(حُسن معاشرت)

دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اپنوں میں کس طرح مساوات مدنظر رکھنا چاہیئے اس کا بہترین سبق امام حسین نے دیا۔ پہلے کے واقعات کا تذکرہ جبکہ اطمینان کے لمحے اور سکون کے اوقات تھے اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ اُن حالات میں دوسرے بھی معاشرتی حقوق کا کچھ نہ کچھ لحاظ کر سکتے ہیں مگر عاشور کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا، اُس وقت حسین نے کس طرح حقوق کا لحاظ کیا ہے اور یہ خیال رکھا ہے کہ جانبداری اور کسی کے ساتھ مخصوص پاسداری نہ ہو یہ ایک عجیب مثال ہے۔ عزیز بھی تھے اور غیر بھی تھے مگر آپ کا طرز عمل سب کے ساتھ اپنے اپنے حدود میں مساویانہ تھا اور پھر حفظ مراتب کے ساتھ۔ یہی چیز مشکل ہے۔

جنگ کے میدان میں اور خیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ امام کے نفس کو کتنا

تعب اور کتنی مشقت برداشت کرنا ہوتی تھی مگر آپ کو سب کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ ضروری تھا جو مجاہد آتا تھا اور اجازت جہاد مانگتا تھا فوراً اُسے دیکھتے تھے، اجازت جہاد دیتے تھے جب تک وہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اُس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے، جب زخمی ہو کر گرتا تھا تو اس کی لاش پر جاتے تھے۔ اب اُس دھوپ اور گرمی اور تمازت آفتاب میں ہر شہید کی لاش پر جانا اور پھر واپس آنا کتنی سخت زحمت کا باعث تھا مگر امام کو تو دکھانا تھا کہ ایک سردار، ایک رئیس اور ایک افسر کو اپنے ساتھیوں، ماتحتوں یا سپاہیوں کے ساتھ کس طرح یگانگت اور مساوات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

اُن سخت اوقات میں جبکہ ایک انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہ سکتے یہ امام حسین ہی کا کام تھا کہ معاشرتی حقوق کی نگہداشت کامل طور پر ملحوظ رکھی۔

وہ بشر بن عمرو کو اُن کے فرزند کی خبر پہونچا جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور حضرت کا اُنھیں بلا کر فرمانا کہ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور اُس مجاہد کا وفادارانہ طور پر ساتھ چھوڑنے سے انکار کرنا۔ اس موقع پر جب اُنھوں نے جانے سے قطعی انکار کر دیا تو قدر دان امام نے اُن کو پانچ قیمتی کپڑے دیئے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی اور فرمایا کہ اچھا تم نہیں جاتے ہو تو اپنے فرزند محمد کو بھیجدو۔ وہ ان کپڑوں کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کرے

معمولی انسان فرائض کے پورا کرنے سے معمولی مجبوریوں کی اوٹ میں اپنے کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے امام حسین سے بڑھ کر ظاہری طور پر اُس وقت مجبور کون سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ اپنے وطن میں نہیں بلکہ سفر میں تھے۔ یہی مجبوری ایک انسان کی معذوری کے لیے کافی ہے۔ صورت واقعہ سے ظاہر ہے کہ آپ کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں تھا۔ یہ مجبوری بھی بالکل کافی ہے۔ پھر اُس وقت محصور بھی تھے بے آب و دانہ بھی تھے۔ موت کی منزل کے سامنے بھی تھے۔ اپنی اور تمام ساتھیوں کی جان کا معاملہ درپیش تھا۔ ایسی حالت میں اگر اس پریشانی پر جو اپنے ایک ساتھی

کے لیے درپیش ہوئی تھی، آپ اخلاقی طور پر صرف اظہار افسوس پر اکتفا کرتے تو اُن حالات کے لحاظ سے کوئی متنفس امام پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا مگر حسین اُس دن کمال انسانیت کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اُس وقت پر جب ہر شخص اُنھیں مجبور سمجھ رہا تھا، اُن ہوش رُبا پریشانیوں کے عالم میں خود اپنے امکان و اختیار کا جائزہ لیا اور جو ممکن صورت امداد کی نظر آئی اُس سے دریغ نہیں کیا۔

خود کربلا میں عین معرکۂ جنگ میں ساتھیوں اور عزیزوں نے مختلف طرح حسین سے امداد مانگی اور کوئی ایسا نہ تھا جسے آپ نے امداد نہ دی ہو۔

یاد کیجئے وہ موقع جب عمرو بن خالد صیداوی، مجمع بن عبداللہ اور جنادہ بن حارث وغیرہ پانچ بہادروں نے انصار امام حسین میں سے فوج میں گھس کر شمشیر زنی کرنا شروع کی ہی اور فوج نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر کر زخمی کر دیا — یہ دیکھنا تھا کہ امام حسین نے اپنے بھائی جناب عباس کو اُن کی امداد کے لیے بھیجا۔ آپ نے تن تنہا جا کر فوج پر حملہ کیا اور بہادروں کو دشمنوں کے حلقہ سے نکال لیا۔

یہ عباس وہی تو تھے جن کی زندگی امام کو اس قدر عزیز تھی کہ جب تک ایک مجاہد بھی موجود رہا عباس کو مرنے کی اجازت نہیں دی مگر ساتھیوں کی قدردانی ایسی تھی کہ دوستوں کی خاطر اُس اپنے عزیز بھائی کو فوج کے نرغہ میں بھیج دیا اور خطرہ کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

وہ بھی ایک طرح کی امداد ہی تھی جب عبداللہ بن عمیر میدان میں مصروف جہاد تھے اور اُن کی وفادار بیوی ام وہب گرز ہاتھ میں لیے میدان میں نکل آئی اور پکار کر کہنے لگی "ہاں میرے ماں باپ تم پر نثار نصرت اولاد رسول میں کوتاہی نہ ہو" — عبداللہ سے کچھ بن نہ پڑتا تھا کہ زوجہ کو کس طرح خیمہ میں واپس کرے۔ امام نے جو یہ دیکھا آواز دی کہ "اے مومنہ خیمہ میں واپس جا عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے"، حکم امام کا وہ نہیب تھا کہ فرض شناس خاتون

فوراً واپس ہوئی اور خیمہ میں واپس چلی گئی۔

اصحاب و اعزا میں زیادہ تر جو گھوڑے سے گرتا تھا یہی آواز دیتا تھا کہ یا اباعبد اللہ ادرکنی (یعنی) اے امام میری خبر لیجیے۔ اور آپ ہر ایک کی امداد کو اپنا فرض سمجھتے تھے کوشش یہ تھی کہ کسی کا سر اس کے تن سے جدا نہ ہو۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ امام کی زندگی میں سوائے ایک حبیب بن مظاہر کے جنھیں پکارنے کا موقع بھی نہ ملا اور کسی کا سر اس کے جسم سے جدا نہیں ہوا اور شاید اسی لیے کہ امام اپنے ایسے وفادار ساتھی کی اتنی امداد بھی نہ کر سکے جتنی وہ ہر ایک کی کرتے تھے۔ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ حبیب کی شہادت کے بعد ایک خاص شکستگی حسین کے چہرہ پر نظر آرہی تھی۔

شہدا کی لاشوں کا احترام بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ اصحاب کی شہادت میں تو ساتھی اکثر موجود ہوتے تھے، وہ لاش کی حفاظت کا سامان کر لیتے تھے مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو پھر زیادہ تر خود حسین کو ان کی لاشوں کے میدان سے اٹھوانے اور خیمہ تک لانے کا اہتمام کرنا پڑا۔ علی اکبر کے لیے کچھ جوانان بنی ہاشم کے ذمہ یہ خدمت کی گئی کہ اپنے بھائی کی لاش خیمہ تک پہونچاؤ۔ اور قاسم چونکہ مختلف وجوہ سے خاص خصوصیت رکھتے تھے تو ان کی لاش آپ نے خود اٹھائی اور دوسرے بنی ہاشم کی لاشوں کے پاس پہونچائی۔ پھر بھی یہ تمنا دل میں رہی کہ کاش آپ ان سب کو دفن بھی کر سکتے۔ اس لیے اگر وقت اتنی اجازت نہ بھی دے سکا کہ بڑی لاشوں کو دفن کر سکتے تو آپ نے اس فرض کو بھی تشنۂ عمل نہیں چھوڑا۔ کمسن شہید علی اصغر کی چھوٹی سی لاش کو آپ نے دفن بھی کر دیا۔ اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ اس سخت ترین ہنگامۂ مصائب میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایک فریضہ اخلاقی بھی آپ کی نظر سے اوجھل اور توجہ سے فراموش ہو۔ اگر کسی ایک پر عمل نہیں ہو سکا تو وہ مجبوری کا نتیجہ ہے۔ غفلت کا نہیں۔

(مساوات)

عـ۵ "مساوات اسلامی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔ قرآن میں ہے،

عـ۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

کہ بنی نوع انسان فرقہ و نسل میں صرف اس وجہ سے منقسم کر دیے گئے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو اور ایک دوسرے میں امتیاز کر سکو، نہ کہ تم ناجائز امتیازات اور خاص حقوق کو اُن کے مقابلہ میں روا رکھو۔

خود حضرت محمدؐ نے اس تعلیم کو اکثر موقعوں پر عملی صورت میں دکھا دیا ہے (جس پر کسی حد تک اسی حصۂ دوم کتاب کی تمہید میں تبصرہ کیا گیا ہے) اُن کے نہایت معزز اور عزیز صحابی جن سے دوسرے بہت حسد کرتے تھے بلال حبشی تھے جن کا چہرہ سیاہ لیکن روح صاف اور روشن تھی۔ حضرت محمدؐ کی بیٹی کے پاس فضہ کنیز تھی۔ نام کے لئے تو وہ کنیز تھی مگر گھر میں مالکہ کے ساتھ برابر کی حصہ دار تھی۔ آج کل مغربی ممالک میں ایک رسم سی ہوگئی ہے کہ وہاں لوگ کنیزوں کو "مددگار" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ قول بھی اتنا ہی مغالطہ انگیز ہے جیسا کہ جمہوریت ثابت کرنے کے لیے اور بہت سے غلط نام رکھ لیے گئے ہیں مگر تیرہ سو برس ہوے جب علی کے گھر میں فاطمہ گھر کی مالک اور فضہ کنیز گھر کے کام کاج میں حقیقی طور پر اُن کی صرف مددگار تھیں۔ وہ گھر میں اوروں کی طرح معزز سمجھی جاتی تھیں اور یہی صورت قنبر خادم کی بھی تھی۔ فضہ و قنبر کو بھی مساوی طور پر آرام و راحت پہونچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور اُن کے لباس یقیناً فاطمہ اور علی سے بہتر ہوتے تھے۔"

عے حسینی مساوات کی تعلیم گو اسلامی مساوات ہی سے ماخوذ تھی لیکن حسین نے جذبۂ مساوات کو ایک ایسے نئے قالب میں ڈھالا کہ جس کے نتیجہ میں اُن کے اعوان و انصار کے خون میں (مساوات کی شراب صالح سے) جوش پیدا ہوگیا۔ ان میں ولولے، امنگیں، خروش اور سرفروشی کے صفات بلند تر ہو گئے۔ نہ کیسے ہوتے جبکہ غلام ہو یا دوست، عزیز ہو یا لخت جگر سب کو یکساں طور پر خلوص اور محبت کے ساتھ جو مساوات کی جان ہے، اذن جنگ دیا جا رہا ہو۔ ہر ایک کی آواز طلب امداد پر بے قراری کے ساتھ میدان جنگ کا رُخ ہو۔ اپنے کو خطرہ میں ڈال کر بہ نفس نفیس ہر ایک کی لاش کو جا کر میدان جنگ سے لانے کا بند و بست ہوتا ہو مہا یہ

عے سید کلب مصطفےٰ صاحب وکیل لکھنؤ

وہ باتیں تھیں کہ ان کا مظاہرہ امن کے وقت میں دلوں کو گرما سکتا تھا لیکن حسین کے انداز اور طرز عمل اور کربلا کے گرم ماحول نے حرارت کو صرف گرمی میں منتقل کر دیا یہی نہیں بلکہ حسین کے گرد و پیش پھرنے والوں کے دلوں میں حسین کی عظمت بزرگی اور ان کے اصولوں کی صداقت کا نقش روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اُن میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی اور جذبۂ افتخار بھی کہ روز عاشورا وہ جو حسین کے رعب و جلال کی وجہ سے حسین کے سامنے تک نہ پہونچ سکتے تھے حسین کے دامن سے لپٹے پھرتے تھے حیثیت سے یہ قرب اُن میں ایک عجیب جذبہ کی تخلیق کر رہا تھا یعنی حسینی برتاؤ کے عوض میں اپنی جانیں نثار کر دینے کا جوش۔

ع۱ "اس معرکہ میں رسول کے خاندان والے تھے۔ وہ بھی تھے جنھیں رسول کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل تھا۔ حسین کے بچپنے کے دوست بھی تھے۔ بالکل بیرونی لوگ اور غلام بھی موجود تھے لیکن حسین نے انسانی حقوق میں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔

غلام جب اذن جنگ مانگتے تھے تو حسین کہتے تھے کہ بھائی تو اپنی جان کو ہماری وجہ سے کیوں خطرہ میں ڈالتا ہے لیکن غلام آزاد انسانوں کی طرح اپنی خودداری اور عزت نفس کا خیال کرتے ہوئے صاف انکار کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب آقا کی جان خطرہ میں ہے تو ہماری جان کی کیا وقعت ہے۔"

غلام ترکی زخمی ہو کر گرا تو امام حسین نے یہ قدر فرمائی کہ آپ سرہانے تشریف لائے اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنا رخسارہ اُس غلام کے رخسارہ پر رکھا۔ غلام نے آنکھ کھولی اور امام کی اس عزت افزائی کا مشاہدہ کیا تو لبوں پر مسکراہٹ آئی اور روح جسم سے مفارقت کر گئی۔

ع۲ "یہ مساوات یا اخوت ہی نہیں ہے بلکہ انسانیت ہے جس میں کہ مساوات اخوت اور آزادی سب ہی کچھ آجاتی ہے اور جس کی ڈینگیں تو سب مارتے ہیں۔

ع۱ سید اشفاق حسین صاحب

لیکن اس کے معنی تک خاک نہیں سمجھتے۔"

انسانی ہمدردی

دوستوں کے ساتھ مراعات و احسان کرنا ایک معتدل فطرت انسان کا خاصۂ مزاج ہے اور کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا اور اُن لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا جو اپنے سے جنگ پر تیار ہوں۔ اُن کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں۔ یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسین نے دیا۔

ہماری کتاب کے ناظرین کو کربلا کے راستے میں منزل شراف کا واقعہ یاد ہوگا ع ۵ "گرمی قیامت کا نمونہ دکھا رہی تھی۔ حُر کا رسالہ پیاس سے جاں بلب تھا اور اُس بیابان میں کوسوں پانی کا پتہ نہ تھا امام حسین کے ساتھ اُن کے اہل و عیال اعزا اور احباب کی ایک جماعت تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے مگر انسانی ہمدردی سے بےچین ہو کر آپ نے اپنے ساتھ کا پانی دشمن کی فوج کو پلا دیا۔"

کربلا میں بھی آخر وقت تک دشمنوں کی خیرخواہانہ نصیحت سے باز نہیں آئے۔

اصحاب بھی امام کے راستے کے سالک اور آپ کے قدم بقدم تھے۔ ہر ایک نے نصیحت و دعوت کے حق کو ادا کیا۔ زہیر بن القین کی تقریر اسی جذبۂ ہمدردی کی ترجمان تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:۔

"دیکھو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادر مسلم کو خیرخواہی کے ساتھ نصیحت کرے اور سچا مشورہ دے اور ہم تم ابھی تک بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی دین اور ایک ہی ملت پر ہیں جب تک ہمارے درمیان تلوار چلنے نہ لگے۔ اُس وقت تک تم اس کے مستحق ہو کہ ہم تم کو نصیحت کریں اور نیک صلاح دیں"

حقیقت میں حسین اپنے کسی دشمن کے بھی دشمن نہ تھے بلکہ دوست تھے یعنی چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح نجات کے راستے پر آجائے۔

ع ۵ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

(صاف بیانی)

دنیا کے سیاست اندیش اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں تو وہ اُن لوگوں کو جنھیں ساتھ لینا چاہتے ہیں طرح طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند توقعات پیدا کر کے اُنھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فتح و ظفر کی کہانیاں سُنائی جاتی ہیں۔ مال و دولت اور جاہ و ثروت کے خواب دکھلائے جاتے ہیں اس طرح لوگوں کو اپنے گرد مجتمع رکھا جاتا ہے، کون ہوگا جو اپنی کمزوریوں، مایوسیوں اور نا امیدیوں کو اُن اشخاص پر ظاہر کردے کہ جن سے اُسے کام لینا منظور ہے۔ چہ جائیکہ یہ کہنا کہ تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو ہمارے پاس سے چلے جاؤ اور ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری وجہ سے جان دو۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی سچائی، ایمان داری اور دیانت پر بڑا حرف آتا ہے اس سے کہ وہ دوسروں کو دھوکے میں مبتلا رکھے اور غلط توقعات قائم کر کے اپنے ساتھ شریک کرے یا کم از کم خاموش رہ کر اُن کو عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے امام حسین نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش رکھی کہ کوئی آپ کے ساتھ غلط فہمی سے مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بنا پر ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ آپ برابر حقیقت حال اور اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے اور اعلان فرماتے رہے کہ ہمارا آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اُس وقت جب آپ ابھی مدینۂ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے۔ اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوئے تھے۔ اور صرف اعزا تھے جو ہمراہی پر آمادہ تھے اس وقت آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابو سعید مقبری جو رجب ۶۰ھ میں یعنی اُس زمانہ میں جب امام حسین مدینۂ منورہ سے روانہ ہوئے ہیں وہاں موجود تھے ناقل ہیں کہ میں نے امام حسین

کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لیے جا رہے ہیں اور دو آدمی دو طرف سے آپ کے بازو تھامے ہوئے ہیں اور آپ ابن مفرغ شاعر کے اس قول کو بطور تمثیل پڑھ رہے ہیں:۔

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح مغیرا ولا دعیت یزیدا

یوم اعطی من المھابۃ ضیما والمنایا یرصدننی ان احیدا

آپ کی زبان سے اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا تھا کہ میرا نام حسین نہیں اگر موت کے خوف سے میں ذلت کو برداشت کروں اور اُس وقت کہ جب موت میری تاک میں ہو میں ہٹ جاؤں،

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور بعد میں بیان کیا کہ ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہہ دیا کہ بخدا ان شعروں کا پڑھنا رمز سے خالی نہیں اور کوئی نہ کوئی خاص مہم آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے بعد دو دن نہ گزرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے (طبری ج ۶ ص ۱۹۱)

اب وہ وقت آیا کہ آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہونے والے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آیند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں اس لیے کہ کوفہ عراق کا پایۂ تخت اور بڑا مرکز ہے۔ حضرت علی کا دار السلطنت بن چکا ہے اور لوگوں کی نظر میں علی اور اولاد علی کے دوستوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں سے بارہ سو خط بھی آ چکے ہیں کہ آپ آئیے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لیے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلم روانہ کیے جا چکے ہیں اور اُن کا بھی خط آ چکا ہے کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے۔ ان سب باتوں کے بعد امام حسین کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس سفر کے متعلق کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کیے جائیں گے اس لیے قدرۃً بہت سے لوگوں کو آپ کے ساتھ اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں

جا کر آپ کی سلطنت سے فائدہ اٹھائیں اور نیز چونکہ آپ ایک زرخیز زمین پر جا رہے ہیں اس لیے وہاں جا کر مالی منافع بھی حاصل کریں۔ اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لے جاتے تو ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوتی آپ کے ساتھ ہوتی۔ لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو واضح فرما دیں اور سب کو بتلا دیں کہ ان کے خوش آیند توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن قبل وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد کہا:

"موت اولاد آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں کتنا اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں؟ اتنا جتنا یعقوب یوسف کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میرے لیے بہتر ہے وہ جگہہ جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں گا۔ میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے۔ مجھ سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے۔ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ کوئی مفر نہیں ہے اُس دن سے جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو۔ اسی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اُس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسول خدا سے اُن کے جگر کے ٹکڑے دور تھوڑی ہو سکتے ہیں بلکہ وہ بارگاہ قدس میں جنت اعلیٰ میں اُن کے پاس جمع ہونے والے ہیں جن سے اُن کی آنکھیں خنک ہوں گی اور اُن کا وعدہ پورا ہوگا۔

جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو۔ وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

دیکھیے کن الفاظ میں لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جا رہی ہے! کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہوگا؟ کیا اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور طہارت ضمیر کا مظاہرہ ہوگا؟ اب ساتھ چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے پر تیار تھے۔ جو حقیقتہً استقلال اور ثابت قدمی رکھتے تھے

جن کو دنیا کی کوئی توقع اور راحت دنیا کا کوئی خیال اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ وہ مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا کے مال و دولت اور جاہ و حشم کو خاک سیاہ سمجھتے تھے۔ جو حقیقی زندگی کے طالب تھے اور اُسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

یہ تقریر مکہ معظمہ کی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کر دیا اور حقیقت حال واضح کر دی مگر مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستے کے اعراب، بادیہ نشین قبائل، بے خبر اشخاص امام کو دیکھتے ہیں کہ ایک جمعیت کے ساتھ ایک بڑے قافلہ کی صورت میں جا رہے ہیں۔ دریافت کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے عراق کا ارادہ ہے، وہاں سے طلبی ہوئی ہے۔ زیادہ تر جو سُنتا ہے اُسے خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ آنے والی جماعت مختصر تھی مگر راستے میں طرح طرح کے لوگ شریک ہونے لگے اور وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی حیثیت رکھتی تھی اب ایک لشکر کی صورت میں آ گئی۔

کوئی اور ہوتا تو اسی فوج کو غنیمت سمجھتا اور اس لشکر کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین اتفاق خیال کرتا۔ وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں گرویدہ رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے مگر امام حسینؑ نے عرصہ تک اس صورت حال کو برداشت نہ کیا جیسا کہ پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اُس وقت جب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے قتل ہونے کی خبر پہونچی اور عبداللہ بن یقطر جو آپ کے قاصد تھے اُن کے بھی شہید ہونے کی اطلاع آ گئی تو منزل زبالہ پر آپ نے قیام فرمایا اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں پڑھ کر سُنائی جس کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"ہمیں یہ دردناک خبر پہونچی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ اور

عبد اللہ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے اور وہ لوگ جو ہماری دوستی کا دعوے کرتے تھے انھوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورت حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اُس پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔"

یہ حضرت کی تقریر تھی جس کے بعد لوگ متفرق ہونے لگے اور کوئی داہنی طرف، کوئی بائیں طرف، اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی۔

اس طرح سے مجمع چھٹ گیا اور صرف وہی لوگ رہ گئے جو آپ کی مکہ معظمہ والی تقریر کو سن چکے تھے اور حقیقۃً موت پر آمادہ تھے۔

اس کے بعد کربلا پہنچ کر دسویں محرم کی شب کو جب کہ صلح کی گفتگو ختم ہو چکی تھی اور بس ایک رات کی مہلت مانگنے سے ملی تھی۔ اب مجمع بھی منتخب تھا اور موت کے پیغامات کئی بار سُن چکا تھا مگر حضرت نے چاہا کہ خطرہ کے بالکل سامنے آنے کے بعد بھی ساتھ والوں کو موقع دے دیا جائے۔ اور وہ یادگار خطبہ ارشاد فرمایا جس کا تذکرہ بڑی تفصیل سے آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اُس میں صاف طور سے کہہ دیا کہ کل کا دن ہمارا ان دشمنوں کے ساتھ تاریخی دن ہو گا۔ میں نے تمھارے متعلق غور کیا ہے اور میری رائے تمھارے لیے یہ ہے کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ اور میری اجازت ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔ کوئی تم پر میری طرف سے ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔ دیکھو یہ رات کا پردہ پڑ گیا ہے۔ اسے تم اپنے لیے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم خود بھی جاؤ اور اتنا اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے میرے ایک ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اُسے اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس کے بعد اپنے اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق ہو جاؤ تاوقتیکہ تمھیں کشائش ہو اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل ہو یہ لوگ تو صرف میرے طالب ہیں جب میں انھیں مل جاؤں گا اور مجھے قتل کر ڈالیں گے تو پھر انھیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہو گی

بس یہ آخری اتمام حجت تھی لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس کی کوئی فرد حقیقت حال سے بے خبر ہو کر ساتھ نہیں آئی تھی۔ کوئی ان میں سے کسی لالچ سے شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایک طرف اعزا رکھڑے ہو گئے اور پھر اصحاب اور سب نے واپس جانے سے انکار کیا۔

امام حسین نے اس طرز عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیے کسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے کبھی غلط توقعات قائم کر کے اپنی کاربراری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سدباب کر کے جو حقیقی جاں نثار ہیں بس اُن کی ہمدردی قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی اور فریب خوردگی سے فائدہ نہ اٹھائے۔

امن پسندی اور رواداری

عہ "حسین کا سب سے پہلا اصول، زندگی کے متعلق اسلام کا وہی مقدم اصول یعنی صلح آشتی تھا اُنھوں نے مدت العمر صلح اور امن قائم رہنے کی کوشش کی جتنی کہ اُن کے جسم اور روح میں امکانی طاقت تھی"

بے شک وہ کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کر سکتے تھے جس میں حمایت باطل کا پہلو پیدا ہوتا ہو۔ یہی سبق انھیں اپنے نانا، باپ اور بھائی سے مل چکا تھا۔

اُن کا نصب العین یہی رہا کہ میں حمایت باطل سے علیحدہ رہوں لیکن امن سوزی اور خوں ریزی کی ذمہ داری عائد نہ ہو۔ اسی لیے امام حسن کی صلح کے شرائط کو حکومت شام کی طرف سے پامال کیے جاتے دیکھ کر بھی آپ نے شروع میں وہی طرز عمل اختیار کیا جو ہر شائستہ اور پرامن جماعت کے اندر اس قسم کی غیر آئینی باتوں پر اختیار کیا جاتا ہے یعنی آپ نے ایک مکتوب کے ذریعہ سے جو امیر شام کو تحریر فرمایا تھا مذکورۂ بالا باتوں پر احتجاج کیا۔ یہ طولانی مکتوب اس کتاب میں پہلے درج کیا جا چکا ہے

عہ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

دس برس تک امام حسن کی وفات کے بعد بھی خاموشی کی زندگی بسر کی حالانکہ اس مدت میں کیسے صبر آزما مراحل پیش آئے۔

امام حسن کی وفات اور رسول کے روضہ میں دفن سے ممانعت۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔

حسین جن کی شجاعت، قوت اور ہمت وجرأت کا واقعۂ کربلا نے کلمہ پڑھوا دیا ہے اس موقع پر خاموش ہو رہتے ہیں، روضۂ رسول سے پلٹا لیتے ہیں اور بقیع میں دفن کر دیتے ہیں۔ یہ رواداری نہ تھی تو کیا تھی۔

بے شک ع۵ حسین اُس وقت تک مصالحانہ انداز رکھتے رہے جب تک کہ تکلیف بس اُنہی تک محدود تھی لیکن جب اُس کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور لوگوں پر جبر و تشدد کی نوبت پہونچی تو وہ اُسے کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جب دوسروں کو ستانے والی حکومت کے اس رویہ کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے تو انسانیت سکھانے والے اسلام کو کیونکر اپنی آنکھوں سے مٹتا دیکھ سکتے تھے جب حاکم شام نے سچے مسلمانوں کو تکلیف پہونچانا شروع کر دی تو صلح نے اپنی اہمیت کھودی اور اب اگر ظلم برداشت کیا جاتا تو وہ ظالم و جابر حکومت سے مرعوب ہو کر برداشت کیا جاتا لہٰذا یہ ضروری ہوگیا کہ اس قسم کی ظالمانہ اور خبیث حکومت کو یک لخت نیست و نابود کر دیا جائے لیکن اس ظلم و جبر کے خلاف محاذ قائم کرنے میں بھی حسین نے کسی لمحہ صلح کی کوشش سے اپنے کو باز نہیں رکھا۔"

پہلے تو یزید کی بالکل غیر آئینی خلافت کے سلسلہ میں امیر معاویہ نے جو صورتیں اختیار کیں، جلسے کئے۔ ممالک اسلامیہ میں وفود روانہ کئے، لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا مگر امام حسین کی طرف سے اس کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں ہوا مثلاً یہ کہ آپ اسلامی بلاد میں خطوط بھیجتے۔ احتجاجی جلسے کرتے، ثابت کرتے کہ یزید کی ولیعہدی غلط اور آئین کے خلاف ہے اور یہ کہ حق ہمارا ہے

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

اس طرح مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے۔ ایسا نہیں ہوا۔

آپ کا ابتدائی اور انتہائی اقدام ان موقعوں پر یہی انکار تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ آپ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہے تو یہ میرا انکار ہی حق پر سے پردہ ہٹانے کے لیے کافی ہے۔ اور اگر ان کی قوت شعور و امتیاز بالکل ختم ہی ہوگئی ہے تو کم از کم ہم تو تائید باطل کے ذمہ دار نہ ہوں گے ہمیں دنیا سے مطلب نہیں ہے وہ جسے چاہے خلیفہ اور بادشاہ بنائے اور تم کو جو کرنا ہے کرو مگر ہم سے مطلب نہ رکھو، ہم سے بیعت کے خواہاں نہ ہو ———— یہ اصول تھا جس پر امام حسین اول سے قائم تھے اور آخر تک قائم رہے۔ اور اسی لیے امیر معاویہ نے اپنی آزمودہ کاری اور جہاں دیدگی سے آپ کے خلاف کوئی سخت عملی قدم نہیں اُٹھایا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسین امن و امان کے حامی ہیں، جب تک ہم خود انھیں مجبور نہ کریں گے وہ امن پسندی سے علیحدہ نہ ہوں گے۔

لیکن اس کے بعد امیر معاویہ کا انتقال ہوگیا اور یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ باپ بیٹے میں زمین آسمان کا تفرقہ تھا۔

یزید حسین سے بجبر بیعت کا طالب ہوا اور مدینہ کے گورنر نے یہ بیعت کا مطالبہ حسین کے سامنے پیش کر دیا۔

یہ معلوم ہے کہ جب ایک بادشاہ دنیا سے جاتا ہے تو لوگوں میں خاص طور سے اضطراب ہوتا ہے اور نظام حکومت بھی انتہائی کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو چونکہ اس وقت مدینہ میں ولید کے پاس کوئی خاص فوج بھی موجود نہ تھی، ولید کو قتل کر دیتے اور مروان کا بھی کام تمام کر دیتے اور اس وقت سب دیکھتے کہ وقتی حیثیت سے مدینہ میں امام حسین کی سلطنت قائم ہو جاتی اور پھر آپ کو موقع ہوتا کہ اطراف و جوانب میں خطوط لکھ کر اپنے گرد ایک بڑا لشکر فراہم کریں مگر اس صورت میں ایک طویل سلسلۂ حرب و ضرب

کے آغاز کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی جس کا نتیجہ بھی بہرحال مشکوک تھا۔ عہ۹ در اُنھوں نے اسی خونریزی کو بچانے کے لیے اپنے وطن مدینہ کو خیرباد کہا"

کہاں تشریف لے گئے؟ مکہ معظمہ۔ یہاں آپ کا جانا اس بات کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا کہ آپ کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنی زندگی کو خطرہ سے محفوظ کریں اور باطل کی حمایت سے الگ رہ کر زندہ رہیں۔ اسلیے کہ مکہ معظمہ لڑائی کی جگہ نہیں۔ پناہ کی جگہ ہے۔ مکہ معظمہ وہ جگہ ہے جس کو (امامن الناس) تمام انسانوں کے لیے محل امن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں آنے کے بعد دنیا کی کوئی تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے کچھ خطوط لکھے ہوں۔ کچھ لوگوں کو مکہ معظمہ کے اندر اپنی طرف دعوت دی ہو یا کچھ لوگوں کو باہر سے بلایا ہو اور لشکر کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ سے جو نسبت آپ کو تھی اور مکہ والوں کو جتنی آپ کی ہستی عزیز ہو سکتی تھی اتنی عبداللہ بن زبیر کی نہیں تھی۔ چنانچہ تاریخ بتلاتی ہے کہ امام حسین کے مکہ میں وارد ہونے سے پہلے لوگ عبداللہ بن زبیر کے گرد جمع ہو کر بیٹھا کرتے تھے لیکن جب سے آپ تشریف لائے تمام لوگوں نے عبداللہ کو چھوڑ دیا اور امام کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ پھر جب عبداللہ کے لیے مکہ میں یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنا ایک مضبوط جنگی محاذ قائم کرلیں اور ایک عرصہ تک حکومت شام سے برسر پیکار رہیں تو امام حسین کے لیے یہ نا ممکن کیسے ہو سکتا تھا؟ مگر آپ نے مکہ معظمہ میں خاموشی کے ساتھ قیام کر کے عملی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں چاہتے ہیں کہ دنیا میں سکون رہے مگر ہم بھی اپنے اُس حق کے ساتھ جس پر اب ہیں قائم رہیں

عہ۷ سید اشفاق حسین صاحب

امن وامان بھی ہو اور باطل کی حمایت بھی نہ ہونے پائے۔

عراق والوں کو خبر معلوم ہوئی کہ امام حسین نے اس طرح بیعت سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے خطوط لکھنا شروع کئے جن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچی ان خطوط میں سے بعض میں یہ بھی درج تھا کہ اگر آپ آجائیں تو ہم نعمان کو باہر نکال دیں اور آپ کو حاکم بنا دیں مگر امام حسین نے ان خطوط کے جواب میں جو کچھ لکھا اُس میں یہ تاریخی فقرات بھی درج کئے کہ امام کے معنی صرف یہ ہیں کہ کتاب خدا پر عامل ہو۔ انصاف کا پابند ہو۔ حق کو اپنا اصول زندگی رکھے اور اپنی ذات کو خدا کی خوشنودی کے لیے وقف رکھے۔"

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں جو آرہا ہوں وہ اس لیے کہ کسی کے خلاف تلوار اُٹھاؤں یا تخت سلطنت پر قبضہ کر لوں بلکہ مجھے ہدایت خلق منظور ہے اور کتاب الٰہی وسنت رسالت پناہی کا اجرار مقصود ہے۔

خط میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ ہمارے سفیر کے پہونچتے ہی کوفہ کے حاکم کو باہر نکال دینا اور ہمارے فرستادہ کو نظم حکومت سپرد کر دینا۔ اُس وقت میرے آنے کی امید کرنا۔

اسی لیے حضرت مسلم نے بھی جو آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے معتمد خاص و قابل اعتبار تھے اور آپ کی ہدایت سے یک سرمو انحراف کرنے والے نہ تھے اپنے عمل سے اسی کا ثبوت دیا۔

وہ علی کا بھتیجا اور حسین کا سفیر تھا جو فقیرانہ لباس میں بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تزک و احتشام کے کوفہ میں داخل ہو گیا۔ نعمان بن بشیر دارالامارہ کے اندر تخت و تاج کا مالک اور حضرت مسلم کو اس سے نہ کوئی مطلب نہ تعرض۔ آپ جاتے ہیں اور ایک معمولی زمیندار مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہو جاتے ہیں۔ وہاں اجتماع ہوتا ہے تو امام کا خط پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور بس۔ لوگ امام کی اطاعت و وفا کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور آپ اُن سے بیعت لیتے ہیں

یہ بیعت اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کوئی بغاوت برپا کرنا چاہتے تھے یا کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر رہے تھے بلکہ یہ صرف اس اقرار داد کی پہچان تھی کہ ہم حضرت امام حسین کی پیروی اور اتباع پر آمادہ ہیں اور حضرت کی حمایت و حفاظت میں بجان و دل کوشاں رہیں گے۔ اسی لیے جب اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی تھی تب بھی انھوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پھر بھی وہ انہی مختار کے گھر میں مقیم رہے اور نعمان بن بشیر کو اسی طرح تخت حکومت پر رہنے دیا۔ خود نعمان کو اس کا احساس تھا کہ جناب مسلم کا طرز عمل معاندانہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب لوگوں نے کہا کہ مسلم بیعت لے رہے ہیں اور تم خاموش بیٹھے ہو تو نعمان نے جواب دیا ہم میں بس اس شخص سے جنگ پر تیار ہوں جو مجھ سے جنگ کرے اور اسی پر حملہ کر سکتا ہوں جو مجھ پر حملہ کرے مگر میں بدگمانیوں پر عمل نہیں کرتا۔ (الاخبار الطوال ص۲۳۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعمان بھی اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ مسلم کوئی باغیانہ قدم نہیں اٹھا رہے ہیں

اس کے بعد ان اسباب کی بنا پر جن کا تذکرہ اپنے محل پر ہو چکا ہے۔ نعمان بن بشیر کو معزول کیا گیا اور عبید اللہ بن زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا اور یہ امن و صلح پسند خاموش و گوشہ گیر مسافر (مسلم بن عقیل) کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

ابھی مسلم کا انجام معلوم نہیں ہونے پایا تھا کہ امام حسین نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی۔ اس فوری اور بظاہر بے موقع روانگی ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حسین کو اپنے لیے خطرہ کتنا نزدیک نظر آ رہا تھا۔ جس شخص کو عبادت الٰہی کا اتنا شوق ہو کہ مرتے مرتے عبادت کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی ہو وہ حج کے عین موقع پر حج کو ترک کر دے۔ یقیناً آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ اگر آپ مکہ معظمہ میں قیام کریں تو بہت جلد آپ پر حملہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہیں تحفظی تدابیر اختیار کیے جائیں مگر اس میں تصادم کے امکانات بہت

قریب تھے۔ لہٰذا جس طرح مدینہ سے نکل کر آپ نے ثابت کر دیا تھا کہ مجھے جنگ کرنا منظور نہیں ہے، اُسی طرح ع۵ "قیام مکہ کو سالانہ حج سے صرف ایک دن پہلے جبکہ مسلمان تمام خطوں سے حج کے لیے جمع ہو رہے تھے ترک کیا"

امام حسین کوفہ روانہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی تیاری کی ہے؟ سامان جنگ ساتھ لیا ہے؟ نہیں بلکہ اس کے خلاف ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورتیں اور بچے آپ کے ساتھ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پرامن رہنا چاہتے ہیں۔ جنگ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سوکمار بنرجی (لکھنؤ یونیورسٹی) لکھتے ہیں "حسین نے اس سے قبل کوفیوں سے کبھی بھی سلسلہ رسل و رسائل نہیں رکھا تھا اس لیے اُنھیں کسی طرح سے خلیفہ وقت کے خلاف کوفیوں سے مل کر سازش کا ملزم قرار نہیں دے سکتے۔ تقریباً گزشتہ انیس[19] برس تک یا اس سے زیادہ اُنھوں نے عرب کے مختلف خطوں میں عزلت نشینی کی زندگی بسر کی تھی۔ وہ کوفہ محض حفاظت خود اختیاری کے ماتحت گئے تھے اس لیے اگر وہ خلیفہ وقت کا مقابلہ ہی کرنا چاہتے تو اُن کے لیے موزوں ترین جگہ خود مکہ ہی تھی جہاں کہ اُن کے باپ، نانا اور ماں کی امتیازی خصوصیت اور خود اُن کی مقدس زندگی بہت متبعین کو اکٹھا کر سکتی تھی حسین کے ایسے صلح پسند انسان نے ان تمام زحمتوں سے بچنے کے لیے مشرق بعید کا رُخ کیا تھا۔"

اسی لیے جب کوفہ کے راستے میں بھی خوں ریزی کے آثار معلوم ہوئے اور حُر کا لشکر آتا نظر آیا تو آپ نے راستہ بدل دیا اور داہنی طرف کا رُخ کر کے ذوحسم پہاڑ کے دامن میں جا کر قیام کیا۔ مگر یہ آنے والی فوج خود تشدد پر آمادہ اور صلح پسندی سے علٰحدہ تھی۔ اس لیے جدھر آپ کو متوجہ دیکھا اُس طرف یہ لشکر بھی متوجہ ہو گیا۔ ان واقعات کا تفصیل سے ذکر کرنا مقصود نہیں ہے وہ پہلے آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ صرف جہاں تک کہ رواداری اور صلح پسندی

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

کے ثبوت سے متعلق ہیں اجمالاً یہاں ذکر کیے جا رہے ہیں

حضرت کا سب سے پہلے فوج حر کو سیراب کر دینا بھی بڑا ثبوت اس کا تھا کہ آپ خود جنگجوئی کے طریقوں پر عمل نہیں کرتے۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت امام حسین نے تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا:۔

"میں نے اس وقت تک تمہاری جانب آنے کا خیال نہیں کیا جب تک کہ تمہارے خطوط اور قاصد میرے پاس نہیں پہونچے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے آپ آئیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔ اب اگر تم اس بات پر قائم ہو تو مجھ سے عہد و پیمان کرو اور میں تمہارے ساتھ کوفہ چلنے پر تیار ہوں اور اگر تمھیں یہ منظور نہیں ہے اور میرا آنا ناگوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس جاتا ہوں"

کیا رواداری کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ ہو سکتا ہے؟

عصر کی نماز کے وقت پھر آپ نے تقریر فرمائی اور یہی کہا کہ اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں واپس چلا جاؤں مگر حر نے اس سے انکار کیا اور آخر طے یہ ہوا کہ آپ نہ تو کوفہ کی طرف جائیں اور نہ مدینہ کی طرف بلکہ ایسا رستہ اختیار کریں جو کوفہ اور مدینہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کو گیا ہو اور اسی قرارداد کے مطابق آپ روانہ ہوئے ——— مگر کربلا کی زمین کے قریب پہونچ کر ابن زیاد کا وہ انتہائی تشدد آمیز خط حر کے پاس آیا کہ حسین کے ساتھ سختی سے کام لو اور حسین کو اترنے پر مجبور کرو ایک خشک زمین پر جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانا اور پینے کے لیے پانی موجود نہ ہو۔"

اس خط کے بعد حر نے اتنی سختی برتی کہ قرب و جوار کے قصبے جو بہت نزدیک تھے جیسے نینوا، غاضریہ، شفیہ کسی میں قیام کرنے کی اجازت نہ دی اور کہا مجھے حکم یہی ہے کہ میں آپ کو کسی آباد مقام پر نہیں بلکہ چٹیل میدان میں اترنے پر مجبور کردوں جہاں پانی بھی قریب نہ ہو ——— اس وقت ع۵ "اصحاب نے

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

امام حسین سے کہا کہ دشمن ابھی زیادہ نہیں ہیں۔ آپ جنگ کر دیں لیکن حسین نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں کسی صورت میں بھی اقدام کرنا نہیں چاہتا پھر عمر سعد کے کربلا پہونچنے کے بعد آپ نے کئی دن تک اُس کے ساتھ معنونہ مفاہمت کی گفت و شنید جاری رکھی۔"

جب عمر سعد آپ سے ملنے کے لیے رات کے وقت اُس خیمہ کی طرف چلا جو دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات کے لیے معین ہوا تھا تو بیس سوار اپنے ساتھ لے لیے شاید اس لیے کہ مخالف کا سامنا ہے۔ معلوم نہیں صورت حال کیا پیش آئے مگر جب امام حسین تشریف لائے اور آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب بھی گئے کہ حضرت تنہا نہ رہیں تو حضرت نے اصحاب کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا اور فرمایا میں عمر سعد سے تنہا ملاقات کروں گا۔ اس سے یہ ثابت کرنا تھا کہ خالص نیت اور صاف دل اور صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کرنا ہے جس میں فوج اور جمعیت کی ضرورت نہیں ہے جب عمر بن سعد نے یہ دیکھا کہ امام تنہا رہ گئے ہیں تو اُس نے بھی ساتھیوں کو واپس کر دیا۔ امام حسین کی گفتگو سراسر صلح پسندانہ تھی۔ انھوں نے یہ کہا کہ میں مدینہ واپس چلا جاؤں گا۔ یہ کہا کہ مجھے ملک عرب سے باہر چلا جانے دو اور دور ترین سرحدوں میں زندگی گزارنے دو۔

عہ "مختصر یہ کہ امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے وہ اپنی ذات پر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ بس اگر انھیں کسی شرط کے ماننے پر اعتراض تھا تو وہ صرف یہ تھی کہ وہ یزید کو جائز خلیفہ یا اسلام کا سچا نمایندہ ماننے کو کسی طرح تیار نہیں تھے۔"

آپ کا رویہ قیام امن کے بارے میں اتنا واضح تھا کہ فوج یزیدی کے افسر عمر سعد نے اپنے حاکم عبید اللہ بن زیاد کو خط لکھا کہ "مبارک ہو خدا نے فتنہ کی آگ کو بجھا دیا اور مسلمانوں کے شیرازہ کو مجتمع کیا اور امت اسلامی کے امر کی اصلاح کی حسین صلح پر آمادہ ہیں اور اُن کے شرائط ایسے ہیں جنھیں قبول کرنے

عہ سید اشفاق حسین صاحب

میں ہم کو عذر نہ ہونا چاہیے۔"

ابن زیاد بھی مصالحت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ صرف شمر کی مفسدانہ اندازی تھی جس سے ابن زیاد نے اس آخری رشتہ کو توقعات امن کے قطع کر دیا۔ اور ابن سعد کو خط لکھا کہ ہم نے تم کو گفت و شنید اور مصالحت کے شرائط کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ تم حسین کے سامنے صرف غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ پیش کرو۔ اور اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر اُن سے جنگ کرو۔ اس خط کا پہنچنا تھا کہ بس عمر سعد نے پوری فوج کو حسین اور اصحاب حسین پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا۔ پھر بھی امام حسین نے ایک رات کے لیے خوں ریزی کو اور ٹال دیا۔ ع اور حسین کی یہ خواہش تھی کہ وہ خوں ریزی کو جہاں تک ہو سکے کم کر دیں اور اس بات کا یقین حاصل کر لیں کہ جو حسینی رنگ میں رنگ گئے ہیں اور خالص روحانی جذبہ رکھتے ہیں وہی اُن کا ساتھ دیں۔"

صبح ہوئی۔ وہ عاشور کی قیامت خیز صبح۔ پیمانہ لبریز ہے۔ پانی سر سے اونچا ہے۔ حملہ ہو چکا ہے اور کوئی امید صلح کی باقی نہیں ہے مگر حسین اب بھی امن پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آپ اپنے طرز عمل سے برابر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ میں اپنی طرف سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

صبح عاشور اُس وقت کہ جب امام خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ کے دروازے پر کھڑے تھے اور خیمہ کی پشت پر خندق میں آگ بھڑک رہی تھی شمر نے آ کر نہایت سخت جملہ کہا کہ "آخرت کی آگ کے پہلے دنیا میں تم نے آگ کا سامان کر لیا"۔ یہ اتنا اشتعال انگیز فقرہ تھا کہ ضعیف العمر مسلم بن عوسجہ کو بھی تاب نہ رہی اور امام سے اجازت مانگی کہ اُسے تیر کا نشانہ بنائیں مگر حضرت نے فرمایا کہ "نہیں ایسا نہ کرو میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔"

اتمام حجت کی اتنی منزلیں اُس شخص کی طرف سے طے ہو رہی ہیں۔ جسے اپنی جان کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جو موت کو اپنی آخری منزل سمجھ چکا ہو اور اعلان

کرتا رہا ہو۔ جو موت کا استقبال کشادہ پیشانی کے ساتھ کرنے پر تیار ہو۔ اس کے بعد یہ امن پسندی، یہ صلح پروری، یہ اشتعال سے علیحدگی، یہ اپنے جوش کی روک تھام، یہ اپنے ساتھیوں کے جذبات کی نگہداشت۔ یقیناً امام حسین اُس دن جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کی منزل طے کر رہے تھے اور "جہاد صغر" کے ساتھ "جہاد اکبر" کا فرض ادا کر رہے تھے،

ع۵ "راہ صداقت پر شروع سے آخر تک اس طرح قائم رہنے کی وجہ سے حسین کی عزت صرف اُن کے ساتھیوں ہی کے دل میں نہیں بھی بلکہ اس کا اعتراف دشمنوں کی جانب سے بھی ہوا۔ یزیدی سپہ سالار عمر بن سعد اگرچہ منصب، اعزاز اور دولت کو ضمیر کے لیے قربان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کم از کم وہ بھی اس بات کے کہنے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکا کہ حسین بے شک صلح کل اور معقول انسان ہیں عمر بن سعد کا یہ قول حسین کی کامیابی کا ایک ثبوت ہے۔

یزیدی فوج کا ایک افسر حر جس نے کہ حسین کو کوفہ جانے سے روکا تھا اور اپنے ساتھ کربلا تک لایا تھا اُس کا حسینی فوج کی جانب آجانا یہ بھی حسین کے مقصد کی کامیابی کا ایک دوسرا ثبوت تھا۔ یقیناً اس طرح سے حُر کا آنا اور نتائج جنگ کو سمجھتے ہوئے اپنے کو حسین پر قربان کر دینا مادیت سے بلند ہے بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کذب پر صداقت کی یہ شاندار فتح تھی"

جو چیز حر پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی تھی وہ امام حسین کے صلح پسندانہ مطالبات کا مسترد ہو جانا چنانچہ اُس نے اپنے آخری فیصلہ کو عمل میں لانے سے پہلے عمر بن سعد سے آکر جو گفتگو کی تھی وہ یہی تھی کہ اُس نے پوچھا "کیا واقعی تم ان سے جنگ کرو گے؟" عمر سعد نے جواب اثبات میں دیا۔ حر نے کہا "کیا اتنی باتیں شرائط صلح میں جو حسین نے پیش کیں، ان میں سے کوئی بھی تمھارے نزدیک ماننے کے قابل نہیں ہے؟" عمر سعد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے کہا

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

"بخدا اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو ضرور منظور کر لیتا مگر تمھارا امیر (ابن زیاد) نہیں مانتا" یہ سنکر حُر فوراً عمر سعد سے جدا ہو گئے۔

چند دیگر اشخاص بھی تھے جو امام حسین کے پیش کردہ شرائط صلح نامنظور ہونے کے بعد فوج عمر بن سعد سے جدا ہوئے اور رفقائے امام کی جانب آ گئے جیسے:- جوین بن مالک بن قیس تیمی۔ حارث بن امرأالقیس کندی۔ حلاس بن عمرو ازدی۔ زہیر بن سلیم بن عمرو ازدی۔ نعمان بن عمرو ازدی۔ بکر بن حی تیمی وغیرہ۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین کے طرز عمل میں صلح پسندانہ پہلو اس درجہ نمایاں تھا کہ اس کا دشمنوں پر اثر پڑ رہا تھا اور وہ آپ کے ہمدرد بن رہے تھے

ع۵ "ابتدائے جنگ سے انتہا تک جبکہ اُن کے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور دوسر اعزاو احباب شہید ہو چکے اور سوائے عورتوں بچوں اور ایک بیمار بیٹے کے اور کوئی نہ بچا تھا تو وہ امن قائم رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کو عمل میں لا رہے ہیں۔ انھوں نے میدان جنگ میں دشمن سپاہیوں کو مخاطب کیا، اُن کو قائل معقول کیا، اُن کو سمجھایا کہ وہ کون ہیں تاکہ اگر وہ نہ جانتے ہوں یا گمراہ کر دیے گئے ہوں تو واقف ہو جائیں لیکن حسین کا سب کہنا سننا بیکار رہا"

دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا کہ بڑے سے بڑے بہادر بھی جنگ میں زرہ پہنتے تھے مگر کربلا حسین۔ صرف ایک کرتا پہنے ہوئے تھے خز کا جو ایک نہایت باریک کپڑا ہوتا ہے اور سر پر عمامہ باندھے تھے (طبری ج ۶ ص ۲۵۹) کیا جنگ کی تیاری یونہی ہوتی ہے اور جس کو لڑنا منظور ہوتا ہے وہ یونہی میدان جنگ میں آتا ہے؟

ع۶ "سپہ سالاران افواج نے ہمیشہ سے فوجیوں کے واسطے کچھ خصوصیتیں رکھی ہیں کمزور، بوڑھے، بچے، بیمار، سپاہی بھرتی نہیں کئے جاتے مگر حسینی سپاہ کی عجیب شان ہے۔ حبیب بن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ کے ایسے بوڑھے۔ قاسم بن حسن

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب ع۶ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

اور عبد اللہ بن حسن ایسے بچے شامل تھے۔ یہ فوجی ترتیب اس اصول کے ماتحت تھی کہ تشدد نہ ہو جو دنیاوی جنگوں میں ضروری سمجھ کر صرف قوت دار جوانوں کو فوجی بھرتی کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔ جہاں تشدد اسکیم سے خارج ہو وہاں کمزور اور غیر کمزور کے لحاظ کی ضرورت نہیں۔ حق کی فتح میں نہ قلت و کثرت کا سوال ہے۔ نہ ضعف و قوت کا۔ نہ بچے اور بوڑھے کا۔ صرف عزم و استقلال و ہمت درکار ہے"

جب اُن کی کوئی تقریر اور اُن کا کوئی عمل دشمن کے قلب میں تبدیلی نہیں کر سکا تو عے انھوں نے اب اپنی آخری حجت کے طور پر اپنے ششماہہ بچہ علی اصغر کو پیش کیا۔ اُنھوں نے اس بچہ کو ہاتھوں پر بلند کیا۔ غالباً حسین کو یہ امید تھی کہ جس مقصد میں کہ وہ ناکامیاب ہوا ہوں اُس میں شاید یہ بچہ کامیاب ہو جائے۔ بچہ نے بھوک اور پیاس کی شدت میں ایسی تصویر پیش کی کہ ہر اُس انسان میں جو کہ بالکل جانور نہ ہو گیا ہو یقیناً جذبۂ رحم پیدا کر دیتی۔ اور ہر اُس دل میں جو کہ بالکل بجھ نہ گیا ہو انسانیت کا ایک شرر پیدا کر دیتی۔ حسین کا یہ آخری اقدام کہ دشمن صلح کے راستے پر آ جائیں ناکامیاب ثابت ہوا اور بچہ کا حلق تیر کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ تھا یزیدی رویہ۔

حسین کا فلسفۂ عدم تشدد ایک بلند نظریہ پر قائم تھا۔ اُن کے لیے عدم تشدد کسی مادی نتیجے تک پہونچنے کے لیے ایک وسیلہ نہیں تھا بلکہ اُن کے نزدیک یہ ایسی خوبی تھی جس کے لیے بڑی قربانیاں درکار ہیں۔ مگر پھر بھی عدم تشدد کی ایک آخری منزل ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی خواہش کرنا چاہیے لیکن اُسی وقت تک کہ یہ ایک خالص خوبی کی حیثیت رکھتا ہو اور ایک آزاد اور باقوت انسان کا خود اختیاری عمل ہو نہ کہ ایک مجبور و بے بس انسان کا عاجزانہ رویہ سمجھا جائے۔ ہر انسان کو یقیناً جسمانی، اخلاقی، تقریری اور جذباتی تشدد سے اُس وقت تک پرہیز کرنا چاہیے جب تک کہ وہ اُس منزل پر نہ پہونچ جائے کہ اُس کا عدم تشدد انسان کو

عے سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

تشدد کا غلام اور مطیع بنا دے۔ ایسی صورت میں عدم تشدد کے تمام اصول کو برطرف کر دینا اور تشدد کا مقابلہ کرنا انسانی فریضہ ہو جائے گا۔

یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہم کن حالتوں میں تشدد اور کس نقطہ پر عدم تشدد کو عمل میں لائیں۔

اسلام اسی قسم کی متوازن اور عمدہ زندگی اور انتہاپندی سے بچنے کی تعلیم دینے کے لیے آیا تھا اور حسین نے بہترین طریقہ پر اس اصول کو عمل میں لا کر دکھلا دیا——

عدم تشدد کے شرائط میں سے انسانیت کا لحاظ رکھنا ایک اہم شرط ہے۔ دشمن کے خلاف بھی جب ہم تشدد کے لیے مجبور ہو جائیں تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ ایک فرد انسان ہے اگرچہ گمراہ سہی۔ مختصر یہ کہ عدم تشدد کے لیے انسانی محبت اور رحمدلی خاص عناصر ہیں۔ سرزمین کربلا اس قسم کی سخی اور فراخ دل انسانیت کی لاتعداد مثالیں پیش کرتی ہے ——

ایسے انسان کی انسانیت کا کون ادراک کر سکتا ہے جو کہ اپنے اعزا کو اپنے چاروں طرف مذبوح دیکھے، جو خود بھی زخموں سے چور ہو کر گرے اور پھر اخیر دم تک دشمنوں کے لیے بد دعا سے زبان کو آشنا نہ کرے بلکہ اُن کی ہدایت کی دعا کرتا رہے۔ یہ تھا حسین کا عدم تشدد، جو صداقت کو تلاش کرنے، اس کو حاصل کرنے اور عمل میں لانے کے لیے تھا۔

کسی ستیاگرہی کی زندگی اور جنگ کا مقصد صرف "حق" ہونا چاہیے۔ صداقت ہی انسانی سعی کا آخری درجہ اور سارے انسانی کاموں کے لیے آخری مہر ہونا چاہیے۔ نوجوان علی اکبر نے ایک مرتبہ سفر کربلا میں اپنے باپ کو مضمحل اور متردد دیکھ کر سبب پوچھا اور حسین نے آخری انجام یعنی موت کی اطلاع دی تو علی اکبر نے پوچھا، "بابا کیا ہم صحیح راستے پر نہیں ہیں" حسین نے اُن کے معصومانہ سوال پر اُن کا چہرہ دیکھا اور کہا "بے شک ہم سیدھے راستے پر ہیں" یہ سننا تھا کہ جوان کے چہرے پر خون دوڑنے لگا اور اُس نے کہا "پھر موت کیا حقیقت و اہمیت رکھتی ہے"

یہ ہے ایک سچے ستیا گرہی کا طریق عمل۔

حسین کو جس سبب سے تردد لاحق تھا وہ صرف یہ تھا کہ وہ کیونکر بغیر عزت کو برباد کئے ہوئے صلح و آشتی حاصل کر سکیں؟ کیونکر بغیر اپنے ضمیر کو دھوکا دیے ہوئے اپنے ساتھیوں اور دشمن کے سپاہیوں کو خونریزی سے بچا لیں۔ وہ اس لیے بھی متردد تھے کہ میرا ہر قدم حق و صداقت کے ماتحت رہے اور کسی طرح ذاتی جذبات کا محکوم نہ ہونے پائے۔ محض اسی وجہ سے وہ چاہ رہے تھے کہ میرا ساتھ کوئی اُس وقت تک نہ دے جب تک کہ میرے مقصد کی موافقت کا مادہ اپنے میں بدرجۂ اتم نہ پا لے“

اُنھوں نے جتنے سخت اور نازک موقعوں پر عدم تشدد کو قائم رکھا ہے اُس میں انھیں کامیابی نہ ہو سکتی اگر ساتھیوں کی پرجوش طبیعتیں پوری طرح اُن کے قابو میں نہ ہوتیں۔ اور ایسے افراد مکمل طور پر اُن کے قابو میں رہ نہیں سکتے تھے جن کی طبیعتیں خود مشتعل ہو کر اکثر اپنے ہی قابو سے باہر ہو جائیں۔

سختی کے ساتھ اس عدم تشدد کے ساتھ پھر بھی کسی وقت اُنھوں نے اپنے کو دشمن کے سپرد نہیں کیا۔ اُن کے ساتھ کا ایک ایک بچہ بھی میدان میں گیا تو تلوار لے کر اور اُس وقت تک زمین پر گرا نہیں جب تک اُس نے اپنی طاقت مقابلہ کو صرف نہیں کر لیا۔

یہاں تک کہ خود امام جب کہ دوستوں اور عزیزوں کے صدموں سے اُن کا نفس یقیناً خود اپنی زندگی سے گریزاں تھا، جب کہ پیاس سے آنکھوں کے نیچے دھواں چھایا تھا اور ہر ایک سانس دل کے لیے خنجر بنی ہوئی تھی۔ اُس وقت بھی اُنھوں نے اپنی امکانی طاقت ظلم و تشدد کے مقابلہ میں اُٹھا نہیں رکھی۔ اور اس طرح اُنھوں نے ایک ایسی نازک اخلاقی شاہراہ کی حد قائم کی جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے جس کا عمل میں لانا کیا، صحیح طور سے سمجھنا اور اس کی صحیح لفظوں میں تعبیر کرنا مشکل ہے۔

مسٹر سی ایس رنگا آئر لکھتے ہیں:۔

"امام حسین کی زندگی نمونہ تھی بے تشدد تشدد کا، متشدد عدم تشدد کا۔ بے صبر صبر کا اور صابر بے صبری کا۔ مثل ایک چٹان کے جس کو کوئی طوفان متزلزل نہیں کر سکتا۔

شادان و خنداں چہرے کے ساتھ غم کو خفیف و حقیر سمجھتے ہوئے ——"

(قربانی)

عہ "تاریخ کے صفحات پر ظلم و ستم کے واقعات بہت سے منتشر و پاشاں ہیں بدی کی طاقتیں وقتاً فوقتاً دنیا پر چھاتی رہیں اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے نشانات چھوڑتی ہوئی فنا ہوتی رہی ہیں۔

جب ہم خوں ریزی، لوٹ مار، غارت گری، آتش زدگی اور ہوسناکی وغیرہ کے اُن واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا قومی فلاح، سیاسی ضروریات یا مذہبی حفاظت کے نام پر ارتکاب کیا گیا ہے تو ہم تھرا اُٹھتے ہیں۔

ہم بغیر آہ سرد بھرے مطالعہ نہیں کر سکتے ہولناک صورت ابتلا و تباہی کا جلتی قوم کی اسپین میں۔ غمناک بربادی کا اسلامی تہذیب کی خانہ بدوش تاتاریوں کے ہاتھ سے یا ان بے رحمی کے واقعات کا جن کا بادشاہوں اور شہنشاہوں نے مصیبت زدہ انسانیت کے ساتھ ارتکاب کیا ہے اور ہم حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا وہی صحیح ہے جو یونانی لوگوں نے اپنے دیوتاؤں کے متعلق کہا ہے کہ وہ بے فکر مسرت کی حالت میں کوہ المپس کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے مزے اڑاتے ہیں اور نیچے فانی اور بے بس انسانوں کو اپنے تیروں کا ہدف بناتے ہیں۔

اس سب کے بعد ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر نسل انسانی اب تک باقی رہی اور وہ اس لگاتار اور خونریز جھگڑے فساد میں فنا نہیں ہوگئی۔ بلکہ ہمیں انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے کہ باوجود شرارت کے عارضی غلبہ کے، آخیر ہمیشہ فتح مند ثابت ہوا

عہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

اس طرح کہ نظم عالم قائم رہا اور یہ دنیا اب تک ایک ایسی جگہ ہے جس میں جینا اور رہنا ممکن ہے۔

پھر ایسا کیوں ہے؟ کوئی تاریخ کا طالب علم جس نے اُس کے صدیوں کے واقعات پر گہرا غور کیا ہو اس صورت حال کے محسوس کرنے میں ناکامیاب نہیں ہو سکتا کہ اس دنیا میں بہت سے نازک واقعات میں کچھ حقیقی یکتا۔ بلند مرتبہ افراد ایسے ہوتے ہیں جو بدی کے بڑھتی ہوئی طغیانی کو روکنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ جو خوف اور طمع کے سامنے یکساں طور پر مضبوط کھڑے رہتے ہیں اور جو غیبی رہنمائی کی روشنی میں چلتے ہوے بہت سے گمراہ نفوس کی جادۂ حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، کمزور اور ناتواں لوگوں کی ہمت بڑھاتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ خدا نے یہ نہیں چاہا ہے کہ یہ دنیا ایک بدترین دنیا ہو جائے یا یہ کہ نسل انسانی ایک عیش پرست وحشیوں کی نسل بن جائے۔

ایسے ہی بڑے انسان حسین تھے ـــــــ جنھوں نے سچائی اور حقانیت کے لیے نہر فرات کے کنارے آج سے تیرہ سو برس پہلے اپنی جان دی ـــــــ"

اس میں شک نہیں کہ[۲] سقراط سے قبل اور بعد بہت سے ایسے شہید گزرے ہیں جنھوں نے کہ حق کی حمایت میں ایذائیں اور صعوبتیں اُٹھائی ہیں اور ہم ان کی قربانیوں کی عظمت کو گھٹانا نہیں چاہتے۔ قید خانوں کی تکلیفیں برداشت کرنا مذاق نہیں۔ حق کے لیے سولی پر چڑھ جانا کوئی معمولی بات نہیں اور مشکل ہے یہ کام کہ فرض شناسی کے سبب جان بوجھ کر تکلیف اُٹھائیں کہ مقصد فنا نہ ہو جائے خود فنا ہو جائیں مگر انسانی ہمت سے بالاتر کام یہ ہے کہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور بچوں کو مصائب کی آگ میں جھونک دیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے انھیں دم توڑتا ہوا دیکھیں اور پھر راہ حق سے سرمو انحراف نہ کریں ـــــــ"

امام حسین کی قربانی کوئی ایک طرح کی قربانی نہ تھی۔ انھوں نے[۳] مدینہ چھوڑ کر

---

[۱] سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر [۲] علامہ ہندی سید احمد صاحب

قومیت کے تحفظ پر وطنی محبت کو قربان کیا۔ عزیز و اقربا، دوست و آشنائے جانی کو حفظ مذہب کے لیے بخوشی منظور کر لیا۔ اپنے عزیز ترین معبد خانہ کعبہ کو جس کے موروثی متولی تھے دین کی خیر خواہی میں چھوڑا۔ تین روز کی بھوک پیاس سہی سوکھے گلوں کو، دل کے ٹکڑوں کو کٹوا کر اپنے اصول زندگی کی حفاظت کی عصمت مآب عورتوں کی عزتوں کو اُن خونخوار جاہل فوجوں کے رحم و کرم پر اسیری کی مصیبتیں جھیلنے کے واسطے بے والی و وارث چھوڑ دیا اور بتا دیا کہ افراد و جماعات کی ہر عزیز سے عزیز شے کو مصالح عمرانی کے واسطے، دین کی راہ میں بے دریغ قربان کر دینا یہی انسان کے لیے انتہائی عزو شرف و سعادت ہے"

حسین کی قربانی ایک منظم حیثیت رکھتی تھی۔ اگر وہ اپنی شہادت کے مرحلہ کو پہلی ہی دفعہ قطع کر دیتے تو یہ کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے منازل کو طے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ معاملہ فہمی اور فرض شناسی پر مبنی ہے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں۔

اُنھوں نے روز عاشور سب سے پہلے اپنے محبوب ترین اصحاب انصار اور ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا۔ عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا۔ اپنے دل کی قوت، آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علی اکبر کو قربان کیا۔ قاسم و عبداللہ ایسے بھتیجے۔ ابوالفضل العباس اور اُن کے بھائیوں ایسے وفادار برادر۔ سب کے بعد باغ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ علی اصغر کو خود اپنے ہاتھوں پر لا کر قربان کیا۔ ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی۔ اب اعضائے بدن تک نوبت پہونچی۔ سطح جسم کا چپہ چپہ اور خون کا ہر ہر قطرہ قربان کیا۔ نوبت یہ پہونچی کہ تیروں کو جگہ

نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں اور نیزوں کو جستجو کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا۔ جب جسم کا ہر حصہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا تو اب حسینؑ کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک رشتہ حیات تھا جو روح و بدن کے اندر پوری کشمکش حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔ اس باہمت مجاہد کے لیے گزشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے کے بعد، یہ منزل بالکل آسان تھی۔ عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور نفس و بدن کا ظاہری اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے باہمی ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق ہزاروں بار اُلٹ جائیں لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

ع۵ "حسینؑ محض اس وجہ سے سید الشہداء نہیں ہیں کہ انھوں نے بڑی بڑی اذیتیں اُٹھائیں اور یہ کہ انھوں نے جان بوجھ کر اور خود سے اُن کو بلایا بلکہ جو چیز اُن کو اس خطاب کا مستحق بناتی اور اُن کی قربانی کو عدیم المثال کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ حسینؑ اپنی شہادت کو اپنی عقیدت شعار اور مخلص زندگی کی معراج اور آخری حد ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اُس کو انسانوں کے خفتہ ضمیروں کی بیداری اور اپنے مقصد کی طرف لوگوں کی توجہ کو مبذول کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس طرح ساری دنیا کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر کے وہ مصائب آلام کے محیط ابر و باد میں چلے گئے تاکہ وہ دنیا کو خاص انسانی خوبیوں کی تعلیم دیں۔ حسینؑ نے کربلا کے چند ہی دنوں کے قیام میں اپنے فعل سے انسانوں کو پورے طور سے بتا دیا کہ کیونکر جینا چاہیے اور کیونکر مرنا چاہیے۔"

ع۵ سید اشفاق حسین صاحب بیرسٹر

ع۵ "شہید کا خون نہ آفتاب کی حرارت بخار بنا کر اڑا دیتی ہے، نہ تپتی زمین اس کو خشک و جذب کر لیتی ہے۔ نتیجہ طبعی اس کا یہ ہے کہ غافل قوموں کو ہوشیار کرے اور سوتی قوموں کو جگا دے۔ امام حسین کا خون ناحق بے تاثیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے قریبی باشندوں کو ہوشیار کیا اور رفتہ رفتہ عالمگیر ہو کر دور و دراز ملکوں کو چونکا دیا۔ امام حسین نے اقوام عالم کو سبق دیا کہ قومی موت کسی کو نہیں چھوڑتی۔ اگر قوم مرتی ہے تو کوئی زندہ نہیں بچتا۔ عہد یزید میں جان بلب اسلام کے لیے آخری لمحے تھے۔ امام حسین نے فیصلہ کر لیا کہ قوم مر گئی تو میری تنہا زندگی قومی زندگی نہیں کہی جا سکتی۔ میں بھی سیاسی موت مر جاؤں گا اور قوم کی زندگی کے لیے موت ہوی تو درحقیقت وہ موت نہیں ہے۔ قومی زندگی ہے اور حسین بھی اسی قوم کی ایک فرد ہیں۔ امام حسین نے اس حقیقت کو ساتھیوں کے ذہن نشین کروایا اور خدمت خلق کے لیے جان دے کر قوم کو زندہ کر دیا۔ مصلحان عالم کو سبق پڑھایا کہ قومی موت کو اپنی موت سمجھو۔ جب قومی موت کا سوال ہو تو ہر فرد قوم کا فرض ہے کہ بڑے سے بڑے نقصان کو گوارا کر کے قوم کو بچا لے۔ اسی کا نام ایثار و قربانی ہے۔"

بقول ہز ہائی نس ناصر الملک مہتر آف چترال :-

از حسین آموز در دو بر فتن ! جان خود را بہر ملت باختن
تا ز خون سرخت از خاک وطن گل دمد ہر سو چو ریحان و سمن

بعض متفرق تعلیمات

واقعۂ کربلا کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں حضرت امام حسین نے فرائض کے ایسے جزئیات تک کو پورا کیا ہے جنھیں عام انسان اس سے کم اضطراب کے موقع پر بھی ترک کر دیتے یا کم از کم ملتوی کرتے یا فرض

ع۵ علامۂ ہندی

کی پابندی کی شدت میں کمی پیدا کر دیتے مگر حضرت امام حسین نے سخت سے سخت اوقات میں فرائض کی پابندی اتنی ہی سختی کے ساتھ کی جتنی کہ عام حالات میں ہو سکتی تھی۔ مثالاً چند چیزیں درج ذیل ہیں :۔

پردہ یہ شریعت اسلامیہ کا ایک قانون ہے کہ مرد اور عورت کے فرائض، طرز زندگی اور نظام معاشرت جدا ہے۔ مرد پر جب موقع آئے تو تلوار لے کر جہاد واجب ہے مگر عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے۔ مرد میدان میں نظر آنا چاہیئے اور عورت گھر کی چار دیواری کے اندر۔ پردہ عورت کے لیے ایک لازمی فریضہ ہے اور اُس کی پابندی تا حد امکان ضروری ہے۔

خاندان رسول کی شان جس طرح تمام عبادات و واجبات کے ادا کرنے میں امتیازی درجہ رکھتی تھی اُسی طرح پردہ کے بارے میں بھی اس گھرانے کا اہتمام خصوصی امتیاز رکھتا تھا۔

دختر رسول حضرت فاطمہ زہرا اس گھرانے کی مقدس خواتین کے لیے مورث اعلیٰ کی حیثیت رکھتی تھیں جنھیں پردہ کا اتنا خیال تھا کہ مرنے کے بعد جنازہ پر بھی نامحرم کی نگاہ پڑنا گوارا نہ تھی۔

کربلا میں حضرت امام حسین کے ساتھ اس گھرانے کی تقریباً تمام مقدس خواتین موجود تھیں۔ پیغمبر خدا کی نواسیاں زینب ام کلثوم۔ حضرت علی کی بیٹیاں فاطمہ اور رقیہ۔ بہوئیں :۔ بیوۂ امام حسن اور لیلیٰ اور رباب۔ امام حسین کی صاحبزادیاں فاطمہ، سکینہ اور دیگر عزیز خواتین۔ ان کے علاوہ کنیزیں تھیں۔ بعض اصحاب بھی اپنے متعلقین کے ساتھ آئے تھے جیسے مسلم بن عوسجہ۔ عبد اللہ بن عمیر اور جنادہ بن کعب وغیرہ۔

حضرت امام حسین نے اپنے اہل حرم کی پردہ داری کا اہتمام ہر لمحہ پیش نظر رکھا راستے میں جب فوج حُر آتے دکھائی دی تھی تو آپ نے ذو حسم پہاڑی اسی لیے منتخب کی تھی کہ اُسے پشت پر قرار دے کر خیام اہل بیت برپا کیے جائیں چنانچہ

یہ کام اتنی تیزی سے عمل میں لایا گیا کہ خیمے برپا ہو چکے اور اہل حرم خیموں میں فروکش
ہو چکے اُس وقت حُر کا لشکر وہاں پہونچ سکا۔

کربلا میں بھی پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ حضرت نے ریگستانی ٹیلوں کا ایک سلسلہ
منتخب کیا جہاں قیام فرمائیں۔ پھر شب عاشور خیموں کی طنابوں کو ایک دوسرے
سے اس طرح وابستہ کر دیا کہ کسی ایک خیمہ کی طنابیں کاٹ کر گرانا غیر ممکن ہو گیا اور خیموں
کے گرد خندق کھدوائی اور اُس شدید گرمی میں اس کے اندر آگ روشن کرائی۔ اسی
لیے کہ پشت پر سے دشمن خیموں کی جانب نہ آسکے۔

یہ تمام انتظامات صبح عاشور مکمل ہو چکے تھے۔ اُس وقت جہاد کا آغاز ہوا۔
بی بیاں خیموں کے اندر اور اعزا میدان جہاد میں باہر۔ کیا اس موقع پر ان اہل حرم
کے دلوں کے اضطراب کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ جب کہ تیروں کی مسلسل بارش تھی اور
زمین گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے سے لرز رہی تھی اور چاروں طرف غبار سے تاریکی
چھائی تھی اور فوجوں کا سیلاب بار بار صف حسینی کے کوہ استقلال سے ٹکرا کر شور کرتا
ہوا واپس ہوتا تھا۔ ہر مرتبہ بہنیں بھائیوں کے لیے۔ مائیں بچوں کے لیے۔ بیویاں
شوہروں کے لیے مضطرب ہو جاتی ہوں گی مگر کیا ممکن تھا کہ انمیں سے کسی کا قدم خیمہ
کے باہر آ جائے۔

وہ موقع اس سے زیادہ سخت تھا جب کہ ایک ماں کو خبر پہونچتی تھی کہ اُس کا
بیٹا مصروف جہاد ہے۔ یا ایک بہن کو یہ کہ اُس کا بھائی لڑ رہا ہے۔ یا ایک خاتون
کو یہ کہ اُس کا شوہر دشمن کی فوج کے اندر ہے۔ اس موقع پر ایک عورت کے لیے
اور وہ بھی عرب کی عورت جو خود فطری شجاعت کا خون رگوں میں رکھتی ہو اور
وہ بھی خاندان بنی ہاشم کی خواتین جن کو شجاعت حیدری ورثہ میں ملی تھی، کتنا
دشوار تھا کہ وہ صبر و سکون کے ساتھ اپنی جگہہ پر بیٹھی رہے جبکہ درمیان کوئی
کوسوں کی مسافت نہیں، پہاڑوں کا اوٹ نہیں، بلکہ صرف ایک خیمہ کے پردہ
اور میدان جنگ کی وسعت کا فاصلہ۔

اُس سے زیادہ سخت وقت وہ تھا جب خبر پہونچتی تھی کہ بیٹا بھائی یا شوہر زخمی ہو کر گر گیا اور اپنی زندگی کی آخری منزل میں ہے۔ جب اُس کی فریاد کی آواز آتی کہ یا اباعبد اللہ ادھر کئیے اور جب امام اُس کی آواز پر جاتے دکھلائی دیتے تھے۔ یہ موقع دل کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دینے والا اور صبر و تحمل کی کشتی کو طوفانی بنا دینے والا ہے۔

ایسے موقعوں پر بعض اصحاب کی عورتیں میدان جہاد میں نکل آئیں جیسے عبداللہ بن عمیر کی زوجہ۔ اور عمرو بن جنادہ کی ماں تو امام حسین نے اُن کو فرض اسلامی کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے اور انھیں خیموں کی طرف واپس کر دیا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زوجہ عبداللہ بن عمیر اور مادر عمرو بن جنادہ میں جرأت و شجاعت کا جوہر زینب و کلثوم سے زیادہ تھا، جن کی رگوں میں علی بن ابیطالب کا خون گردش کر رہا تھا۔ ہرگز نہیں۔ مگر یہ ان کی احساس فرائض میں پختگی تھی کہ انھوں نے کسی وقت بھی اپنی حد سے قدم آگے نہیں بڑھایا۔

سب سے زیادہ سخت موقع وہ تھا جب خود امام حسین نیزہ و شمشیر و تبر کے اندر تھے اور پھر اُس وقت جب گھوڑے سے زمین گرم پر آ چکے تھے —— مگر کیا اندازہ ہو سکتا ہے اُن بزرگواروں کے احساس فرائض کا جنھوں نے اس موقع پر بھی اصول شریعت کا احترام ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جس وقت عبداللہ بن الحسن نے خیمہ سے تڑپ کر باہر نکلنا چاہا، ام کلثوم نے دامن تھاما کہ کہاں جاتے ہو؟ بچے نے کہا اس عالم میں میں اپنے چچا کو تنہا نہ چھوڑوں گا اور دامن ہاتھ سے چھڑا کر روانہ ہو گیا۔ بس اب ام کلثوم بے بس تھیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ بچے کے ساتھ میدان میں آ جاتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک خیمہ کے حدود تھے وہاں تک ام کلثوم چلی آئیں اور جہاں سے بچہ اُس حد سے آگے بڑھ گیا بس شاہزادی کے قدم رک گئے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کربلا میں حفظ مراتب کے اصول قائم ہوئے تھے سو ہاں ہر ادنیٰ اعلیٰ پر قربان ہو رہا تھا۔ اصحاب اعزا پر قربان ہوئے اور اعزا امام پر قربان ہوئے اور امام دین خدا پر قربان ہوئے۔ اگر آئین اسلام کے حدود میں کچھ بھی گنجائش ہوتی تو اُس وقت جب حسینؑ زخمی ہو چکے تھے اور قریب تھا کہ اُن کی زندگی ختم ہو جائے، تمام خاندان بنی ہاشم کی عورتیں تلواریں لے کر میدان جہاد میں آ جاتیں اور حسینؑ کے گرد ایک مرتبہ دشمن پر حملہ کر دیتیں تو یہ کوئی کھیل نہ ہوتا بلکہ یقین سمجھنا چاہیے کہ کافی وقت تک حسینؑ کی زندگی بچ سکتی تھی اور ضرور واقعۂ کربلا میں ایک نئی نوعیت پیدا ہو سکتی تھی مگر نہ امام حسینؑ اس طرح کی قربانی کو اپنے نظام عمل میں جگہ دے سکتے تھے اور نہ وہ مخدرات عصمت خون کے انتہائی جوش اور دل کے انتہائی تلاطم کے باوجود کوئی ایک قدم بھی حسینؑ کے مرتب کردہ نقشۂ جنگ کے خلاف اٹھانے کے لیے تیار تھیں اس لیے حسینؑ کی تنہائی بھی دیکھی، دشمن کے حملوں کا خروش بھی سنا، فتح کے باجوں کی آوازیں بھی آئیں اور قتل الحسینؑ کا شور بھی گوش زد ہوا مگر وہ جہاں حسینؑ بٹھا گئے تھے وہیں بیٹھی رہیں اُس وقت تک جب تک وہ جگہ باقی رہی —— ہاں جب خیموں میں آگ کے شعلے بلند تھے، اُس وقت مجبور ہو کر امام وقت حضرت زین العابدینؑ کے مذہبی حکم کے ماتحت میدان میں نکلیں اور پھر بھی اختیار کی رفتار کے ساتھ پردہ کا احساس قائم رہا —— جب تک چادریں رہیں، چادروں کا پردہ رکھا —— چادریں نہ رہیں تو بالوں سے مُنھ چھپائے —— دربار میں کنیزوں کے حلقہ میں اپنے کو مخفی کیا —— اور جب یزید کے دربار میں تقریر کی ضرورت محسوس ہوئی تو عزیزوں کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے سے زیادہ دردناک الفاظ میں اس مصیبت کا شکوہ کیا کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردہ میں بٹھایا اور خاندان رسولؐ کی خواتین کو اس طرح دربدر پھرا رہا ہے کہ اُن کے چہروں پر اپنے پرائے ہر ایک کی نگاہ پڑ رہی ہے۔

اپسے صبر آزما مواقع پر اس فریضۂ اسلامی کی اتنی مکمل نگہداشت کی گئی ہے
جو ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کے سامنے ایک زریں مثال کی حیثیت سے قائم رہیگی

وصیت شریعت اسلام میں وصیت کا پورا کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔ بعض وصیتیں انسان کے ذاتی جذبات و نفسیات کے خلاف ہوتی ہیں مگر مرنے والے انسان کا احترام اُس کی وصیت کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے۔ بعض وصیتیں بعد کے پیدا شدہ حالات میں دشوار یا وقتی طور پر خلاف مصلحت بھی ہو سکتی ہیں مگر فرض شناس انسان کو وصیت کی پابندی موجودہ حالات کے تقاضا پر مقدم محسوس ہوتی ہے۔

حضرت امام حسین نے اپنے بزرگوں کی وصیت کا جس طرح اور جن جن موقعوں پر لحاظ کیا ہے وہ ایک نہ بھولنے کے قابل سبق ہے۔ رسول اللہ کی وفات کے وقت امام حسین بہت کم سن تھے مگر مذہبی روایات متفقہ طور پر یہ بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنے اس بچہ کی صلاحیتوں کا کم سنی ہی میں اندازہ کر کے اُسے اپنے مذہب اسلام کی مستقبل میں حفاظت کرتے رہنے کی وصیت کی تھی۔ اگر اسے لفظی طور پر کوئی نہ بھی مانے تو اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ کا برتاؤ حسین کے ساتھ اور اسلام کے مفاد پر پیغمبر کا ہر قربانی کے لیے آمادہ رہنا یہ ہر لحظہ حسین کو ایک وصیت کی حیثیت رکھتا تھا کہ جب اسلام پر کوئی وقت پڑے تو اپنی جان عزیز نہ کرنا۔ تمھیں اسی دن کے لیے اس محبت و شفقت کی گود میں پالا جا رہا ہے۔ حسین نے اس وصیت کو مرتے دم تک یاد رکھا اور کربلا کا پورا دفعہ اسی وصیت کی تعمیل تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب نے اپنی وفات کے قبل امام حسن کو جانشین بناتے ہوئے حسین کو اُن کی پیروی کی ہدایت کر دی تھی۔ حسین نے بے نظیر طریقہ پر اس فرض کو بھی انجام دیا۔

امام حسن کی وصیت تھی کہ مجھے میرے جد بزرگوار رسول اللہ کے مزار

کی طرف دفن کے لیے لے جانا لیکن اگر مزاحمت ہو تو خبردار ایک قطرہ خون گرنے نہ پائے بغیر کسی جنگ و مقاومت کے میرے جنازہ کو واپس لانا اور البقیع میں دفن کر دینا۔

حسین حسب وصیت بھائی کا جنازہ روضۂ رسول پر لے گئے مگر جیسا کہ امام حسن کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان وغیرہ نے مخالفت کی۔ نوبت یہ پہونچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش کر دی اور کچھ تیر جنازۂ امام حسن تک پہونچے۔ بنی ہاشم کے اشتعال کی انتہا نہ تھی مگر وہ فرض شناس حسین تھے جنھوں نے بھائی کی وصیت کے مقابلہ میں اپنے تمام جوش، ولولہ اور حوصلہ مند طبیعت کے تقاضوں کا خون کر دیا —— اُنھوں نے خاموشی کے ساتھ دشمن کی مخالفت کے سامنے سر جھکا دیا اور امام حسن کا تابوت واپس لے جا کر جنۃ البقیع میں دفن کر دیا

اپنے مرحوم بھائی امام حسن کی وصیت کے احترام ہی سے تھا کربلا میں اپنے عزیز بھتیجے قاسم بن الحسن کو اجازت جہاد دینا جب کہ آپ خود اس لیے اجازت دینے سے انکار کرتے تھے کہ ابھی قاسم حد بلوغ کو نہ پہونچے تھے اور جہاد کی تکلیف عائد نہ تھی۔

اپنی نام زد لڑکی کا یتیم امام حسن کے ساتھ عقد کر دینا بھی اپنے بھائی کی وصیت کی تعمیل ہی میں تھا۔

جب ہی تو حضرت امام حسین کی زیارت میں اس صفت کا خاص تذکرہ ہے کہ والی وصیۃ اخیک مسارعا (یعنی) اپنے بھائی کی وصیت کے پورا کرنے میں آپ نے بڑی تعجیل کی کہ کہیں وقت نکل نہ جائے اور وصیت کی تعمیل رہ نہ جائے۔

تلقین صبر بلند مرتبہ ہستیوں کے مصائب کے تذکرہ سے اشکبار ہونا حقیقۃً اُن بلند اوصاف کی قدر و قیمت کا اظہار ہے جو اُن ہستیوں کے ساتھ اُٹھ گئیں اور اس لیے یہ آنسو سچائی کی شرط کے ساتھ بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں مگر کسی انسان کا خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو خود اپنی مصیبت پر بے تاب ہونا اور بالخصوص جبکہ دشمنوں کو مضحکہ کا موقع ملے یہ اس

انسان کی عظمت نفس کے خلاف ہے۔

راہ حق میں انسان کو خود اگر مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو اُسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنا شان ثبات و استقلال ہے جو مرتبہ کی رفعت کا سبب ہے

حضرت امام حسین کربلا میں خود صاحب مصیبت تھے۔ اور آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہل حرم اور بالخصوص زینب و کلثوم صاحب مصیبت تھیں۔ زینب کو محبت بھی اپنے بھائی کے ساتھ غیر معمولی تھی۔ وہ ایک مرتبہ صرف حسین کی زبان سے اپنی شہادت کی خبر کے طور پر کچھ اشعار سُنکر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ امام حسین کو یہ فکر تھی کہ کہیں میرے غم میں میرے اہل حرم اور بالخصوص میری بہن زیادہ اپنا حال تباہ نہ کریں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دشمنوں کے طعن و تشنیع کا سبب ہو اس لیے آپ نے اپنی بہن کو بڑے مؤثر انداز میں یہ وصیت فرمائی کہ میرے غم میں گریبان نہ پھاڑنا، مُنھ پر طمانچے نہ مارنا اور سر کے بال نہ نوچنا۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جو معمولی طور پر اموات کے غم میں شرع اسلامی میں ممنوع ہیں یقیناً حسین ایسے بلند مرتبہ انسان کے غم میں یہ تمام باتیں روا ہیں مگر اپنی بہن زینب کو حسین خود صاحب مصیبت ہونے کے اعتبار سے اسیری کے ہولناک ماحول میں اور دشمنوں کے محاصرہ میں ایسے صبر و سکون کا مرقع بنانا چاہتے تھے جو دنیا کے صاحبان مصیبت کے لیے ایک اسوۂ حسنہ ہو سکے اور زینب نے اس پر ایسے بہترین طریقہ پر عمل کیا کہ خود بے تاب ہونا کیسا وہ کوفہ کی طرف روانگی کے موقع پر اور مقتل شہداء میں گزرنے کے وقت اپنے بھتیجے زین العابدین کو دلاسا دے رہی تھیں جبکہ وہ اپنے باپ کے لاشے کو زمین گرم پر بے دفن دیکھ کر اتنا متاثر تھے کہ قریب تھا کہ روح جسم سے مفارقت کر جائے۔

شعائر الٰہیہ کا احترام امام حسین نے کعبہ کے احترام کو مدنظر رکھنے کے لیے حج کو ترک کیا اور مسافرت گوارا کی فرمایا میں نہیں چاہتا میری وجہ سے خانۂ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔

اسلاف کی یاد حسین کسی وقت اپنے بزرگوں کو نہیں بھولے۔ جب مدینہ سے روانگی قطعی ہوگئی تھی تو آخری شب اپنے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کے لیے مخصوص کی۔

مکہ سے چلتے وقت جو خطبہ پڑھا اُس میں بھی فرمایا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی ملاقات کا اُتنا مشتاق ہوں جتنا یعقوب یوسف کے مشتاق تھے۔

نہم محرم کی عصر کو جس وقت حملہ ہوا ہے تو آپ پر غنودگی طاری تھی۔ جناب زینب نے بیدار کیا تو فرمایا میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا ہے فرماتے ہیں کب میرے پاس آؤ گے۔

عاشور کے دن فرزند جوان علی اکبر کی جدائی کے وقت خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اُٹھائے اور کہا گواہ رہنا کہ وہ جوان جا رہا ہے جو صورت و سیرت و رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے۔ جب ہم مشتاق تیرے رسول کی زیارت کے ہوتے تھے تو اس کے چہرہ پر نظر ڈال لیتے تھے، اس طرح آپ نے علی اکبر کے غم میں اپنے شدید تاثر کا سبب بھی ظاہر کر دیا۔ بقول عالم نقوی:۔

شہ کو غم تھا شبیہ احمد کا   کب وہ روتے تھے اپنے اکبر کو

خودداری عام انسان ذرا سا سخت موقع آئے تو گڑگڑانے لگتا ہے اور بہت سی ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جو ایک خوددار انسان کے شایان شان نہیں ہیں۔

حضرت امام حسین نے شروع سے آخر تک کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہیں کیا جو عظمت نفس کے خلاف ہو۔

اُس وقت جب آپ مدینہ سے روانہ ہو رہے تھے لوگوں نے کہا کہ عبداللہ بن زبیر کی طرح عام راستے کو چھوڑ دیجیے اور غیر معروف راستے سے روانہ ہو جیے مگر حضرت نے فرمایا میں مجرموں کی طرح چھپ کر جانا نہیں چاہتا۔ میں عام راستے ہی سے جاؤں گا۔

کربلا میں ساتویں تاریخ سے پانی بند ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ غذا موجود تھی۔ جیسا کہ جناب شیخ جعفر شوستری نے لکھا ہے یقیناً غذا بھی میسر نہ تھی اور اس لیے امام حسین اور اُن کے اہل حرم جس طرح تین دن کے پیاسے تھے وہ تین دن کے بھوکے بھی تھے لیکن اس کے باوجود کربلا میں امام حسین نے پانی کا سوال بار بار کیا اور پیاس کا مختلف طرح اظہار کیا مگر کوئی تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ آپ نے یا آپ کے اعزا و انصار میں سے کسی نے بھوک کی شکایت کی ہو اور کھانے کا سوال کیا ہو۔

اس کا کیا سبب ہے؟ صرف یہ کہ پانی مانگنا اصول شرافت کے خلاف نہیں ہے ہر آدمی دوسرے سے پانی مانگ لیتا ہے مگر کھانا مانگنا یا بھوک کی تکلیف ظاہر کرنا رکیک بات ہے اور شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین اور اُن کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کیا۔

(خاتمۂ کتاب)

عالمِ انسانی کو اصلاحِ عمل اور اتباعِ اسوۂ حسینی کی دعوت

سنہ ۱۳۶۱ھ میں واقعۂ کربلا کو پورے تیرہ سو برس کا زمانہ گزرا اور اس کی سیزدہ صد سالہ یادگار دنیا کے ہر قطعہ میں منائی گئی۔ خود برّ اعظم ہندوستان کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور دیہات تک ایسا نہیں جہاں کسی نہ کسی طرح اس سال اس یاد کو تازہ نہ کیا گیا ہو۔ ہر جگہ بین الاقوامی جلسے ہوئے، جن میں ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، بودھ، جین اور آزاد خیال ہر طبقہ اور ہر ملک کے لوگوں نے مل کر امام حسین کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اسی یادگار کے سلسلہ میں یہ تاریخی کتاب "شہیدِ انسانیت" آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

عام طور پر واقعۂ کربلا کو ایک غم انگیز مصیبت ہی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے جس پر ہمارا کام آنسو بہانا اور اظہارِ رنج و ملال کر دینا ہے اور بس ——— مگر یہ تو ایک فطری تقاضائے انسانیت ہے جس کو بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ اسے مقصدِ حسین یا اصل مفادِ واقعۂ کربلا سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ حسین کا بلند نصب العین ہم سے کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ — وہ یہ کہ ہم اپنی سیرتِ زندگی کو حسینی سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہیں۔

امام حسین کو کوئی عقیدت مند اس اعتبار سے نجات دہندہ نہیں سمجھتا کہ اُنھوں نے اپنے ماننے والوں کو فرائض کی پابندی سے آزاد کر دیا اور خود گویا سب کا کفارہ ہو گئے۔ یہ سمجھنا کہ حضرت امام نے گنہگارانِ اُمّت کے لیے

شہادت اختیار کی، اس معنی سے ہرگز صحیح نہیں کہ انھوں نے ہمیں گناہوں کا جواز عطا کر دیا۔ اگر کوئی ایسا سمجھے گا تو اپنی غلط ذہنیت سے اُن کی شہادت کے مقصد کو پامال کرنے کا باعث ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ امام حسین کی ذات کو اپنے معاصی کے حق بجانب ہونے کا بہانہ قرار دیتا ہے، حسین بے شک نجات دہندۂ امت ہیں، بایں معنی کہ حسین نے نجات کا رستا نمایاں کر دیا۔ حسین نجات دہندۂ امت ہیں یعنی حسین نے ایک امت کی تشکیل کا سامان کر دیا جو اپنے عمل سے نجات کی حق دار ہو۔ اگر حسین نہ ہوتے اور اُن کا کربلا کا جہاد نہ ہوتا تو دین اور شریعت کی اصلی صورت ہی رخصت ہو جاتی۔ بادشاہوں کی سیرت سُنّت الٰہیہ بنتی اور اُن کی تقلید ہی معیار نجات سمجھی جاتی اور یہ امت اسلامیہ کی حقیقت میں ابدی ہلاکت ہوتی حسین نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ہم کو نجات کے قابل بنا دیا۔

ہمارا شہید اطاعت کے راستے پر لے جانے والا تھا۔ گناہوں کا دروازہ کھولنے والا نہیں تھا حسین نے ہمارے قوائے عمل کو معطل نہیں کیا ہے بلکہ اُن کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے بہترین محرک عمل ہے۔

پیشوایان مذہب نے جو گریہ و بکا کی تاکید کی اور اس کے لیے آخرت کے بہترین ثواب بتائے۔ اُس کا فلسفہ یہی تھا کہ اگر یہ ثواب ہمارے پیش نظر ہوگا تو ہم اُن کے حالات کو زیادہ سننے اور یاد کرنے کی کوشش کرینگے اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہمارے اعمال پر اُس کا اثر پڑے گا ــــ اگر اتنی اہمیت اس واقعہ کو بحیثیت مصیبت نہ دی گئی ہوتی تو دنیا کے تمام دیگر واقعات کی طرح یہ بھی تاریخ کے اوراق کے سپرد ہو جاتا اور یہ جو بچہ بچہ اُس سے واقف ہے یہ کبھی نہ ہوتا ــــ جب ہم اُس سے پورے طور پر واقف ہی نہ ہوتے تو سبق کیا حاصل کرتے۔

آج سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی کو امتیازی شان کے ساتھ قائم کرنے

کا بھی اصلی ماحصل یہی ہے۔ حسین کی یاد اگر پوری طاقت اور ایک نئی زندگی کے ساتھ ہمارے دل میں تازہ ہوئی ہے تو اس کا اثر ہمارے کردار پر پڑنا چاہیے

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:۔

"فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لیے ہوئی تاکہ پیروان اسلام کے لیے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اس کے ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لیے ایک کامل ترین مثال قائم کر دی۔ پس جو باخبر ہیں اُن کو رونا چاہیئے اور جو روتے ہیں اُن کو صرف رونے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ اُن کے سامنے سید الشہداء نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو جب تک اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر ثبوت نہ دے"

پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ یہ ہیں:۔

"عظیم مسائل اس ملک میں اور ساری دنیا میں اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور ہم انھیں محض ہمت، قربانی صبر و استقلال اور عقل سلیم ہی کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے کو ان مقاصد کا اہل بنانا ہے جو ہم کو دعوت عمل دے رہے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتیات اور حقیر شکایات کو بھلا دینا ہوگا اور وسیع تر مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا۔ یہ مقاصد ہم سے اتحاد و قربانی کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ آزادی ایک متحدہ قوم کے پاس آئے اور باہمی سوء ظن کا جذبہ ناپید ہو جائے سانحۂ کربلا کا یہی سبق ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اسی جذبہ کے ماتحت ہم سب اس قربانی کی بارگاہ میں سر عقیدت جھکائیں گے"

موجودہ زمانہ میں اگر قومی حالت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک

بہت بڑی کمزوری یہی ہے کہ قومیت کا صحیح احساس نہیں اور رواداری کے جذبات فنا ہو گئے ہیں۔

یہ افتراق و اختلاف، یہ روزمرہ کی لڑائیاں اور تنازعات جن سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں، کا ہے کا نتیجہ ہیں؟ صرف رواداری نہ ہونے اور ایثار کا جذبہ مفقود ہونے کا نتیجہ۔

ہر ایک اپنے ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کے اغراض کو پامال کر دینے کے لیے تیار۔ اپنے مطلب کے لیے ہر ایک کو نقصان پہونچانے پر آمادہ۔ یہ خود غرضی اور مطلب پروری وہ ہے جس سے افراد کے درمیان محبت کے جذبات کمزور اور قومیت کا شیرازہ روز بروز منتشر ہوتا جاتا ہے۔

اس کے بعد جوشِ عمل باقی نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ ہے اجتماعی اور انفرادی تعطل و جمود۔ رواداری نہیں اس لیے لڑیں گے اور دوسروں کی ترقی میں روڑے اٹکائیں گے اور خود جوشِ عمل نہیں اس لیے اپنی بھی ترقی و بہبودی کا کوئی سامان نہ کرینگے۔

آئین پسندی اور جس بات کو حق سمجھ لیا اس پر مرمٹنا، یہ چیزیں وہ ہیں جو ارتقائے قومی کا حقیقی رمز ہیں مگر جوش اور قوتِ عمل کے کمزور ہونے سے یہ جوہر بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ ثابت قدمی باقی نہیں رہتی۔ استقامت کا وجود اور استقلال کا نشان نہیں رہتا۔ دعاوی رہتے ہیں جن کا ثبوت نایاب۔

اگر واقعۂ کربلا سے قوم صحیح سبق حاصل کرے اور سید الشہداء نے کربلا میں جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے اس کو اتنا سمجھ لے کہ اس پر عمل پیرا ہو سکے تو زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں اور وہ تمام خصوصیات پیدا ہو جائیں جو ایک قوم کے حقیقی ارتقار کا جزو اعظم ہیں۔

واقعۂ کربلا حقیقت میں ایک مدرسۂ تربیت ہے جہاں دنیا کو اخلاق، ادب اور فرائض شناسی کے اصول بتلائے گئے ہیں۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے

سبق حاصل کریں اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسین دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

عہ "صدق دل سے حسین کے ساتھ اگر عقیدت ہو تو ان کے نقش قدم پر چلنا فرض ہے۔ سود و زیاں کا حساب لگانا بے کار ہے۔ جان رہے یا جائے۔ ثروت و حشمت حصہ میں آئیں یا نہ آئیں۔ حق پر فدا ہونا اور باطل کا فنا کرنا یہی پہلا اور آخری زینہ حسین کے مذہب کا ہے۔

حضرت امام حسین نے ورثہ میں غم کیوں دیا؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یزید کا مقابلہ کثیر فوج سے کرکے اُسے تہ تیغ کرتے اور دنیا میں بجائے ماتم کے محفل چراغاں ہوتی؟ غیر ممکن تو نہ تھا لیکن اگر ایسا کرتے تو اس کا ثبوت نہ ملتا کہ کمزور بھی باطل کا سامنا کر سکتے ہیں اور اپنی ہستی مٹا کر باطل کی بیخ کنی کر سکتے ہیں۔ ہر شخص تن آسانی کے خیال سے اپنے کو کمزور سمجھ کر باطل پرست بن جاتا اور اس کی بیعت کر لیتا۔

صرف یہی نہیں حسین کی قربانی میں ایک اور بھی راز ہے وہ آئے تھے انسان کے دل پر اُس کے فریضہ کا نقش قائم کرنے۔ یہ محفل چراغاں میں ناممکن تھا۔ دل پر چوٹ لگتی اور گہری چوٹ لگتی ہے تو غم کی نہ خوشی کی۔ رنج و الم کی تیز آنچ میں تپا کر ہی حسین نے اُس پر اپنا نقش کندہ کیا ہے۔

اگر دل میں ہر وقت حسین کا درد ہے تو ضرور اُس کو حسین کی فکر رہے گی اُن ہی کے نقش قدم کی تلاش ہوگی اور اُس پر چل کر حیات جاودانی حاصل کریگا دل غم امام سے آباد ہو۔ ہاتھ امام کے کام میں لگے ہوں۔ دل بیاد۔ دست بکار۔ کام بھی وہی جو امام کے پیرو کے شایان شان ہوں روزی کے لیے تو جانور بھی دوڑتے پھرتے ہیں اگر ہم بھی محض شکم پری کے کام میں پھنسے رہے تو ہم میں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہا۔ اگر ہم زندہ جاوید ہونا چاہتے ہیں

عہ پنڈت برج ناتھ صاحب شرغا ایڈوکیٹ لکھنؤ

تو ہم کو اپنے خیالات و احساسات سے، اپنے حرکات و سکنات سے حق کا اعتراف کرنا چاہیے۔

پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ترسیں مگر حق پر ثابت قدم رہیں۔ اپنے عزیز اپنے بچے آنکھوں کے سامنے بچھڑ جائیں، ہم اُف نہ کریں۔ سر قلم ہو لیکن باطل کی بیعت نہ کریں۔ ایسا ایثار ہونا چاہیے حسین کی راہ پر چلنے والے کے لیے کہ اپنے کو مٹا دے اور حق کا ہو رہے ——— اس وقت دنیا کو ضرورت ہی خود فراموش حق پرستوں کی۔

حسین اپنی روشِ زندگی سے دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ آؤ میرے قدموں کے نشان پر چلو۔ مٹا دو اپنے تئیں حق کے لیے۔ مقابلہ کرو باطل کا ہمت مردانگی سے۔ بنی نوع انسان کو ترقی معکوس سے بچاؤ جس پر اُس نے اب قدم بڑھایا ہے، انسان کو انسانیت سے بالاتر ہونا ہے۔ اسے حیوانیت کی طرف واپس نہ ہونے دو۔ جو اس دعوت کو قبول کرتے ہیں وہ حسین کے سچے پیرو ہیں۔

حسین کی یہ دعوت ایک ملک، ایک مذہب، ایک قوم، ایک زمانہ کے لیے محدود نہیں ہے۔ وہ تو بحرِ حیات میں مثل اُن روشنی کے برجوں کے ہیں جو ہر وقت ہر ملک و قوم و ملت کے بھولے بھٹکے جہازوں کو خطرہ سے آگاہ کر دیتے ہیں اور سلامتی کی راہ دکھلاتے ہیں۔"

عـہ "حسین نے اپنی بلند قربانی سے ایک روشن مثال قائم کر دی کہ ایک سچے معتقد کی کیا شان ہونا چاہیے۔ یزید کی مخالفت میں اُن کی طرف سے کوئی حیلہ گری، کوئی تصنع، اور سازش نہ تھی۔ وہ ایک نازک موقع میں ڈال دیے گئے تھے اور سخت قسم کی اُن کی آزمائش ہو رہی تھی لیکن وہ اخیر لمحہ تک مستقل رہے اور رتی بھر پس و پیش نہ کیا۔

ہم بے دست و پا افراد کی زندگی میں بھی اس قسم کے مواقع ممکن ہیں آ جائیں تو

عـہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

کیا یہ مثال ہماری نظروں کے سامنے ہماری رہبری اور ہمارے کمزور اور مرتعش قدموں کی رہنمائی نہ کرے گی۔ کیا ہم خوف اور لالچ کے مقابلہ میں استقلال کے ساتھ نہ کھڑے ہوں گے اور اپنی عزت نفس اور اپنے مذہب کی عزت بچانے میں اپنا سب کچھ قربان نہ کردینگے۔

اس کے برخلاف حسین پر ستم و ظلم کرنے والوں کا کردار ذلت کی گہرائی اور ظلم و تشدد کے عمق کی ایک بین مثال ہے کہ انسان دنیاوی فائدہ اور شہرت کی لالچ میں کہاں تک پہونچ جاتا ہے۔

وہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ وہ خدا کا نام لیتے تھے۔ وہ قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے اور پھر بھی اُنھوں نے پیغمبر اسلام کے نواسے کو بے دردی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔

اس حد تک آدمی اپنے کو دھوکے میں رکھ سکتا ہے جبکہ وہ حق و صداقت کی طرف سے اپنی آنکھوں کو بند کرلے۔

کیا ہم بھی ان ہی انسانوں کی طرح ہوں گے؟ کیا ہم بھی جبکہ ایک سچے مذہب کا دم بھرتے ہیں اُسی وقت اُس مذہب کی بیخ کنی پر آمادہ رہیں اور خود اپنے بھائیوں کا گلا کاٹیں۔

آئیے شہادت حسین کی اس یادگار کے موقع پر ہم اپنی روح اور دلوں کا جائزہ لیں۔ آئیے ہم اپنے دلوں کو لالچ، نفرت اور جانبداری سے پاک و صاف کردیں اور اُن میں انسانیت کے ساتھ محبت اور ہمدردی کی روح بھردیں۔

آئیے حسین کے قاتلوں کو بُرا کہنے کے بعد ہم خود اپنی ذاتی زندگی میں صداقت اور انصاف کا خون نہ کریں اور ایسا کرنے سے یزید و ابن زیاد کی حیثیت نہ حاصل کریں۔ اس لیے کہ حسین صداقت اور انصاف کے مجسمہ کے علاوہ اور تھے ہی کیا؟

آئیے ہم اپنی نظر کو تاریک ماضی میں دُور تک پھیلائیں اور پھر ایک دفعہ

حسین کا خوں آلود سر نیزہ پر چڑھا ہوا اور کوفہ کے کوچہ و بازار میں پھرایا جاتا ہوا دیکھیں حسین کا ہاتھ ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ ہم صداقت اور خوبی کے راستے پر۔ مذہب اور حق پرستی کے راستے پر۔ محبت اور رواداری کے راستے پر گامزن ہوں۔ کیا ہم حسین کی اس آواز پر لبیک نہ کہیں گے؟!"

تمام شد

(نوٹ)

کتاب کے توقع سے زیادہ طولانی ہو جانے کی وجہ سے ضمیمے اس جلد سے خارج کئے گئے۔ وہ دوسری جلد میں انشاء اللہ درج کئے جائینگے

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

اِدارۂ یادگارِ حسینی ۱۳۶۱ھ کا مفید و بہترین لٹریچر

مجالس عزا میں بطور تبرک دیگر اقوام میں مفت تقسیم کرنے اور خود واقعۂ کربلا کے متعلق بہترین معلومات حاصل کرنے کیلئے حسب ذیل کتب جلد طلب فرمائیے

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
واقعۂ کربلا اور اسکے اسباب و نتائج اردو	۵ر	پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے		اثبات عزاداری	۶ر	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام	
ہندی	۵ر	سوانح عمری شہزادہ علی اصغر	۸ر	ذوالجناح	۱ر	سندھی	۳ر
مذاہب عالم حسینؑ کی عظمت میں ہندی	۵ر	حبیب ابن مظاہر	ہر	شہدائے کربلا حصہ اول	۶ر	ہندی	۲ر
حسینؑ اور انکا پیغام انگریزی	ہر	عون ابن علیؑ	۲ر	حصہ دوم	عہ	بنگالی	ہر
ہندی	ہر	عثمان بن علیؑ	۴ر	حصہ سوم	۶ر	خاندان حسینؑ کی گرفتاری	۱۲
شہید کربلا	ہر	جنگ آزادی (نظم)	۱ر	کربلا کا جامع ہندی	۳ر	تاریخ حسینی (ترجمہ ابو حنیفہ)	ہر
سچا نیتا	ہر	مقدمہ فلسفۂ آل محمدؐ	۵ر	حسین ان دی لائین آف کربلا انگریزی	۲ر	ذکر العباس سوانح عمری	۱۲
دی سیج آف حسین انگریزی	ہر	فلسفۂ آل محمدؐ جلد اول	عہ	شہید اعظم	۲ر	حضرت عباسؑ	
مستند سی ایس نگا آیات انگریزی		جلد دوم	ہر	دی لاسٹ سیج آف حسین	۴ر	ہاشمی مجاہد سوانح عمری	
مارٹرڈم آف امام حسین مختصر	ہر	شہید نینوا	ہر	انگریزی	۲ر	حضرت علی اکبرؑ	
شہادت عظمیٰ بعیت فارسی	۲ر	یادگار شہید اعظم	ہر	اسیری کربلا	۳ر	عزاداری کی تاریخ	
رسالہ یوم عاشور محرم نمبر ۱۳۶۱ھ	۸ر	قاتلان حسینؑ کا مذہب	۲ر	دی ... آف حسین انگریزی	۱ر	ذاکری کی پہلی کتاب	۳ر
حسینؑ و اقعات کربلا کے متعلق		خون شہیدان		منظوم کربلا	۳ر	حصہ اول	۵
مختلف مذاہب کے بہترین		مجاہدۂ کربلا	عہ	دی ...	۳ر	حصہ دوم	۵
اہل قلم کے انگریزی مضامین		دی مارٹرڈم آف حسین انگریزی		حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام گجراتی	۳ر	ذاکری کی دوسری کتاب	۸ر
درج ہیں جس کا صرف		معارکۂ کربلا	۳ر			عجائب و نوادر	۲ر

واقعۂ کربلا پر بہترین تقریریں

ملک کے بہترین ہندو مسلم، عیسائی اور ہر مذہب و ملت کے مایۂ ناز مقررین نے یادگار حسینی کے اجلاس لکھنؤ میں جو بے نظیر تقریریں واقعۂ کربلا پر فرمائی ہیں اور ممتاز شعرا نے جو نظمیں ارشاد فرمائی ہیں اُن کا مکمل مجموعہ دیدہ زیب کتابت و بے مثل طباعت کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ اس میں تیرہ ۱۳ بلاک بھی ہیں جو آرٹ پیپر پر طبع ہوئے ہیں ضخامت ... صفحات باوجود ان تمام خصوصیات کے قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

نوٹ

نیز ہمارے یہاں سے تمام علمی ادبی اور مذہبی کتابیں مناسب قیمت پر مل سکتی ہیں۔ محصول ڈاک ہر صورت میں بذمہ خریدار ہوگا

سید مظہر نقی جارچوی آنریری جوائنٹ سکریٹری انجمن یادگار حسینی ناداں محل روڈ لکھنؤ